نبی رحمت

وَمَآ أَرۡسَلۡنَٰكَ إِلَّا رَحۡمَةٗ لِّلۡعَٰلَمِينَ

(الانبیاء ۱۰۷)

فہرست عناوین

"نبی رحمت"

دیباچہ طبع سوم

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین

خاتم النبیین محمد وآلہ وصحبہ اجمعین ومن تبعہم

باحسان الیٰ یوم الدین

اما بعد! مؤلف "نبی رحمت" کا قلب تو اللہ تعالیٰ کے اس احسان کے شکر میں سجدہ ریز ہے اور اس کے شاخوان کہ "السیرۃ النبویۃ" عربی کا ساتواں اور "نبی رحمت" (اردو) کا تیسرا ایڈیشن پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ عربی میں "السیرۃ النبویۃ" سنہ ۱۳۹۷ھ (سنہ ۱۹۷۷ء) میں شائع ہوئی تھی اور اس کا ساتواں ایڈیشن سنہ ۱۴۰۸ھ (سنہ ۱۹۸۸ء) میں دار الشروق (جدہ) سے نکلا ہے۔

عام ناظرین کے علاوہ موضوع سے خصوصی دلچسپی، واقفیت اور شغف رکھنے والے افراد، تعلیم و تربیت کے ماہرین اور علمی اداروں کی طرف سے کتاب کی جو قدر افزائی ہوئی اس پر مؤلف اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ عربی سیرت کا اردو، انگریزی، ترکی اور انڈونیشی زبان میں بھی ترجمہ ہوا اور ان زبانوں کے وسیع حلقے میں اس کی اشاعت ہوئی اور عربی سیرت نے خاص طور پر متعدد عرب جامعات

(یونیورسٹیز) کے نصاب میں جگہ پائی۔ اس عرصہ میں مؤلف کو سیرتِ نبوی اور اس کے تاریخی و جغرافی، تمدنی و اجتماعی پہلوؤں سے متعلق نئی کتابوں اور عربی، اردو، انگریزی کے جدید مواد سے استفادہ کا موقع ملا اور اس نے اُن کی روشنی میں کتاب میں جابجا قیمتی اضافے کیے، کہیں کہیں واقعات کے پس منظر پر مزید روشنی ڈالی، اور تقابلی مطالعہ کے نتائج پیش کیے، نیز سیرت کے واقعات کے بعض وہ تاریخی علمی اور دعوتی پہلو اجاگر کیے جو پہلے ایڈیشن میں رہ گئے تھے۔

مؤلف سیرت نے ابتداء ہی سے مجرد وقائع نگار اور ضابطے کے ایک مؤرخ کی حیثیت سے صرف واقعات و معلومات کی بے جان و خشک فہرست مرتب کرنے پر اکتفا نہیں کی، بلکہ واقعاتِ سیرت اور افادات و ارشاداتِ نبوی سے ان دور رس وعجیب نتائج اور ان بلیغ و عمیق اشارات کی طرف بھی متوجہ کرنے کی کوشش کی جو سیرِ انبیاء اور خصوصاً سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت و دعوت کے مطالعہ، نفسیاتِ انسانی، علم الاخلاق، و علم الاجتماع میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور جن سے ہر زمانہ اور ہر مقام میں دعوت و تربیت کے کام، قوموں اور نسلوں کی رہنمائی اور زندگی کے پیچ در پیچ مسائل و مشکلات کی عقدہ کشائی میں بیش قیمت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے یہ ایڈیشن سیرت کے قدیم بنیادی مواد کے ساتھ موضوعِ سیرت سے متعلق نئے معلومات، تاریخی تفحص اور علمی تحقیق پر مشتمل ہے، اسی کے ساتھ اس میں ایمانی و دینی جذبات کی تسکین اور ذاتِ نبوی سے قلبی و روحانی ربط و تعلق کی تقویت کا سامان بھی ہے، جو سیرتِ نبوی کی کتاب کی اصل سوغات اور زندگی کا

اصل قیمت ولذت ہے ۔

در زمین کائنات کردیم نگاہ
یک دانہ محبت است باقی ہمہ کاہ

یہ باتیں بغیر کسی مبالغہ ورنگ آمیزی کے پیش کی گئی ہیں کہ سیرت کو ان کی ضرورت نہیں اس کا جمال جہاں آرا قلب و دماغ کو موہنے اور متاثر کرنے کی ذاتی صلاحیت رکھتا ہے ۔

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

اخیر میں مؤلف ایک بار پھر اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے اس کو اس کی مہلت و توفیق دی اور اس کے لئے وہ اسباب فراہم کئے کہ وہ اپنی کتاب میں کچھ اضافے کرسکا، اسی طرح وہ "دار الشروق" اور اس کے فاضل و محترم مالک محب گرامی قدر شیخ محسن احمد بارودم کے حسن توجہ کا بھی ممنون ہے اور اللہ سے ان دونوں کے لئے دائمی توفیق اور حسن قبول کی دعا کرتا ہے ۔

والسلام
ابوالحسن علی ندوی
ندوۃ العلماء لکھنؤ

۲۸ شعبان ۱۴۰۶ھ
۲۸ اپریل ۱۹۸۶ء

دیباچہ طبع دوم

الحمد للہ رب العلمین والصلاۃ والسلام علی خیر المرسلین

وخاتم النبیین محمد وآلہ وصحبہ اجمعین

ناچیز مصنف کی زبان و قلم اللہ تبارک تعالیٰ کے اس انعام کے شکر اور اس کی حمد سے قاصر ہیں کہ سیرت نبوی کے سلسلہ کی اس کی ایک کوشش، جس کو اپنی نسبت عالی کی بنا پر حقیر و ناچیز لکھنے کی کسی طرح ہمت نہیں ہوتی، علمی و دینی حلقوں میں ناقابل اعتناء نہیں ٹھہری۔ کتاب اصلاً عربی زبان میں لکھی گئی تھی، جو سیرت کی مفصل و مبسوط، قدیم و جدید، عالمانہ اور محققانہ ہر طرح کی تصنیفات سے مالا مال ہے۔ اس کتاب کا اختتام ۵ ذی قعدہ ۱۳۹۶ھ (۲۹ اکتوبر ۱۹۷۶ء) کو ہوا تھا، لیکن چند برس کی مختصر مدت نہیں گزرنے پائی تھی کہ اس کے عربی ایڈیشن قاہرہ و بیروت سے شائع ہوئے اس ایڈیشن کی کئی ہزار کا تھا۔ اور دیکھتے دیکھتے وہ عالم عربی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گیا۔ مصنف کے لیے سب سے بڑی سعادت اور فخر کی بات یہ ہے کہ یہ کتاب اس سرزمین میں مقبول ہوئی جہاں اس حیات طیبہ کا ایک ایک لمحہ گزرا تھا، اور ان تعلیم گاہوں اور تعلیمی مرکزوں میں داخل نصاب ہوئی جو مہبط وحی

اور مولد و مرقد رسول سے قریبی نسبت رکھتے تھے۔ بیچ

بریں مژدہ گر جان فشانم رواست

عربی سے اردو میں ترجمہ کی خدمت مصنف کے لخت جگر اور قرۃ العین برادر زادہ عزیز سید محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی نے بڑے شوق اور پورے آداب کے ساتھ انجام دی، بیان کے ترجمہ کے سلسلے کی آخری کڑی تھی اس کی طباعت کے بعد وہ زیادہ دن اس دنیا میں نہیں رہے، اور ان پر چند دوستوں میں سیرت نبوی کے مصنف عظیم علامہ شبلی نعمانی کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہوتا تھا

کتاب کے ترجمہ پر مصنف نے اس وقت نظر ڈالی جب اس باب (نزول الماء) کی شکایت کی وجہ سے قلمی مسودات کے پڑھنے اور کتابت وطباعت کی غلطیوں کو پکڑنے کی پوری صلاحیت نہ تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس میں کچھ فروگذاشتیں ایسی رہ گئیں جن کو خود مصنف یا خور اور ہمدردی کے ساتھ ایک ایک لفظ پڑھنے والا ناقد بھی پکڑ سکتا تھا، مصنف اپنی بڑھی ہوئی مصروفیات اور پے درپے طویل سفروں کی وجہ سے اس پر نظر ثانی کرنے کے لئے جلد وقت نہیں نکال سکا، اب الحمدللہ اس کو اس کی توفیق اور فرصت ہوئی، اس نے اردو ترجمہ کو لفظاً لفظاً پڑھا، جہاں ضرورت پیش آئی اصل کتاب اور عربی ماخذ سے مقابلہ کیا، اور کتاب کو طبع ثانی کے لئے پورے طور پر تیار کر دیا، بعض مقامات پر (خصوصاً حواشی میں) چند مفید اور ضروری اضافے بھی کئے، متعدد اہل علم ناظرین نے بعض مقامات پر توجہ بھی دلائی جو نظر ثانی کے محتاج تھے،

مصنف ان سب دوستوں کا بھی شکر گزار ہے اور وہ خدا کے یہاں اجر و ثواب کے بھی مستحق ہیں جنھوں نے بعض اہم غلطیوں اور فروگزاشتوں کی نشاندہی کی، اس سلسلہ میں مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی استاذ تفسیر و حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء خاص طور پر قابل ذکر و شکر ہیں۔

اب کتاب کا یہ دوسرا ایڈیشن انسانی و امکانی سعی کے مطابق زیادہ صحیح اور مکمل شکل میں قارئین کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس سعی کو قبول فرمائے اور کتاب کو لکھنے والے، ترجمہ کرنے والے، پڑھنے والے اور اس کی طباعت و اشاعت میں کسی قسم کا حصہ لینے والوں کے لئے نجات اور ترقی درجات کا ذریعہ بنائے۔

ابوالحسن علی ندوی
دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی

٢٢ محرم الحرام ١٤٠٠ھ
یکم دسمبر ١٩٧٩ء

پیش لفظ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین

وخاتم النبیین محمد وآلہ وصحبہ اجمعین، ومن تبعهم

باحسان الی یوم الدین

وہ پہلا مکتب اور مدرسہ جہاں سب سے پہلے مصنف کتاب کا داخلہ ہوا وہ سیرت نبوی کا مدرسہ ہے، اس مبارک مدرسہ میں اس کا داخلہ اس ابتدائی عمر میں ہوا جس میں بچے عام طور پر مکتب اور مدرسہ میں داخل نہیں کئے جاتے، یہ اس کے گھرانے اور خاندانی ماحول اور فضا کا نتیجہ تھا جو وہاں قائم تھی، سیرت کو اس ثقافت اور کلچر کے ایک اہم اور بنیادی عنصر کی حیثیت حاصل تھی جس سے بہرہ مند اور آراستہ ہونا گھر کے بچوں اور لڑکوں کے لئے اس عہد میں ضروری خیال کیا جاتا تھا، اس میں اس بچے کی چھوٹی موٹی لائبریری کو بھی بڑا دخل ہے، جو نظم و نثر دونوں طرح کی کتابوں پر مشتمل تھی، اور برابر گردش میں رہتی تھی، اس کے بعد اس میں سب سے بڑا حصہ اس کے برادر اکبر ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبد العلی صاحب کی حکیمانہ تربیت اور رہنمائی کا ہے، اس کا فائدہ یہ تھا کہ اس نے بہت کم سنی اور نو عمری میں اردو میں سیرت کی وہ بہترین

کتابیں پڑھ لیں جن کے بارے میں عربی زبان کے بعد سیرت کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے اور جو اپنا آخر
میں اس پر سب سے بڑا کام ہوا ہے۔[1]

جب عربی زبان وادب کا کچھ ذوق پیدا ہوا تو اس نے اپنی ساری توجہ سیرت
کے عربی ماخذ پر مرکوز کردی ان میں سرفہرست دو کتابیں تھیں ایک ابن ہشام کی کتاب
"السیرۃ النبویۃ" دوسرے امام ابن القیم کی کتاب "زاد المعاد" اس نے ان
کتابوں کو صرف علمی یا روایتی طریقہ سے پڑھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ
انھیں کتابوں میں اپنی زندگی کے شب وروز بسر کئے یہی وہ وقت تھا جب اس کا دل
ایمان ویقین کی حلاوت سے آشنا ہوا اور جذبہ شوق ومحبت کو نئی غذا ملی اور اس کی
از سر نو آبیاری ہوئی اس لئے کہ سیرت کے موثر واقعات تربیت ورہنمائی کا سب سے
طاقتور ذریعہ اور انسان کے قلب ودماغ کے لئے (قرآن مجید کے بعد) سب سے زیادہ
اثر انگیز اور حیات آفریں سرچشمہ ہیں ان دونوں کتابوں کے بعد عربی اور انگریزی میں
سیرت کی جو قدیم وجدید کتابیں اس کی دسترس میں آئیں وہ بھی برابر مطالعہ میں آتی
رہیں یہی وجہ ہے کہ سیرت اس کی کتابوں اور تحریروں کی ہمیشہ سب سے بڑی بنیاد رہی
اسی کے دم قدم سے اس کا سارا سوز وساز اور آب ورنگ تھا اور اسی کے نقش قدم
کے طفیل اس کے نقوش قلم میں تازگی تھی اپنے مقاصد ومطالب کی وضاحت کے لئے
اس کو قوی سے قوی تر دلائل اور بلیغ سے بلیغ مثالیں سیرت کے جمال وکمال ہی سے

---

[1] اس کی دلچسپ کہانی مصنف نے اپنی عربی کتاب "الطریق الی المدینۃ" میں "الکتاب الذی لا انسیٰ فضلہ" کے عنوان سے سنائی ہے اور اس میں خاص طور پر قاضی محمد سلیمان صاحب منصورپوری مرحوم کی مشہور کتاب "رحمۃ للعالمین" کے مطالعہ کے گہرے اثرات کا ذکر کیا ہے۔

ملتی تھیں، اور سیرت نبی سے اس کی طبع میں روانی و جولانی پیدا ہوتی تھی اور اس کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوتی تھیں، اس کی کوئی قابل ذکر تحریر ایسی نہیں جس پر اس جمال محمدی کا کوئی پرتو اور سیرت نبوی کے گہرے مطالعہ اور فکر و تدبر کا کوئی عکس نہ ہو۔

سیرت کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں اور بعثت محمدی کی عظمت اور اس کے تحیر العقول اثرات و نتائج پر اس کے مقالات و خطبات کاروان مدینہ[1] میں یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

مصنف نے اس طویل عرصہ میں بہت سی کتابیں لکھیں، لیکن خاص سیرت کے موضوع پر کوئی مستقل کتاب اس کے قلم سے نہ نکل سکی، حالانکہ اس کو اس بات کا احساس تھا کہ اس موضوع پر ایک ایسی کتاب کی شدید ضرورت ہے جو ایک طرف عصری اور علمی اسلوب میں لکھی گئی ہو اور اس میں قدیم و جدید دونوں قسم کے ماخذ سے پورا استفادہ کیا گیا ہو، دوسری طرف سیرت کے اولین اور اصل (ORIGINAL) ماخذ پر اس کی بنیاد ہو اور قرآن و حدیث سے اس میں سرمو انحراف نہ کیا گیا ہو، وہ موسوعی (ENCYCLOPAEDIC) طرز پر نہ لکھی گئی ہو جس میں سارے معلومات بغیر کسی نقد و تمحیص کے بھر دیئے جاتے ہیں اور ہر طرح کا ضروری و غیر ضروری مواد پیش کر دینا ضروری سمجھا جاتا ہے، یہ وہ طرز تصنیف اور اسلوب تحریر ہے جس کے دور آخر کے اکثر مصنفین اور بعض متقدمین بھی عادی رہے ہیں، یہ طرز بحث ایسے غیر ضروری اشکالات و سوالات پیدا کرتا ہے جن سے سیرت نبوی بری و بے داغ ہے اور جس میں بادیہ پیمائی اور

---

[1] اس کتاب کے متعدد عربی ایڈیشن مدینہ منورہ، لکھنؤ اور دمشق سے اور اردو میں دو ایڈیشن لکھنؤ اور کراچی سے شائع ہو چکے ہیں، عربی میں اس کا نام "الطریق الی المدینة" ہے۔

آشفتہ سری کی سلاسل کو کوئی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ تحقیق و تنقیح کا قلم اجتہاد پسندانہ رجحانات اور مستشرقین کی تشکیک کا کوئی اثر قبول کیے بغیر اپنا کام کر چکا ہے۔ اس کے ساتھ وہاں ان مسلمات و حقائق کے ساتھ ہم آہنگ ہے جن کی روشنی و رہبری کے بغیر آسمانی کتاب یا انبیاء کی سیرت معجزات اور غیبی واقعات و حقائق کو صحیح طور پر سمجھنا مشکل ہے اور جو اس اصول پر کار بند اور اس عقیدہ کا حامل ہو کہ یہ ایک نبی کی سیرت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں مبعوث کیا گیا تھا اور جس کو ہر قدم پر حفاظت خداوندی نصرت و تائید حاصل تھی نہ کسی بڑے قومی لیڈر اور ملکی رہنما کے حالات زندگی۔ یہ وہ سیرت ہے جو ہر منصف مزاج تعلیم یافتہ شخص (خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم) کے سامنے کسی تحفظ (RESERVATION) استثناء اور کسی تاویل کا سہارا لیے بغیر پیش کی جا سکے۔ چنانچہ مصنف نے اس کتاب میں خود ان واقعات و حالات اور سیرت کے اصل و بنیادی مواد پر زیادہ اعتماد کیا ہے اور اس کو اس کا موقع دیا ہے کہ وہ خود اپنی زبان سے بولے اور پڑھنے والے کے دماغ و دل اور ذہن و نظر میں اپنا راستہ خود بنائے۔ ان منہ سے بولتی ہوئی صداقتوں اور زندہ حقیقتوں کو فلسفہ کا رنگ دینے، واقعات کی تاویل کرنے اور اس کے لئے طویل و عریض مضمون باندھنے کی اس میں زیادہ کوشش نہیں کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سیرت اپنے حسن و جمال، اپنی موزونیت و لطافت اور اپنی اثر انگیزی و دل آویزی کے لئے کسی بڑے آدمی کی سفارش، کسی حکیم کے علم و دانش اور کسی ادیب اور صاحب قلم کے انداز نگارش یا رنگینی بیان کی محتاج نہیں۔ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ ایک مصنف کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ حسن بیان، حسن ترتیب اور حسن انتخاب ہے۔

پھر اس میں عقل و جذبات دونوں کی بیک وقت اور شانہ بشانہ جلوہ گری اور

کا فرمانی ہونی چاہیئے ایسا نہ ہو کہ عالمانہ بحث اور معروضی تنقید و جائزہ جذبۂ محبت
اور ذوق و شوق کی کیفیت کو سرد و افسردہ کر دے جو سیرت کے جمالِ جہاں آرا سے
لطف اندوز ہونے اور اپنے دیدۂ و دل کو اس سے روشن اور منور کرنے کی ایک ناگزیر
ضرورت اور اس سے صحیح و کامل استفادہ اور اس کے مسائل احکام اور واقعات کو
صحیح طور پر سمجھنے اور صحیح نتائج تک پہنچنے کی لازمی شرط ہے اگر سیرت کی کوئی کتاب
اس جذباتی اور ایمانی عنصر سے خالی ہے تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ چوبِ خشک کا مصنوعی
ڈھانچہ ہے جس میں زندگی کی حرارت اور نمی موجود نہیں اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ
یہ جذباتی و ایمانی عنصر عقلِ سلیم کے تقاضوں پر غالب نہ آجائے جن کی اہمیت عصرِ حاضر
نے خاص طور پر بڑھا دی ہے نہ وہ منطق کے صحیح معقول اور قابلِ فہم اصولوں کے منافی ہو
نہ عقیدہ اور تقلید پر مبنی ایسا خراجِ عقیدت اور خراجِ تحسین ہو جس کو صرف موروثی اور
پشتینی مسلمان اور وہ علماء راسخین قبول و تسلیم کر سکیں جن کی بیرونی دنیا اور جدید
ثقافت سے کوئی رسم و راہ نہیں یا عقیدت و محبت بلاشبہ ایک عطیۂ خداوندی اور نعمت
خداداد ہے لیکن یہ بات کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ وہ بہرحال اس نبی کی سیرت ہے
جس کو رحمۃ للعالمین بنا کر دنیا کے تمام انسانوں اور نوعِ انسانی کے تمام طبقوں کی
طرف بھیجا گیا ہے اس لئے اس کو اس طبقہ کے افراد کے لئے ممنوع یا محرم نہیں
کیا جا سکتا جن کو حالات نے اس اسلامی و ایمانی ماحول میں نشو و نما حاصل کرنے کا
موقع نہیں دیا اور تقدیرِ الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ وہ غیر اسلامی ماحول ہی میں پیدا ہوں
وہیں ان کی نشو و نما ہو پھر لطفِ الٰہی ان کی مساعدت کرے اور سیرتِ محمدی کا کوئی
معطر و جاں نواز جھونکا اپنی دل آرائی و مسیحائی کے ذریعہ ان کو اس جگہ سے اٹھا کر

اسلام کے سایۂ رحمت اور ایمان کی پناہ گاہ میں پہنچا چکے، واقعہ یہ ہے کہ ان غیر مسلموں کو
حقِ سیرت بیان کرنا ان مسلمانوں سے ہرگز کم نہیں جو پہلے ہی سے اسلام و ایمان کے سایۂ رحمت
میں آچکے اس لئے کہ دوا و علاج کی تندرست سے زیادہ ایک بیمار کو ضرورت ہے، دریا کے
اس پار رہنے والے کو پل کی جتنی حاجت ہوگی اتنی حاجت پل کے اسی طرف رہنے
والے کو کیوں کر ہو سکتی ہے؟

مصنف سیرت نگاری کے وقت اس ماحول اور اس عہد کو بھی کسی طرح نظر انداز
اور فراموش نہیں کر سکتا، جس میں نبوت محمدی کا آفتاب پہلی بار طلوع ہوا، اس لئے
اس عہد کی عالمگیر جاہلیت کی پوری تصویر کشی بھی ضروری ہے جو چھٹی صدی عیسوی
میں ساری دنیا پر محیط نظر آتی ہے، اس میں یہ بھی دکھانا ہوگا کہ اس زمانہ میں
فساد و اخلاقی بگاڑ اور انسان کی بے چینی و اضطراب کس درجہ پر پہنچ چکا تھا،
اس کی اخلاقی، سماجی، معاشی اور سیاسی حالت کیا تھی؟ تخریب و فساد کے
کیا کیا اسباب و عوامل اس وقت کی دنیا میں کارفرما تھے اور کیسی کیسی ظالمانہ
حکومتیں، مسخ شدہ مذاہب، انتہا پسندانہ و خیالی فلسفے، تباہ کن تحریکیں اور قومیں
اپنا کام کر رہی تھیں، جب مصنف نے اپنی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط
المسلمین"[1] کی تمہید اور مقدمہ کے طور پر عہد جاہلیت کی ذرا تفصیل کے ساتھ تصویر
کھینچنے کی کوشش کی تو اس قدر دشواری کا سامنا کرنا پڑا جو اسے آج تک یاد
ہے، اس کو اس کے لئے ان تمام مغربی ماخذ کا جائزہ لینا پڑا جن میں ظہورِ اسلام کے
وقت کے متمدن ملکوں اور اقوام عالم کی تاریخ بیان کی گئی تھی، اسی لئے ان تمام ضخیم کتابوں

---

[1] جس کے اردو ترجمہ کا نام "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" ہے۔

نے ان منتشر حالات کو اس طرح جمع کیا ہے جیسے چھوٹے شیشوں کے ٹکڑے ٹکڑے جوڑ کر دانے اکٹھا کئے جاتے ہیں
یہ تجزیہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہے اور سیرت کا مطالعہ کرنے والے کے لئے
روشنی کا کام کرتی ہے اور اس کے سامنے بعثتِ محمدی کی عظمت و وسعت اور منصبِ نبوت
کی نزاکت و اہمیت اور اس کے عظیم الشان نتائج کی مکمل تصویر پیش کرتی ہے۔
عہدِ حاضر کے سیرت نگار کے لئے بہت ضروری ہے اور اس کا کام اس وقت تک مکمل قرار
نہیں دیا جائے گا جب تک اس میں بحث و تحقیق کا یہ انداز اختیار نہ کیا گیا ہو اور ظہورِ اسلام
کے وقت عہدِ جاہلیت کا نقشہ اور اس کے فساد و اضطراب، اخلاقی پستی اور خود فراموشی
و خود کشی کی زندہ و متحرک تصویر پوری امانت داری کے ساتھ بے کم و کاست پیش نہ کی گئی ہو۔
یہی اس ماحول اور اس شہر کا نقشہ تھا جہاں اسلام کی پہلی کرن چمکی، جہاں
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی اور دعوتِ حق کے قافلہ
نے پہلا قدم آگے بڑھایا، جہاں آپ کی عمر مبارک کے ۵۳ سال گذرے اور جہاں تیرہ سال
دعوتِ اسلام کے سخت و جاں گداز مرحلوں میں بسر ہوئے۔ سیرت کا مطالعہ کرنے
والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس زمانہ میں عقل و شعور اور تہذیب و تمدن کی جو سطح تھی،
اس سے باخبر ہو، نیز اس ملک کے اجتماعی اور سیاسی اور دینی و مذہبی حالات، اس کے
اقتصادی و سیاسی ڈھانچہ اور حربی اور عسکری طاقت کی نوعیت سے بھی واقف
ہو تاکہ اس ملک کے باشندوں کے صحیح رجحانات، ان کے مزاج و افتادِ طبع، ان کے ذہن
و نفسیات کو اچھی طرح سمجھ سکے، اور اس کو ان دشواریوں اور رکاوٹوں کا پورا

۱؎ ملاحظہ فرمائیے "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" باب بعثت سے پہلے شائع کردہ
"مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ"۔

اندازہ ہوسکے جو اسلام کی ترقی و پیش قدمی کی راہ میں حائل ہو رہی تھیں۔

یہی بات بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی یثرب کے بارہ میں کہی جا سکتی ہے جہاں اسلام منتقل ہوا جہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام نے ہجرت فرمائی اور تقدیر الٰہی نے اس کو اسلام کا اولین مرکز قرار دیا، اس لیے اس کے پس منظر کو سمجھے بغیر اسلام کی کامیابیوں اور کامرانیوں کا پورا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، ان حالات کو جانے بغیر ہم سمجھ ہی نہیں سکتے کہ اسلام نے ان افراد کی کیا اور کس طرح تربیت کی ان کو کیسے حیات نو بخشی، مختلف مسائل کو کس طرح حل کیا، متضاد و متحارب عناصر کو کس طرح شیر و شکر کیا، اس سلسلہ میں نبوت محمدی کا کارنامہ کیا تھا؟ اس نے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے اور روٹھے ہوئے انسانوں کو ملانے، اور ان کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و تطہیر کا فریضہ کس طرح انجام دیا، یہ بات صرف اسی وقت سمجھی جا سکتی ہے جب آدمی کے سامنے اس عجیب و غریب اور پیچیدہ ماحول کی پوری تصویر ہو جس کا سامنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو کرنا پڑا، بہت سے واقعات اور فیصلے جو حدیث و سیرت کے مطالعہ میں آدمی کی نظر سے گزرتے ہیں اس وقت تک سمجھے ہی نہیں جا سکتے جب تک مدینہ کی اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی حالت، وہاں کی زمین کی خاصیت اس کے جغرافیائی حدود و قرائن، وہاں کی انفرادی اور علاقائی طاقتوں، ان کے باہمی تعلقات و روابط، حالات اور رجحانات، اور ہجرت سے قبل کے معاملات اور نزاعات و ملکی دستور اور رسم و رواج کا قاری کو علم نہ ہو، اگر کوئی شخص ان تمام باتوں سے بالکل ناواقف ہو کر سیرت کی کتابوں میں اپنا سفر شروع کرتا ہے تو اس کی مثال ایک شہر میں چلنے والے کی سی ہوگی جس کو نہ اپنے داہنے بائیں اور آغاز و منزل کسی چیز کی خبر نہ ہو۔

یہی اصول اس وقت کی معاصر و متمدن حکومتوں اور بڑی ریاستوں پر بھی منطبق ہوتا ہے اس لئے کہ ناظرین کے سامنے دعوت اسلامی کے اس اقدام کی اہمیت اور اس کی حوصلہ مندی اور خطر پسندی کی کوئی صاف اور واضح تصویر اس وقت تک نہیں آسکتی جب تک اس کو ان حکومتوں کے حجم اور قوت و شوکت کا اندازہ نہ ہو جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلام دی اور ان کے نام فرامین جاری کئے، اور ان کی تہذیب و ثقافت عسکری قوت، وسائل و ذرائع اور عرض و طول اور ان کے سلاطین کی عظمت، اور ان کے رعب و دبدبہ اور شان و شوکت کا صحیح علم نہ ہو، جدید معلومات نے ان حکومتوں اور قوموں کی تاریخ اور ان کے معاشرہ پر خاصی روشنی ڈال دی ہے اور بہت سے ان حالات اور حقائق کا پردہ چاک کر دیا ہے جو عہد قدیم میں لوگوں کے سامنے نہیں آئے تھے یا زیادہ صاف اور واضح نہ ہوئے تھے، اس زمانہ کے سیرت نگار کے لئے بہتر و ضروری ہوگا کہ وہ اپنے کام میں ان تمام معلومات سے پورا مدد لے اور تاریخ و جغرافیہ اور تقابلی مطالعہ (COMPARATIVE STUDIES) کے میدان میں جو جدید ترین UP TO DATE مباحث و معلومات اب تک سامنے آئے ہیں ان سے پورا فائدہ اٹھائے۔

مصنف کو ان تمام باتوں کا احساس تھا اور سیرت نگاروں کی ناقابل فراموش خدمت اور مختلف زمانوں و مختلف زبانوں میں ان کے قلم سے نکلنے والی تحریروں کی قیمت و افادیت کا پورا اعتراف بھی، اس لئے اپنی سعادت سمجھ کر یہ کوشش کی کہ وہ بھی سیرت نبوی پر ایک نئی کتاب لکھ کر اس محبوب و جلیل القدر موضوع کے مصنفین کی نورانی فہرست میں شامل ہو جائے۔

لیکن تنگی وقت اور ضعف بصارت کی وجہ سے مصنف کی تفصیلی اطمینان

کے ساتھ اس موضوع پر قلم اٹھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی، اس لئے کہ اس کو اس کا خوب تجربہ تھا کہ کسی بڑے آدمی کی سیرت (جس اور سید الاولین والآخرین واشرف المرسلین کا معاملہ اس سے کہیں برتر و بالا ہے) مصنفین کے لئے سخت مشکل اور نازک موضوع ہے، مصنف کو مشہور اہم شخصیات کے سوانح حیات اور متقدمین و متاخرین کے حالات زندگی اور کارنامے لکھنے اور بیان کرنے کا شاید اپنے بہت سے معاصرین اور رفقاء سے زیادہ اتفاق ہوا ہے اس نے آغاز نوجوانی بلکہ لڑکپن ہی سے جب سے قلم کو چلانا سیکھا، اہل حق مصلحین امت اور اصحاب دعوت و عزیمت کے حالات و تراجم پر لکھنا شروع کر دیا، اور اپنے قلم سے سیر و تراجم کے موضوع پر کئی ہزار صفحے سیاہ اور اپنے نصیب کو روشن کیا، اور بچپن ہی سے ان اسلاف کرام اور ائمۂ رشد و ہدایت کے ساتھ زندگی گذاری، اور خدا کا شکر ہے کہ اس سلسلہ میں بہت کچھ پڑھنے کا موقع ملا، اور بہت کچھ لکھنے کی توفیق ہوئی، ان سب وجوہ کی بنا پر اس کو اس موضوع کی نزاکت اور اس ذمہ داری کی اہمیت کا اندازہ تھا، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی مصنف پر کوئی خاص رجحان یا ذوق ایسا غالب آتا ہے کہ وہ اپنے ممدوح کو بھی شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنے اس ذوق و رجحان کے تابع کر دیتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی تصنیف اور تحریر صرف اس رجحان اور ذوق کی نمائندگی کرتی ہے جو اس وقت مصنف پر حاوی تھا، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے ممدوح کی تصویر کشی کے ارادہ سے قلم اٹھاتا ہے لیکن بجائے اس کے خود اپنی تصویر اتار دیتا ہے، وہ اس کے حالات و سوانح پر صرف روشنی اور بے لاگ طریقہ سے روشنی ڈالنا چاہتا ہے لیکن اس کو اپنے ذاتی میلانات و تجربات اور اپنے نقطۂ نظر کی عینک سے دیکھنے اور ان حالات و واقعات کو اپنے مخصوص پیمانوں سے ناپنے لگتا ہے۔

جس کا علم النفس اور اخلاقیات کے کوچے سے بھی گذر ہوا ہے معاشر شخصیتوں کے مطالعہ و مشاہدہ کا اسے کبھی موقع ملا ہے اور اس نے ایک طویل عرصہ ان کی رفاقت و صحبت میں گذارا ہے وہ بآسانی اندازہ کر سکتا ہے کہ نفس انسانی کی تہ تک پہنچنا اور اس کے وسیع آفاق اور فضا سے پیدا کا علم پھر اس کی جامع اور نازک تصویر کشی علوم اور تعبیر اور اسالیب بیان کی سب سے دشوار نازک اور بہت جلد متاثر ہونے والی صنعت ہے اور اس کا تھوڑا بہت حق وہی ادا کر سکتا ہے جو نفس انسانی کے احساسات و جذبات اس کے سوز و ساز سرور و شوق اس کی رنج کی تپش اور دل کے گداز سے بہت کچھ واقف ہو اور یہ محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو کہ اس کی راتیں کیسے کٹتی ہیں اور اس کے دن کس طرح گذرتے ہیں وہ اپنے گھر میں کیا نظر آتا ہے اور اپنے رفقاء و دوستوں سے کس طرح پیش آتا ہے اس نے اس کو صلح و جنگ میں بھی دیکھا ہو اور اشتعال اور سکون تنگی و راحت اور ضعف و قوت میں بھی اس لئے کہ انسان کے اندر بہت سے ایسے جذبات و احساسات اور اس کے جمال و کمال کے بہت سے ایسے نادیدہ و ناشنیدہ پہلو بھی ہیں جن کے لئے انسانی لغت میں ابھی تک الفاظ وضع نہیں کئے جا سکے اور جن کی منظر کشی و ترجمانی کے لئے لغت کا بڑے سے بڑا ذخیرہ کفایت نہیں کرتا۔ ؎

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

سیرت نبوی یا دوسرے افراد بنی آدم میں (بشمول انبیاء و غیر انبیاء) اپنی نزاکت و لطافت وسعت و جامعیت زندگی کی نازک سے نازک تفصیلات اور دقیق سے دقیق معانی و مطالب اور دل کی دھڑکنوں اور پیشانی کی سلوٹوں اور نفس انسانی کی مختلف حالتوں کے احاطہ و استیعاب اور اس کی مکمل تشریح و ترجمانی میں سب سے

ممتاز اور بلند مقام رکھتی ہے ایسا در اصل علم حدیث کی وجہ سے ممکن ہو سکا جس کی کوئی
نظیر دوسرے انبیاء یا تاریخ انسانی کی عظیم شخصیتوں میں کہیں نہیں ملتی سیرت و شمائل
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں[1] دن و رات کے مختلف حصوں میں آپ کے
اوراد و اذکار اور خدا کے حضور آپ کی آہ سحرگاہی اور گریۂ نیم شبی اور اس امت اور
پوری انسانیت کے لئے آپ کی بیقراری و دل سوزی کے جو عجیب نمونے آپ کے ادعیۂ
مسنونہ کے وسیع ذخیرہ[2] میں ہمیں نظر آتے ہیں اس کو بھی اس میں بڑا دخل ہے اسی طرح
آپ کے اقوال ماثورہ اور جوامع الکلم اور آپ کے باکمال وصف نگاروں اور
اہل بیت کرام نے آپ کے جو شمائل و خصائل عادات و معمولات اور روزمرہ کی زندگی
کے واقعات بیان کئے ہیں ادبیات عالم اور تاریخ و انساب کے وسیع لٹریچر نے اس سے
زیادہ نازک تصویر کشی اور منظر نگاری اور انسانی خد و خال اور اس کی اخلاقی بلندیوں
اور لطافتوں کی اس سے عمیق اور عظیم ترجمانی اب تک ریکارڈ نہیں کی گئی۔ اس لحاظ سے
سیرت کے موضوع پر کتاب کی تصنیف میں کسی طرح کی دشواری اور ابہام و مفروضات
قائم کرنے اور قیاس سے کام لینے کی بالکل ضرورت نہیں جو مصلحین و قائدین کے تذکرے
میں بہت پیش آتی ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت ان سب سے زیادہ مکمل ہے

---

[1] اس کی تفصیل کے لئے مصنف کا مقالہ "سیرت محمدی دعاؤں کے آئینہ میں" ملاحظہ فرمائیں جس میں
سیرت سے ان دعاؤں کا تعلق انسانی زندگی کے حقائق اور انسانی نفسیات و اخلاقیات سے آپ کی گہری واقفیت
اور اس کے باریک سے باریک و نازک سے نازک پہلوؤں کی کامل رعایت کا اندازہ ہوتا ہے یہ مقالہ ایک
مستقل رسالہ کی شکل میں کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں مصنف کی
کتاب "منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین" مضمون "محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا معجزہ
رہتی دنیا تک کے انسانوں کے لئے قابل تقلید نمونہ و اسوہ اور اس کے وسیع امکانات"
بار اول طبع ص ۲۰۰-۲۱۲

اور جن میں بھی اس کی بنیاد قرآن مجید کے وہ صریح نصوص اور تاریخ کی ناقابل تردید شہادتیں
آپ کا جمال صوری و معنوی، شمائل و خصائل، عادات، عبادات اور اخلاق و معاملات
کی وہ واضح، روشن اور تفصیلات جزئیات ہیں جن سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا
یا جس سے حقیقت اور امر واقعہ سے کبھی اتنی قریب ہیں جس سے زیادہ تصور نا ممکن ہے۔

لیکن ان تمام باتوں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور مصلحین
عالم کے سوانح و حالات زندگی بلکہ خود دوسرے انبیاء کرام کی سیرت میں اس قدر فرق
و تفاوت اور سیرت محمدی کی اس گیرائی اور ہمہ گیری اور جہاں آرائی کے باوجود جو کمال
نبوت اور کمال آدمیت کی سدرۃ المنتہیٰ اور معراج ہے ہم اس کا اعتراف کرنے پر
مجبور ہوتے ہیں کہ آپ کی زندگی اور مکارم اخلاق کی صحیح تصویر اور آپ کے ان معجزات کا
استیعاب و تفصیل جن کی جلوہ ریزی آپ کی پوری سیرت، دعوت اور انفرادی و اجتماعی
زندگی میں نظر آتی ہے اللہ تعالےٰ کے ساتھ اور اللہ کے بندوں کے ساتھ آپ کا معاملہ
آپ کا حسن صورت، سیرت، کمال ظاہر و باطن، آپ کی محبت و شفقت اور دلداری
و دلنوازی، آپ کی دعائیں اور خدا سے عرض حال، بنی نوع انسان اور انسانیت کے
مستقبل کے لئے آپ کی بیقراری و دل سوزی، آپ کی فصاحت، بلاغت، علم و حکمت
اور کمال و جامعیت کی ان روشن و جمال نواز تشبیہوں اور تشریحوں لافانی معجزوں کا
مفصل و مکمل بیان قریب قریب نا ممکن ہے، سیر و شمائل کی کتابوں نے اس سلسلہ میں
جو کچھ پیش کیا ہے وہ ان کے کمال دیدہ وری و ژرف نگاہی کے اعتراف کے ساتھ
آپ کے جمال سیرت و کمال نبوت کا صرف ایک ہلکا سا عکس ہے جو اللہ تعالےٰ نے
آپ ہی کے ساتھ مخصوص فرمایا تھا، زیادہ سے زیادہ اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ

بیان کی بس محمود ہے کہ انھوں نے اس قدر ضبط و اتقان اور نہایت درجہ اہتمام کے ساتھ ان حالات کو قلم بند کیا، اور اس کی بہترین جزا اللہ تعالیٰ ان کو عطا فرمائے گا، یہ ایسی مشترک عالم گیر اور غیر مختتم دولت ہے جس میں ہر فرد بشر، ہر انسانی نسل اور انسانوں کا ہر گروہ، اور ہر طبقہ ہدایت و روشنی اور اتباع و پیروی میں اپنا حصہ رسدی پا سکتا اور اچھے طالب حقیقت کو بیدار کر سکتا ہے :-

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ	تم کو پیغمبر خدا کی پیروی کرنی بہتر ہے
أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ	یعنی اس شخص کو جس کو خدا سے ملنے
يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ	اور روز قیامت کے آنے کی امید ہو
وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا (سورۃ الاحزاب)	اور وہ خدا کا کثرت سے ذکر کرتا ہو۔

شاید یہی اسباب و وجوہ تھے جن کی وجہ سے سیرت نبوی کے موضوع پر کسی نئی تالیف کی مجھے اب تک ہمت نہ ہو سکی، اور میں اس عظیم الشان کام کو اپنی حیثیت سے بہت بلند سمجھتا رہا، میرے بعض فاضل اور محترم دوستوں[1] نے مجھے اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش بھی کی کہ عربی زبان میں سیرت نبوی پر ایک ایسی کتاب تیار کروں جس میں نئی نسل کے ذہن اور ذوق اور اس کے فہم اور نفسیات کی موجودہ سطح کا خیال رکھا گیا ہو، نیز ان نئے تقاضوں اور ضرورتوں اور اس طرز تحقیق اور طرز کلام کی اس میں پوری رعایت ہو جو موجودہ دور میں رائج ہے اس لئے کہ ہر زمانہ کا ایک خاص اسلوب بیان اور زبان ہوتی ہے جن کا لحاظ ضروری ہوتا ہے داعیوں

---

[1] بالخصوص مصنف کے فاضل و محترم دوست شیخ محمد محمود الصواف رکن مجلس تاسیسی رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ و مشیر وزارت تعلیم حکومت سعودیہ۔

اور غذاؤں کی بھی خاص خوراکیں اور ایک خاص ترتیب ہوتی ہے جو حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، لیکن یہ سب کچھ (جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے) سیرت کو اپنی خواہشات و اغراض اور ان علمی نظریات کا تابع بنائے بغیر ہونا چاہیے جو صبح و شام بدلتے رہتے ہیں، اور اس کو ان شبہات و اعتراضات کی ہر آمیزش اور آلودگی سے پاک و صاف ہونا چاہیے جو اکثر مذہبی تعصب، کم علمی و ناواقفیت یا سیاسی معاندات و اغراض سے پیدا ہوتے ہیں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ نے مجھے اس معاملہ میں شرح صدر نصیب فرمایا اور میں پوری یکسوئی اور توجہ کے ساتھ اس کام میں مشغول ہو گیا، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ میرے سارے لمحات اور سانسیں اسی ماحول میں گزرنے لگیں، میں نے اس سلسلہ میں نہ صرف سیرت و حدیث کی کتابیں پڑھنا شروع کیں، بلکہ قدیم اور جدید لٹریچر میں جو بھی کام کی چیز مجھے ملی میں نے اس سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، اس کے بعد میں نے اس موضوع پر جو سب سے زیادہ مستند کتابیں لکھی گئی ہیں ان پر اعتماد کرتے ہوئے اس مبارک کام کا آغاز کیا، عہد حاضر میں اس موضوع پر جو کچھ کام ہوا ہے اور مغربی زبانوں کے اہم ماخذ سے بھی (جن سے سیرت کے بہت سے پہلوؤں کی وضاحت ہوتی ہے اور اس عہد کی اور ان حکومتوں اور سلطنتوں نیز اس زمانہ کے معاشرہ اور سوسائٹی پر روشنی پڑتی ہے) استفادہ کی کوشش کی گئی ہے[1] اور اس کی کوشش کی گئی کہ کتاب علمی اور تربیتی و دعوتی دونوں پہلوؤں کی جامع ہو اور ان میں سے کوئی ایک پہلو دوسرے پہلو پر غالب نہ آ جائے، نیز اس میں وہ زندہ منہ سے بولتے ہوئے

---

[1] عربی و دیگر زبانوں کے ماخذ کا انڈکس کتاب کے آخر میں ملاحظہ کریں۔

اور زندگی و حرارت سے بھرے ہوئے اقتباسات زیادہ سے زیادہ پیش کیے جائیں جن سے اسوۂ نبوی کے اتباع اور پیروی کا جذبہ پڑھنے والے میں خود بخود پیدا ہوتا ہے اور جس کی نظیر کسی انسان کی سیرت کسی عظیم سے عظیم شخصیت کے سوانح کسی نسل اور قوم کی تاریخ اور کسی دعوت و تحریک اور دین و مذہب کے نقشہ میں نہیں ملتی، یہ سب کسی رنگ آمیزی، داستان طرازی اور تزئین و آرائش کے بغیر قاری کے سامنے رکھ دیا جائے کہ جمال فطرت اور حسن حقیقت کو ظاہری رنگ و روغن اور مہکتے ہوئے تازہ پھولوں کو مصنوعی رنگ و بو کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ع

روئے دل آرام را حاجت مشاطہ نیست

شوال ۱۳۹۵ھ سے شوال ۱۳۹۶ھ (اکتوبر ۱۹۷۵ء - اکتوبر ۱۹۷۶ء) تک مجھے اس موضوع کے سوا بعض اضطراری حالات کو چھوڑ کر کسی اور چیز سے سروکار نہیں رہا، درمیان میں کچھ وقفے کسی بیماری کے حملہ اور مشرق و مغرب کے بعض طویل دورہ کے مقدر ہوئے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے غرۂ شوال ۱۳۹۶ھ میں یہ کتاب تکمیل کو پہونچی اور اب قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔

اس موقع پر اپنے ان دو فاضل دوستوں کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جن سے مجھے اس کتاب کی تالیف میں بڑی مدد ملی، ایک مولانا برہان الدین سنبھلی استاذ حدیث و تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء جن سے احادیث کی تخریج اور تلاش و جستجو نیز کتب سیر کے بعض مقامات کی تحقیق میں مجھے قیمتی مدد ملی، اللہ تعالیٰ ان کو اس کی جزائے خیر عطا فرمائے دوسرے سید محی الدین صاحب جن کو مغربی مآخذ کے مطالعہ تاریخ عالم نیز مختلف دائرۃ المعارف (ENCYCLOPAEDIAS) کی چھان بین میں میری بڑی قیمت

ندوی مصنف ان کے اس گرانقدر تعاون کا معترف اور ان کی محنت و سعی اور اخلاص کے لئے شکر گذار ہے۔

اپنی معذوری کی بنا پر عرصہ سے معمول ہے کہ مضامین اور کتابیں تیں املا کراتا ہوں اس لئے اس کتاب میں بھی مجھے اپنے بعض عزیز طلبہ سے مدد لینی پڑی بالخصوص عزیزان محمد معاذ اللہ ندوی اور علی احمد گجراتی اور عزیزی مولوی نور عالم امینی ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء نے تحریر و کتابت کے اس فرض کو انجام دیا۔ اللہ تعالے ان کو اس کا صلہ عطا فرمائے۔

سیرت کی اس کتاب کے لئے نقشوں کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ ان سے بہت سی ایسی حقیقتیں آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجاتی ہیں جو بعض اوقات طویل عبارتوں سے بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔ یہ نقشے تاریخی معلومات اور اس عہد کی تاریخ کے مطالعہ کی روشنی میں تیار کئے گئے ہیں، اور کوشش کی گئی ہے کہ وہ فنی و علمی حیثیت سے ہر طرح مکمل اور عہد جدید کے مطابق ہوں، اس سلسلہ میں ہمارے عزیز دوست محمد حسن صاحب نصاری (ایم اے جغرافیہ) جناب پروفیسر محمد شفیع صاحب پرو وائس چانسلر و صدر شعبۂ جغرافیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ و کارکنان شعبۂ جغرافیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے بڑی دلچسپی لی خدا انھیں جزائے خیر دے کہ انھوں نے اس کام کو سیرت نبوی کی ایک خدمت سمجھ کر انجام دیا، عزیزی مولوی محمد رابع ندوی مصنف جغرافیۂ جزیرۃ العرب صدر شعبۂ ادب عربی دار العلوم ندوۃ العلماء کے قیمتی مشورے بھی اس کام میں شامل رہے۔ اللہ تعالے ان سب دوستوں اور عزیزوں کو جزائے خیر دے اور ان کی سعی کو مشکور فرمائے۔

مصنف کی دوسری اہم تصنیفات و مضامین کی طرح عربی سے اردو میں کتاب

ترجمہ کی خدمت مصنف کے برادر زادہ عزیز سید محمد الحسنی سلمہٗ مدیر "البعث الاسلامی"
نے اپنی ایک بڑی سعادت سمجھ کر انجام دی اس کام کے لئے وہ ہر طرح سے موزوں
اور اس کے لئے وہ دل وجان سے حاضر تھے اللہ تعالیٰ ان کی اس سعی محمود کو قبول فرمائے
اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب سے نفع پہونچائے اس عمل کو اپنی قبولیت
سے نوازے اور اس کو آخرت کا ذخیرہ اور سیرت پاک کے مطالعہ اور اس سے استفادہ
اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا ذریعہ و وسیلہ بنائے اگر یہ کتاب کسی صاحب
ایمان کے دل میں شوق ومحبت کی ایک چنگاری بھی بھڑکا دیتی ہے اور کسی غیر مسلم کے
دل میں اس کو پڑھ کر اس نبی رحمت کی سیرت مطہرہ کی طرف کوئی کشش آپ کی
محبت کی کوئی لہر اور اسلام کے سمجھنے کا جذبہ پیدا کر دیتی ہے اور اس سے بڑھ کر
یہ کہ وہ خدا کے یہاں قبول، مصنف کے لئے ذریعۂ مغفرت اور وسیلۂ شفاعت
ہو تو وہ سمجھے گا کہ اس کی محنت ٹھکانے لگی اور اس کو یہ کہنے کا حق ہوگا۔ ع

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

ابوالحسن علی حسنی ندوی
دائرہ حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلی

روز جمعہ
۵ر۱۱ر۱۳۹۶ھ
۲۹ر۱۰ر۱۹۷۶ء

عہدِ جاہلیت

مذاہب اور اہل مذاہب پر ایک اجمالی نظر چھٹی صدی عیسوی میں

چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کے بڑے مذاہب قدیم مذہبی صحیفے اور ان کے احکام و قوانین (جنھوں نے مذہب اخلاق اور علم کے میدان میں مختلف موقعوں پر اپنا مخصوص کردار ادا کیا تھا) بازیچۂ اطفال بن چکے تھے، اور تحریف کے علم برداروں، منافقوں اور ناخدا ترس و بے ضمیر مذہبی پیشواؤں کی ذاتی اغراض کا نشانہ اور حوادث زمانہ کا اس طرح شکار ہو چکے تھے کہ ان کی اصل شکل و صورت کا پہچاننا مشکل بلکہ ناممکن تھا، اگر ان مذاہب کے اولین بانی و علمبردار اور ان کے انبیاء کرام دوبارہ واپس آ کر اس حالت کو دیکھتے تو ان مذاہب کو خود نہ پہچان سکتے اور ان کا انتساب اپنی طرف کرنے پر ہرگز تیار نہ ہوتے۔[1]

---

[1] ان قدیم قوموں (اور بڑے مشہور مذاہب کے علمبرداروں) کی مذہبی کتابیں اور صحیفے جس بے دردی و بے رحمی کے ساتھ تحریف کا شکار ہوئے بلکہ جس طرح ان کی صورت و حقیقت مسخ کی گئی اور بعض اوقات ان کو کلی طور پر تباہ و برباد کیا گیا، اس کی تفصیل مستند تاریخی شواہد و دستاویزات اور خود ان کے علماء و مذہبی رہنماؤں کے اعترافات کی روشنی میں عہد عتیق اور عہد جدید کے صحیفوں سے لے کر ایران کی مذہبی کتاب اوستا اور ہندوستان کے ویدوں تک مصنف کی کتاب "منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین" کے ساتویں خطبہ (ختم نبوت) ص ۲۲۵-۲۴۲ میں ملاحظہ فرمائیں، شائع کردہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ۔

یہودی مذہب چند بے جان رسموں اور روایات کا نام تھا جن میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ تھی علاوہ ازیں یہودیت بجائے خود ایک نسلی مذہب ہے جس کے پاس دنیا کے لئے کوئی پیغام، اقوام عالم کے لئے کوئی دعوت اور انسانیت کے لئے چارہ سازی و مسیحائی کا کوئی سامان نہیں ہے۔

یہ مذہب اپنے عقیدۂ توحید میں بھی (جو مختلف مذاہب اور قوموں میں اس کا امتیازی شعار رہا ہے جس میں اس کی عزت و شرف اور زمانۂ قدیم میں بنی اسرائیل کی دوسری قوموں پر فضیلت کا راز پنہاں ہے اور جس کی وصیت حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہما السلام نے اپنے بیٹوں کو کی تھی) ثابت قدم نہ رہ سکا، یہودیوں نے اپنی پڑوسی قوموں کے اثر سے یا غالب و فاتح قوموں کے دباؤ سے ان کے بہت سے عقائد قبول کر لئے اور ان کی بہت سی عادتیں اور مشرکانہ بت پرستانہ اور جاہلی روایات اختیار کر لیں، اس کا اعتراف بعض منصف مزاج یہودی مورخین خود کرتے ہیں۔ جیوش انسائیکلوپیڈیا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

"بت پرستی کے خلاف نبیوں کا غیظ و غضب یہ ظاہر کرتا ہے کہ دیوتاؤں کی پرستش اسرائیلی عوام کے دلوں میں گھر کر چکی تھی اور بابل کی جلاوطنی سے واپس آنے کے وقت تک پوری طرح اس کا استیصال نہیں ہوا تھا، توہم پرستی اور سحر کے ذریعہ بہت سے مشرکانہ خیالات اور رسوم دوبارہ عوام نے قبول کر لئے تھے، تالمود سے بھی اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ بت پرستی میں یہود کے لئے بڑی جاذبیت اور کشش تھی۔"[1]

بابل کی تالمود[2] جو یہودیوں میں صد درجہ مقدس سمجھی جاتی ہے اور بعض اوقات تورات

---

[1] JEWISH ENCYCLOPEDIA, VOL. XII P. [illegible]

[2] تالمود کے معنی ہیں یہودیوں کے مذہب اور آداب کی تعلیم کی کتاب، یہ دراصل عہد یہود کی کتاب شریعت المشناۃ کی شرح و حواشی کا مجموعہ ہے جو مختلف زمانوں میں رائج رہا ہے۔

پھر بھی اس کو ترجیح دی گئی ہے اور چھٹی صدی عیسوی میں یہودیوں میں مقبول و رائج تھی۔ کم عقلی، بدزبانی، خدا کے حضور جسارت و گستاخی، خرافات و تشکیلات اور دین و عقل کے ساتھ تمسخر کے ایسے عجیب و غریب نمونوں سے بھری ہوئی ہے جن کو دیکھ کر اس صدی میں یہودی معاشرہ کی ذہنی پستی اور مذہبی ذوق کے بگاڑ کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔[1]

عیسائیت اپنے دور اول ہی میں انتہا پسندوں کی تحریف، جاہلوں کی تاویل اور رومی نصرانیوں کی بت پرستی کا شکار ہو گئی تھی، حضرت مسیح کی سادہ و پاکیزہ تعلیمات اس تمام ملبہ کے نیچے دفن ہو چکی تھیں، توحید اور اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کا نور گھرے بادلوں کے اندر چھپ چکا تھا۔

چوتھی صدی کے آخر میں عیسائی سوسائٹی میں تثلیث کا عقیدہ کس طرح سرایت کر گیا تھا اس کے متعلق ایک عیسائی فاضل لکھتا ہے:-

"یہ عقیدہ کہ خدائے واحد تین اقانیم سے مرکب ہے عیسائی دنیا کی پوری زندگی اور افکار میں چوتھی صدی کے آخری ربع میں سرایت کر چکا تھا اور طویل عرصہ تک سرکاری اور تسلیم شدہ عقیدہ کی حیثیت سے جس کو پوری مسیحی دنیا مانتی تھی باقی رہا، یہاں تک کہ انیسویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں اس عقیدہ کے تغیر اور اس شکل تک پہنچنے کا راز فاش ہوا۔"[2]

ایک معاصر عیسائی مورخ نے عیسائی سوسائٹی میں بت پرستی کے آغاز اور

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "یہودیت تالمود کی روشنی میں" از ڈاکٹر روہلنگ اور اسی سے اس کا عربی ترجمہ "الکنز المرصود فی قواعد التلمود" از ڈاکٹر یوسف حنا نصراللہ۔

[2] ماخوذ از NEW CATHOLIC ENCYCLOPEDIA, VOL. 14, 1967 مقالہ "تثلیث مقدس" ج ۱۴ ص ۲۹۵ باختصار

اس کی نوبہ نو شکلوں اور دوسری مشرک بت پرست قوموں کی (ان کے مذہبی و قومی شعائر، عادات و اطوار اور تہواروں اور تقریبوں میں) اندھی تقلید، مروجہ بت پرستیاں کی بنیاد پر ان کی جوں کی توں نقل کرنے کا جذبہ اور اس معاملہ میں عیسائیوں کی جدت طرازی اور تفنن طبع کا خوب ذکر کیا ہے، وہ اپنی کتاب مسیحیت علم جدید کی روشنی میں (THE HISTORY OF CHRISTIANITY IN THE LIGHT OF MODERN KNOWLEDGE) میں لکھتا ہے:-

"بت پرستی ختم تو ہوئی مگر تباہ نہیں ہوئی بلکہ جذب کر لی گئی تقریباً سب ہی کچھ جو بت پرستی میں تھا عیسائیت کے نام سے چلتا رہا جن لوگوں کو اپنے دیوتاؤں اور مشاہیر سے ہاتھ دھونے پڑے تھے انھوں نے غیر شعوری طور پر بہت آسانی سے کسی شہید کو پرانے دیوتاؤں کے اوصاف سے متصف کر کے کسی مقامی مجسمہ کو اس کا نام دے دیا اور اس طرح کافرانہ مسلک اور دیومالا ان مقامی شہداء کے نام پر منتقل ہو گئی اور خدائی اوصاف سے متصف اولیاء کے عقیدہ کی بنیاد پڑ گئی، ان اولیاء نے ایک جانب تو آریوسین کے عقائد کی بنا پر انسان اور خدا کے درمیان شان ایزدی رکھنے والے انسانوں کی شکل اختیار کر لی اور دوسری جانب پیغمبروں و ولی کے تقدس اور پارسائی کے نشان بن گئے بت پرستانہ تہوار قبول کر کے ان کے نام بدل دیئے گئے یہاں تک کہ سنہ ۴۰۰ء تک پہنچتے پہنچتے سورج دیوتا کے قدیم تہوار نے مسیح کے یوم پیدائش کی شکل اختیار کر لی۔"[1]

---

[1] REV. JAMES HOUSTON BAXTER IN THE HISTORY OF CHRISTIANITY IN THE LIGHT OF MODERN KNOWLEDGE GLASGOW [illegible] p. [illegible]

چھٹی صدی عیسوی جس وقت شروع ہوئی اس وقت شام و عراق کے عیسائیوں اور مصر کے عیسائیوں کی جنگ پورے شباب پر تھی یہ جنگ حضرت مسیح کی حقیقت و ماہیت کے موضوع پر ہو رہی تھی اور اس کی وجہ سے مدارس، کلیسا اور گھر سب متحارب کیمپ میں تبدیل ہو گئے تھے جو ایک دوسرے کی تکفیر میں مشغول اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ دو مذہبوں یا دو مخالف قوموں کی جنگ ہے[1] اس کی وجہ سے عیسائیوں کو اس کی فرصت نہ تھی کہ عالم گیر فساد کے انسداد اور اصلاح حال کی کوشش کرتے اور انسانیت کو فلاح و نجات کا پیغام دیتے۔

مجوسی (ایران کے پارسی) قدیم زمانے سے عناصر اربعہ (جن میں سب سے بڑا عنصر آگ تھا) کی عبادت کرتے تھے اور انھوں نے اس کے لئے مخصوص آتش کدے اور مخصوص عبادت گاہیں تعمیر کی تھیں، آتش پرستی ملک کے طول و عرض میں عام تھی، اس کے لئے بہت منظم اور دقیق قوانین و احکام مقرر تھے جن پر عمل درآمد لازمی تھا، آگ کی پرستش اور سورج کی تقدیس کے سوا ہر عقیدہ و مذہب یہاں مٹ چکا تھا، مذہب ان کے نزدیک چند رسوں یا چند قدیم روایات سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا جن کو وہ مخصوص مقامات میں ادا کرتے تھے، عبادت گاہ کے باہر وہ بالکل آزاد تھے جہاں وہ اپنی مرضی اور خواہش نفس کے مطابق زندگی گذارتے تھے، ایک مجوسی اور ایک بے دین بے ضمیر کے کردار و اخلاق میں کوئی فرق باقی نہ رہ گیا تھا۔[2]

"ایران بعہد ساسانیاں" کے مصنف آرتھر کرسٹن سین نے اس زمانے کے

---

[1] دیکھئے ALFRED J. BUTLER کی کتاب "ARABS CONQUEST OF EGYPT AND THE LAST THIRTY YEARS OF ROMAN DOMINION" (OXFORD 1902, P.P. 44-45)

[2] ایران بعہد ساسانیاں صفحہ ۱۵۵

مذہبی فرائض اور ذمہ داریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"سرکاری ملازمین کے لئے لازمی تھا کہ وہ دن میں چار بار سورج کی پوجا کریں چاند کی آگ کی اور پانی کی پوجا اس کے علاوہ تھی سونے جاگنے، نہانے جنیو پہننے، کھانے پینے، چھینکنے، حجامت بنوانے اور ناخن ترشوانے قضاء حاجت اور شمع جلانے ہر کام کے لئے دعائیں تھیں اور ان کا کرنا ان پر ضروری تھا ان کو اس کا بھی حکم تھا کہ آگ کسی وقت بجھنے نہ پائے اور آگ پانی ایک دوسرے سے نہ لیں، دھات کو زنگ نہ لگے اس لئے کہ دھاتیں بھی ان کی نگاہ میں مقدس تھیں۔"[1]

اہل ایران آگ کی طرف رخ کر کے عبادت کرتے تھے ایران کے ساتویں بادشاہ یزدگرد نے ایک مرتبہ سورج کی قسم کھاتے ہوئے یہ جملہ کہا تھا "میں سورج کی قسم کھاتا ہوں جو سب سے بڑا معبود ہے" اس نے ان عیسائیوں کو جنہوں نے عیسائیت سے توبہ کر لی تھی اس کا پابند کیا تھا کہ وہ اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے سورج کی پوجا کریں[2] اہل ایران ہر زمانہ میں ثنویت کا شکار رہے حتیٰ کہ یہ ان کی علامت اور پہچان بن گئی، وہ دو خداؤں کے قائل تھے ایک روشنی یا خیر کا خدا جس کو وہ آہورمزدا یا یزدان کہتے تھے دوسرا ظلمت یا شر کا خدا جس کا نام انھوں نے اہرمن تجویز کیا تھا، ان کا عقیدہ تھا کہ ان دونوں خداؤں میں باہمی کشمکش اور طاقت آزمائی برابر جاری ہے۔[3]

۱؎ ایران بعہد ساسانیان (ترجمہ اردو از فرنچ) بقلم پروفیسر محمد اقبال اورینٹل کالج لاہور ص ۱۵۵

۲؎ ایضاً ص ۱۵۰-۱۵۱ ۳؎ ایران بعہد ساسانیان باب ۱ مذہب زردشت بحوالہ کارنامہ مذہب ص ۱۳۲-۱۴۲

ایرانی مذہب کے ان محققین نے ان کے معبودوں کے متعلق جو کہانیاں
لکھی ہیں اور پورا علم الاصنام MYTHOLOGY تیار کر دیا ہے وہ اپنی
بوالعجبی عجائب پسندی اور تفصیلات و جزئیات میں یونانی یا ہندستانی
دیومالا سے کسی طرح کم نہیں ہے۔[1]

بودھ مذہب جو ہندستان اور وسط ایشیا میں پھیلا ہوا تھا وہ بھی ایک ایسے
بت پرستانہ مذہب میں تبدیل ہو چکا تھا کہ بت اس کے جلو میں چلتے تھے جہاں اس کے
قافلہ کا پڑاؤ ہوتا وہاں گوتم بدھ کی مورتی نصب کی جاتی اور دیکھتے دیکھتے ایک معبد
تیار ہو جاتا۔ اہل علم و اصحاب نظر کو اس مذہب اور اس کے بانی کے بارے میں یہاں تک
شبہ ہے کہ آسمان و زمین اور خود انسان کے خالق خدا کے وجود پر بھی ان کا عقیدہ
و ایمان تھا یا نہیں ان کو حیرت ہے کہ ایمان و عقیدے کے بغیر یہ عظیم مذہب کیسے قائم رہ سکا۔[2]

جہاں تک ہندو مذہب کا تعلق ہے وہ دیوی دیوتاؤں کی کثرت میں دوسرے
مذاہب سے بہت آگے ہے چھٹی صدی میں بت پرستی اس میں اپنے شباب پر تھی معبودوں
کی تعداد اس صدی میں (۳۳) کروڑ تک بتائی جاتی ہے غرض ہر عظیم با ہیبت اور
یا نفع پہونچانے والی شئی معبود تھی، بت تراشی اور مجسمہ سازی کا فن بھی نقطۂ عروج
پر تھا اور اس میں طرح طرح کی جدت طرازیاں کی جاتی تھیں۔[3]

---

۱ دیکھئے ایران بعہد ساسانیان صفحہ ۲۰۳-۱۴۴   ۲ دیکھئے کتاب ہندوستانی تمدن اردو
از ایشوری پرشاد صفحہ ۳۹ پروفیسر تہذیب ہند جیمنا آیار پنڈت نہرو کی کتاب DISCOVERY OF INDIA
از پنڈت جواہر لال نہرو صفحہ ۲۰۱-۲۰۲   ۳ دیکھئے بودھ مذہب پر مقالہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا
۴ دیکھئے آر سی دت کی کتاب ANCIENT INDIA ج ۲ صفحہ ۲۷۶ اور
L.S.S. O'MALLEY: POPULAR HINDUISM - THE RELIGION OF THE MASSES.
(CAMBRIDGE, 1935) P. 43

ایک ہندو فاضل (C. V. VAIDYA) اپنی کتاب ہسٹری آف میڈیول ہندو انڈیا (HISTORY OF MEDIAEVAL HINDU INDIA) میں راجہ ہرش (۶۰۶-۶۴۸) کے بارے میں لکھتے ہیں یاد رہے کہ یہ وہ زمانہ ہے جس کے بعد ہی جزیرۃ العرب میں اسلام کا ظہور ہوا۔

"اس زمانہ میں ہندو مذہب اور بدھ مت دونوں ہی یکساں طور پر بت پرست تھے بلکہ شاید بدھ مت بت پرستی میں ہندو مذہب سے بھی آگے بڑھ گیا تھا یہ مذہب حقیقتاً خدا کے انکار سے شروع ہوا لیکن آخرکار اس نے بدھ کو ہی سب سے بڑا خدا بنا لیا بعد میں اور دوسرے خداؤں مثلاً BODHISATVAS کا اضافہ ہوتا گیا اور خصوصاً مہایانا مذہب (اسکول) میں بت پرستی نے حتمی طور پر قدم جما لئے ہندوستان میں یہ اس قدر رائج حال ہوا کہ بعض مشرقی زبانوں میں بدھ کا نام ہی بت کا ہم معنی ہو گیا[۱]"

اس میں شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ بت پرستی اس زمانہ میں ساری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی یورپ اور افریقہ سے بحر الکاہل تک بت پرستی میں غرق تھی عیسائیت سامی مذاہب بدھ مت گویا بتوں کی تعظیم و تکریم میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں مصروف تھے[۲]

---

[۱] VOL. I, POONA, 1921, P. 101 فارسی اور اردو ادب میں بت کا لفظ جس کثرت سے استعمال کیا گیا ہے اس کی تصدیق ہوتی ہے بودھ بھی بدھ اور بت اصولی حیثیت سے ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔

[۲] C. V. VAIDYA : HISTORY OF MEDIAEVAL HINDU INDIA VOL. I, (POONA 1921) P. 101

ایک اور ہندو فاضل اپنی کتاب POPULAR HINDUISM-THE RELIGION OF THE MASSES میں لکھتے ہیں:-

"خدا سازی کا عمل یہیں پر ختم نہیں ہو گیا بلکہ مختلف زمانوں میں خدائی اکائیوں یا کونسل میں اتنی بڑی تعداد کا اضافہ ہو گیا کہ اس کا شمار مشکل ہے ان میں بہت سے ہندوستان کے قدیم باشندوں کے معبود تھے جن کو ہندو مذہب کے دیوتاؤں اور خداؤں کے ساتھ شامل کر لیا گیا تھا ان کی کل تعداد تینتیس ملین (۳ کروڑ) بتائی جاتی ہے۔"[1]

جہاں تک ان عربوں کا تعلق ہے جو عہد قدیم میں دین ابراہیمی کے حامل تھے اور عرب کی سرزمین میں خدا کا سب سے پہلا گھر تعمیر ہوا وہ نبوت اور انبیاء کرام سے بعد زمانی اور جزیرہ نمائے عرب میں محصور رہنے کی وجہ سے بہت گھٹیا درجہ کی بت پرستی میں مبتلا تھے جس کی نظیر ہندوستان کے بت پرستوں اور مشرکوں کے سوا اور کہیں نہیں ملتی وہ شرک میں بھی بہت آگے تھے اور خدا کو چھوڑ کر بہت سے معبود انہوں نے تجویز کر لئے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ خود ساختہ معبود کائنات کے نظم و انتظام میں خدا کے ساتھ شریک ہیں اور نفع نقصان پہنچانے اور تقدیر بنانے اور بگاڑنے کی ذاتی صلاحیت اور قدرت رکھتے ہیں چنانچہ پورا عرب بتوں کی پرستش میں ڈوب چکا تھا ہر قبیلہ اور علاقہ کا علیحدہ معبود تھا بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہر گھر صنم خانہ تھا۔[2]

خود کعبہ کے اندر اور اس کے صحن میں (جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف

---

[1] L.S.S. O'MALLEY C.I.E., I.C.S., POPULAR HINDUISM—THE RELIGION OF THE MASSES (CAMBRIDGE, 1935) PP. 6-7

[2] دیکھئے کتاب الاصنام ابن الکلبی ص ۳۳

اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے تعمیر کیا تھا) تین سو ساٹھ بت تھے،[1] وہ بتوں اور معبودوں کی عبادت سے آگے بڑھ کر ہر قسم کے پتھروں کو پوجنے لگے تھے، اور فرشتوں اور جنوں اور ستاروں کو بھی اپنا معبود سمجھتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں، جن خدا کے شریک ہیں، اس وجہ سے وہ ان کی طاقت اور اثر کے قائل تھے اور ان کی عبادت کرنا ضروری سمجھتے تھے۔[2]

دنیا کے ملکوں اور قوموں پر ایک عمومی نظر

یہ ان مذاہب کا حال تھا جو اپنے اپنے زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے کے لیے آئے تھے، جہاں تک ان متمدن ممالک کا تعلق ہے جہاں عظیم الشان حکومتیں قائم تھیں، علوم و فنون کا بازار گرم تھا، اور جو تہذیب و تمدن، صنعت و حرفت اور علوم و فنون کا مرکز سمجھے جاتے تھے، وہاں مذاہب کی شکل بالکل مسخ ہو چکی تھی اور انھوں نے اپنی اصل حقیقت اور قدر و قیمت اور قوت و افادیت کھو دی تھی اور مصلحین اور معلمین اخلاق روپوش ہو گئے تھے۔

مشرقی رومی سلطنت[3]

مشرقی رومی شہنشاہی میں ٹیکسوں کی اتنی بھرمار تھی کہ اہل ملک اپنی حکومت پر

---

[1] صحیح بخاری (کتاب المغازی) باب فتح مکہ [2] کتاب الاصنام ص ۱۳

[3] مشرقی رومی سلطنت کا ذکر تاریخ میں بازنطینی سلطنت کے نام سے آتا ہے، عرب اس کو روم کہتے ہیں جس طرح کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اس کی قلمرو میں حسب ذیل ممالک شامل تھے یونان، بلقان، ایشیائے کوچک، سیریا، فلسطین، پورا بحیرۂ روم کا علاقہ اور کل شمالی افریقہ۔ اس کا پایۂ تخت قسطنطنیہ تھا۔ اس سلطنت کا آغاز ۳۹۵ء میں ہوا اور اختتام ۱۴۵۳ء میں جب قسطنطنیہ پر عثمانی ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔

بجز ملکی حکومت کو ترجیح دینے لگے تھے بار بار انقلابات اور بغاوتیں ہوتی تھیں صرف ۵۳۲ء کے ایک فساد میں قسطنطنیہ کے تیس ہزار آدمی قتل کیے گئے۔[1] ان کا سب سے بڑا شغل اور دلچسپی کسی نہ کسی ذریعہ سے مال حاصل کرنا پھر عیش و عشرت میں اس کو خرچ کرنا تھا، تفریح و تعیش میں وہ اتنا آگے بڑھ گئے تھے کہ اس کی سرحدیں درندگی و بربریت سے مل گئی تھیں۔[2]

CIVILIZATION PAST AND PRESENT کے مصنفین نے بازنطینی سوسائٹی کے اس عجیب تضاد اور اخلاقی فساد و تفریح طبع اور تعیش کے عشق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

> "بازنطینیوں کی سماجی زندگی میں زبردست تضاد پایا جاتا تھا، مذہبی رجحان ان کے ذہنوں میں گہرے طور پر پیوست ہو چکا تھا، ترک دنیا اور رہبانیت سلطنت کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھی، ادنیٰ درجہ کا شخص بھی خفیف مذہبی مباحث میں گہری دلچسپی لیتا تھا، اور اسی کے ساتھ بھی لوگوں کی روزمرہ کی زندگی پر اسراف پسندی کی اور لطافت کی چھاپ لگی ہوئی تھی، لیکن اس کے برعکس یہی لوگ ہر قسم کے کھیل تماشوں کے غیر معمولی شائق بھی تھے، زبردست سرکس کے میدان تھے جس میں اسی ہزار تماشائیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی جہاں رتھوں کی دوڑ کے زوردار مقابلے ہوا کرتے تھے عوام کو "نیلے" اور "ہرے" دو گروہوں میں بانٹ دیا گیا تھا، بازنطینیوں

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، مقالہ "JUSTINIAN"

[2] ملاحظہ ہو EDWARD GIBBON: DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE

میں حُسن سے پیار بھی تھا اور ظلم و خباثت کا رجحان بھی ان کے کھیل تماشے اکثر خونریز اور اذیت رساں ہوتے تھے ان کی اذیتیں ہولناک اور ان کے خواص کی زندگی عیش و طرب، سازش، تکلفات اور بداخلاقیوں سے مرکب تھی۔[1]

مصر (جو دولت مند بازنطینی سلطنت کی ایک ریاست تھی) زبردست مذہبی مظالم اور بدترین سیاسی استبداد کا شکار تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ بازنطینی سلطنت کی خوش حالی کا بڑا ذریعہ اور سرچشمہ بھی تھا اس کی مثال اس گائے کی سی تھی جس کو اچھی طرح دوہا جائے اور چارہ کم سے کم دیا جائے۔[2]

شام جو بازنطینی شہنشاہی کی دوسری ریاست تھی، رومائی توسیع پسندی اور جوع الارض (ملک گیری) کا شکار تھا جہاں صرف طاقت کے سہارے غیر ملکیوں کی طرح حکومت کی جاتی تھی، اور محکوم رعیت کو کبھی شفقت و محبت سے واسطہ نہ پڑتا تھا اس کا حال یہ تھا کہ اکثر شامی اپنا قرض ادا کرنے کے لئے اپنے بچوں کو فروخت کر دیتے تھے مختلف نوع کے مظالم اور حق تلفیوں، غلام بنانے اور بیگار لینے کا عام رواج تھا۔[3]

ایرانی شہنشاہی

مذہب زردشت جس نے مزدائیت کی جگہ لی ایران کا قدیم مذہب ہے زردشت جو اس مذہب کا بانی تھا ساتویں صدی قبل مسیح میں ظاہر ہوا ایرانی تحقیق

---

[1] WALTER WALLBANK AND ALASTAIR M. TAYLOR, CIVILIZATION, PAST AND PRESENT [illegible] P. [illegible]

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الفریڈ بٹلر کی کتاب THE ARAB CONQUEST OF EGYPT. اور HISTORIANS' HISTORY OF THE WORLD, VOL VII

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو خطط الشام از کرد علی ج ۱ ص

مشرق کی روشن شہنشاہی سے اردو متہ الکبریٰ سے علیحدگی کے بعد اپنے رقبہ ذرائع آمدنی اور شان و شوکت میں زیادہ بڑی تھی اس کی بنیاد ۲۲۶ء میں اردشیر کے ہاتھوں پڑی اپنے عروج کے زمانہ میں اسیریہ، خوزستان، میڈیا، فارس، آذربائیجان، طبرستان، سرخس، مرجان، کرمان، مرو، بلخ، سغد، سیستان، ہرات، خراسان، خوارزم، عراق اور یمن سب اس کی قلمرو میں شامل تھے کسی زمانہ میں گذرگاہ دریائے سندھ کے درمیانی اضلاع اور اس کے دہانے کے آس پاس کے صوبے یعنی کچھ کاٹھیاواڑ مالوہ ان کے پرے کے علاقے بھی اس کے زیر نگیں تھے۔

طیسفون (المدائن) جو اس شہنشاہی کا پایۂ تخت اور شہروں کا ایک مجموعہ تھا جیسا کہ اس کے عربی نام سے اندازہ ہوتا ہے پانچویں صدی میں اور اس کے بعد کے زمانہ میں اپنے تمدن و ترقی اور تعیش و اسراف کے آخری نقطہ پر تھا (تفصیل کے لئے دیکھئے "ایران بعہد ساسانیان" از پروفیسر آرتھر کرسٹن سین)

مذہب زرتشتی اول روز سے نور و ظلمت اور خیر و شر کی کشمکش اور بھلائی کے خدا اور برائی کے خدا کے درمیان مسلسل معرکہ آرائی کے تصور پر قائم تھا تیسری صدی عیسوی میں "مانی"[1] اس مذہب کے ریفارمر اور مصلح کی حیثیت سے سامنے آیا۔ اس کے بعد شاپور اول، اردشیر ثانی دولت ساسانیان م ۲۷۱ء کے بعد کا حکمراں) پہلے اس مذہب کا پیرو ہوا اور پھر اس کا مخالف ہو گیا اس لئے کہ مانی دنیا سے شر و فساد کا مادہ ختم کرنے کے لئے تجرد کی زندگی کا داعی تھا اس کی دعوت یہ تھی کہ نور و ظلمت کا امتزاج بجائے خود

---

[1] "مانی" کی تعلیمات اور دعوت و فلسفہ کو سمجھنے کے لئے "ایران بعہد ساسانیان" کا چوتھا باب بعنوان "پیغمبر مانی اور اس کا مذہب" ملاحظہ کریں ص ۲۳۳-۲۶۱

ایک نیا شر اور ایسی برائی ہے جس سے انسان کو چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس نے فنائیت اور عدم سے جلد ہم آغوش ہونے، ظلمت پر نور کے غلبے کے لیے نسل انسانی کے سلسلہ کو ختم کرنے اور ازدواجی تعلقات کو ختم کرنے کا راستہ اختیار کیا۔ اس نے کئی سال جلاوطنی میں گزارے، پھر ایران واپس آیا، اور بہرام اول کے عہد میں مارا گیا۔ لیکن اس کی تعلیمات اس کی موت کے بعد بھی زندہ رہیں، اور ایرانی طرز فکر اور ایرانی سوسائٹی کو طویل عرصہ تک متاثر کرتی رہیں۔

پانچویں صدی عیسوی کے آغاز میں مزدک ظاہر ہوا، اور اس نے مال و دولت اور عورت میں مکمل مساوات اور اشتراک کی کھلی ہوئی دعوت دی اور یہ چیزیں تمام انسانوں کے لئے بلا کسی قید و لحاظ کے جائز کر دی گئیں، اس کی دعوت نے جلد ہی قوت پکڑ لی، حالت یہ ہو گئی کہ لوگ جس کے گھر میں چاہتے بے تکلف گھس جاتے اور اس کے مال و اسباب اور عورتوں پر زبردستی قبضہ کر لیتے، ایک قدیم ایرانی دستاویز میں جو نامۂ تنسر کے نام سے موسوم ہے، ان حالات کی تصویر کشی کی گئی ہے جو مزدکیت کے عروج اور تسلط و اقتدار کے زمانہ میں نظر آتے ہیں:۔

"ناموس و ادب کا پردہ اٹھ گیا، ایسے لوگ پیدا ہو گئے جن میں نہ شرافت تھی نہ عمل، نہ ان کے پاس موروثی جاگیر تھی، اور نہ انھیں خاندان اور قوم کا غم تھا، نہ ان کا پیشہ صنعت تھی نہ حرفت، نہ انھیں کسی قسم کی فکر دامن گیر تھی اور نہ ان کا کوئی پیشہ تھا، چغلی اور شرارت میں مستعد، اور دروغ بیانی اور تہمت میں مشاق تھے، یہی ان کا ذریعہ معاش تھا، اور اسی کو وہ حصول مال و جاہ کا وسیلہ بناتے تھے"[1]

---

[1] از نامۂ تنسر طبع مینوی ص ۱۲

آرتھر کرسٹن سین اپنی کتاب "ایران بعہد ساسانیان" میں لکھتا ہے :-

"نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف کسانوں کی بغاوتیں برپا ہو گئیں لوٹ مار کرنے والے امراء کے محلوں میں گھس جاتے تھے، مال و اسباب لوٹ لیتے تھے عورتوں کو پکڑ لے جاتے تھے اور جاگیروں پر قبضہ کر لیتے تھے، زمینیں رفتہ رفتہ غیر آباد ہو گئیں اس لئے کہ نئے جاگیردار زراعت سے بالکل ناواقف تھے"[1]

ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم ایران میں انتہا پسندانہ دعوتوں اور تحریکوں کو قبول کرنے کی عجیب و غریب صلاحیت تھی اور وہ ہمیشہ شدید عمل و ردِ عمل کے اثر میں رہا اور فلسفہ لذتیت[2]، اور آخری درجہ کی رہبانیت اور نفس کشی کے درمیان ہمیشہ جھکولے کھاتا رہا، کبھی وہ خاندانی و موروثی جاگیردارانہ نظام یا مذہبی اجارہ داری کے دباؤ میں رہا، کبھی بے قید اشتراکیت اور مطلق العنان انارکی و لاقانونیت کے سیلاب میں، اس کی وجہ سے ایران میں وہ توازن، اعتدال اور سکون و سنجیدگی کبھی پیدا نہ ہو سکی جو فطری و صحت مند معاشرہ کے لئے ضروری ہے۔

اس شہنشاہی میں (خاص طور پر ساسانی عہدِ اقتدار میں چھٹی صدی تک) حالت بہت بگڑ چکی تھی، پورا ملک ان سلاطین کے رحم و کرم پر تھا جو موروثی طور پر تخت و تاج کے مالک بنتے تھے اور اپنے کو عام انسانوں سے بالاتر سمجھتے تھے، بادشاہ آسمانی خداؤں کی نسل سے تسلیم کیا جاتا تھا، خسرو دوم پرویز اپنے نام کے ساتھ حسبِ ذیل القاب لکھتا ہے:-

"خداؤں میں انسان غیر فانی اور انسانوں میں خدائے لاثانی اس کا نام

---

[1] از تاریخ مختصر [illegible] ص ۴۷۷ [2] یونانی فلسفی (EPICURUS) اس کا ایک اہم فلسفہ لذتیت تھا اس کا کہنا تھا کہ لذت ہی سب کچھ ہے اور وہی سب سے بڑی چیز ہے۔

بول بالا، آفتاب کے ساتھ طلوع کرنے والا اور شب کی آنکھوں کا اجالا۔[1]

ملک کی تمام دولت اور آمدنی کے وسائل ان بادشاہوں کی ملکیت سمجھے جاتے تھے، دولت جمع کرنے کی تمنا، الف لیلوی اور قیمتی اشیاء اکٹھا کرنے کے جنون، معیار زندگی کی بلندی اور جدت طرازی، زندگی سے لطف اندوز ہونے اور تفریح و تعیش کے شوق، دولت مند بننے اور دنیا کے مزے اڑانے کی دیوانگی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ اس پر خیال آرائی اور شاعری کا شبہ ہونے لگتا ہے اور اس کا تصور صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس نے قدیم ایران کی تاریخ اور شعر و ادب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہو اور شہر مدائن، ایوان کسریٰ، بہار کسریٰ[2] (وہ قالین جس پر موسم بہار میں شاہان ایران شراب نوشی کیا کرتے تھے) تاج کسریٰ اور ایرانی بادشاہوں سے وابستہ خدم و حشم، بیویوں اور لونڈیوں، خدمت گاروں باورچیوں اور خانساماؤں، پرندوں اور درندوں کے سدھانے والوں اور سامان شکار، زرّیں ظروف و برتنوں کی ان افسانوی تفصیلات و جزئیات[3] سے واقف و باخبر ہو اس کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ جب اسلامی فتوحات کے نتیجہ میں ایران کا آخری تاجدار یزدگرد اپنے دارالحکومت مدائن سے فرار ہوا تو اس حالت میں بھی اس کے ساتھ ایک ہزار باورچی ایک ہزار مغنی، ایک ہزار چیتوں کے منتظم اور ایک ہزار شکروں کی دیکھ بھال کرنے والے اور خدم و حشم اور مصاحبین کی ایک بڑی تعداد تھی۔ اتنے بڑے لاؤ لشکر کے باوجود بھی وہ اس تعداد کو کم اور خود کو ایک انتہائی معمولی اور حقیر پناہ گزیں سمجھتا تھا، وہ محسوس کرتا تھا کہ مصاحبین و ملازمین کی تعداد اور تعیش و تفریح کے سامان کی کمی کے باعث اس کی حالت انتہائی قابل رحم ہے۔[4]

---

[1] ایران بعہد ساسانیان ص ۳۳۳۔ [2] اس کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۷۱

[3] دیکھئے شاہین مکاریوس کی تاریخ ایران عربی طبع ۱۸۹۸ء ص ۹۳ [4] ایضاً

دوسری طرف غریب عوام سخت مفلوک الحال اور مصیبت زدہ تھے اور اپنی قسمت کو رو رہے تھے، ان کو جسم و جان کا رشتہ باقی رکھنے کے لئے بھی سخت جد و جہد کرنی پڑتی تھی، مختلف قسم کے ٹیکسوں، طرح طرح کی بندشوں اور بیڑیوں نے ان کی زندگی کو عذاب جان بنا دیا تھا، اور وہ مویشیوں کی طرح زندگی گزار رہے تھے، اس مصیبت سے تنگ آکر اور ان ٹیکسوں اور لازمی فوجی بھرتی سے عاجز ہو کر بہت سے کسانوں نے اپنے کھیتوں کو خیرباد کہہ دیا اور راہبوں کی خانقاہوں اور معبدوں میں پناہ لی[1]، وہ مشرقی ساسانی سلطنت اور مغربی بازنطینی سلطنت کی طویل و خون آشام جنگوں میں (جو تاریخ کے مختلف وقفوں میں ہوتی رہیں اور جن میں نہ عوام کی کوئی مصلحت اور نہ ان کو اس سے کوئی دلچسپی تھی) حقیر ایندھن کی طرح کام آتے رہے۔

ہندوستان

ہندوستان جو عہد قدیم میں ریاضیات، فلکیات اور طب و فلسفہ میں دنیا میں بڑا نام پیدا کر چکا تھا، اس کے متعلق مورخین کی عام رائے یہ ہے کہ اس کا مذہبی، اخلاقی اور اجتماعی طور پر سب سے تاریک اور بدترین دور چھٹی صدی عیسوی کے آغاز سے شروع ہوتا ہے[2]، بے حیائی اور عیاشی سے ان کی عبادت گاہیں بھی پاک نہ تھیں اور ان کاموں میں کوئی عیب نہ سمجھا جاتا تھا اس لئے کہ مذہب نے ان کو تقدیس و عبادت کا رنگ دے دیا تھا[3]، عورت کی کوئی قیمت اور عزت و عصمت باقی نہ رہی تھی

---

[1] دیکھئے ایران بعہد ساسانیان کا پانچواں باب۔ [2] دیکھئے ANCIENT INDIA ج ۳ مؤلفہ آر سی دت
[3] ملاحظہ ہو ستیارتھ پرکاش از دیانند سرسوتی ص ۳۴۴

شوہر اپنی بیوی کو جوئے میں ہار جاتا تھا۔[1] اگر اس کا شوہر مر جاتا تھا تو وہ زندہ درگور کی مانند ہوتی تھی نہ شادی کر سکتی تھی نہ اس کو کوئی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ شوہر کے انتقال پر عورت کے ستی ہو جانے کا اعلیٰ اور خوش حال خاندانوں میں رواج تھا، اور اس کا مقصد اظہارِ وفاداری اور ننگ و عار سے گلو خلاصی تھا۔ یہ بدترین رسم انگریزی اقتدار کے بعد ہی ختم کی جا سکی۔[2]

ہندوستان اپنے پڑوسیوں اور دنیا کے دوسرے ملکوں کی برادری میں طبقاتی عدم مساوات اور انسانوں کے درمیان فرق و امتیاز میں بہت آگے تھا۔ یہ ایک سخت اور بے رحمانہ نظام تھا جس میں نرمی اور لچک کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس امتیازی سلوک کو مذہب اور عقیدہ کی سند اور پشت پناہی حاصل تھی اور آریہ حملہ آوروں کی مصلحت اور مذہب اور تقدس کے اجارہ دار برہمنوں کے مفاد کا بھی یہی تقاضا تھا۔ یہ نظام ان پیشوں کی بنیاد پر قائم تھا جو مختلف برادریوں اور ذاتوں میں نسلی طور پر چلے آ رہے تھے۔ اس کے پیچھے اس ملکی، سیاسی اور مذہبی قانون کی طاقت تھی جس کو ان ہندو قانون سازوں نے وضع کیا تھا جو مذہبی حیثیت کے بھی مالک تھے۔ یہ قانون بالکل پورے معاشرہ پر نافذ تھا، اور اس کو زندگی کا دستور العمل سمجھا جاتا تھا۔ اس نے ہندوستان کے باشندوں کو چار طبقوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

۱۔ مذہب کے اجارہ دار اور پروہت جن کو برہمن کہا جاتا تھا۔

۲۔ سپاہی اور فوج میں بھرتی ہونے والے افراد یعنی چھتری۔

۳۔ زراعت پیشہ اور تجارت کرنے والے یعنی ویش۔

---

[1] دیکھئے مہابھارت کا ابتدائی حصہ [2] دیکھئے فرانسیسی سیاح برنیر کا سفرنامہ نیز قرونِ وسطیٰ کے راجگان کی تاریخ

۴۔ نوکر چاکر اور خدمت گار یعنی "اچھوت":

یہ آخری طبقہ (جو سب سے بڑی تعداد میں تھا) پستی کی آخری منزل میں تھا۔ اس کے متعلق یہ تصور تھا کہ وہ خالق کائنات کے پاؤں سے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے اس کا کام صرف ان تینوں طبقوں کی خدمت کرنا اور ان کو آرام و راحت پہنچانا ہے۔

اس قانون نے برہمنوں کو اتنے حقوق دے دیئے تھے اور ان کو اتنا بلند رتبہ عطا کیا تھا جس میں کوئی دوسرا ان کے برابر نہ تھا۔ برہمن کے سارے گناہ معاف تھے خواہ وہ تینوں دنیاؤں کو اپنے گناہوں اور بدکرداریوں سے گندہ اور تباہ و برباد کر دے۔ اس پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ اس کو کسی صورت میں بھی سزائے موت نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس کے برعکس اچھوت نہ جائداد رکھ سکتے تھے نہ جمع کر سکتے تھے نہ کسی برہمن کے قریب بیٹھ سکتے تھے نہ اس کے بدن کو چھو سکتے تھے نہ مقدس کتابوں کا پڑھنا ان کے لئے جائز تھا۔[1]

اہلِ حرفہ اور خدمت کرنے والے طبقہ کے لوگ (جو چنڈال کہلاتے تھے) شہر سے باہر رہتے تھے۔ رات کو (خواہ کوئی موسم ہو) ان کا شہر میں رہنا ممکن نہ تھا۔ شہر کی چہار دیواری میں طلوعِ آفتاب کے بعد وہ کام کرنے کے لئے داخل ہوتے تھے اور غروب سے پہلے ان کو باہر نکل جانا پڑتا تھا۔[2]

---

[1] اس قانون کی تفصیلات اور وضاحت جاننے کے لئے منوشاستر کا مطالعہ کریں۔ باب ۱۔ ۲۔ ۸۔ ۱۰۔ ۱۱۔

[2] قطب الدین ایبک کے عہد میں (۱۲۰۶ء۔۔۔ ۱۲۱۰ء) یہ جابرانہ نظام ختم ہوا اور شہر کی چہار دیواری طبقاتی تقسیم کی نشانی ہونے کے بجائے شہر پناہ بن کر رہ گئی اور شہروں میں امراء کے محلات اور فقراء کے جھونپڑے ایک ساتھ نظر آنے لگے۔

پورا ملک انتشار کا شکار تھا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا اس میں سینکڑوں ریاستیں اور حکومتیں تھیں جو اکثر برسرِ پیکار رہتی تھیں بدامنی اور بد انتظامی اور رعیت کی طرف سے بے پرواہی اور ظلم و استبداد عام تھا۔

علاوہ بریں یہ ملک دنیا سے کٹ کر زندگی گذار رہا تھا اس پر جمود طاری تھا وہ عادات و روایات اور رسم و رواج کے سخت شکنجہ میں گرفتار، طبقاتی کشمکش اور نا ہموار کاشتکاری اور خون نسل اور نسب کے تعصبات سے زار و نزار ہو رہا تھا ایک ہندو مورخ ودیا دھر مہاجن سابق پروفیسر تاریخ پنجاب یونیورسٹی کالج، اسلام کی آمد سے قبل ہندوستان کی حالت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"ہندوستان کے عوام ساری دنیا سے کٹے ہوئے تھے وہ اپنے آپ میں مگن اور دنیا کے حالات سے بے خبر تھے اور اس بے خبری نے ان کی پوزیشن بہت کمزور کر دی تھی ان میں جمود پیدا ہو چکا تھا اور بحیثیت وانحطاط کے آثار نمایاں تھے اس زمانے کے ادب میں کوئی جان نہ تھی فن تعمیر مصوری اور دوسرے فنون لطیفہ میں بھی انحطاط تھا۔ ذات پات کی پابندیاں شدید تھیں بیواؤں کی شادی نہیں کی جاتی تھی اور کھانے پینے کے سلسلہ میں شدید پابندیاں تھیں اچھوت بستیوں کے باہر رہنے پر مجبور تھے"[1]

جزیرۃ العرب

عربوں کے اخلاق بھی بہت بگڑ چکے تھے وہ شراب اور جوئے کے رسیا تھے

[1] VIDYADHAR MAHAJAN : MUSLIM RULE IN INDIA , (NEW DELHI 1970), P. 31

ان کی قساوتِ قلبی اور جہالتِ جاہلی کا اندازہ ان کے لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے سے کیا جا سکتا ہے قافلوں کو لوٹنا اور بے گناہوں کو تہِ تیغ کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا عورتوں کی ان کے یہاں کوئی عزت باقی نہ تھی مکان کے دوسرے سامان و اسباب کی طرح یا مویشیوں کی طرح جہاں چاہتی منتقل کی جاتی یا ورثہ میں ملتی کچھ کھانے مردوں کے ساتھ مخصوص تھے عورتیں ان کو استعمال نہیں کر سکتی تھیں آدمی جتنی عورتوں سے چاہتا شادی کر سکتا تھا بعض لوگ اپنی اولاد کو افلاس اور معاشی پریشانی کے خوف سے قتل کر ڈالتے تھے۔[1]

قبائلی اور نسلی خاندانی اور خونی عصبیت اور جذبۂ انتقام بے حد شدید تھی جنگ ان کی گھٹی میں پڑی تھی اور ایک دوسرے کو قتل کرنا ان کے لئے ایک کھیل اور تفریح تھا ایک معمولی واقعہ اکثر بڑی خونریز اور طویل جنگوں کا سبب بن جاتا بعض جنگوں کا سلسلہ ۴۰ - ۴۰ سال چلا اور ہزاروں آدمی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔[2]

یورپ

یورپین قومیں جو شمال و مغرب کے اندر دور تک آباد تھیں جہالت و ناخواندگی کے مہیب سایہ میں تھیں اور خونریز جنگوں میں مشغول وہ تمدنِ انسانی کے کارواں سے بہت پیچھے اور علوم و فنون کی دنیا سے بہت دور تھیں نہ بیرونی دنیا کو ان سے کوئی سروکار تھا نہ ان کو بیرونی دنیا سے کوئی مطلب ان کے جسم گندے اور دماغ اوہام و خرافات سے بھرے ہوئے تھے[3] وہ نظافت کی طرف توجہ اور پانی کا استعمال کم سے کم

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو قرآن مجید کتب حدیث اشعار عرب حماسہ سبع معلقات وغیرہ۔
[2] دیکھئے شعر جاہلی ایام عرب اور اخبار عرب کے سلسلہ کی کتب۔
[3] THILLY : HISTORY OF PHILOSOPHY, NEW YORK 1955

کرتے تھے۔ ان کے پادری اور راہب جسم کو اذیت پہنچاتے۔ اور انسانوں سے فرار میں نہایت درجہ متشدد اور انتہا پسند تھے۔ ان کے یہاں ابھی تک یہی بات طے نہیں ہوئی تھی کہ عورت انسان ہے یا حیوان؟ اس کے اندر ابدی وغیر فانی روح ہے یا نہیں؟ اس کو ملکیت اور بیع و شرا کا حق حاصل ہے یا ان میں سے کسی بات کا وہ حق نہیں رکھتی؟[1]

ROBERT BRIFFAULT لکھتا ہے:-

"پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور یہ تاریکی تدریجاً زیادہ گہری اور بھیانک ہوتی جا رہی تھی اس دور کی وحشت و بربریت زمانۂ قدیم کی وحشت و بربریت سے کئی درجہ زیادہ بڑھی چڑھی تھی، کیونکہ اس کی مثال ایک بڑے تمدن کی لاش کی تھی جو سڑ گئی ہو، اس تمدن کے نشانات مٹ رہے تھے اور اس پر زوال کی مہر لگ چکی تھی، وہ ممالک جہاں یہ تمدن برگ و بار لایا اور گذشتہ زمانہ میں اپنی انتہائی ترقی کو پہنچ گیا تھا جیسے اٹلی، فرانس، وہاں تباہی، طوائف الملوکی اور ویرانی کا دور دورہ تھا۔"[2]

گھٹا ٹوپ اندھیرا اور جان لیوا مایوسی

مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی جس میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تاریخ کا بدترین دور تھا، اور انسانیت کے مستقبل اور اس کی بقا و ترقی کے لحاظ سے انتہا درجہ تاریک اور مایوس کن۔

---

[1] LECKY, W. E. H. HISTORY OF EUROPEAN MORALS. (NEW YORK [illegible])

[2] THE MAKING OF HUMANITY, P. [illegible]

مشہور انگریز مصنف H. O. WELLS نے بھی ساسانی اور بازنطینی حکومتوں کے ذکر میں اس عہد کی تصویر کھینچی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

"سائنس اور سیاسیات دونوں ان زیر پیکار اور زوال پذیر حکومتوں میں موت کی نیند سو چکے تھے۔ ایتھنس کے متاخرین فلسفیوں کی اپنی تباہی تک جو اس پر مسلط کر دی گئی تھی عہد قدیم کے ادبی سرمایہ کو اگرچہ بغیر سوچے سمجھے مگر بے انتہا عقیدت کے ساتھ محفوظ رکھا تھا۔ لیکن اب دنیا میں ان ملکوں کا کوئی طبقہ ایسا باقی نہیں رہا تھا جو عہد قدیم کے شرفاء کی طرح جری اور آزاد خیال کا حامی ہوتا۔ اور قدماء کی تحریروں کی طرح تلاش و تحقیق یا جرأت مندانہ اظہار خیال کا قائل ہوتا۔ اس طبقہ کے ختم ہونے کی خاص وجہ سیاسی اور سماجی افراتفری تھی لیکن ایک وجہ اور بھی تھی جس کے باعث اس عہد میں ذہن انسانی کند اور منجمد ہو چکا تھا۔ ایران اور بازنطینہ دونوں ملکوں میں عدم رواداری کا دور تھا۔ دونوں حکومتیں ایک نئے انداز کی مذہبی حکومتیں تھیں جس میں آزادانہ اظہار خیال پر کڑے پہرے بٹھا دیئے گئے تھے۔"

بازنطینی شہنشاہی پر ایرانی شہنشاہی کے حملے اور بازنطینیوں کی فتح کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد چھٹی صدی عیسوی میں سماجی و اخلاقی پستی پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف لکھتا ہے :۔

"اگر کوئی سیاسی پیشین گو ساتویں صدی کے آغاز میں دنیا کا جائزہ لیتا تو اس نتیجہ پر پہنچتا کہ صرف چند صدیوں کی بات ہے کہ پورا یورپ اور ایشیا منگولوں کے زیر اقتدار آجائے گا۔ مغربی یورپ میں نہ کوئی نظم تھا

اور نہ اتحاد و باز نطینی اور ایرانی حکومتیں ایک دوسرے کو تباہ کرنے پر
تلی ہوئی تھیں ہندوستان بھی منقسم اور تباہ حال تھا۔[1]

عالمگیر فساد

غرض بعثت محمدی کے زمانہ میں پوری انسانیت خودکشی کے راستہ پر تیزی کے ساتھ گامزن تھی انسان اپنے خالق اور مالک کو بھول چکا تھا اور خود اپنے آپ کو اور اپنے مستقبل اور انجام کو فراموش کر چکا تھا اس کے اندر بھلائی اور برائی اور زشت و خوب میں تمیز کرنے کی بھی صلاحیت باقی نہیں تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسانوں کے دماغ و دل کسی چیز میں کھو چکے ہیں ان کو دین و آخرت کی طرف سر اٹھا کر دیکھنے کی بھی فرصت نہیں اور روح و قلب کی غذا، اخروی فلاح، انسانیت کی خدمت اور اصلاح حال کے لئے ان کے پاس ایک لمحہ خالی نہیں، بسا اوقات پورے پورے ملک میں ایک شخص ایسا نظر نہ آتا جس کو اپنے دین کی فکر ہو، جو خدائے واحد کی پرستش کرتا ہو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراتا ہو، جس کے جگر میں انسانیت کا درد ہو اور اس کے تاریک [illegible] کا انجام دیکھ کے بے چینی ہو، یہ صورت حال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی ہو بہو تصویر تھی کہ

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ	خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال
بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ	کے سبب فساد پھیل گیا ہے تاکہ خدا
لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا	ان کو ان کے بعض عملوں کا مزہ چکھائے
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (سورہ روم: ۴۱)	عجب نہیں کہ وہ باز آجائیں۔

---

[1] A SHORT HISTORY OF THE WORLD (LONDON 1931) [illegible] P. 144.

محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جزیرۃ العرب میں کیوں مبعوث ہوئے!

اللہ تعالیٰ کی مشیت و حکمت کا فیصلہ تھا کہ انسانیت کی ہدایت و نجات کا
یہ آفتاب جس سے ساری کائنات میں روشنی پھیلی جزیرۃ العرب کے اُفق سے طلوع ہو
جو دنیا کا سب سے تاریک خطہ تھا اور جس کو اس تیز روشنی کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اس دعوت کے لئے عربوں کا انتخاب اس لئے کیا اور ان کو ساری
دنیا میں اس کی تبلیغ و اشاعت کا ذمہ دار بنایا کہ ان کے دلوں کی تختی بالکل صاف تھی،
اس میں پہلے سے کچھ نقوش تحریر اور نقش و نگار موجود نہ تھے جن کو مٹانا مشکل ہوتا، برخلاف
رومیوں، ایرانیوں یا ہندوستانیوں کے جن کو اپنی ترقی، علوم و فنون اور اپنے تہذیب و تمدن
اور فلسفہ پر بڑا ناز اور غرور تھا اور اس کی وجہ سے ان کے اندر کچھ ایسی نفسیاتی گرہیں اور
فکری و ذہنی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں جن کا دور ہونا آسان نہ تھا، عربوں کے دل و دماغ
کی سادہ تختیاں صرف ان معمولی اور ہلکی پھلکی تحریروں کی آشنا تھیں جن کو ان کی جہالت
و ناخواندگی اور بدوی زندگی نے ان میں ثبت کر دیا تھا اور جن کا دھونا اور مٹانا اور ان کی
جگہ پر نئے نقش قائم کرنا بہت آسان تھا، موجودہ علمی اصطلاح میں وہ "جہل بسیط"
یا "جہل سادہ" کا شکار تھے، اور یہ وہ غلطی ہے جس کا مداوا ہو سکتا ہے، دوسری متمدن
اور ترقی یافتہ قومیں "جہل مرکب" میں مبتلا تھیں جس کا علاج اور تدارک اور اس کو

دھوکے کے نئے حروف لکھنے کا کام ہمیشہ بے حد دشوار ہوتا ہے۔

یہ عرب اپنی اصل فطرت پر تھے مضبوط اور آہنی ارادہ کے مالک تھے اگر حق بات ان کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ اس کے خلاف شمشیر تک اٹھانے میں کوئی تکلف نہ کرتے اور اگر حق کھل کر سامنے آجاتا تو وہ اس سے دل وجان سے زیادہ محبت کرتے، اس کو گلے سے لگاتے اور اس کے لئے جان تک دینے میں پس وپیش نہ کرتے۔

یہ عربی نفسیات اور ذہن سُہیل بن عمرو کے ان الفاظ میں جھلکتا ہے جو صلح حدیبیہ کے معاہدہ کی تحریر کے وقت ان کی زبان سے نکلے معاہدہ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا تھا "ھذا ما قاضی علیہ محمد رسول اللہ" (یہ وہ ہے جس کا فیصلہ محمد رسول اللہ نے کیا) انھوں نے کہا کہ "واللہ لوکنا نعلم انک رسول اللہ ما صددناک عن البیت ولا قاتلناک" (واللہ اگر ہم یہ جانتے اور مانتے کہ آپ خدا کے رسول ہیں تو نہ آپ کو بیت اللہ سے روکتے نہ آپ سے جنگ کرتے) یہ ذہن عکرمہ بن ابی جہل کے الفاظ میں بھی جھلک رہا ہے، یرموک کی لڑائی پورے شباب پر تھی اور عکرمہ پر سخت دباؤ پڑ رہا تھا جب رومی یلغار کرتے ہوئے عکرمہ کی طرف بڑھے تو انھوں نے ان کو للکار کر کہا کہ عقل کے دشمنو! (جب تک بات میری سمجھ میں نہیں آئی) میں رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے مقابلہ میں ہر جگہ صف آراء رہا، آج میں تم سے بھاگوں گا؟ پھر انھوں نے پکار کر کہا کہ ہے کوئی جو موت پر مجھ سے بیعت کرے؟ کچھ لوگ آئے اور بیعت کی پھر وہ آگے بڑھ کر لڑنے لگے یہاں تک کہ زخمی ہوئے اور شہادت پائی۔[1]

یہ عرب بڑے حقیقت پسند، سنجیدہ، سلیم الطبع، صاف گو، سخت کوش وسخت جان

---

[1] تاریخ طبری ج ۴ ص ۳۶

تھے وہ نہ دوسروں کو قریب دیتے تھے نہ اپنے کو قریب ہی رکھنا پسند کرتے تھے، سچی اور پکی بات کے عادی بات کی لاج رکھنے والے اور پختہ ارادہ کے مالک تھے، اس کا ایک واضح نمونہ اور ثبوت بیعت عقبۂ ثانیہ میں ہمیں نظر آتا ہے جس کے بعد ہی مدینہ طیبہ ہجرت کا آغاز ہوا۔

ابن اسحاق روایت کرتے ہیں کہ جب اوس و خزرج عقبہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرنے کے لئے جمع ہوئے تو عباس بن عبادہ انصاری نے (اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے) کہا اے اہل خزرج! کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ انھوں نے جواب دیا ہاں! انھوں نے کہا تم ان سے احمر و اسود (ہر قسم کے لوگوں سے) جنگ پر بیعت کر رہے ہو (یعنی بہت بڑی تعداد اور مختلف اصناف کے لوگوں سے) اگر تم ایسا خیال کرتے ہو کہ تمہارے مال لوٹ لئے جائیں اور تباہ و برباد کر دیئے جائیں گے تمہارے اشراف اور سرداران قبیلہ قتل کر دیئے جائیں تو تم ان کو دشمنوں کے حوالہ کر کے علیحدہ ہو جاؤ گے اگر ایسا ہے تو ابھی اس بات کو ختم کر دو اس لئے کہ اگر تم نے ایسا کیا تو واللہ دنیا و آخرت دونوں جگہ کی رسوائی ہے اور اگر تمہارا فیصلہ یہ ہے کہ جس چیز کے لئے تم نے ان کو دعوت دی ہے اس کو پورا کرو گے خواہ تمہارا سارا مال و اسباب تہس نہس ہو جائے اور تمہارے سردار و اشراف قتل کر دیئے جائیں تو اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دو، اس وقت اس میں خدا کی قسم دنیا و آخرت دونوں جگہ کی کامیابی و بھلائی ہے، ان لوگوں نے جواب دیا کہ مال و دولت کی تباہی اور سرداروں کے قتل پر (جس چیز پر) ہم آپ سے بیعت کرتے ہیں، لیکن اس کا صلہ یا رسول اللہ اگر ہم نے یہ عہد پورا کیا کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا جنت

کہنے لگے ہاتھ بڑھائیے، آپ نے اپنا دست مبارک آگے کیا اور ان سب نے آپ سے بیعت کی۔[1]

اور واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اس عہد کو جس پر آپ سے بیعت کی تھی پورا کیا۔ حضرت سعد بن معاذؓ نے اپنے مشہور جملے میں ان سب کی ترجمانی کی تھی کہ خدا کی قسم اگر آپ چلتے چلتے برک الغماد تک پہونچ جائیں گے تب بھی ہم آپ کے ساتھ چلتے رہیں گے اگر آپ اس سمندر کو عبور کرنا چاہیں گے تو ہم آپ کے ساتھ سمندر میں کود جائیں گے۔[2]

عزم و ارادہ کی یہ پختگی اور سچائی، عمل کی سنجیدگی اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کا مزاج اور طبیعت اس جملہ سے بھی عیاں ہے جو اسلامی افواج کے مشہور قائد و سپہ سالار عقبہ بن نافعؓ سے منسوب ہے، جب ان کی فتوحات اور پیش قدمیوں کی راہ میں بحر اوقیانوس (اٹلانٹک) حائل ہوا تو اس موقع پر انھوں نے کہا کہ خدایا یہ بحر ذخار حائل ہے ورنہ جی چاہتا ہے کہ برابر آگے بڑھتا جاؤں اور بحر و بر میں تیرے نام کی منادی کر دوں۔[3]

اس کے برخلاف یونان، روم اور ایران کے لوگ زمانہ سازی اور ہوا کے رخ پر چلنے کے عادی تھے کوئی ظلم و زیادتی ان کے اندر تحریک پیدا کرنے سے قاصر تھی کوئی اصول پسندی اور حقیقت ان کے لئے کشش نہ رکھتی تھی، کوئی دعوت اور عقیدہ ان کے خیالات و افکار اور احساسات و جذبات پر اس طرح طاری نہ ہوتا تھا کہ

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۴۴۳ (طبع مصطفیٰ البابی الحلبی) طبع دوم [2] برک الغماد کے متعلق مختلف اقوال ہیں ایک قول یہ ہے کہ وہ یمن کا کوئی دور دراز مقام ہے، سہیلی کہتے ہیں کہ اس سے مراد حبشہ ہے مقصد یہ ہے کہ اگر آپ بعید ترین مقام تک بھی لے جائیں گے تو ہم ہر کہیں جائیں گے اور ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ زاد المعاد ج ۱ ص ۳۴۲-۳۴۳ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۶۱۵ بخاری و مسلم میں بھی یہ روایت آئی ہے۔

[3] مسلمان مورخین اور مصنفین عام طور پر اس کو بحر ظلمات سے یاد کرتے ہیں [4] کامل ابن اثیر ج ۴ ص ۴۲

وہ اس کے لئے اپنی ہستی کو فراموش کر دیں اور اپنے عیش اور دنیا کی لذتوں کو خطرہ میں ڈال دیں۔

عرب تہذیب، تمدن اور تعیش و آرام طلبی کی پیدا کی ہوئی ان تمام بیماریوں و کمزوریوں سے محفوظ تھے جن کا علاج بڑا دشوار ہوتا ہے اور جو کسی ایمان و عقیدہ کے لئے گرم جوشی و جاں فروشی میں ہمیشہ حائل ہوتی ہیں اور اکثر آدمی کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیتی ہیں۔

ان کے اندر صداقت بھی تھی، دیانت بھی اور شجاعت بھی، منافقت اور سازش ان کے مزاج سے مناسبت نہ رکھتی تھی، بے جگری سے لڑنے والے، گھوڑوں کی پیٹھ پر زیادہ وقت گذارنے والے، سخت ترین ملامت اور تعب برداشت کے مالک، سادہ زندگی کے عادی، شہسواری اور فنون جنگ کے عاشق، جو ایک ایسی قوم کے لئے ضروری شرط ہے جس کو دنیا میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دینا ہو، خصوصاً اس دور میں جب معرکہ آرائیوں اور مہم جوئیوں کا سلسلہ ہو اور بہادری و شجاعت کا عام چلن ہو۔

دوسری بات یہ کہ ان کی فکری و عملی قوتیں اور فطری صلاحیتیں محفوظ تھیں اور خیالی فلسفوں، بے فائدہ منطقی بحثوں اور موشگافیوں، علم کلام کے دقیق و نازک مضامین یا مذہبی و علاقائی خانہ جنگیوں میں ضائع نہیں ہوئی تھیں، یہ ایک نوخیز اور اس لحاظ سے محفوظ قوم تھی اور زندگی و حرارت، جوش و نشاط اور عزم و آہنی ارادہ سے بھرپور تھی۔

آزادی و مساوات، فطرت اور مناظر فطرت سے محبت اور سادگی و سادہ دلی اس کی گھٹی میں پڑی تھی، اس کو کبھی کسی غیر ملکی اقتدار کے سامنے جھکنا نہ پڑا تھا، تو غلامی اور ایک انسان کے دوسرے انسان پر حکم چلانے کے معنی سے ناآشنا تھی، اس کو ایرانی و رومی شہنشاہیت کے تکبر اور انسان اور انسانیت کو نگاہ حقارت سے دیکھنے کا کبھی تجربہ نہ ہوا تھا، اس کے نزدیک ایرانی

سلاطین (جو جزیرۃ العرب کے پڑوسی تھے) مافوق البشر سمجھے جاتے تھے اگر ایرانی بادشاہ فصد کھلواتا یا کوئی دوا استعمال کرتا تو دارالسلطنت میں اعلان کر دیا جاتا کہ آج بادشاہ سلامت نے فصد کھلوائی ہے یا دوا استعمال کی ہے اس اعلان کے بعد شہر میں نہ کوئی پیشہ ور اپنے پیشہ میں مشغول ہوتا اور نہ کوئی سرکاری و درباری آدمی کوئی کام کر سکتا، اگر اس کو چھینک آتی تو اس کے لئے کسی کو دعائیہ کلمات کہنے کا حق نہ تھا وہ خود اگر دعا کرتا تو آمین بھی نہیں کہہ سکتا تھا اگر وہ اپنے وزراء وامراء میں سے کسی کے گھر فروکش ہوتا تو یہ دن بہت غیر معمولی اور اہم سمجھا جاتا اور اس دن سے اس خاندان کی نئی تقویم اور نئی جنتری کی شروع ہوتی اور خطوط میں تاریخ ڈالی جاتی، ایک معینہ مدت کے لئے ٹیکس معاف کر دیئے جاتے، وہ شخص مختلف قسم کے اعزازات، انعامات، وظائف و زر و فتوحات سے نوازا جاتا، محض اس بنا پر کہ بادشاہ نے اپنی تشریف آوری سے اس کو سرفراز کیا ہے۔[1]

بیان آداب و رسوم تعظیم و بندگی کے علاوہ جن کا بجا لانا ارکان سلطنت اور اہل دربار اور دوسرے تمام آدمیوں کے لئے ضروری تھا مثلاً ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہنا[2] (یعنی سینہ پر ہاتھ رکھ کر ادب کے ساتھ سر نیاز خم کر دینا) ان کے سامنے اس طرح مؤدب کھڑا رہنا جس طرح نماز میں اپنے خدا کے سامنے کوئی کھڑا ہوتا ہے، یہاں اس بادشاہ کے عہد کا تذکرہ ہے جو نوشیروان عادل کے نام سے شہرۂ آفاق ہے یعنی خسرو اول (۵۳۱ء تا ۵۷۹ء) اس سے

۱؎ ملاحظہ ہو ایران بعہد ساسانیان ص ۴۲۶-۴۲۹ ۲؎ ایضاً ص ۴۲۹ اس کے لئے عربی میں ایک مستقل لفظ ہی بن گیا تھا "تکفیر"، ملائی بھی جھکتے ہوئے اپنا ہاتھ سینہ پر رکھ کر تعظیماً سر جھکا دینا، ایران کا عام رواج تھا، ابن منظور نے اس اصطلاح کی اور لغت عرب میں اس کی اصل نقل کی ہے، میں ہے کہ تکفیر کے معنی ہیں ایرانی کا اپنے بادشاہ کی تعظیم کرنا اور اہل کتاب کی تعریف ہے کہ تعظیم و ادب کے طور پر آدمی اپنا سر جھکا دے جھکنے کے اس طریقہ سے استفادہ کرتے ہوئے خصوصاً آنحضرت نے فرمایا کہ جیسے کوئی دینا سکون اپنے مصاحب اور مددگار کے سامنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر ذرا اپنا سر جھکا دیتا ہے (لسان العرب ج ۵ ص ۱۴۶ مادۂ کفر)

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایران کے ان شہنشاہوں کا کیا حال ہوگا جو ظلم و سفاکی اور بے رحمی میں مشہور زمانہ تھے۔

آزادیٔ خیال اور اظہار رائے (مثلاً تنقید و نکتہ چینی) وسیع ایرانی سلطنت میں تقریباً مفقود تھی۔ طبری نے اس سلسلہ میں نوشیروان عادل کی ایک عجیب حکایت بیان کی ہے جس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ایرانی شہنشاہی میں آزادیٔ رائے اور اظہار خیال پر کتنی سخت پابندی تھی اور دربار شاہی میں لب کشائی کی قیمت کیا ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس واقعہ کو "ایران بعہد ساسانیان" کے مصنف نے طبری کے حوالے سے قلم بند کیا ہے۔

"اس نے ایک کونسل منعقد کی اور دبیر خراج کو حکم دیا کہ لگان کی نئی شرحیں باواز بلند پڑھ کر سنائے جب وہ پڑھ چکا تو خسرو نے دو دفعہ حاضرین سے پوچھا کہ کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟ سب چپ رہے جب بادشاہ نے تیسری مرتبہ یہی سوال کیا تو ایک شخص کھڑا ہوا اور تعظیم کے ساتھ پوچھنے لگا کیا بادشاہ کا یہ منشا ہے کہ ناپائدار چیزوں پر دائمی ٹیکس لگائے جو مرور زمانہ نا انصافی پر منتج ہوگا؟ اس پر بادشاہ چلا کر بولا کہ اے ملعون و گستاخ! تو کن لوگوں میں سے ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں دبیروں میں سے ہوں، بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو قلمدانوں سے پیٹ پیٹ کر مار ڈالو اس پر ہر ایک دبیر نے اپنے اپنے قلمدان سے اس کو مارنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ بیچارہ مر گیا اس کے بعد سب نے کہا کہ اے بادشاہ! جتنے ٹیکس تو نے ہم پر لگائے ہیں وہ ہمارے نزدیک سب انصاف پر مبنی ہیں۔"[1]

ہندوستان میں عزت و ناموس کی تذلیل و توہین اور ان بے انتہا طبقوں کی تقسیم

---

[1] ایران بعہد ساسانیان ص ۵۱۱ ماخوذ از ترجمہ پروفیسر محمد اقبال۔

(جن کو فاتح آرین قوم اور ملکی قانون نے ایک کمتر مخلوق قرار دیا تھا اور جو پالتو جانوروں سے صرف اس بات میں مختلف تھے کہ دو پیروں پر چلتے تھے اور آدمیوں جیسی شکل رکھتے تھے (تصور کیجئے) روا ہے اس قانون میں یہ باقاعدہ موجود تھی کہ اگر کوئی شودر کسی برہمن کو نقصان پہنچانے کے لئے ہاتھ اٹھائے یا لاٹھی اٹھائے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اگر اس کو لات مارے تو اس کا پیر کاٹ دیا جائے اگر یہ دعویٰ کرے کہ وہ اس کو تعلیم دے سکتا ہے تو اس کو کھولتا ہوا تیل پلا دیا جائے اس قانون کی رو سے کتے، بلی، مینڈک، گرگٹ، کوے، الو اور اس اچھوت طبقے کے فرد کے قتل کا جرمانہ برابر تھا۔[1]

رومی بھی اس معاملہ میں ایرانیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے اگرچہ بے قدری اور تذلیل انسانیت میں یہ ہندوستان کو پہنچا نہ تھا ایک مغربی مورخ VICTOR CHOPART اپنی کتاب THE ROMAN WORLD میں لکھتا ہے:-

"قیصر معبود سمجھے جاتے تھے یہ بات موروثی و خاندانی طور پر نہ تھی بلکہ جو بھی تخت و تاج کا مالک ہوتا وہ خدا تسلیم کر لیا جاتا تھا اگرچہ اس میں ایسی کوئی شاہی اور عظمت نہ ہوتی جو اس کو اس درجہ پر فائز ہونے کی طرف اشارہ کرتی (AUGUSTUS) کا شاہانہ لقب ایک شہنشاہ سے دوسرے شہنشاہ تک دستوری قانون کے بموجب منتقل نہیں ہوتا تھا بلکہ رومی ایوان حکومت کا صرف اتنا کام تھا کہ اس حکم پر جو فوج شہر کی دیواروں پر صادر ہو صاد کر دیا کرے، یہ شہنشاہی صرف ایک فوجی آمریت (ڈکٹیٹرشپ) کی ایک شکل تھی۔"[2]

اگر اس کا موازنہ عربوں کی اس حریت پسندی، عزت نفس اور ادب و تعظیم اعتدال

---

[1] منوشاستر (دسواں باب) [2] ...

[2] THE ROMAN WORLD (LONDON 1928) P. 419.

سے کیا جائے جو ظہورِ اسلام سے قبل ان کے اندر ملتا ہے تو دونوں قوموں کے مزاج اور عربی
و عجمی معاشرہ کا فرق اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔ وہ بعض اوقات اپنے بادشاہوں کو "أبیت
اللعن" و "عِم صباحًا"[1] جیسے الفاظ سے خطاب کرتے تھے یہ آزادی و خودشناسی اور اپنی عزت
و ناموس کی حفاظت و پاسبانی عرب میں اس درجہ تھی کہ وہ اپنے ملوک و امراء کے بعض مطالبوں کو
فرمائشوں کو پورا کرنے سے بھی بعض اوقات عذر کر دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں یہ دلچسپ قصہ تاریخ
میں آتا ہے کہ ایک عرب بادشاہ نے بنی تمیم کے ایک شخص سے ایک گھوڑی جس کا نام "سکاب"
تھا طلب کی تو اس نے دینے سے صاف انکار کر دیا اور مشہور شعر کہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

أبیت اللعن إن سكاب علق　　　نفیس لا تعار ولا تباع

اور مقطع یہ ہے ؎

فلا تطمع أبیت اللعن فیها　　　ومنعكها بشيء يستطاع[2]

یہ آزادی و خودنگری بلند نفسی اور شرافت و حوصلہ مندی عوام کے سب طبقوں
میں موجود تھی اور مردوں اور عورتوں دونوں میں پائی جاتی تھی اس کا ایک نمونہ ہمیں حیرہ
کے بادشاہ عمرو بن ہند کے قتل کے واقعہ میں نظر آتا ہے۔ یہ واقعہ عرب مورخین نے اس طرح بیان
کیا ہے کہ عمرو بن ہند نے مشہور عرب شہسوار اور شاعر عمرو بن کلثوم کی دعوت کی اور یہ خواہش
کی کہ اس کی ماں بادشاہ کی ماں کے ساتھ دعوت میں شریک ہو چنانچہ عمرو بن کلثوم بنو تغلب کی
ایک جماعت کے ساتھ جزیرہ سے حیرہ کی طرف روانہ ہوا اور اس کی ماں لیلیٰ بنت مہلہل بھی

---

[1] "أبیت اللعن" دعائیہ جملہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ عیب کے کاموں سے محفوظ رہیں۔ "عم صباحًا" آپ کی صبح بخیر ہو۔ [2] دیوان الحماسہ باب الحماسہ ص ٦٢-٦٣۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ اے بادشاہ! یہ بہت قیمتی اور نفیس گھوڑی ہے نہ اس کو عاریتاً دیا جا سکتا ہے نہ اسے بیچا جا سکتا ہے۔ اس کو حاصل کرنے کی آپ کوشش نہ کریں۔ اس کا آپ سے روکنا میرے لئے ممکن ہے۔

بنی تغلب کے کچھ ذمّہ داروں کے ساتھ روانہ ہو لی عمرو بن ہند کا خیمہ حیرہ اور فرات کے درمیان نصب کیا گیا، ایک طرف عمرو بن ہند اپنے خیمہ میں داخل ہوا اور دوسری طرف لیلیٰ اور ہند خیمہ کے ایک علحدہ کمرہ میں جب ہو بیٹھیں عمرو بن ہند نے اپنی ماں سے کہہ دیا تھا کہ جب کھانا لگ جائے تو نوکروں کو دور علحدہ کر دینا اور کوئی ضرورت ہو تو لیلیٰ سے کام لینا، چنانچہ عمرو بن ہند نے دستر خوان لگانے کا حکم دیا، پھر کھانا لگوایا اسی درمیان میں ہند نے لیلیٰ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ بہن! فدا ذرا یہ طباق تو مجھے اٹھا دو لیلیٰ نے کہا کہ "جس کو ضرورت ہو وہ خود اٹھائے" اس نے دوبارہ مانگا اور اصرار کرنے لگی اس وقت لیلیٰ نے صدا لگائی ہائے کیا ذلت کی بات ہے، اے بنی تغلب! یہ آواز عمرو بن کلثوم نے سنی تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اس نے لپک کر عمرو بن ہند کی تلوار جو سامنے لٹک رہی تھی اٹھائی اور اس کے سر پر مار دی اس کے ساتھ ہی تغلب نے خیمہ کو لوٹ لیا اور جزیرہ کی طرف واپس آگئے اسی واقعہ پر عمرو بن کلثوم نے وہ مشہور قصیدہ کہا جس کا شمار سبع معلّقہ میں کیا جاتا ہے۔[1]

اسی طرح جب مغیرہ بن شعبہ مسلمانوں کے سفیر بن کر رستم کے دربار میں گئے تو وہ اپنی پوری شان و شوکت اور لوازم امارت کے ساتھ اپنے تخت پر بیٹھا تھا مغیرہ ابن شعبہ عربوں کی عادت کے موافق اسی کے ساتھ اس کے تخت پر تکیہ کے پاس بیٹھ گئے، اس پر درباری فوراً اٹھ پڑے اور ان کو نیچے اتار لائے، اس پر انھوں نے کہا کہ ہم کو تو یہ خبریں ملی تھیں کہ تم لوگ بہت عقلمند ہو لیکن مجھے تم سے زیادہ بیوقوف کوئی نظر نہیں آتا، ہم عرب تو سب برابری کا معاملہ کرتے ہیں ہم میں سے کوئی کسی کو غلام نہیں بناتا سوائے حالت جنگ کے میرا گمان تھا کہ تم بھی اپنی قوم سے اسی طرح مساوات و برابری کا معاملہ کرتے ہو گے

---

[1] کتاب الشعر والشعراء لابن قتیبہ ص ۶۳

اس سے بہتر یہ تھا کہ تم مجھے پہلے ہی مطلع کر دیتے کہ تم نے آپس میں ایک دوسرے کو خدا بنا رکھا ہے اور یہ معاملہ تمہارے ساتھ طے نہ ہو سکے گا۔ اس صورت میں ہم تم سے بیر باؤ نہ کرتے اور نہ تمہارے پاس آتے لیکن تم نے ہمیں خود دعوت دی ہے۔[1]

جزیرۃ العرب میں آخری نبی کی بعثت کا دوسرا سبب جزیرۃ العرب اور مکہ میں کعبہ کا وجود تھا جس کو حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اس لئے تعمیر کیا تھا کہ ایک اللہ کی عبادت کی جائے اور یہ جگہ ہمیشہ کے لئے توحید کی دعوت کا مرکز ہے۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ	پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کرنے کے
لَلَّذِي بِبَكَّةَ[2] مُبَارَكًا وَهُدًى	لئے مقرر کیا تھا، وہی ہے جو مکہ میں ہے
لِلْعَالَمِينَ[3]	بابرکت اور جہان کے لئے موجب ہدایت۔

بائبل (عہد عتیق) میں اس قدر تحریف کے باوجود وادی بکہ کے الفاظ آج تک موجود ہیں لیکن مترجمین نے اس کو وادی البکاء بنا دیا ہے اور علم کے بجائے نکرہ کر دیا ہے۔ مزامیر داؤد کے الفاظ جو عربی میں آتے ہیں وہ یہ ہیں:-

"طوبى للاناس عزهم بك، طرق بيتك في قلوبهم عابرين في وادي البكاء يصيرونه ينبوعا۔[4] (مزامیر ۸۴۔ ۵-۶-۷)

"مبارک وہ انسان جن میں قوت تجھ سے ہے ان کے دل میں تیری راہیں ہیں وہ بکا کی وادی میں گذرتے ہوئے اسے ایک کنواں بناتے (کتاب مقدس برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی)

---

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۔ [2] بکہ بیت الحرام کا نام ہے اس کے بکہ اور مکہ دونوں نام آتے ہیں اس لئے کہ عربی زبان میں میم اور باء میں اکثر تبادلہ ہوتا رہتا ہے جیسے لازم اور لازب اور طیط [illegible]

[3] سورۂ آل عمران آیت ۹۶ [4] الکتاب المقدس فی ساعتہ [illegible]

لیکن علمائے یہود کو صدیوں کے بعد احساس ہوا کہ یہ ترجمہ غلط ہے چنانچہ (JEWISH ENCYCLOPEDIA) میں یہ اعتراف موجود ہے کہ وہ ایک مخصوص وادی ہے جس میں پانی نہ ملتا تھا اور جس نے یہ مذکورہ بالا عبارت لکھی ہے اس کے ذہن میں یک ایسی وادی کی تصویر تھی جس کے خاص قدرتی حالات تھے جن کی ترجمانی اس نے ان الفاظ سے کی ہے۔[1]

ان صحیفوں کے انگریزی مترجموں نے ترجمہ میں صحت و احتیاط کا عربی مترجموں سے زیادہ ثبوت دیا ہے انھوں نے بکہ کا لفظ اسی طرح باقی رکھا ہے جیسا کہ اصل صحیفہ میں تھا انھوں نے اس کو حرف "B" بڑے لکھا ہے جیسے عام طور پر اسماء و اعلام کو لکھا جاتا ہے یہ انگریزی ترجمہ درج ذیل ہے۔[1]

(BLESSED IS THE MAN WHOSE STRENGTH IS IN THEE; IN WHOSE HEART ARE THE WAYS OF THEM- WHO PASSING THROUGH THE VALLEY OF BACA MAKE IT A WELL-)

PSALM 84 5-6

(مبارک یاد ہے ان لوگوں کو جن کی عزت و قوت تیرے ساتھ ہے جن کے دلوں میں تیرے راستے ہیں جو وادی بکہ سے گزریں گے اور اس کو ایک کنواں بنائیں گے)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی اس دعا کا نتیجہ تھی جو انھوں نے کعبہ کی بنیادیں رکھتے اور اس کی تعمیر کرتے وقت کی تھی یہ دعا یہ ہے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ	اے ہمارے پروردگار ان لوگوں میں
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ	انھیں میں کا ایک پیغمبر مبعوث کیجیو جو ان کے
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ	تیری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کرے

[1] VOL. II P. 415 ۔ [1] ماخوذ از تفسیر ماجدی از مولانا عبدالماجد دریابادی و رحمۃ للعالمین از قاضی سلیمان منصور پوری جلد اول۔

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿﴾ (سورۂ بقرہ - ۱۲۹)

اور کتاب اور دانائی سکھایا کرے
اور ان کے دلوں کو پاک صاف کیا کرے
بے شک تو غالب اور صاحب حکمت ہے"

اللہ تعالےٰ کی سنّت ہے کہ وہ اپنے مخلصین و صادقین اور اپنی ذات عالی سے لو لگانے والوں اور دامن احتیاج پھیلانے والوں کی دعا ضرور قبول کرتا ہے انبیاء و مرسلین کا رتبہ تو اس سے بھی اونچا ہے صحف سماویہ اور اخبار صادقہ ان مثالوں سے لبریز ہیں۔ خود توریت میں اس کا ثبوت موجود ہے کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قبول کی۔ کتاب پیدائش (۲۰) کے صاف الفاظ یہ ہیں:۔

"اور اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سنی۔ دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا۔"

اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ اپنے بارہ میں فرمایا کرتے تھے کہ "انا دعوۃ ابراھیم و بشری عیسٰی"[1] (میں ابراہیمؑ کی دعا اور عیسیٰؑ کی بشارت ہوں) توریت میں اس کی تحریف کے باوجود اب تک اس کے شواہد ملتے ہیں کہ یہ دعا قبول ہوئی۔ کتاب استثناء (۱۸-۱۵) میں موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں۔

"یقیم لک الرب الٰہک نبیاً من وسطک من اخوتک مثلی له تسمعون"

ترجمہ: خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی طرف کان دھریو۔

۱؎ مسند امام احمد۔

"احوذ دقہ" (تیرے ہی بھائیوں) کا لفظ خود بتا رہا ہے کہ اس سے مراد بنی اسماعیل ہیں، جو بنی اسرائیل کے ابنائے عم تھے۔ اسی صحیفہ میں دو آیتوں کے بعد یہ الفاظ درج ہیں

"قال لی الرب قد احسنوا فیما تکلموا اقیم لهم نبیا من وسط اخوتهم مثلک واجعل کلامی فی فمه فیکلمهم بکل ما اوصیه به:

(سفر التثنیہ ۱۸۔ ۱۷۔ ۱۸)

"اور خداوند نے مجھے کہا کہ انہوں نے جو کچھ کہا سو اچھا کہا میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔"

"اجعل کلامی فی فمہ" (اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا) کے الفاظ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی متعین طور پر نشان دہی کرتے ہیں اس لئے کہ آپ ہی وہ تنہا نبی ہیں جن پر اللہ تعالےٰ کا کلام لفظاً و معناً نازل ہوا اور اللہ تعالےٰ نے اس کا اعلان بھی فرمایا۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ	اور نہ خواہش نفس سے منہ سے بات
إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ٥	نکالتے ہیں یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے
(سورۃ النجم ۳۔ ۴)	جو ان کی طرف بھیجا جاتا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

لَّا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ	اس پر جھوٹ کا دخل نہ آگے سے
وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ	ہو سکتا ہے نہ پیچھے سے دانا اور خوبیوں
حَمِيدٍ ٥ (سورۃ حم سجدہ ۔ ۴۲)	والے خدا کی اتاری ہوئی ہے۔

اس کے برخلاف انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفے اس کا بالکل دعویٰ نہیں کرتے کہ وہ

لفظاً و معناً دونوں طرح اللہ کا کلام ہیں، ان کے علماء بھی ان کو انبیاء کی طرف منسوب کرنے میں تکلف سے کام نہیں لیتے جیوش انسائیکلوپیڈیا میں آتا ہے کہ:۔

"کتاب مقدس (عہد قدیم) کی پہلی پانچ کتابیں (جیسا کہ قدیم یہودی مذہبی روایات ہمیں بتاتی ہیں) موسیٰ نبی کی تالیف ہیں، آخری آٹھ آیات کو مستثنیٰ کرکے (جن میں موسیٰ کے انتقال کا واقعہ بیان کیا گیا ہے) ربیّاں (یہودی عالم) ان تضادات اور ایک دوسرے سے مختلف روایات پر غور کرتے رہتے ہیں جو ان صحیفوں میں پائی جاتی ہیں، اور اس بارے میں حکمت و ذہانت سے اصلاح کرتے رہتے ہیں۔"[1]

جہاں تک اناجیل اربعہ کا تعلق ہے جن کو "عہد جدید" کہا جاتا ہے ان کو لفظاً و معناً کلام الٰہی ہونے سے دور کا بھی واسطہ نہیں، اس کا اطمینان ہر وہ شخص کر سکتا ہے جس کی ان کتابوں پر نظر ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ کتابیں سوانح و واقعات کی کتابیں زیادہ معلوم ہوتی ہیں، خدا کی نازل کردہ کتابیں جو وحی و الہام پر مبنی ہوں کم۔[2]

اس کے بعد جزیرۃ العرب کے مخصوص جغرافیائی محل وقوع کا نمبر آتا ہے جس نے اس کو سب سے موزوں مرکز دعوت کی شکل دے دی ہے جہاں سے یہ دعوت و پیغام ساری دنیا کو پہونچایا جا سکتا ہے اور ساری قوموں کو خطاب کیا جا سکتا ہے، ایک طرف براعظم ایشیا کا ایک حصہ ہے دوسری طرف براعظم افریقہ اور اس کے بعد یورپ بھی قریب ہے اور یہ سب وہ علاقے ہیں جو تہذیب، تمدن، علوم و فنون اور مذاہب و افکار کا ہمیشہ مرکز رہے ہیں اور جہاں بڑی وسیع اور طاقتور سلطنتیں قائم ہوئیں، پھر یہ علاقہ تجارتی کاروانوں کی

---

[1] JEWISH ENCYCLOPEDIA, VOL. [illegible], P. [illegible]

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے ہماری کتاب "منصب نبوت" (اسی سال الوداع خطبۂ ختم نبوت) فصل "آسمانی صحیفے اور قرآن علم و تاریخ کی روشنی میں"

گذرگاہ بھی تھا جس کے ذریعہ مختلف ممالک کے لوگ ایک دوسرے سے ملتے تھے یہ کبھی
بڑا عظموں کو جوڑتا تھا اور ایک جگہ کی مخصوص فضا اور پیداوار دوسری جگہ جہاں اس کی
ضرورت تھی منتقل کرتا تھا[۱]۔ یہ جزیرہ نمائے عرب دو زبردست بیرونی طاقتوں کے
درمیان واقع تھا عیسائی طاقت اور مجوسی طاقت مغرب کی طاقت اور مشرق کی طاقت
لیکن اس کے باوجود اپنی آزادی اور اپنی شخصیت کی اس نے ہمیشہ حفاظت کی اور اپنے
چند سرحدی مقامات اور بعض قبائل کو چھوڑ کر اس نے کبھی ان طاقتوں کی ماتحتی قبول نہیں کی
وہ نبوت کی ایک ایسی عالمی دعوت کا بجا طور پر مرکز بن سکتا تھا جو بین الاقوامی خطوط پر
قائم ہو انسانیت کو بلند سطح سے خطاب کر سکے ہر قسم کے سیاسی دباؤ اور غیر ملکی اثرات سے
بالکلیہ آزاد رہے۔

ان سب وجوہ کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے جزیرۃ العرب اور مکہ مکرمہ کو رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت وحی آسمانی کے نزول اور دنیا میں اسلام کی اشاعت کے
عالمگیر مرکز اور نقطہ آغاز کے طور پر منتخب فرمایا۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ	اور اللہ تعالیٰ زیادہ جانتا ہے کہ اس کا
رِسَالَتَهٗ ۔ (سورۃ الانعام ۱۲۴)	پیغام کہاں اور کس کے حوالہ کیا جائے۔

۱؎ ڈاکٹر حسین کمال الدین نے جو ریاض یونیورسٹی کے انجینئرنگ کالج میں سول انجینئرنگ کے شعبہ کے
صدر ہیں اپنے ایک پیپر (تحقیقی مقالہ) میں لکھا ہے کہ [illegible] جغرافیائی نقطہ نظر سے یہ پہنچ چکے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا
ہے کہ مکہ مکرمہ ٹھیک زمین یا خشکی کے حصہ کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے انہوں نے اپنی تحقیق کا آغاز کیا اپنے
مقصد سے کیا جس میں مکہ مکرمہ سے دوسرے مقامات کی سمت [illegible] کا حصول ہے [illegible]
[illegible] کوئی چیز [illegible] سمت قبلہ کا تعین کر سکے اسی درمیان ان پر یہ حقیقت واضح ہوئی
ہے کہ مکہ مکرمہ ٹھیک دنیا کے وسط میں واقع ہے اسی تحقیق سے [illegible] مکہ مکرمہ کو
بیت اللہ کا مرکز اور ہدایت آسمانی کا نقطہ آغاز بنانے میں خدا کی مصلحت کیا تھی (ماہنامہ الاعلام [illegible])

عرب کا تاریک ترین دَور

اور ایک مستقل نبی کی بعثت کی ضرورت

ان صلاحیتوں اور خوبیوں کے باوجود جن سے اللہ تعالےٰ نے عربوں کو سرفراز کیا تھا اور جن کی وجہ سے بعثت محمدی اور ظہور اسلام کے لئے ان کا انتخاب فرمایا تھا، جزیرۃ العرب میں بیداری اور بے چینی کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے اور حنفاء[1] اور تلاش حق کا جذبہ رکھنے والے چند نفوس باقی رہ گئے تھے جو انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے، اور جن کی حیثیت برسات کی اندھیری اور ٹھٹھری ہوئی رات میں جگنوؤں سے زیادہ نہ تھی جو نہ کسی گم گشتہ کو راہ دکھا سکتے ہیں نہ کسی کو گرمی و حرارت پہونچا سکتے ہیں۔

یہ دور جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی جزیرۃ العرب کی تاریخ کا بھی تاریک ترین دور تھا، یہ ملک ظلمت و انحطاط کی اس آخری منزل پر تھا جب اصلاح کی امید ختم ہو جاتی ہے، یہ وہ سخت و جاں گداز اور سنگین مرحلہ تھا جو کسی نبی کو تبلیغ کے راستہ میں پیش آیا ہوگا۔

سیرت نبوی کے ایک انگریز مصنف (SIR WILLIAM MUIR) نے جو اسلام اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں اپنی خوردہ گیری اور عیب چینی میں مشہور ہے اس دور کی خوب تصویر کھینچی ہے اور مغربی مصنفین کے اس نقطۂ نظر کی تردید کی ہے کہ آپ کی

---

[1] حنفاء ان کو کہتے ہیں جو بت پرستی چھوڑ چکے تھے اور اپنی سمجھ کے مطابق ابراہیمی عقیدہ پر قائم تھے

بعثت سے قبل لاوا بالکل پک چکا تھا، محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے صرف اتنا کیا کہ بروقت اور صحیح جگہ پہونچ کر اس کو آگ دکھا دی، چنانچہ یہ لاوا پھوٹ پڑا، وہ کہتا ہے۔

"محمد کے عنفوانِ شباب کے زمانہ میں جزیرہ نمائے عرب بالکل ناقابلِ تغیر تھا، شاید اس سے زیادہ ناامیدی کی حالت کبھی اور زمانہ میں نہ پائی گئی۔"[1]

یہی مصنف دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"فروغِ عیسائیت کی معمولی کوششوں نے عرب کی اوپری سطح پر تھوڑا بہت معمولی ارتعاش تو پیدا کیا تھا، اور نسبتاً شدید تر یہودی اثرات بھی کبھی کبھی اندرونی سطح پر بھی نظر آجاتے تھے، لیکن مقامی بت پرستی اور اسماعیلیوں کی توہم پرستی کا تیز دھارا ہر سمت سے کعبہ کی جانب امنڈ کر آرہا تھا، اور اس کا واضح ثبوت مہیا کر رہا تھا کہ مکہ کا مذہب اور طریقۂ عبادت عربوں کے ذہن پر شدت کے ساتھ اور بلا شرکتِ غیرے قابض ہو چکا تھا۔"[2]

اسی تاریخی حقیقت کا باسورتھ اسمتھ (BOSWORTH SMITH) نے اختصار لیکن طاقت اور وضاحت کے ساتھ اظہار کیا ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"سب سے زیادہ فلسفیانہ رجحان رکھنے والا ایک مورخ کہتا ہے کہ ان تمام انقلابات میں جو تاریخِ انسانیت کی عمرانی تاریخ پر لافانی نقوش چھوڑے ہیں، ان میں کسی کا ظہور عقلِ انسانی کے لئے اتنا غیر متوقع نہ تھا جتنا کہ عرب کے اس مذہب کا۔"

---

[1] WILLIAM MUIR, THE LIFE OF MAHOMET, VOL. I (LONDON [illegible]) P. [illegible]

[2] WILLIAM MUIR, THE LIFE OF MAHOMET, VOL. I (LONDON [illegible]) P. [illegible]

ہمیں پہلی ہی نظر میں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ علم تاریخ (اگر علم تاریخ نام کی کوئی چیز ہے) اس سے قاصر ہے کہ وہ اسباب و علل کی ان کڑیوں کو تلاش کرے جن کا تلاش کرنا اس کا فرض ہے۔[1]

نبی کی ضرورت

چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں حالات کا بگاڑ اتنا بڑھ گیا تھا اور انسانیت کی پستی اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ اب وہ کسی مصلح، ریفارمر اور معلمِ اخلاق کے بس کی بات نہ تھی، مسئلہ کسی ایک عقیدہ کی تصحیح کا، کسی مخصوص عادت کو بدلنے کا یا کسی طریقۂ عبادت کی ترویج کا یا کسی معاشرہ کی سماجی اصلاح کا نہ تھا، اس کے لیے وہ مصلحین اور معلمینِ اخلاق کافی تھے جن سے کوئی زمانہ اور کوئی علاقہ کبھی خالی نہیں رہا۔ مسئلہ یہ تھا کہ جاہلیت کے مشرکانہ و بت پرستانہ اور انسانیت کے اس مہلک اور تباہ کن ملبہ کو کس طرح ہٹایا اور صاف کیا جائے جو صدیوں اور نسلوں سے تلے اوپر جمع ہو رہا تھا اور جس کے نیچے انبیاء کرام کی صحیح تعلیمات اور مصلحین کی مساعی اور خدمات دفن ہو چکی تھیں، پھر اس کی جگہ پر وہ نئی مستحکم اور عظیم الشان، وسیع و عریض اور بلند و بالا عمارت کیسے تعمیر کی جائے جس کے سایۂ رحمت میں ساری انسانیت کو پناہ مل سکے۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ انسان کیوں کر پیدا کیا جائے جو نئے پیش رو انسان ہر چیز میں جدا ہو اور ایسا نظر آئے کہ وہ ابھی ابھی وجود میں آیا ہے یا اس کو نئی زندگی ملی ہے

أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ	بھلا جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو
وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ	زندہ کیا اور اس کے لئے روشنی کر دی

---

[1] MOHAMMED AND MOHAMMEDANISM (LONDON, 1874) P. 19

فِي النَّاسِ كَمَن مَّثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ	جس کے ذریعے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے
لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا	کہیں اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو اندھیرے
(سورۂ انعام ۱۲۲)	میں پڑا ہوا ہو اور اس سے نکل نہ پا سکے۔

پس مثلاً فساد کی جڑ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کرنے اور بت پرستی کی بنیاد کو بیخ و بن سے اس طرح اکھاڑ پھینکنے کا نتیجہ جس کے بعد اس کا کوئی اثر اور نشان باقی نہ رہ جائے اور عقیدۂ توحید کو نفس انسانی کی گہرائیوں میں عملاً اس طرح پیوست اور راسخ کر دیا جائے کہ اس سے زیادہ تصور کرنا مشکل ہے اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی، عبادات کا رجحان، انسانیت کی خدمت اور حق پرستی کا جذبہ اور پھر غلط خواہش اور شوق کو لگام دینے کا ملکہ اور اس کی صلاحیت و قوت پیدا کی جائے مختصر یہ کہ اس انسانیت کو جو خود کشی پر آمادہ تھی بلکہ اس کے لئے پر تول چکی تھی اور اس جان لیوا داستان میں اس نے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی، مرتے مرتے دنیا و آخرت کے جہنم سے بچا لیا جائے اور اس کو اس شاہراہ پر ڈال دیا جائے جس کا پہلا سرا وہ حیات طیبہ ہے جو مخلوق میں اہل ایمان کو اس دنیا ہی میں نصیب ہوتی ہے اور دوسرا اور انتہائی سرا وہ ہمیشہ رہنے والی جنت ہے جس کا متقیوں کی زندگی اختیار کرنے والوں سے وعدہ کیا گیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے احسان کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو ارشاد فرمایا ہے اس سے بڑھ کر اس صورت حال کی کوئی تصویر و ترجمانی نہیں ہو سکتی ہے ارشاد ہے۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ	اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے
أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم	کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت
بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا	ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی
حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم	ہو گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ
مِّنْهَا (سورۂ آل عمران ۱۰۳)	چکے تھے تو خدا نے تم کو اس سے بچا لیا۔

بنی نوع انسان کی پوری تاریخ میں اس سے زیادہ نازک و پیچیدہ کام اور اس سے بڑی اور عظیم الشان ذمہ داری نظر نہیں آتی جو ایک نبی اور فرستادۂ الٰہی کی حیثیت سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ڈالی گئی نہ کوئی کوشش اتنی زرخیز ثابت ہوئی اور نہ کسی کی بار آوری جیسی آپ کی ہر کوشش ہوئی اتنی بار آور ثابت ہوئی جتنا آپ کی سعی انسانیت عامہ کے حق میں مفید و حیات بخش ثابت ہوئی یہ حیاتیات تاریخ کا سب سے بڑا عجوبہ اور دنیا کا سب سے بڑا معجزہ ہے اس کی شہادت مشہور فرانسیسی ادیب اور شاعر نے بھی بڑی قوت بلاغت اور وضاحت و صراحت کے ساتھ دی ہے یہ ادیب لامرٹائن LASIARTINEI ہے! وہ محبوبِ مجتبیٰ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

"کسی بھی انسان نے کبھی بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے لئے اتنا عظیم الشان مقصد متعین نہیں کیا اس لئے کہ یہ مقصد انسان کی طاقت سے باہر تھا اور وہ تھا اوہام و خرافات کو جو انسان اور اس کے خالق کے درمیان حجاب بن گئی تھیں زیر و زبر کرنا۔ انسان کو خدا کے حوالے کرنا اور خدا کو پھر انسان کو لوٹانا۔ اس زمانہ کی اصنام پرستی کے مادی خداؤں کی جگہ خدائے واحد کے پاکیزہ اور عقلی تصور کو از سر نو بحال کرنا یہ تھا وہ عظیم مقصد کسی انسان نے کبھی بھی ایسے عظیم الشان کام کا جو کسی صورت سے انسانی طاقتوں کے بس کا نہ تھا اتنے کمزور ذرائع کے ساتھ بیڑا نہیں اٹھایا۔"

آگے لکھتا ہے :۔

"اس سے بھی زیادہ آپ کا یہ کارنامہ ہے کہ آپ نے قربان گاہوں دیوتاؤں، مذاہب، تصورات، عقائد اور نفوس کے اندر ایک ہلچل ڈال دی یا ایک ایسی کتاب کی اساس بنا کر جس کا ہر حرف قانون کی حیثیت رکھتا ہے آپ نے ایک ایسی روحانی امت کی تشکیل

کا جوہر نسل اور زبان کی وحدت پر مشتمل ہے اس تحریک اسلامیہ کی امت کی خصوصیت
جسے محمدؐ نے پیچھے ورثہ میں چھوڑا ہے یہ ہے کہ اسے جھوٹے خداؤں سے سخت نفرت ہے
اور مادہ سے تیار شدہ خداؤں سے شدید نفرت اور یہی محبت اس خدائے واحد کی ذات کے ساتھ
انتقام پر مجبور کر دیتی ہے اور یہی محبت محمدؐ کے متبعین کی خوبیوں کی بنیاد بنتی ہے
اپنے عقائد کو ایک تہائی دنیا سے تسلیم کرا لینا بے شک آپ کا معجزہ تھا لیکن زیادہ صحیح
تو یہ ہے کہ یہ ایک فرد کا نہیں بلکہ عقل کا معجزہ ہے خدا کی توحید کے تصور کا اعلان
وہ بڑا اعلان کرنا جب کہ دنیا لاتعداد وحشی خداؤں کی پرستش کے بوجھ سے دبی ہوئی تھی
بذاتِ خود آپ کی کا معجزہ تھا محمدؐ کی زبان سے جیسے ہی اس عقیدہ کا اعلان ہوا تو بتوں کے
تمام قدیم معبدوں میں خاک اڑنے لگی اور ایک تہائی دنیا ایمان کی حرارت سے لبریز ہو گئی[1]

یہ موسوی اور مسیحی ہمہ گیر انقلاب و روحانیت کی حیات تازہ یا تعمیر نو کا عظیم الشان کام نئی رسالت کا طالب تھا جو تمام رسالتوں اور نبوتوں کی جگہ لے اور ایسے نبی کا خواستگار تھا جو ہدایت اور دین حق کا پرچم آفاقی عالم میں ہمیشہ کے لئے بلند کر دے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ	جو لوگ کافر ہیں یعنی اہل کتاب اور مشرک
الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنفَكِّينَ	وہ کفر سے باز رہنے والے نہ تھے جب تک
حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ رَسُولٌ	ان کے پاس کھلی دلیل نہ آتی یعنی خدا کے
مِّنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝	پیغمبر جو پاک اوراق پڑھتے ہیں جن میں
فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝ (سورۂ بینہ ۱-۳)	مستحکم آیتیں لکھی ہوئی ہیں۔

---

[1] ہسٹری آف ٹرکی LAMARTINE لامارٹن ہسٹوری ڈی لا ٹرکی HISTOIRE DE LA TURQUIE جلد دوم ص ۲۷۶-۲۷۷ پیرس (۱۸۵۴ء) ماخوذ از اسلام ان دی ورلڈ تصنیف ڈاکٹر زکی علی لاہور (۱۹۴۷ء)

جزیرۃ العربؑ

جزیرۃ العرب کے حدود

جزیرۃ العرب اپنے طول و عرض میں دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ نما ہے علمائے عرب مجازاً اس پر جزیرۃ العرب کا اطلاق کرتے ہیں۔ اس کے تین طرف پانی ہے یہ ملک ایشیا کے جنوب مغرب میں واقع ہے اس کے مشرق میں خلیج عرب ہے جسے یونانی خلیج فارس کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کے جنوب میں بحر ہند ہے اور اس کے مغرب میں بحر احمر ہے جیسا کہ ان جدید نقشوں میں دکھایا جاتا ہے اور یونانی و لاطینی اصطلاح میں اس کو خلیج عرب

لہ ہم نے اس حصہ میں قارئین سیرت کے لئے ایسی بنیادی معلومات کا انتخاب کیا ہے جن کا جاننا ضروری ہے جیسے اس خطے کی طبعی حالت و جغرافیائی اقوام و مذاہب [illegible] یہاں کا نظام اس کے باشندوں کے رجحانات وغیرہ۔ اس طرح سیرت کا مطالعہ کرنے والا ان احوال سے بالکل ناواقف نہیں رہے گا جس میں کائنات کی عظیم مہم انجام دی گئی۔ یہ مضمون ان قدیم و جدید کتابوں سے ماخوذ ہے جو جزیرۃ العرب پر لکھی گئی ہیں ہم نے خاص طور پر ڈاکٹر جواد علی کی کتاب "المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام" (۱۔۸) سے زیادہ استفادہ کیا ہے جس میں سب سے زیادہ تفصیل کا عمل وہ کتابیں ہیں جو جزیرۃ العرب کے جغرافیہ پر لکھی گئی ہیں یا جو تاریخ عرب اور تاریخ ادب عربی سے متعلق ہیں ان کی تعداد بہت ہے۔

لہ ملک عرب کے لئے جزیرۃ العرب کا استعمال قدیم زمانہ سے ہے یہ حقیقتاً قدیم زمانہ میں جزیرہ اور جزیرہ نما کے درمیان فرق کرنے اور ان کے لئے علیحدہ الفاظ ہونے کا رواج نہ تھا بعض اہل علم نے اس کو جدید جغرافیائی اصطلاح میں جزیرہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جس کا ایک نمونہ محمد جعفری کی کتاب "تاریخ الاسلام" [illegible] حصہ دوم میں دیکھا جا سکتا ہے لیکن یہ کوشش تکلف سے خالی نہیں اور اس میں جزیرۃ العرب کے حدود کو بہت دور تک لے جانے کی ضرورت پڑی ہے۔

جزیرہ نمائے عرب
ایران
عمان
الربع الخالی
سعودی عرب

(SINUS ARABICUS) کے نام سے نمایاں کیا جاتا ہے اور قدیم عربی کتابوں میں بحر قلزم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس کی شمالی حد ایک مفروضہ سرحدی خط ہے جو علمائے عرب کی اصطلاح میں (خلیج عقبہ سے خلیج عرب یا شط العرب کے دہانے تک کھنچتا ہے۔

مسلمانوں نے جزیرۃ العرب کو پانچ قسموں پر تقسیم کیا ہے (۱) حجاز جو ایلہ (عقبہ) سے یمن تک ہے اور ان کی رائے میں حجاز اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اس پہاڑی سلسلے پر مشتمل ہے جو تہامہ کو (جو بحر احمر کے ساحل کی نشیبی زمین ہے) نجد سے الگ کرتا ہے (۲) تہامہ جس کا معنی بیابان بطحا (۳) یمن (۴) نجد۔ یہ وہ مرتفع حصہ ہے جو حجاز کے پہاڑوں سے شروع ہو کر مشرق میں صحرائے بحرین تک چلا جاتا ہے یہ وسیع مرتفع علاقہ ہے جس میں بہت سے ریگستان اور پہاڑ واقع ہیں۔ (۵) عروض! اس کے مشرق میں بحرین اور مغرب میں حجاز ہے۔ اسے عروض یمن اور نجد کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں یا اسے یمامہ بھی کہا جاتا ہے۔[1]

جزیرۃ العرب کے طبعی حالات اور اس کے باشندے

اس پورے جزیرہ نما پر صحرائیت کا غلبہ ہے، اور طبعی عوامل اور ارضیاتی حوادث اور اپنے جغرافی جائے وقوع کے سبب اس پر خشکی غالب ہے اسی وجہ سے ماضی اور زمانۂ حال میں اس کے باشندوں کی تعداد بہت کم رہی ہے اور متمدن معاشرے اور بڑی مرکزی حکومتیں وجود میں نہ آسکیں بدویت اور اس کے دیہاتی رنگ انفرادیت کے شدید رجحانات قبائل کے جنگ و جدال کے سبب متمدن سرسبز علاقوں اور ان جگہوں میں بہت کم

---

[1] راویانِ جغرافیہ اس تقسیم کی سب سے پرانی روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ تک پہنچتی ہے۔
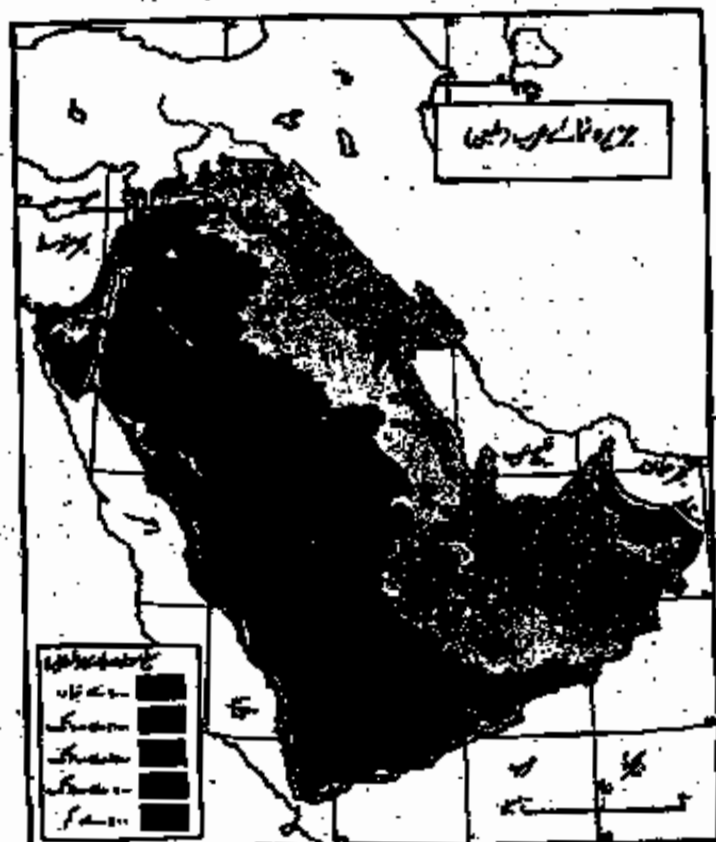
رہ گیا جہاں اچھی بارش ہوتی یا سوتے اور چشمے پھوٹتے تھے یا جہاں پانی سطح زمین سے
قریب ہوتا اور اس لیے کنویں کھودے جا سکتے تھے اس لیے کہنا چاہیے کہ جزیرۃ العرب کی
زندگی کی سرگرمی پانی کی بدولت باقی رہتی تھی چنانچہ قافلے اسی کا رخ کرتے اور اسی کی
تلاش میں رہتے اور فطرت اعراب کو ہر جگہ سے لا کر شاداب علاقوں میں جمع کر دیتی تھی۔
وہ کسانوں کی طرح زمین کے ایک جگہ چپکے نہیں رہتے تھے بلکہ کسی سرزمین پر وہ اسی وقت
تک قیام پذیر رہتے تھے جب تک کہ وہاں جانوروں کے لیے گھاس چارہ اور ان کے لیے
پانی رہتا تھا اور جب یہ سہولت ختم ہو جاتی تو وہ نئی جگہوں کی تلاش میں چل پڑتے تھے۔

اس وجہ سے ان کی زندگی جفاکشی یا بدوی کا نمونہ تھی اور ان کی سوسائٹی قبیلہ
کی شکل اختیار کر لیتی قبیلہ ایک بدوی کے لیے حکومت و قومیت کے مرادف ہوتا تھا اور
یہ قبائلی زندگی راحت طلبی اور استقرار و استحکام سے نا آشنا ہوتی اور صرف قوت کی زبان
سمجھتی ہے ایسی زندگی تھی جو انسانوں کے لیے مشقت و مصیبت ہی لاتی تھی اور پڑوس
کی متمدن آبادیوں کے لیے بھی خطرہ بنی رہتی تھی چنانچہ وہ آپس میں بھی لڑتے رہتے تھے اور جب
فرصت پا کر متمدن آبادی سے برسر پیکار ہو جاتے تھے لیکن دوسرے لحاظ سے ایک عرب
اپنے قبیلے کے آداب و روایات کے سلسلے میں بڑا وفادار اور مخلص ہوتا تھا وہ موقع پر ایسا
شریف النفس میزبان ہوتا جو جان کے تمام فرائض بخوشی انجام دیتا جنگی معاہدوں کا
پابند ہوتا دوستی کا حق ادا کرتا اور رسم و رواج کا آخری حد تک احترام کرتا ان تمام
خصوصیات کی گواہی ان کے شعر و ادب حکم و امثال اور اقدار و اطوار سے بکثرت ملتی ہے۔

ایک عرب مساوات کا دلدادہ حریت کا عاشق حقیقت پسند خیال اور عملی انسان
ہوتا تھا وہ ہلکی اور پست حرکتوں سے پرہیز کرتا تھا وہ اپنی سی معمولی زندگی اور بدویت

پر نہ صرف راضی بلکہ نازاں اور اپنے مقدر پر خوش اور مطمئن تھا۔ مذہب سے ان کا علاقہ اکثر کمزور ہوتا تھا۔ ان کا ایمان اپنے قبائلی رسوم اور آبائی روایات پر اس سے کہیں زیادہ پختہ ہوتا تھا۔ ان کا اخلاقی نصب العین ان شریفانہ و مردانہ صفات سے عبارت تھا جسے وہ لفظ مروت سے تعبیر کرتے اور اپنے شعر و ادب میں جن کے گیت گاتے اور کلمہ پڑھتے ہیں۔

تمدنی و ثقافتی مراکز

ان جگہوں میں جہاں بارش چشمے یا کنوؤں کا پانی وافر طور پر ہوتا وہاں قریوں اور دیہاتوں اور موسمی بازاروں اور میلوں کی شکل میں ایک تمدن وجود میں آجاتا تھا۔ ان جزیروں کا عربوں کی زندگی پر عمومی اثر پڑتا تھا۔ زندگی کے ان مرکزوں میں وہ معاشرے اور ماحول پیدا ہوتے جن کا خاص رنگ اور مستقل طرز ہوتا جن میں آپ ہی صنعتوں اور پیشوں اور اس معاشرہ کے اقتصادی حالات کا الگ الگ رنگ نمایاں ہوتا تھا چنانچہ مکہ میں ایک خاص معاشرہ تھا جس کا امتیاز بالکل الگ تھا اسی طرح اہل حیرہ اور اہل یثرب کے معاشرے اپنی اپنی خصوصیات رکھتے تھے یمن کا معاشرہ عرب معاشروں میں اپنے مخصوص حالات، قدیم تمدنی تاریخ اور بعض سیاسی وجوہ سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ اور غلہ کی پیداوار، جانوروں کی پرورش، معدنیات سے استفادہ، محلوں اور قلعوں کی تعمیر میں بہت بڑھا ہوا تھا۔ صنعتوں اور ضروریات زندگی کے لئے وہ باہر سے سامان اور آلات درآمد کرتا اور عراق، شام اور افریقہ سے تجارتی تعلقات بھی رکھتا تھا۔

اہل عرب کے طبقات اور قسمیں

راویوں اور مؤرخوں کا قدیم عربوں کی اس تقسیم پر تقریباً اتفاق ہے کہ وہ تین قسموں

پر مشتمل ہے (۱) عرب بائدہ (جو اسلام سے پہلے ختم ہو چکے تھے) (۲) عرب عاربہ (بنو قحطان جو عرب بائدہ کے بعد ہوئے) (۳) عرب مستعربہ (حضرت اسماعیلؑ کی اولاد جو حجاز میں آباد ہوئی) وہ نسب کے لحاظ سے اہل عرب کی دو قسمیں کرتے ہیں۔

(۱) قحطانی جن کی آبادی کا ابتدائی مرکز یمن تھا اور (۲) عدنانی جو پہلے حجاز میں آباد تھے۔ اسی طرح ماہرین انساب عدنان کی دو شاخیں بتاتے ہیں، ایک ربیعہ دوسری مضر۔ قحطانی و عدنانی قدیم زمانہ سے ایک دوسرے کے رقیب و حریف تھے۔ اسی طرح ربیعہ و مضر کے درمیان بھی صدیوں سے عداوت و مقابلہ چلا آ رہا تھا۔ ماہرین انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ قحطانی اصلی اور زیادہ قدیم ہیں اور عدنانی ان کی شاخ ہیں جنھوں نے ان سے عربی سیکھی اور پھر جیسے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد نے حجاز میں ہجرت کے بعد اپنا لیا۔ حضرت اسمٰعیل عرب مستعربہ یعنی عدنانیوں کے جد امجد ہیں۔

اہل عرب انساب کا خاص خیال رکھتے اور اسے بڑی اہمیت دیتے ہیں جس کا اعتراف عجمی اہل نظر نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ ایرانی سپہ سالار اعظم رستم نے اپنے درباریوں کو (جب وہ مسلمانوں کے سفیر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے پھٹے کپڑوں اور خستہ حالی کے سبب حقارت کی نظر سے دیکھ رہے تھے) تنبیہ کی کہ تم عجیب احمق ہو، عرب کھانے اور لباس کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ وہ اپنے حسب نسب کی حفاظت کرتے ہیں[۲]۔

---

[۱] عصر حاضر کے بعض محققین کی رائے ہے کہ اصل عرب عدنانی ہیں اور وہی پہلے عرب عاربہ ہیں جبکہ اکثر مورخین کا خیال اس کے برعکس ہے۔ ان محققین کا کہنا ہے کہ یہ تقسیم جاہلی نصوص پر مبنی نہیں بلکہ اسلامی دور میں لکھی ہوئی کتابوں سے ماخوذ ہے اور اس کی بنیشتر روایتیں ان راویوں کے اقوال پر مبنی ہیں جو قحطانی اور یمنی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ واللہ اعلم۔ [۲] البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۷ ص

اہم قبائل کے مقامات
قبائل کے مقامات ۔ بڑے شہر

لسانی وحدت

اس وسیع ملک کے لئے (جو ایک برِ صغیر کے برابر ہے) یہ بات ذرا بھی تعجب خیز نہ ہوئی کہ اس میں زبانوں کی کثرت اور تنوع ہوتا کیونکہ قبیلوں کے درمیان خاصے طویل فاصلے ہیں اور اس لئے بھی کہ جنوبی علاقے کے لوگ شمالی علاقے کے لوگوں سے اور مشرقی علاقے کے لوگ مغربی علاقے کے لوگوں سے مشکل سے ملتے تھے، قبائلی عصبیت اور نسلی احساس برتری کا بھی شکار رہتے تھے اور روم و ایرانی سرحدوں کے قریب بسنے والے عرب قبائل ان کی زبانوں سے قدرتاً کم و بیش متاثر بھی تھے اور یہ ناگزیر بھی تھا چنانچہ انھیں اسباب کی وجہ سے وسطی یورپ اور ہندوستان کے برِ اعظم میں زبانوں کی حیرت انگیز حد تک کثرت ہے، دستورِ ہند میں تسلیم شدہ قومی زبانوں کی تعداد پندرہ ہے، اس میں بعض مستقل زبانیں بھی ہیں جن کے بولنے والوں کو ترجمان کی ضرورت پڑتی ہے یا انگریزی سے کام لینا پڑتا ہے۔

لیکن جزیرۃ العرب کا اپنی وسعت اور قبائل کی کثرت کے باوجود شروع سے طرۂ امتیاز رہا ہے کہ ظہورِ اسلام سے اس وقت تک اس کی ایک ہی مشترک زبان عربی ہے جو ہمیشہ سے اس جزیرہ کے رہنے والے بدوی اور متمدن قحطانی و عدنانی لوگوں کے بول چال اور باہمی تعلقات کی زبان رہی ہے جس میں اگرچہ لہجوں اور مقامی بولیوں کا قدرتی اختلاف موجود ہے (جو فلسفۂ زبان، جغرافی اور طبیعی پس منظر کے رجحانات سے پیدا ہوتا ہے، فاصلوں سے لہجوں کا فرق پیدا ہونا ناگزیر بھی ہے) تاہم اس میں ایک لسانی وحدت بھی موجود رہی ہے، دعوتِ اسلامی کے لئے سہولت اشاعتِ اسلام میں

مرصعت اور پھیلی ہوئی اکائیوں کو فصیح (قرآنی) عربی زبان میں مخاطب کرنے اور اس سے متاثر کرنے میں اس نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

جزیرۃ العرب اقوام و ملل کی تاریخ میں

آثار قدیمہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جزیرۃ العرب میں قدیم حجری یا عہد [illegible] سے انسانی آبادی کا نشان ملتا ہے اور جو سب سے پرانے آثار پائے گئے ہیں اس عہد حجری کے اولین زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ عربوں کا ذکر تورات میں بھی آیا ہے جس سے عبرانیوں کے عربوں سے تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ تورات میں عربوں کا ذکر اس کی تاریخ ۱۰۰۰ ق م سے متعلق ہے۔ اس طرح تلمود میں بھی عربوں کی طرف اشارے ہیں۔ جوزیفس فلاویس کی کتاب میں (جو ۳۷ تا ۱۰۰ء میں زندہ تھا) عربوں کے متعلق قیمتی معلومات اور نبطیوں کے حالات ملتے ہیں۔ بعض غلطیوں اور غلط فہمیوں کے باوجود ان قدیم تحریروں میں پائی جاتی ہیں۔ اسلام سے پہلے لکھی جانے والی یونانی و لاطینی کتابوں میں بھی تاریخی معلومات، واقعات اور اہم جغرافی معلومات دستیاب ہوتے ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے عربی قبائل کا نام بھی ملتا ہے کہ اگر یہ کتابیں نہ ہوتیں تو ہم ان سے واقف نہیں ہو سکتے تھے۔ اسکندریہ ان اہم مرکزوں میں شمار ہوتا تھا جہاں عربوں کے حالات اور عادات اور ملک کی پیداوار کی کیفیت معلوم کرنے کا خاص اہتمام تھا تاکہ وہاں کی چیزوں کو بحیرۂ روم کے ساحل پر واقع ملکوں کے تاجروں تک پہونچایا جا سکے۔

عربوں کا ذکر کرنے والے سب سے قدیم یونانی اخیلس (۵۲۵ – ۴۵۶ ق م) اور ہیروڈوٹس (۴۸۴ – ۴۲۵ ق م) ہیں۔ ان کے علاوہ عہد قدیم کے کچھ اور مصنفین بھی ہیں

جن کے بیانات میں عربوں اور بلادِ عرب کی طرف اشارے موجود ہیں۔ ان میں بطلیموس کا نام نمایاں ہے جو اسکندریہ میں دوسری صدی عیسوی میں ہوا ہے، اور جس نے ریاضی میں "المجسطی" لکھی ہے جو عربی و ریاضیات کی ایک معروف کتاب ہے۔ ایسی مآخذ میں بھی عرب جاہلیت اور عرب اسلام سے متعلق خاصا مواد ہے اگرچہ وہ زیادہ تر مسیحیت، اس کی اشاعت اور اس کے مرکزوں کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔

تورات میں جن عربوں کا ذکر آیا ہے وہ اعراب یعنی بدوی عرب ہیں اسی لئے کہ اس میں عرب بادیہ ہی کے اوصاف کا ذکر ہے۔ اسی طرح یونانیوں، رومیوں کی کتابوں اور اناجیل میں جہاں ایسی صفات کا ذکر ہے، ان سے مراد بدوی عرب ہی ہیں جو رومن امپائر اور یونانی سرحدوں پر یورش کرتے رہتے، قافلوں کو لوٹتے اور تاجروں اور مسافروں سے ٹیکس وصول کرتے رہتے تھے۔ سسلی کے ڈیوڈورس نے عربوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ آزادی کے عاشق کھلی فضا میں زندگی گذارنے والے آزادوارانے اور آزادیٔ مطلق کے قائل ہیں۔ اسی لئے ہیروڈوٹس نے ان کے بارے میں لکھا ہے "وہ ہر اس قوت کا مقابلہ کرتے ہیں جو انھیں غلام بنالے اور ذلیل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔" آزادی عربوں کا وہ امتیاز ہے جس کے لئے وہ یونانی اور لاطینی اہل قلم کی نظروں میں محترم رہے ہیں۔

اس طرح عرب و ہند کے تعلقات ایک دوسرے سے واقفیت اور تجارتی و ثقافتی لین دین بہت پرانا ہے اور اسلام اور اس کی فتوحات سے بہت پہلے کی چیز ہے۔ ایشیائی ممالک میں ہندوستان عربوں سے سب سے زیادہ واقف اور جغرافی و اقتصادی لحاظ سے اس کے قریب تھا جیسا کہ ہندوستانی اور عربی مآخذ اور جدید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے[1]۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "عرب و ہند کے تعلقات" از مولانا سید سلیمان ندوی جو اس موضوع پر سب سے معتبر اور مفصل کتاب ہے۔

نبوت اور آسمانی مذاہب کا جزیرہ عرب کا تعلق

جزیرۃ العرب بہت سی نبوی دعوتوں اور انبیاء کا گہوارہ رہا ہے قرآن کہتا ہے:۔

وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنذَرَ قَوْمَهُ	اور قوم عاد کے بھائی (ہود) کو یاد کرو
بِالْأَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ	جب انھوں نے اپنی قوم کو سرزمین احقاف
مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ	میں ہدایت کی اور ان سے پہلے اور
أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنِّي أَخَافُ	پیچھے بھی ہدایت کرنے والے گذر چکے تھے
عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝	کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو مجھے
(سورۃ الاحقاف ۔۲۱)	تمہارے بارے میں بڑے دن کے عذاب
	کا ڈر لگتا ہے۔

اس آیت میں حضرت ہود مراد ہیں جو عاد کی طرف بھیجے گئے ہیں اور مورخین کے قول کے مطابق عاد کا تعلق عرب بائدہ سے تھا۔ اور وہ "احقاف" میں رہتے تھے حقف ریت کے طویل ٹیلے کو کہتے ہیں۔ عاد کی بستیاں جزیرہ کی جنوبی بلندیوں پر تھیں جو آج کل "ربع خالی" کے جنوب مغرب میں حضرموت کے قریب واقع ہے اب ان میں تاب زندگی ہے نہ کوئی آبادی ہے جب کہ ایک زمانہ میں وہ سرسبز و شاداب علاقہ تھا اور گلزار شہر تھے جن میں عاد جیسی جبار قوم آباد تھی بالآخر اللہ نے تیز آندھی سے ہلاک کر دیا جس نے انھیں ریت کے طوفان میں ڈھک لیا تھا۔[1]

آیت یہ بھی بتا رہی ہے کہ حضرت ہود اس علاقے میں آنے والے پہلے اور آخری نبی

---

[1] تفصیل کے لئے احقاف کی آیت ۲۴ ـ ۲۵ سامنے رہے۔

نہ تھے ان سے پہلے اور بعد بھی انبیاء آتے رہے تھے اس لئے قرآن کہتا ہے وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ"

اسی طرح قوم ثمود کے نبی حضرت صالحؑ کی بعثت بھی جزیرۃ العرب میں ہوئی۔ ثمود الحجر میں رہتے تھے جو تبوک اور حجاز کے درمیان ایک بستی ہے حضرت اسمٰعیلؑ پیدائش کے بعد ہی مکہ آ گئے تھے وہ وہیں رہے اور وہیں انتقال فرمایا اور اگر جزیرہ کو وسعت دے کر مدین کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے تو حضرت شعیبؑ بھی عرب ہی ثابت ہوتے ہیں اس لئے کہ مدین شام کے علاقے میں ارض عرب کے حدود پر تھا مورخ ابوالفداء لکھتا ہے:-

"اہل مدین عرب تھے اور مدین میں رہتے تھے جو ارض معان سے قریب اور شام کے ان اطراف میں تھا جو حجاز سے ملے ہوئے ہیں اور بحیرۂ لوط کے نزدیک تھا اور قوم لوط کے بعد ہی ان کا زمانہ ہے"

عرب کی سرزمین بہت سے انبیاء و مرسلین کا مرجع و ملجا تھی جن پر ان کی زمین اپنی کشادگی کے باوجود تنگ کر دی گئی تھی اور وہ اپنے وطن میں بے دین کر دیے گئے تھے چنانچہ ان حضرات نے اس دور دراز سرزمین کا انتخاب کیا جو جابر بادشاہوں اور ظالم حاکموں کے اثر سے دور تھی جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ہوا اور حضرت موسیٰؑ کے ساتھ مدین میں پیش آیا اس کے علاوہ بہت سے مذاہب کو جب اپنے مرکزوں میں پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملا تو وہ اس جزیرہ میں آ کر آباد ہو گئے چنانچہ یہود کی ایک بڑی جماعت رومیوں کے ظلم سے تنگ آ کر یمن و یثرب آ گئی اور نصرانیت نے بھی حمیر و روم کے ظلم و سفاکی سے بھاگ کر نجران میں پناہ لی۔[1]

۱؎ مضمون کے اس آخری حصہ میں ہم نے شیخ محمد ابو زہرہ کی کتاب خاتم النبیین جلد اول اور [illegible] سے استفادہ کیا ہے۔

بعثت سے پہلے

حضرت اسماعیلؑ مکہ میں

سیدنا ابراہیم علیہ السلام مکہ کی طرف آئے جو خشک اور بے آب و گیاہ پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا، اس میں پانی، کھیتی، غلہ اور ضروریات زندگی میں سے کوئی ایسی چیز موجود نہ تھی جو انسانی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے، ان کے ساتھ ان کی بیوی ہاجرہ اور صاحبزادے اسماعیل بھی تھے، یہ سفر دراصل دنیا میں پھیلی ہوئی بت پرستی سے ہجرت اور ایک ایسے مرکز کی تاسیس کے لئے کیا جا رہا تھا جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے اور دوسرے لوگوں کو بھی اس کی دعوت دی جائے، اور یہ مرکز ہدایت کا ایک روشن مینار انسانوں کی جائے پناہ و جائے امن اور توحید حنیفیت اور دین خالص کی دعوت کا نقطۂ آغاز بن سکے[1]۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عمل خالص کو قبول فرمایا اس خشک وادی میں خوب برکت عطا فرمائی اور اس چھوٹے سے مبارک خاندان کے لئے جو صرف ماں بیٹے پر مشتمل تھا (جن کو حضرت ابراہیم اس دور افتادہ اور بے آب و گیاہ صحرا میں خدا کے بھروسہ پر چھوڑ گئے تھے) پانی کا ایک چشمہ جاری فرما دیا جو چشمۂ زمزم کہلایا اور اللہ تعالیٰ نے اس میں بہت برکت دی۔

---

[1] قرآن مجید (سورۂ بقرہ و سورۂ ابراہیم)

اسماعیلؑ جب کچھ بڑے ہوئے اور چلنے پھرنے اور دوڑنے بھاگنے لگے تو حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ کی محبت پر ان کی محبت کو قربان کرنا چاہا اور ان کو ذبح کرنے کا ارادہ کیا اس لئے کہ خواب میں ان کو اس کی ہدایت کی گئی تھی سعادت مند فرزند نے ارشاد الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور خوش دلی و اطمینان کے ساتھ اس پر تیار ہوگئے لیکن اللہ تعالیٰ نے ذبح عظیم (بڑی قربانی) کو اس کا فدیہ بنا دیا اور ان کو محفوظ و مامون رکھا تاکہ دعوت الی اللہ میں وہ اپنے والد کا ہاتھ بٹا سکیں اور خاتم النبیین اور سید المرسلین کے جد امجد بنتے نیز اس امت مسلمہ کے مورث اعلیٰ بننے کا شرف ان کو حاصل ہو جس پر دعوت الی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کی ذمہ داری قیامت تک کے لئے ڈالی گئی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ مکہ واپس ہوئے اور باپ بیٹے دونوں نے مل کر اللہ کے گھر کی تعمیر شروع کی ان کی دعا یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ اس گھر کو قبول کرے اور اس میں برکت عطا فرمائے اور وہ دونوں اسلام پر جئیں اور مریں اور ان کی وفات کے بعد ان کی اولاد کو یہ دولت اور میراث حاصل ہو وہ اس دعوت کی صرف حفاظت اور پاسبانی ہی نہ کریں اور ہر خطرہ بلکہ ہر نگاہ بد اور راستے کے ہر کانٹے اور پتھر سے اس کو دور رکھیں بلکہ اس دنیا میں اس کے داعی اور علم بردار بنیں اس کو ہر چیز پر ترجیح دیں اس کی راہ میں کسی قربانی سے دریغ نہ کریں یہاں تک کہ یہ دعوت سارے عالم میں پھیل جائے اور اللہ تعالیٰ ان کی اولاد میں ایک ایسا نبی پیدا کرے جو اپنے جد اعلیٰ ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کو از سر نو زندہ کرے اور اس کام کی تکمیل کرے جس کو وہ شروع

لہ قرآن مجید سورۂ صافات۔

کررہے تھے یہ۔

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

(سورہ بقرہ ۔ ۱۲۷-۱۲۹)

اور جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی بنیادیں اونچی کررہے تھے تو دعا کئے جاتے تھے کہ اے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار بنائے رکھیو اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک گروہ کو اپنا مطیع بنائے رہیو اور پروردگار ہمیں ہمارے طریق عبادت بتا اور ہمارے حال پر (رحم کے ساتھ) توجہ فرما بیشک تو توجہ فرمانے والا مہربان ہے۔ اے ہمارے پروردگار ان لوگوں میں انہیں میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیجیو جو ان کو تیری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کرے اور کتاب اور دانائی سکھایا کرے اور ان کے دلوں کو پاک صاف کیا کرے بیشک تو غالب اور صاحب حکمت ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہی دعا فرمائی تھی کہ یہ شہر ہمیشہ امن و سکون کا گہوارہ رہے اللہ تعالیٰ ان کی اولاد کو بتوں کی پرستش سے محفوظ رکھے جس سے زیادہ

نفرت و کراہیت ان کو کسی چیز سے نہ تھی اور جس سے بڑا خطرہ وہ اپنی آل و نسل کے لئے کسی چیز کو نہ سمجھتے تھے اس لئے کہ انبیاء کرام کے بعد ان کی قوموں کا انجام ان کی نظر کے سامنے تھا اور انھوں نے دیکھا تھا کہ ان کی مسلسل کوششوں اور عظیم قربانیوں کے باوجود یہ قومیں کس طرح ان کے راستہ سے ہٹ گئیں اور ان کے دنیا سے تشریف لے جانے پر شیطان نفس پرستوں، اپنے اپنے وقت کے دجالوں، بتوں کے پجاریوں اور جاہلیت کے علمبرداروں نے ان کو شکار کیا اور لقمۂ تر بنا لیا۔

انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور اس تمنا کا بھی اظہار کیا کہ ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد اس دعوت اور جہاد کے برابر تسلسل قائم رکھے اور ان کی بت شکنی، شرک و بت پرستی سے نفرت و بیزاری، راہِ حق میں مسلسل محنت اور جد و جہد، اپنے بت تراش و بت فروش والد کے مقابلہ میں ان کی صف آرائی، حق گوئی و دل سوزی اور ان کی ہجرت اور ترکِ وطن کو ہمیشہ یاد رکھے اور یہ محسوس کرے کہ انھیں نازک دور اور اہم کام کے لئے اس ویرانے اور پتھریلی و سنگلاخ زمین (جو کھیتی کے لائق بھی نہ تھی، تہذیب و تمدن کی پرورش اور ترقی کا اس میں کوئی سامان تھا) کے انتخاب کا راز کیا ہے اور دنیا کے بڑے بڑے آباد و گلزار شہروں کو تجارت و زراعت، صنعت و حرفت کے مرکزوں پر جہاں ہر طرح کے اسبابِ عیش اور سامانِ راحت موجود تھے اس دور افتادہ و گمنام خطہ کو کیوں ترجیح دی گئی ہے؟

انھوں نے اپنے اللہ سے یہ بھی دعا کی کہ ان کی اولاد کو محبوبیت و دلآویزی، مقبولیت و شہرت اور مرجعِ خلائق اور مرکزِ آفاق بننے کا شرف حاصل ہو، لوگوں کے دل بے ساختہ ان کی طرف کھنچیں اور وہ دنیا کے کونے کونے سے آکر اپنی محبت و عقیدت کا خراج ان کو پیش کریں، رزق خود بخود ہر طرف سے ان کو پہنچتا ہے اور میوے اور ہر طرح کے

قرآنی دعاؤں کی بخششوں کے بہترین نتائج اور فوائد و منافع ان کو حاصل ہوں:-

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ؕ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ رَبَّنَاۤ اِنِّیْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْۤ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ ۝

(سورۂ ابراہیم ۳۵-۳۷)

اور جب ابراہیم نے دعا کی کہ میرے پروردگار اس شہر کو (لوگوں کے لئے) امن کی جگہ بنادے اور مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے کہ بتوں کی پرستش کرنے لگیں بچائے رکھ۔ اے پروردگار انہوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کیا ہے سو جس شخص نے میرا کہا مانا وہ میرا ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔ اے پروردگار! میں نے اپنی اولاد کو میدان (مکہ) میں جہاں کھیتی نہیں تیرے عزت والے گھر کے پاس لا بسایا ہے اے پروردگار تاکہ یہ نماز پڑھیں تو لوگوں کے دلوں کو ایسا کردے کہ ان کی طرف جھکے رہیں اور ان کو میووں سے روزی دے تاکہ تیرا شکر کریں۔

قبیلۂ قریش

یہ ساری دعائیں اور تمنائیں ایک ایک کرکے پوری ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے

ان دونوں کی اولاد میں برکت عطا فرمائی۔ یہ ابراہیمی عرفی خاندان خوب برگ و بار لایا اور پھیلا۔ اسماعیل علیہ السلام نے قبیلہ جرہم[1] میں رشتہ کیا جو عرب عاربہ میں شمار کیا جاتا تھا۔ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں بہت برکت ہوئی یہاں تک کہ انہیں میں عدنان پیدا ہوئے جن کا سلسلۂ نسب حفظ و احتیاط اور تواتر و اجماع کے لحاظ سے انساب عرب میں سب سے زیادہ روشن اور مستند ہے۔

عدنان کی بھی کثیر اولاد ہوئی جن میں معد بن عدنان زیادہ مشہور ہیں۔ معد کی اولاد میں نضر نامور ہوئے اور ان کی اولاد میں فہر بن مالک نے خاندان کا نام روشن کیا۔ فہر بن مالک بن النضر کی اولاد کا نام قریش پڑ گیا۔ اور یہ نام ان کے سارے ناموں پر اس طرح غالب آیا کہ قبیلہ قریش کہلانے لگا۔ اہل عرب نے قریش کی عالی نسبی، سیادت و امارت، فصاحت و بلاغت، قوت بیانیہ، اخلاق عالیہ، شجاعت و حوصلہ مندی پر پورا اتفاق کر لیا اور اب یہ ایک ایسی حقیقت بن گئی جو ضرب المثل کی طرح مشہور اور اختلافات سے بالاتر سمجھی گئی ہے اور اس میں دو رائیں نہیں پائی جاتیں۔[2]

قصی بن کلاب اور ان کی اولاد

فہر کی اولاد میں قصی بن کلاب پیدا ہوئے اور مکہ کی سرداری قبیلہ جرہم کے ہاتھ میں تھی یہاں تک کہ شرافت و حرمت بیت اللہ کے نگراں اور محافظ تھے ان پر غالب آگئے،

---

[1] کہا جاتا ہے کہ قبیلہ جرہم دوسرے بڑے قبیلے ہیں جس نے مکہ میں اقامت کی اور اس کا سبب پانی کے اس زمزم ہونے والے سرچشمہ کا وجود تھا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے لڑکے اسماعیل کو اس وادی میں چھوڑ کر ہجرت فرمائی اس وقت یہ قبیلہ یہاں موجود تھا۔

[2] تفصیل کے لئے دیکھئے سیرت ابن ہشام ج ۱۔ اور سیر و انساب کی دیگر کتابیں۔

اس کے بعد قصیٰ بن کلاب کا ستارۂ اقبال بلند ہوا اور ان کی صلاحیتیں اور خوبیاں سامنے آئیں اور بیت اللہ کی خدمت کا منصب ان کے حوالے کیا گیا قریش کے سب لوگ افراد ان کے ساتھ مل گئے اور انھوں نے قبیلہ خزاعہ کو مکہ سے بے دخل کرکے اس کا نظم و انتظام اپنے ہاتھ میں لیا قصیٰ بن کلاب بہت ہر دل عزیز و مقبول سردار تھے بیت اللہ کی دربانی و پاسبانی ان کے ذمہ تھی اس کی کلید ان ہی کے قبضہ میں تھی اور ان کی اجازت کے بغیر کوئی اس میں داخل نہ ہو سکتا تھا اسی کے ساتھ زمزم کا سقایہ اور رفادہ[1] یعنی حجاج کی سالانہ ضیافت، ندوہ یعنی ان کی وہ مجلس جو مختلف مشوروں اور لڑائیوں میں پرچم کے علم بردار اور لشکر کے قائد کے انتخاب وغیرہ کے لئے حسب ضرورت ہوتی تھی سب چیزیں ان کے دائرہ اختیار میں تھیں اور اس طرح مکہ کا سارا شرف اور ہر قسم کی فضیلت ان کو حاصل ہو گئی تھی۔

ان کی اولاد میں عبد مناف نے زیادہ عزت و وجاہت حاصل کی ان کے سب سے بڑے صاحبزادے ہاشم تھے اور سقایہ و رفادہ کا یہ کام ان کے ذمہ رہا یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب کے والد تھے عبد المطلب کو سقایہ و رفادہ کا یہ منصب بلند اپنے چچا المطلب بن عبد مناف سے حاصل ہوا انھوں نے اپنی قوم میں جو عزت و نیک نامی اور وجاہت و ہر دل عزیزی پائی وہ اب تک ان کے آباء و اجداد میں کسی اور کے حصہ میں نہ آئی تھی[2]

بنی ہاشم

بنی ہاشم قبیلۂ قریش کی مشہور اور اہم کڑی تھے تاریخ و سیر کی کتابوں نے ان

[1] رفادہ اس کھانے اور دعوت کو کہتے ہیں جو حجاج کے لئے اس بنیاد پر ہر سال کی جاتی تھی کہ وہ رحمان کے مہمان ہیں۔ [2] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام ج ۱ (اولاد عبد مناف)

جو واقعات و حالات ہمارے لئے محفوظ کر دیئے ہیں (اور وہ اصل حقیقت سے بہت کم ہیں) مگر ہم ان کا جائزہ لیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ ان میں شریفانہ انسانی احساسات کی کتنی نمود تھی اور ہر چیز میں اعتدال، عقل سلیم، بیت اللہ کی انتہائی نگاہداشت جو قوت و حمیت ہے اس کا پورا احساس، ظلم و حق تلفی سے گریز، عالی ہمتی، کمزوروں اور مظلوموں کے ساتھ شفقت و ہمدردی، سخاوت و شجاعت مختصر یہ کہ عربوں کے نزدیک الفروسیۃ (شہسواری) کے جتنے اوصاف عالیہ و صفات حمیدہ ہیں اور اس میں جتنے بلند و لطیف معانی پوشیدہ ہیں، ان کا جلوہ ان کی سیرت میں ہمیں نظر آتا ہے، یہ وہ سیرت و کردار ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے آباء و کرام کے حسب و نسب شایان شان ہے اور آپ نے جن اعلیٰ و بلند اخلاق کی اپنے قول و عمل سے دعوت دی اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو، اس لئے کہ وہ انقطاع وحی کے دور میں تھے اور جاہلیت کے عقائد و عبادات میں اپنی قوم کے ساتھ بہر حال شریک و سہیم تھے۔

مکہ میں بت پرستی اور اس کا اصل سرچشمہ اور تاریخ

قریش کا قبیلہ ابراہیم خلیل اللہ اور اپنے جد اعلیٰ اسماعیل کے دین پر برابر قائم اور توحید اور خدائے واحد کی عبادت پر ثابت قدم رہا، یہاں تک کہ عمرو بن لحی الخزاعی کا دور آیا، یہ پہلا شخص تھا جس نے حضرت اسماعیل کے دین میں تغیر کیا، بتوں کو نصب کیا، جانوروں کی تعظیم اور ان کو سائبہ بنانے کا

۱؎ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۷۶-۷۷ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے عمرو بن عامر الخزاعی کو دیکھا کہ وہ جہنم میں اپنی آنتیں گھسیٹتا پھر رہا ہے، یہ وہ پہلا شخص تھا جس نے جانوروں کو بتوں کے نام سائبہ بنا کر چھوڑنے کی بنیاد ڈالی (بخاری، مسلم بالمعنی) عمرو بن لحی کے متعلق ہے دوسری جگہ مروی ہے کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے دین اسماعیل کو بدلا، بت نصب کئے (باقی صفحہ ۹۹ پر)

رواج ڈالا اور حلال و حرام کے نئے قاعدے وضع کئے جن کا احکام الٰہی سے کوئی
تعلق نہ تھا اور جو شریعت ابراہیمی سے بالکل جُدا تھے، یہ قصہ یوں مشہور ہوا کہ یہ شخص
مکہ سے شام گیا اور یہ دیکھا کہ وہاں کے لوگ بتوں کو پوجتے ہیں، یہ بات اس کو بہت پسند
آئی اور اس نے کچھ بت وہاں سے حاصل کر کے مکہ میں نصب کئے اور لوگوں کو ان کی
تعظیم اور پرستش کا حکم دیا۔

یہ بات بھی ممکن اور قرین قیاس ہے کہ وہ شام جاتے ہوئے جزاہو سے گزرا ہو
جس کو قدیم مورخ اور جغرافیہ دان "بطرا" اور بطرہ (PATRA) کہتے آئے ہیں یہ شرق اردن[له]
کے جنوب میں واقع مشہور پہاڑی قصبہ ہے جس کا ذکر رومیوں اور یونانیوں کے یہاں
ملتا ہے کہا جاتا ہے کہ اس کو نبطیوں نے جو اصلاً عرب تھے ہزاروں سال پہلے تعمیر کیا تھا،
یہ لوگ مصر، شام، وادی فرات اور روم کے سفر برابر کرتے رہتے تھے اور ہو سکتا
ہے کہ وادی فرات جاتے ہوئے وہ حجاز سے ضرور گزرتے ہوں، یہ لوگ کھلی ہوئی
بت پرستی میں مبتلا تھے، پتھروں سے بت تراشتے اور اس کی پوجا کرتے تھے، مورخین
کا خیال ہے کہ شمالی حجاز کا مشہور بت "لات" جو سب سے اہم سمجھا جاتا تھا، اصل
"جزاہو" ہی سے برآمد کیا گیا تھا اور اہم اور خاص بتوں میں شامل کر لیا گیا تھا۔[له]

اس کی تصدیق فلپ ہٹی (P. K. HITTI) کی کتاب HISTORY OF SYRIA
سے بھی ہوتی ہے جس میں ان نبطی علاقوں (موجودہ شرق اردن) پر روشنی ڈالی

(باقی ص۹۵ کا) اور جاہلی رسوم کو ساتھ کر کے ان کا رواج ڈالا، ٹھیک یا سانڈ جو استعمال میں نہ آئے اور
جنہیں کسی کے لئے وقف کیا جائے۔ [له] مصنف نے ۱۹ اگست ۱۹۸۰ء کو رابطہ عالم اسلامی کے وفد کے
رکن کی حیثیت سے یہ جگہ خود دیکھی ہے، اور پہاڑوں میں تراشے گئے بت پتھر کی کثرت خاص
طور پر نوٹ کی ہے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کا سفرنامہ "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک"۔

گئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ:-

"ان معبودوں کا سردار ذوالشریٰ تھا جو ایک مستطیل ستون یا سیاہ مربع پتھر سے مشابہ تھا۔ "لات" جس کی عرب پرستش کرتے تھے دراصل "ذی الشریٰ" ہی سے متعلق تھا۔ دوسرے نبطی بت جن کا ذکر ان تاریخی آثار اور قدیم نبطی تحریروں اور نقوش میں ملتا ہے وہ "منات" اور "عزیٰ" ہیں۔ ان تحریروں میں "ہبل" کا ذکر بھی ملتا ہے۔"[1]

یہ خیال رہے کہ یہ وہ زمانہ ہے جب بت پرستی کی مختلف قسمیں جزیرۃ العرب کے چاروں طرف اور بحیرہ کے علاقہ میں پھیل رہی تھیں اور حضرت مسیح اور ان کے حواریوں کی دعوت ظاہر ہو چکی تھی جس نے بت پرستی کی بیخ کنی شروع کی اور اس کی تیزی و سرگرمی کو کم کیا۔ رہ گئی یہودیت تو وہ محدود نسلی مذہب تھا جو بنی اسرائیل کے اندر منحصر تھا اور بنی اسرائیل کے سوا کسی اور کو توحید کی دعوت دینے کی اجازت اس کو نہ تھی۔ (DE LACY O' LEARY) اپنی کتاب "عرب محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) سے پہلے" میں لکھتے ہیں:-

"یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ بتوں کی عبادت دراصل شام کی دین تھی جو جزیرۃ العرب کو شامی و یونانی مخلوط روایات سے ملی ہے جو شام میں عام تھیں اور شاید عرب کے بقیہ حصوں میں ان کا زیادہ رواج اور چلن نہ تھا۔"[2]

---

[1] P. K. HITTI : HISTORY OF SYRIA, (LONDON 1951) P. [illegible]

[2] ARABIA BEFORE MUHAMMAD, (LONDON 1927) P. [illegible]

اسی طرح بت پرستی وادی فرات اور جزیرۃ العرب کے مشرق میں عام تھی اور
چونکہ اس علاقے سے جزیرۃ العرب کے تجارتی تعلقات اور دوستانہ روابط تھے،
اس لئے کچھ بعید نہیں کہ جزیرۃ العرب میں بت پرستی پھیلنے میں اس علاقہ کا بھی
حصہ ہو۔ GEORGES ROUX نے اپنی کتاب "قدیم عراق" میں اس کی صراحت کی
ہے کہ عراق کی قدیم تاریخی تحریریں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ بت پرستی وہاں تیسری صدی
عیسوی اور اس کے بعد تک عام تھی، یہ ملک ان بتوں اور معبودوں کا مرکز تھا،
جن میں غیر ملکی بت بھی تھے اور مقامی بھی۔[1]

ایک روایت یہ بھی ہے کہ قریش میں بت پرستی کا آغاز تدریجی طور پر ہوا، اس کی
ایک توجیہ مؤرخین عرب کے بیان سے یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پہلے وہ لوگ جب مکے سے کہیں
سفر کرتے تھے تو حرم کے کچھ پتھر تبرک کے طور پر "تعظیماً" اپنے ساتھ لے لیتے تھے۔

اس کے بعد جو پتھر ان کو زیادہ پسند آتے اس کی عبادت کرنے لگتے، ان کی
اولاد اور نئی نسل اس تفصیل سے بھی ناواقف تھی، اس نے کھلی ہوئی بت پرستی اختیار
کر لی اور جس طرح اور دوسری گمراہ قومیں تھیں اسی طرح یہ بھی گمراہی میں جا پڑیں، تاہم
عہد ابراہیمی کے کچھ باقی ماندہ اعمال اور روایات کو وہ اپنے سینے سے لگائے رہے
خانۂ بیت اللہ کی تعظیم، طواف، حج اور عمرہ۔[2] اقوام و مذاہب کی مرحلہ وار تاریخ

---

[1] ANCIENT IRAQ [illegible] P. [illegible]

[2] اس کی تفصیل ان بتوں کے نام اور ان کے مقامات نیز اس سلسلے کے واقعات اور بت تراشی کے محرکات و اسباب کو سمجھنے کے لئے کتاب "الاصنام" کلبی اور "بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب" از علامہ سید محمود شکری آلوسی [illegible] الاصنام و حسب انساب العرب [illegible] ملاحظہ کریں ص ۲۱۰

اور وسائل سے مقامات تک اور مقامات سے شخصیات تک ان کی تبدیلی و منتقلی کے جائزے سے ان محققین کی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ عربوں میں اور خاص طور پر قریش میں بت پرستی کا آغاز کس طرح ہوا۔ بعض دوسری مسلم قوموں اور فرقوں میں تصویروں، شبیہوں اور مزارات سے وابستگی اور تعظیم و تقدیس میں جس طرح غلو سے کام لیا گیا اس کی تاریخ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اسی لئے اسلامی شریعت نے وہ تمام راستے اور چور دروازے پہلے ہی سے بند کر دیئے ہیں جو شرک یا اشخاص اور مقامات و آثار کی تقدیس و تعظیم میں غلو کی طرف لے جانے والے ہیں۔[1]

---

[1] شریعت اسلامی اور احادیث صحیحہ میں اس کے دلائل اتنی کثرت سے ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے ان ہی میں سے ایک مشہور حدیث ہے "لا تتخذوا قبری عیدا" (میری قبر کو عید اور جشن کی جگہ نہ بنانا اور اس پر میلہ نہ لگانا) ایک اور حدیث ہے کہ "لا تشد الرحال الا الی ثلاثة مساجد" (صرف تین مسجدیں ہیں جہاں باقاعدہ زیارت کی نیت کر کے سفر کرنا جائز ہے) دوسری حدیث ہے "لا تطرونی کما اطرت النصاری المسیح بن مریم" (میری اس طرح حد سے بڑھی ہوئی مدح سرائی نہ کرو جس طرح نصاریٰ نے مسیح بن مریم کی کی ہے) اسی طرح کی کثرت احادیث وارد ہوئی ہیں جاندار کی تصویر بنانے کی حرمت میں بڑا اصل یہی حکمت اور راز پوشیدہ ہے قدیم زمانہ میں بہت سی قومیں اپنے بزرگوں کی تصاویر کی محبت و تعظیم کے مرحلے سے گزر کر ان کی باقاعدہ پرستش تک پہنچی ہیں ابن کثیر آیت مندرجہ ذیل کی تفسیر میں لکھتے ہیں "وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا" یہ قوم نوح کے بت ہیں، راوی کہتا ہے کہ آدم اور نوح کے درمیان یہ نیک اور صالح اشخاص تھے جن کے متبعین اور عقیدت مندوں کی خاصی تعداد تھی جب ان کا انتقال ہو گیا تو ان کے متبعین نے سوچا اگر ہم ان کی کوئی شبیہ یا تصویر بنا لیں تو اس سے ان کی یاد تازہ رہے گی اور عبادت میں زیادہ ذوق و سرور حاصل ہوگا اسی خیال سے انہوں نے ان کی تصاویر بنائیں جب یہ لوگ ختم ہو گئے اور دوسری نسل آئی تو شیطان نے ان کو یہ سمجھایا کہ ان کے آباء و اجداد اصل میں ان تصویروں اور شبیہوں کی عبادت کرتے تھے اور انہی کی برکت سے بارش ہوتی تھی رفتہ رفتہ ان کی باقاعدہ پرستش [illegible]

اصحاب الفیل کا واقعہ

اسی زمانہ میں ایک اتنا بڑا واقعہ پیش آیا جس سے بڑا واقعہ عربوں کی تاریخ میں کبھی نہ ہوا تھا، یہ اس بات کی دلیل تھی کہ کوئی بہت بڑی بات مستقبل قریب میں ہونے والی ہے، اور اللہ تعالے نے عربوں کے ساتھ خیر کا ارادہ رکھتا ہے، اور کعبہ کی شان اس طرح دوبالا ہونے والی ہے کہ وہ شان اور عظمت دنیا کی کسی عبادت گاہ اور کسی اور گھر کو حاصل نہ ہوگی، اور اس کے ساتھ اس تاریخ مذاہب اور انسانیت کے مستقبل کا وہ ابدی پیغام اور لافانی کردار وابستہ ہے جس کو اسے انجام دینا اور تکمیل تک پہونچانا ہے۔

اللہ تعالے کی نظر میں بیت اللہ کی عزت و حرمت پر قریش کا عقیدہ

قریش کے لوگ یہ عقیدہ اور ایمان رکھتے تھے کہ اس گھر کی اللہ تعالے کی نگاہ میں ایک خاص قدر و منزلت ہے، اور وہی اس کا حامی و ناصر اور نگہبان و پاسبان ہے، ان کا یہ عقیدہ اور ایمان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دادا اور قریش کے سردار عبدالمطلب اور حبشہ کے بادشاہ ابرہہ کی گفتگو سے پوری طرح عیاں ہے اس کا قصہ یہ ہے کہ ان کے دو سو اونٹ ابرہہ نے لے لئے تھے، وہ اس کے لئے ابرہہ سے ملنے گئے اور اندر آنے کی اجازت چاہی، ابرہہ نے ان کی بہت عزت کی، اپنے تخت سے اتر آیا، پہلو میں بٹھایا، اور ضرورت دریافت کی، انھوں نے کہا کہ میرے دو سو اونٹ جو بادشاہ نے لے لئے ہیں وہ واپس لینا چاہتا ہوں، بادشاہ نے عبدالمطلب سے کہا

حقیر و ذاتی مطالبہ پر اپنی حیرت و استعجاب ظاہر کرتے ہوئے کہا تم دو سو اونٹوں کی بات کرتے ہو جو میں نے لے لئے ہیں اور اس گھر کی فکر نہیں کرتے جس پر تمہارا اور تمہارے آباء و اجداد کا دین قائم ہے اور جس کو ڈھانے کے لئے میں یہاں آیا ہوں، اس کے لئے تم کوئی گفتگو نہیں کرتے؟

عبدالمطلب نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ جواب دیا کہ میں تو اونٹوں کا مالک ہوں (اس لئے اس کی فکر کرتا ہوں) جو گھر کا مالک ہے وہ آپ اس کی حفاظت کرے گا۔

اس نے کہا "وہ مجھ سے کہاں بچ سکتا ہے!"

انھوں نے جواب دیا "آنت وذاک" یہ تم جانو اور وہ (گھر کا مالک اور رب) جانے۔[1]

اس کے بعد جو کچھ پیش آیا اس کی تفصیل آگے آئے گی، اور اس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ اب کسی حملہ آور کی مجال نہیں ہے کہ اس کو بُری نظر سے دیکھے اور اس پر دست درازی کرے بے شک اپنے گھر اور اپنے دین کی حفاظت اللہ تعالیٰ ہی کے ذمہ تھی، اور اس کام کی تکمیل اسی کو کرنی تھی۔

اس اہم واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ابرہۃ الاشرم جو نجاشی (شاہ حبش) کا صنعاء میں عامل (گورنر اور حاکم) تھا، اس نے صنعاء میں ایک بڑا گرجا تعمیر کیا اور اس کا نام (القلّیس) رکھا، مقصد یہ تھا کہ عربوں کے حج کا رُخ اس طرف پھیر دے۔ عجب اس کے لئے یہ بات بہت تکلیف دہ تھی کہ کعبہ بندگان خدا کی پناہ گاہ اور مرکز توجہ

---

[1] سیرت ابن ہشام ص ۴۹-۵۰

کی حیثیت سے باقی ہے اور لوگ دور دراز مقامات سے کارواں در کارواں وہاں حاضر ہوں، وہ چاہتا تھا کہ یہ مرتبہ بلند اور مرکزیت گرجا کو حاصل ہو۔

یہ بات عربوں کے لئے بہت شاق تھی اس لئے کہ کعبہ کی محبت ان کی گھٹی میں پڑی تھی اور وہ کسی گھر، معبد اور مذہبی مرکز کو اس کے برابر نہ سمجھتے تھے اور اس کو چھوڑ کر کوئی بڑی سے بڑی دولت لینے پر تیار نہ تھے، اس مسئلہ نے ان کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور وہ ہر جگہ موضوع سخن بن گیا، اسی درمیان میں کنانی اس کام کے لئے نکل کھڑا ہوا، اور اس گرجا میں جا کر قضائے حاجت کی اور اس کو نجس کر دیا، اس سے ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہو گیا، ابرہہ کو اس بات پر بے حد غصہ آیا اور اس نے اسی وقت قسم کھائی کہ وہ خود کعبہ پر حملہ آور ہوگا اور اس کو گرائے بغیر اطمینان کی سانس نہ لے گا۔[1]

---

[1] ہو سکتا ہے کہ ابرہہ کے حملہ اور فوج کشی کا سبب محض ایک عبادت گاہ کی بے حرمتی و اہانت سے زیادہ وسیع اور اہم ہو اور وہ مکہ کو فتح کرنے کی نیت رکھتا ہو تاکہ شام سے یمن کا رابطہ قائم ہو جائے اور عیسائی حکومت کے قدم جزیرۃ العرب پر مضبوطی سے جم جائیں، نیز اہل روم اور حبش کے یکساں مفاد میں تھا اس لئے کہ وہ دونوں عیسائیت سے تعلق رکھتے تھے، یہ مقصد خواہ اس کے اسباب کچھ بھی ہوں اس گھر اور مرکز کو راستہ سے ہٹائے اور مکہ کو اس روحانی پیشوائی سے بے دخل کئے بغیر ممکن نہ تھا جس کے لئے تقدیر کا فیصلہ یہ تھا کہ اسے تمام انسانوں کے لئے سرچشمہ ہدایت بنائے اور آخری نبوت کا مرکز بننا ہے لیکن مشیت الٰہی کا فیصلہ کچھ اور تھا، اس کا بھی احتمال ہے کہ یہودیوں نے ابرہہ کو فتح کعبہ پر اکسایا ہو اور اس کے پیچھے بعض سیاسی مقاصد کے حصول کا جذبہ ہو جو مشرقی ایرانی اثرات کو کم کرنا اس لئے کہ جزیرۃ العرب میں یہودیوں کے اثر و نفوذ کا مقابلہ تنہا ایرانی کر رہے

ابرہہ لشکر لے کر چلا اور ہاتھیوں کی ایک بڑی تعداد اپنے ساتھ لے لی عربوں نے ہاتھیوں کے بارے میں پہلے سے بہت کچھ سن رکھا تھا یہ خبر ان پر بجلی بن کر گری اور وہ اس حملہ سے بے حد خائف ہوئے اور کوشش کی کہ کسی طرح اس لشکر کو آگے بڑھنے سے روکا جائے لیکن ان کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ ابرہہ اور اس کے لشکر جرار کا مقابلہ ان کی طاقت سے باہر ہے۔ چنانچہ یہ معاملہ انھوں نے اللہ کے سپرد کیا۔ ان کو پورا یقین تھا کہ اس گھر کا جو مالک اور رب ہے وہ اس کی خود پاسبانی کرے گا۔

قریش نے لشکر کی دست درازیوں اور مظالم سے بچنے کے لئے پہاڑیوں اور وادیوں میں پناہ لی اور منتظر رہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے گھر کی حرمت و ناموس کے لئے کیا کرتا ہے۔ عبد المطلب اور ان کے ساتھ قریش کے کچھ لوگ باب کعبہ کا حلقہ پکڑ کر خدا کے حضور آہ و زاری میں مشغول ہو گئے اور ابرہہ اور اس کے لشکر کی ہزیمت کے لئے نصرت خداوندی کی دعا کی۔ ادھر ابرہہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ کعبہ کی طرف بڑھا۔ اپنے ہاتھی کو جس کا نام "محمود" تھا اس نے حملہ کے لئے تیار کیا لیکن مکہ کے راستہ ہی میں ہاتھی ایک جگہ بیٹھ گیا اور مارنے کے باوجود اس نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ جب انھوں نے اس کا رخ یمن کی طرف کیا تو وہ فوراً اٹھا اور بہت تیزی سے دوڑنے لگا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے سمندر کی طرف چڑیوں کے جھنڈ بھیجے ہر چڑیا اپنے پنجوں میں پتھر لئے ہوئے تھی یہ پتھر جس پر گرتے اس کو ہلاک کر دیتے۔ یہ دیکھ کر اہل حبشہ جس راستے سے آئے تھے اس پر تیزی سے واپس بھاگے اور چڑیوں کے پتھروں سے گرتے گئے اور ہلاک ہوتے گئے۔ ابرہہ کا جسم بھی چھلنی ہو گیا۔ وہ اس کو اٹھا کر

اپنے ساتھ واپس لے جانے لگے تو اس کا ایک ایک پور گرنے لگا یہاں تک کہ صنعاء پہونچ کر اس نے بہت بری طرح جان دی۔[1]

یہ واقعہ قرآن مجید میں بھی بیان کیا گیا ہے:۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ	کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمھارے
بِأَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ اَلَمْ يَجْعَلْ	پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ
كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝ وَّ اَرْسَلَ	کیا کیا کیا ان کا داؤں غلط نہیں
عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ	کیا اور ان پر جھلڑ کے جھلڑ جانور
بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ	بھیجے جو ان پر کھنگر کی پتھریاں
كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝	پھینکتے تھے تو ان کو ایسا کر دیا
(سورۂ فیل۔ ۱۔ ۵)	جیسے کھایا ہوا بھس۔

واقعۂ فیل اور اس کے اثرات

جب اللہ تعالیٰ نے اہلِ حبشہ کو مکہ سے ناکام و نامراد واپس کیا اور ان پر یہ عذاب نازل ہوا جس کا ذکر ابھی گزرا ہے تو عربوں کے دلوں میں قدرتی طور پر قریش کی بڑی عظمت پیدا ہو گئی، وہ کہنے لگے کہ بے شک یہ اللہ والے ہیں ان کی طرف سے اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست دی اور ان کو لڑنا بھی نہ پڑا، ان کے دل میں کعبہ کی عظمت پہلے سے دو چند ہو گئی اور اس کی عند اللہ حرمت و عزت پر ان کا ایمان اور پختہ ہو گیا۔[2]

یہ اللہ تعالیٰ کی ایک کھلی ہوئی نشانی اور معجزہ تھا اور اس بات کا پیش خیمہ کہ مکہ

---

[1] دیکھئے واقعہ فیل سیرت ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۶۰ [2] سیرت ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۵۷

میں ایک ایسے نبی کا ظہور ہونے والا ہے جو کعبہ کو بتوں کی نجاست سے پاک کرے گا اس کے ہاتھوں اس کی شان دوبالا ہوگی۔ اس کے دین کا اس گھر سے بہت گہرا اور ابدی ولازوال تعلق رہے گا۔ اس واقعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ اس نبی کی بعثت اور ظہور کا مبارک دن کچھ دور نہیں ہے۔

عربوں میں اس واقعہ کو بجا طور پر بہت اہمیت حاصل ہوئی اور اس سے انھوں نے نئی تاریخ شروع کی چنانچہ ان کی تحریروں میں اس کا رواج ملتا ہے کہ یہ بات عام الفیل (یعنی واقعہ فیل والے سال میں) پیش آئی فلاں شخص عام الفیل میں پیدا ہوا یہ واقعہ عام الفیل کے اتنے سال کے بعد کا ہے، عام الفیل ۵۷۰ء کے مطابق ہے۔

مکّہ
بعثتِ نبوی کے وقت

مکّہ ایک اہم شہر

بہت سے وہ لوگ جو زمانۂ بعثت کے حالات سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں، اور عربوں کی تاریخ، سماجی زندگی، ان کے ادب اور شاعری اور قبائلی روایات پر ان کی زیادہ گہری نظر نہیں ہے، یہ سمجھتے ہیں کہ مکّہ بعثتِ نبوی کے وقت ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں زندگی عقلی، اجتماعی اور تمدّنی ہر لحاظ سے دورِ طفولیت میں تھی، وہ قبائل کی چند آبادیوں کا نام تھا جہاں بالوں کے بنے ہوئے خیموں اور ڈیروں میں (جن کے چاروں طرف اونٹوں، بھیڑ بکریوں اور گھوڑوں کے باندھنے کی جگہیں تھیں) ان کی گزر بسر تھی، وہ زیادہ تر وادیوں کے کنارے اور پہاڑوں کے دامن میں پھیلے ہوئے تھے، ان کا کھانا سوکھی روٹی یا اونٹ کا گوشت تھا جو وہ ٹھیک سے پکانا بھی نہیں جانتے تھے، اونٹ کے بالوں سے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے، ان کے کھانے پینے میں کوئی تنوّع تھا نہ لباس میں کوئی خوش نمائی نہ زندگی میں گرمی اور حرارت، نہ احساس میں نزاکت و لطافت، نہ خیال میں بلندی پرواز۔ مکّہ کی یہ تاریک اور حقیر تصویر جو سیرت و تاریخ کی عام کتابوں میں پیش کی گئی ہے اور وہ زیادہ تر مغربی زبانوں میں لکھی گئی ہیں، تاریخی حقیقت کے خلاف ہے
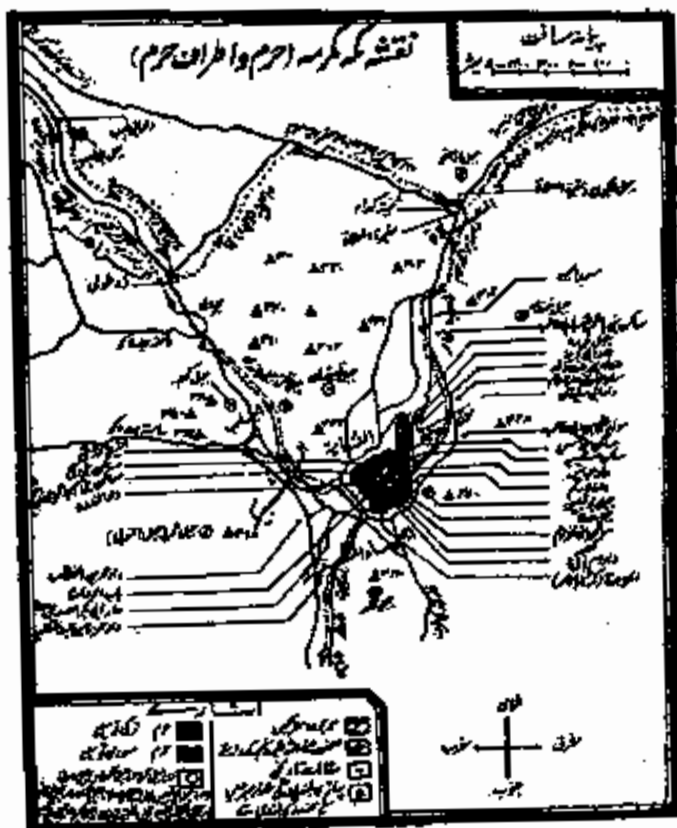
جو تاریخ کی کتابوں اور ادب اور جاہلی اشعار میں ملتی ہے اور جس میں مکہ اور باشندگان مکہ کی عادات و روایات اور دستور و قوانین کا (جو ابتدائی بدویانہ زندگی سے ابتدائی شہری اور تمدنی زندگی کے دور میں داخل ہو چکے تھے) خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

یہ تصویر قرآن مجید کے ان اوصاف و اسماء سے بھی کوئی مطابقت نہیں رکھتی جس میں مکہ کو "ام القریٰ" کے نام سے یاد کیا گیا ہے:۔

وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا	اور اسی طرح تمہارے پاس قرآن عربی
عَرَبِيًّا لِّتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ	بھیجا تاکہ تم بڑے گاؤں (یعنی مکہ) کے
حَوْلَهَا وَتُنذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ	رہنے والوں کو اور جو لوگ اس کے ارد گرد
لَا رَيْبَ فِيهِ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ	رہتے ہیں ان کو راستہ دکھاؤ اور انہیں
وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ ۝	قیامت کے دن کا بھی جس میں کچھ شک
(سورۂ شوریٰ ۔ ۷)	نہیں خوف دلاؤ اس روز ایک فریق
	بہشت میں ہوگا اور ایک فریق دوزخ میں۔

دوسری جگہ اس کے متعلق یہ ارشاد ہے:۔

وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ ۝ وَطُورِ سِينِينَ ۝	انجیر کی قسم اور زیتون کی اور طور
وَهَٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ (سورۂ تین ۱-۳)	سینین کی اور اس امن والے شہر کی۔

ایک جگہ آیا ہے:۔

لَا أُقْسِمُ بِهَٰذَا الْبَلَدِ ۝ وَأَنتَ حِلٌّ	اس شہر (مکہ) کی قسم اور تم اسی
بِهَٰذَا الْبَلَدِ ۝ (سورۂ بلد ۱-۲)	شہر میں تو رہتے ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ مکہ پانچویں صدی عیسوی کے وسط ہی میں دور جہالت سے دور تمدن میں

میں داخل ہو چکا تھا۔ اگرچہ یہ تہذیب اپنے محدود دائرہ میں تھی یہ شہر ایک ایسے نظام کے ماتحت تھا جو باہمی تعاون و اتحاد اجتماعی و عمومی مفاہمت اور تقسیم کار کی بنیاد پر قائم تھا۔ اور یہ نظام قصی بن کلاب کے ہاتھوں قائم ہوا تھا جن کی پانچویں پشت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔

ابتداء میں مکہ کی آبادی قدرتی طور پر بہت محدود تھی یہ مقام دو پہاڑیوں جبل ابو قبیس (جو صفا پہاڑی کے اوپر واقع تھا) اور جبل احمر کے درمیان واقع تھا جس کو جاہلیت میں "اعرف" کہتے تھے اور جو وادی قعیقعان کے بالکل سامنے تھا لیکن بیت اللہ کی بدولت اور اس کے خادموں اور پاسبانوں اور مکہ کے باشندوں کو عام طور پر جو عزت و وجاہت حاصل تھی نیز وہاں جو غیر معمولی امن و سکون تھا اس کی وجہ سے ان قبائل کے لئے مکہ میں بڑی کشش تھی چنانچہ اس کی آبادی زمانہ کے ساتھ خود بخود بڑھتی گئی خیموں اور چھولداریوں کی جگہ پتھر اور گارے کے بنے ہوئے مکانات تعمیر ہو گئے اور آبادی و آباد کاری کی یہ لہر مسجد حرام سے مکہ کی بالائی و نشیبی وادیوں تک پھیل گئی ابتداء میں یہ لوگ اپنے مکانات کی چھتیں بھی بیت اللہ کی طرح مربع شکل کی نہ بناتے تھے اور محسوس کرتے تھے کہ یہ ایک طرح کی بے ادبی ہے آہستہ آہستہ اس کا وہ اہتمام باقی نہیں رہا اور اس میں بڑی گنجائش پیدا کر لی گئی تاہم مکانات بیت اللہ سے اس وقت بھی احتراماً بلند نہ کئے جاتے تھے۔

بعض راویوں کا بیان ہے کہ اہل مکہ کعبہ کے احترام و تعظیم میں اپنے مکانات گول بناتے تھے پہلا شخص جس نے مربع مکان بنوایا وہ حمید بن زہیر تھا اس کے عمل کو اہل قریش نے ناپسند کیا۔ مکہ کے مالداروں اور سرداروں کے مکانات پتھر کے بنے ہوئے ہوتے تھے

اور ان میں کئی کمرے ہوتے تھے اور آمنے سامنے دو دو دروازے ہوتے تھے تاکہ گھر کے ایک حصے میں مہمانوں کی موجودگی کے وقت عورتیں دوسرے دروازے سے نکل سکیں۔

مکہ کی تعمیر نو اور اس کے اصل بانی

مکہ کی اس توسیع و ترقی اور تعمیر نو میں سب سے بڑا ہاتھ قصی بن کلاب کا تھا۔ اس لئے کہ انھوں نے سب سے پہلے قریش کو اس مقصد سے متحد کیا اور رہائش کے لئے جگہوں کی باقاعدہ حد بندی کی جس کو عربی اصطلاح میں رباع[1] کہتے ہیں۔ قریش کی مختلف برادریوں اور خاندانوں کو ان مکانات میں آباد کیا، ان کی اولاد نے مکہ کی اراضی کی تقسیم اور حد بندی کا کام جاری رکھا، خود بھی آباد ہوئے اور زمینیں دوسروں کے ہاتھ فروخت کیں اور خرید و فروخت اور تعمیرات کا یہ سلسلہ بغیر کسی اختلاف و تنازعہ کے قریش اور دوسری برادریوں کے درمیان چلتا رہا۔

زندگی کی تنظیم اور عہدوں کی تقسیم

قصی اپنی قوم اور اہل مکہ دونوں پر حاوی تھے حجابۃ (بیت الشریف کی دربانی) سقایۃ (سبیل اور پانی وغیرہ کا انتظام) رفادۃ (حجاج بیت الشریف سالانہ دعوت عام) ندوۃ (مجلس شوریٰ) اور لواء یعنی جنگی امور سب ان ہی کے ہاتھوں میں تھے۔

---

[1] ابو الولید الازرقی (م ۲۲۳ھ) نے اپنی کتاب "اخبار مکہ" میں اس کی پوری تفصیل بیان کی ہے۔ رباع مکانات اور اس کے گرد و پیش کے حصوں کو کہتے ہیں، واضح رہے کہ فتح کے بعد حجاج کے لئے پانی کے حوض تیار کئے جاتے تھے جن کو کھجور اور کشمش وغیرہ سے شربت بنایا جاتا اور یہ آگ جب مکہ آتے تو پیتے تھے۔

انھوں نے دارالندوۃ کو مسجد حرام سے بالکل متصل تعمیر کیا، دراس کا دروازہ کعبہ کی طرف نکالا۔ قصی بن کلاب کا گھر بھی تھا اور قریش کے مشوروں اور فیصلوں اور مکہ کی سوسائٹی کا مرکز بھی۔ قریش کا کوئی فرد مرد یا عورت شادی کرنا چاہتا، کسی اہم اور فوری معاملے میں مشورہ کی ضرورت ہوتی، کسی قبیلے کے خلاف اعلان جنگ کرنا ہوتا یا جنگی تیاری کا مرحلہ آتا حتیٰ کہ کوئی بچی جب بڑی ہوتی تو اس کو اوڑھنی اوڑھانے کی بھی رسم یہیں انجام دی جاتی۔ قصی کی شخصیت کو ان کی زندگی میں اور مرنے کے بعد بھی دین و مذہب جیسی عظمت حاصل رہی جس کی سند کے بغیر کوئی کام نہ ہو سکتا تھا۔ قانون یہ تھا کہ دارالندوہ میں بنی قصی کے علاوہ دوسرے قبیلوں کے وہی اشخاص آ سکتے ہیں جن کی عمر چالیس سے کم نہ ہو البتہ بنی قصی اور ان کے حلیف قبائل کے سب افراد بڑے ہوں یا چھوٹے اس میں شریک ہونے کا حق رکھتے تھے۔ دارالندوہ میں جن برادریوں اور خاندانوں کو شرکت کی اجازت تھی وہ تھے ہاشم، اُمیہ، مخزوم، جمح، سہم، تیم، عدی، اسد، نوفل، زُہرہ یہ دس مختلف خاندان کے لوگ تھے۔

ان کے انتقال کے بعد عہدوں کی نئی تقسیم ہوئی۔ بنی ہاشم کو سقایہ، بنی اُمیہ کو قریش کا پرچم عقاب، بنی نوفل کو رفادہ[1]، بنی عبدالدار کو لواء، سدانہ اور حجابہ اور بنی اسد کو مشاورت کا قلمدان دیا گیا۔

قریش کے مختلف اشخاص میں جو صاحب اثر تھے اور اصحاب وجاہت تھے ان میں یہ ذمہ داریاں تقسیم تھیں (حضرت ابو بکر صدیقؓ) جو بنی تیم سے تھے کے پاس دیت

---

[1] رفادہ اس کھانے کو کہتے ہیں جو حجاج کے لئے بطور ضیافت کے تیار کیا جاتا تھا۔ اس کی شکل یہ تھی کہ قریش ہر سال کچھ مقررہ رقم اس کے اخراجات کے لئے قصی کو پیش کرتے تھے (اقصری ص ۳۳)

تاوان اور جرمانہ وغیرہ تھا خالد بن الولیدؓ کے پاس جو بنی مخزوم میں سے تھے قبہ اور اعنہ کا قلم دان تھا۔ قبہ اس خیمہ کو کہتے ہیں جس میں فوجی ضروریات کا سامان رکھا جاتا تھا اعنہ وہ سامان تھا جو جنگ کے دوران قریش کے گھوڑوں پر رہتا تھا۔ عمر بن الخطابؓ کے پاس سفارت تھی جب کسی قبیلہ سے جنگ مقصود ہوتی تو ان کو سفیر بنا کر فریق مخالف کے پاس بھیجا جاتا، اگر کوئی برادری ان پر فخر کرتی تو اس کے مقابلہ کے لئے ان کا انتخاب ہوتا اور سب اس پر راضی رہتے، صفوان بن اُمیہ (بنی جمح) کے ذمہ تیر اور ازلام کا کام تھا کوئی بڑا اقدام اس عمل کے بغیر نہ کیا جاتا، حارث بن قیس کے سپرد نظم و انتظام اور بتوں کے نام پر جمع کیا ہوا مال تھا، یہ ذمہ داریاں اور اعلیٰ مناصب ان کو آباء و اجداد سے نسلی طور پر حاصل ہوتے تھے۔

تجارتی سرگرمیاں اور درآمد و برآمد

قریش تجارتی اغراض سے دو سفر کرتے تھے ایک شام کی طرف موسم گرما میں دوسرا یمن کی طرف موسم سرما میں[1]، اشہر حرم (رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم) ان کے نزدیک عزت و حرمت کے مہینے سمجھے جاتے تھے، اور ان میں جنگ سے احتراز کیا جاتا، ان میں ان کے بازار بیت اللہ کے پہلو میں حرم شریف کے اندر لگتے تھے اور جزیرۃ العرب کے دور دراز مقامات سے لوگ اس میں ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہوتے تھے، اور اس میں ان کو ضروریاتِ زندگی کا پورا سامان

---

[1] ازلام، ازلام۔ جو شے کے وہ پانسے جو کسی معاملہ میں کسی پہلو کو ترجیح دینے کے لئے پھینکے جاتے ان پر مختلف علامتیں ہاں نہیں لکھی رہتیں۔

ملتا تھا۔ مکہ کی تاریخ میں ہمیں جن بازاروں کا ذکر ملتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں کے باشندے تمدن و ترقی کی کس سطح پر تھے۔ ان بازاروں میں ایک بازار عطر فروشوں کے لیے مخصوص تھا۔ ایک مختلف پھلوں کے لئے، ایک رُطب کے لئے، ایک بازار صرف حجاموں کے لیے تھا۔ یہ سب بازار بہت کشادہ اور وسیع ہوتے تھے جن میں گیہوں گھی، شہد اور مختلف اجناس جو تجارتی قافلے باہر سے لاتے تھے، بڑی مقدار میں موجود رہتی تھیں۔ یہاں اہلِ مکہ کے لئے غلہ کی منڈی تھی۔[1] ان بازاروں کے علاوہ خاص ایک گلی جوتوں کی دکانوں کے لئے اور ایک کپڑوں کے لئے مخصوص تھی۔

اہلِ مکہ کی کچھ تفریح گاہیں بھی تھیں جہاں گرمی کے دنوں میں سرِ شام مکہ کے خوش باش و خوش طبع نوجوان جمع ہوتے تھے جو زیادہ دولت مند اور ناز و نعم کے عادی تھے وہ سردیاں مکہ میں گزارتے تھے اور گرمیاں طائف میں۔ مکہ کے کچھ نوجوان خوش پوشاکی و جامہ زیبی اور تجمل و آرائش میں مشہور تھے۔ ان میں سے بعض کی پوشاکیں کئی کئی سو درہم کی تیار ہوتی تھیں۔

تجارتی سرگرمیاں اور نقل و حرکت مکہ میں پورے عروج پر تھی۔ وہاں کے تاجر افریقہ و ایشیاء کے مختلف ممالک کا سفر کرتے رہتے تھے اور ہر ملک کے نوادرات، تحفے اور مشہور و مخصوص اشیاء یا وہ چیزیں جن کی ان کے ملک کو ضرورت تھی اپنے ہمراہ لاتے تھے۔ افریقہ سے جو چیزیں وہ درآمد کرتے تھے ان میں گوند، ہاتھی دانت، سونا

---

[1] چنانچہ جب ثمامہ بن اثال نے جو بنی حنیفہ کے ایک سردار تھے، مسلمان ہونے کے بعد مکہ میں جانے والے غلہ پر پابندی لگادی تو قریش کو بہت دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ اہلِ مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک عرضداشت لکھی کہ آپ ثمامہ کو غلہ روکنے سے منع فرمائیں۔ [illegible]
(صحیح مسلم)

آبنوس سا کی لکڑی، یمن سے کھالیں، انگریٹھی و لوبان، اور کپڑے، عراق سے گرم مسالے، ہندوستان سے سونا، چین سے جواہرات، ہاتھی دانت، صندل کی لکڑی، گرم مسالے اور زعفران، مصر و شام سے مختلف قسم کے تیل، غلّہ و اجناس، اسلحہ اور ریشم اور شیرینیاں لی ہیں۔

وہ بعض سلاطین و امراء کو مکہ کی خاص مصنوعات سوغات کے طور پر بھی بھیجا کرتے تھے، ان میں سب سے زیادہ خاص چیز چمڑا ہوتا تھا، چنانچہ جب قریش نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے پاس اپنے دو نمائندے عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص بن وائل کو بھیجا اور جو مسلمان وہاں ہجرت کر گئے تھے، ان کو واپس لینے کی کوشش کی تو انھوں نے مکہ کے خاص تحفہ کے طور پر اس کو چمڑا بھی دیا تھا۔

عورتیں بھی تجارتی کاروبار کرتی تھیں اور شام اور دوسرے ممالک ایران کے تجارتی قافلے جایا کرتے تھے، حضرت خدیجہ بنت خویلد اور حنظلیہ ام ابی جہل اس کے لیے زیادہ مشہور تھیں، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا	مردوں کو حصہ ہے اپنی کمائی سے
وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ۔	اور عورتوں کو حصہ ہے اپنی کمائی
(سورۃ النساء ۔ ۳۲)	سے۔

اقتصادی حالت، اوزان اور پیمانے

ان وجوہ کی بنا پر مکہ تجارت میں آگے تھا، اہل مکہ میں سے متعدد افراد بہت خوش حال اور فارغ البال تھے اور ان کے پاس خاصا سرمایہ اکٹھا ہو گیا تھا، اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ قریش کا تجارتی کارواں جو غزوۂ بدر کے موقع پر شام سے واپس آیا

وہ ایک ہزار اونٹوں پر مشتمل تھا اور اس پر پچاس ہزار دینار کا مال و اسباب لدا ہوا تھا۔

اہل مکہ رومانی اور بازنطینی اور ایرانی و ساسانی سکے استعمال کرتے تھے مگر اور جزیرۃ العرب میں اس وقت رائج سکے دو قسم کے تھے ایک درہم دوسرے دینار، درہم کی دو قسمیں تھیں، ایک قسم وہ تھی جس پر فارس کا نقش اور مہر تھی اس کو "بغلیہ" اور "سود وافیہ" کہتے تھے دوسری قسم وہ تھی جس پر روم کا نقش تھا اور اس کو زیادہ تر "طبریہ" اور "بزنطیہ" کہتے تھے، وہ سب چاندی کے سکے تھے ان کے مختلف اوزان تھے اسی لئے اہل مکہ ان کے شمار پر نہیں بلکہ وزن پر معاملہ کرتے تھے، علماء کے اقوال سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ درہم جس کا شریعت میں اعتبار ہے جَو کے پچپن دانوں کے ہم وزن ہے اور دس درہم سات مثقال سونے کے مساوی ہے اور خالص سونے کا ایک مثقال بہتر دانوں کے ہم وزن ہے اور اسی پر (جیسا کہ ابن خلدون نے لکھا ہے) سب کا اجماع ہے۔

عہد نبوت میں جو سکے رائج تھے اور جن کا زیادہ استعمال تھا، وہ اکثر چاندی کے ہوتے تھے، علماء کا قول ہے کہ اس زمانہ میں چاندی کا رواج تھا سونے کا نہیں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج ۳ ص ۲۲۲)

جہاں تک دینار کا تعلق ہے، وہ سونے کا ہوتا تھا، اور جاہلیت اور اسلام کے ابتدائی دور میں شام اور حجاز میں اس کا رواج تھا، یہ سب سکے رومی تھے جو روم ہی میں ڈھالے جاتے تھے اور ان پر بادشاہ روم کی تصویر ہوتی تھی، اور اس کا نام رومی زبان میں کندہ ہوتا تھا، جیسا کہ ابن عبد البر نے "التمہید" میں لکھا ہے لفظ دینار دراصل ایک قدیم رومی سکہ (DENARIUS) سے عربی زبان میں آیا ہے اور بعض عربی ممالک میں یہ لفظ اب تک رائج ہے اور انجیل میں اس کا ذکر متعدد بار آیا ہے دینار کا وزن

ایک مثقال کے برابر مانا جاتا تھا، اور خالص سونے کا ایک مثقال جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے متوسط جو کے بہتر (۷۲) دانوں کے ہم وزن مانا گیا تھا اور یہ مشہور ہے کہ جاہلیت اور اسلام کسی عہد میں اس میں تغیر نہیں ہوا۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ میں ہے کہ بازنطینی دینار ۴ر۲۵ گرام کے برابر ہوتا ہے،[1] مستشرق زمباور کی تحقیق یہ ہے کہ مکہ کا مثقال ۴ر۲۵ گرام کے برابر ہوتا ہے (دیکھئے مادہ دینار ج ۹ ص ۲۷) درہم اور دینار کے مابین تناسب یہی تھا۔

جہاں تک اس کے تبادلہ کا تعلق ہے احادیث، فقہ، تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ایک دینار دس درہم کے مساوی تھا، ابوداؤد میں عمرو بن شعیب سے مروی ہے کہ دیت کی قیمت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ۸۰۰ دینار یا آٹھ ہزار (۸۰۰۰) درہم تھی، اس کے بعد صحابہ کا اسی پر عمل رہا یہاں تک کہ اسی پر امت کا اجماع ہو گیا، مشہور احادیث میں درہم کے نصاب اور اس کی واجب مقدار کے بارہ میں جو صراحت آئی ہے اور جمہور فقہاء کی بھی یہی رائے ہے اس سے اس کا پورا ثبوت ملتا ہے کہ سونے کا نصاب بیس دینار ہے، اور اس سے یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ عہد جاہلیت اور آغاز اسلام میں ایک دینار کی قیمت دس درہم یا اس کے مساوی سکوں کے برابر تھی۔

امام مالکؒ نے موطا میں لکھا ہے کہ وہ صحیح مسلک جس پر ہمارے نزدیک کوئی اختلاف نہیں ہے یہ ہے کہ زکوٰۃ بیس دینار پر یا دو سو درہم پر واجب ہے۔[2]

---

[1] بعض محققین کا کہنا ہے کہ اس دور میں دینار کا معیاری وزن وہی تھا جو بوزنطی سولیڈس کا تھا یعنی تقریباً ۴ر۵ گرام خلیفہ عبدالملک کی اصلاحات کے بعد اس کا وزن گھٹا کر ۴ر۲۵ گرام کر دیا گیا۔

[2] مستفاد از بلوغ الادب فی معرفۃ احوال العرب آلوسیؒ، التراتیب الاداریہ شیخ عبدالحی الکتانی، "فقہ الزکوٰۃ" یوسف القرضاوی، تفسیر ماجدی۔

ناپ تول کے جو پیمانے اس زمانے میں رائج تھے ان میں صاع، مُد، رطل، اوقیہ اور مثقال تھے اور انھیں میں سے کچھ نئی قسمیں انھوں نے اور نکالی تھیں، علم الحساب سے بھی ان کو واقفیت تھی حصوں اور میراث کی تقسیم میں قرآن نے ان کے اسی حساب پر اعتماد کیا ہے۔

قریش کا دولت مند طبقہ

جن گھرانوں میں خوش حالی اور مالی فراوانی تھی، ان میں بنو اُمیہ اور بنو مخزوم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اشخاص میں ولید بن المغیرہ، عبد العزیٰ (ابو لہب) ابو احیحہ بن سعید بن العاص بن امیہ (جس کا ابوسفیان کے قافلہ میں تیس ہزار دینار کے بقدر حصہ تھا) عبد اللہ بن ربیعہ المخزومی جیسے امیر و رئیس لوگ تھے ان میں عبد اللہ بن جدعان التیمی زیادہ نامور اور مشہور تھے جن کے متعلق بیان آتا ہے کہ وہ سونے کے پیالہ میں پانی پیتے تھے اور ان کا پورا لنگر خانہ تھا جس میں غریبوں اور بھوکے لوگوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا عباس بن عبد المطلب کا شمار بھی قریش کے دولت مند لوگوں میں تھا، وہ اپنی دولت لوگوں پر خوب خرچ کرتے تھے اور سودی لین دین بھی کرتے تھے یہاں تک کہ اسلام کا غلبہ ہوا سود کی حرمت نازل ہوئی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر سودی رقوم کے خاتمہ کا اعلان فرمایا اور اس کا آغاز اپنے چچا عباس بن عبد المطلب سے کیا اور ارشاد ہوا کہ "پہلا سود جس کو میں ساقط کرتا ہوں وہ عباس بن عبد المطلب کا سود ہے۔"

ان میں ایسے تعیش پسند دولت مند بھی تھے جن کے گھروں میں شیشے کی قندیلیں

گرم ہوتی تھیں اگر پہ فرش فروش سے آراستہ دستر خوان سجے ہوئے اور بادہ و جام کا دور چلتا ہوا۔

سردارانِ قوم کی محفلیں زیادہ تر بیت اللہ کے سامنے جمتی تھیں جہاں شعر و شاعری ہوتی، جاہلیت کے ممتاز شعراء جیسے لبید بن ربیعہ وغیرہ ان میں شریک ہوتے۔ یہ بھی ذکر آتا ہے کہ عبدالمطلب کا فرش کعبہ کے سایہ میں بچھتا تھا۔ ان کے لڑکے ان کے ادب و احترام میں فرش کے باہر چاروں طرف بیٹھتے اور جب تک وہ نہ آجاتے کوئی فرش پر نہ بیٹھتا۔

مکہ کی صنعتیں اور ادب و ثقافت

اہلِ مکہ کی نظر میں صنعت و حرفت کی زیادہ اہمیت نہ تھی۔ بلکہ وہ اس کو حقارت سے دیکھتے تھے اور اپنے لئے باعثِ ننگ و عار سمجھتے تھے۔ عام طور پر صنعت و حرفت غلاموں یا عجمیوں کے ساتھ مخصوص سمجھی جاتی تھی۔ تاہم بعض صنعتیں جن کی انہیں سخت ضرورت تھی، وہاں موجود تھیں اور مکہ کے بعض لوگ ان سے متعلق تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت خباب بن الارت تلواریں تیار کرتے تھے۔ تعمیر وغیرہ میں جس کی ضرورت ہر شخص کو پیش آتی ہے رومی اور ایرانی مزدوروں سے کام لیا جاتا تھا۔

ناخواندگی وہاں عام تھی۔ لیکن کچھ لکھنے پڑھنے والے لوگ موجود تھے۔ قرآن مجید نے اسی لئے ان کو امی یعنی ناخواندہ سے تعبیر کیا ہے۔ "ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ" (الجمعہ ۲) (وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں

انھیں میں سے ایک پیغمبر بھیجا۔)

مکہ والے پورے جزیرۃ العرب میں حسن ذوق لطافت طبع اور آرائش و تجمل میں ممتاز سمجھے جاتے تھے جیسا کہ تقریباً ہر قدیم تہذیب رکھنے والے دارالسلطنت اور پایۂ تخت کا حال ہوتا ہے۔

جہاں تک ان کی زبان کا تعلق ہے اس کو سند اور میزان کا درجہ حاصل تھا اور جزیرۃ العرب کے اطراف و اکناف میں اسی پر اعتماد کیا جاتا تھا، مکہ کے باشندے سب سے زیادہ فصیح و بلیغ، اور قادر الکلام تھے اور ابتذال و سوقیانہ پن نیز عجمی اثرات سے بہت دور اور محفوظ رہتے، تناسب الاعضاء و جسمانی ساخت حسن و جمال نیز اعتدال و توازن میں بھی دوسرے علاقوں کی بہ نسبت وہ زیادہ ممتاز تھے، اور جوانمردی و عالی ظرفی کے ان اعلیٰ صفات کے حامل تھے جس کو عربی میں "الفتوۃ" اور "المروۃ" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جن کا ذکر عرب شعراء اور خطباء نے بار بار کیا ہے اس لئے وہ خیر و شر دونوں میدانوں میں سب کے استاد تھے۔

ان کی دلچسپی کے موضوعات میں بالترتیب انساب، اخبار عرب شعر و شاعری، علم نجوم، چھینک، پرندوں سے شگون لینے اور کسی قدر طب و علاج جو ان کے تجربات اور بزرگوں کی روایات پر مبنی تھا، اور بہت کچھ شہسواری گھوڑوں کی پہچان، اس کے اعضاء و صفات سے گہری واقفیت اور قیافہ شناسی جیسے علوم شامل ہیں، علاج و معالجہ کے جو طریقے ان میں رائج تھے، ان میں داغنے، فاسد عضو کو کاٹنے، فصد کھلوانے، پچھنا لگوانے اور استعمال ادویہ کا ذکر آتا ہے

جنگی طاقت

جہاں تک جنگی طاقت کا تعلق ہے، قریش طبعاً امن پسند اور عافیت کوش تھے، دوسری معاصر قوموں کی طرح ان کی معیشت کا زیادہ تر انحصار تجارت کے فروغ، قافلوں کی مستقل آمد و رفت، بازاروں اور منڈیوں کی تنظیم اور تاجروں اور سیاحوں کی آمد پر تھا، جس سے ان کی مذہبی عظمت و اہمیت میں بھی اضافہ ہوتا تھا، اور اقتصادی منفعت بھی حاصل ہوتی تھی، اور ہر طرح کا رزق مختلف جہتوں سے وہاں پہونچتا رہتا تھا، اللہ تعالٰے کا ارشاد ہے:۔

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ	تو چاہیے بندگی کریں اس گھر
الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ	کے رب کی جس نے ان کو کھانا
وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ ○	دیا بھوک میں، اور امن دیا
	ڈر میں۔

(سورۂ قریش ۳-۴)

عرب کی طویل اور خوں ریز جنگوں کی وجہ سے بھی جن کا سلسلہ تیس تیس چالیس چالیس برس تک جاری رہا، اور جن کے نتیجہ میں (جیسا کہ جاہلی شاعر زہیر بن ابی سلمیٰ نے اپنے معلقہ میں اس کا تذکرہ کیا ہے) ہزاروں بچے یتیم اور ہزاروں عورتیں بے سہاگ اور بیوہ ہو گئیں، وہ جنگ کے خوفناک نتائج اور اس کے دور رس اثرات سے ناواقف نہ تھے، وہ مکہ کی حرب الفجار اور مدینہ کی جنگ بعاث کا حشر دیکھ چکے تھے کہ ان کا ان دونوں شہروں کی تمدنی، اقتصادی اور اخلاقی زندگی پر کیا اثر پڑا تھا، اس لئے ایک حقیقت پسند انسان کی حیثیت سے وہ عرب کے دوسرے جنگجو قبائل کی طرح

(جن کا پیشہ ہی جنگ تھا) بلا ضرورت جنگ کو دعوت دینے کے لئے تیار نہ تھے۔

دوسرے الفاظ میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ قریش (جب تک ان کی قبائلی ومذہبی عصبیت کو للکارا نہ جائے) "بقائے باہم" کے اصول پر کاربند تھے لیکن اسی کے ساتھ وہ قابلِ لحاظ فوجی طاقت کے بھی مالک تھے، شجاعت وبہادری میں ضرب المثل اور شہسواری میں فرد، چنانچہ "الغضبۃ القرشیۃ" (معرکی غصہ) پورے جزیرۃ العرب میں معروف تھا، اور زبان وادب اور محاورات وامثال میں شامل ہو گیا تھا۔

قریش نے اپنی اس ذاتی طاقت پر بس نہیں کیا، بلکہ وہ "احابیش" کی قابلِ لحاظ قوت سے بھی فائدہ اٹھاتے رہے جو کہ مکہ کے اطراف میں رہنے والے بعض عرب قبائل کنانہ اور خزیمہ بن مدرکہ کے بطن سے تھے، خزاعہ قریش کے حلیف تھے اس کے علاوہ قریش کے پاس غلاموں کی بھی بڑی تعداد تھی جو تمام لڑائیوں میں ان کے پرچم کے نیچے رہتے تھے، وہ بیک وقت کئی ہزار جنگجو میدان میں جھونک دیتے تھے، غزوۂ احزاب میں یہ تعداد دس ہزار تک جا پہونچی تھی اور یہ عہد جاہلیت کی تاریخ میں جزیرۃ العرب کی سب سے بڑی جنگی نفری تھی۔

مکہ جزیرۃ العرب کا ایک بڑا شہر اور اس کا روحانی وسماجی پایۂ تخت

اس مذہبی حیثیت ومرکزیت، معاشی فارغ البالی، تجارتی سرگرمیوں اور تمدن ومعیشت میں ترقی کی وجہ سے مکہ جزیرۃ العرب کا ایک بڑا شہر بن گیا تھا اور یمن کے مشہور شہر صنعاء سے آنکھیں ملا رہا تھا، اور جب چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں صنعاء پر یکے بعد دیگرے حبشہ اور ایران کا تسلط ہو گیا اور یہ دارالـ

غسان کی ریاستوں کی بھی وہ سابقہ شان و شوکت جاتی رہی تو اس وقت مکہ نے جزیرۃ العرب کے ایک ایسے مذہبی اور سماجی پایۂ تخت کی حیثیت اختیار کرلی جس میں اس کا کوئی شریک و ہمسر نہ تھا۔

اخلاقی پہلو

مکہ کا اخلاقی پہلو بہت کمزور تھا سوائے ان چند جاہلی روایات و اقدار کے جن کو وہ اپنے سینہ سے چپٹائے ہوئے تھا جوئے کا کاروبار ان میں عام تھا اور وہ اس پر فخر کرتے تھے شراب نوشی عام طور پر رائج تھی عیش و طرب اور رقص و نغمہ کی محفلیں بکثرت آراستہ ہوتی تھیں اور دور جام چلتا تھا بہت سے فواحش ظلم و سفاکی حق تلفی و ناانصافی اور ناجائز کمائی ان کے معاشرہ میں بری نظر سے نہ دیکھی جاتی تھی۔

اس اخلاقی پستی کی جو عام طور پر جزیرۃ العرب اور خاص طور پر اہل مکہ میں ہمیں نظر آتی ہے، سب سے سچی اور نازک تصویر وہ ہے جو قریش ہی کے ایک فرزند اور مکہ کے اصلی و قدیم ساکن جعفر بن ابی طالب نے نجاشی کے سامنے پیش کی تھی اور اس قوت کی عربی معاشرت اور جاہلی کردار کا نقشہ کھینچا تھا، ان کا بیان یہ تھا کہ:

"اے بادشاہ! ہم جاہلیت والی قوم تھے، بتوں کی پرستش کرتے تھے، مردار کھاتے تھے، ہر طرح کی بے حیائی کرتے تھے، رشتوں کو توڑتے تھے، پڑوسی کے ساتھ برا سلوک کرتے تھے اور طاقت ور کمزور کو کھاتا تھا"[1]

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۳۶

مذہبی پہلو

مذہبی پہلو (اخلاقی و تمدنی) زاویۂ نگاہ سے بدرجہا زیادہ کمزور تھا۔ اس کی
وجہ یہ تھی کہ عہد نبوت سے ان کا فاصلہ بہت بڑھ چکا تھا۔ جہالت عام تھی۔ بت پرستی
جو انھوں نے اپنے پڑوس کی قوموں سے سیکھ لی تھی، دلوں میں گھر کر چکی تھی۔ بتوں سے ان کو
ایک قسم کا عشق ہو گیا تھا۔ چنانچہ صرف کعبہ کے اندر اور صحن میں تین سو ساٹھ بت تھے،
جن میں سب سے بڑا ہبل تھا، جس کو مخاطب کرتے ہوئے ابوسفیان نے جنگ احد میں
کہا تھا: اُعْلُ ہُبَل (ہبل کی بڑائی ہو)۔ یہ بت کعبہ کے اندر ایک گڑھے کے اوپر تھا،
جس میں نذرانے وغیرہ جمع ہوتے تھے۔ یہ بت سرخ عقیق کا بنا ہوا تھا، انسان کی
شکل میں تھا، جس کا دایاں ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا۔ قریش نے اس کو اسی طرح سے پایا تھا،
اس لیے انھوں نے سونے کا ہاتھ لگوا دیا تھا۔ کعبہ کے سامنے دو بت رہتے تھے جن میں ایک
کا نام "اساف" تھا، دوسرے کا "نائلہ"۔ ایک کعبہ سے بالکل ملا ہوا تھا، دوسرا زمزم کے
پاس تھا۔ قریش نے کعبہ کے قریب والے بت کو بھی دوسرے بت کے پاس منتقل کر دیا،
یہ وہ جگہ ہے جہاں عرب قربانی وغیرہ کرتے تھے۔ صفا پر بھی ایک صنم تھا جس کا نام تھا
"نہیک مجاود الریح"، مروہ پر جو بت نصب تھا اس کا نام "مطعم الطیر" تھا۔
مکہ کے ہر گھر میں ایک بت تھا، جس کی یہ گھر والے عبادت کرتے تھے۔ عزیٰ عرفات کے
قریب تھا، اور اس پر ایک معبد بنا دیا گیا تھا۔ قریش کے نزدیک تمام بتوں سے زیادہ
معزز اور بڑا تھا۔ وہ ان بتوں کے سامنے تیروں سے فال نکالا کرتے تھے۔ "الخلصۃ"
مکہ کے نشیب میں نصب تھا، اس بت کو ہار پہنائے جاتے تھے، جو اور گیہوں کا نذرانہ

اس کو پیش کیا جاتا تھا اس کو دودھ سے نہلایا جاتا تھا اس کے لیے قربانی کی جاتی تھی اور اس پر بیشتر مرغ کے انڈے لٹکائے جاتے تھے بت گریں گلی گلی آوازیں دے کر بیچے جاتے تھے دیہات کے لوگ پسند کرتے خریدتے اور اپنے گھر کی زینت بناتے۔

اس طرح یہ قوم (اپنی ساری جوانمردی، وفاداری، جاں نثاری اور اپنے کریمانہ عربی اوصاف کے باوجود) بت پرستی، بتوں سے عشق و شیفتگی، اوہام و خرافات سے وابستگی، صحیح دینی مفہوم سے ناواقفیت اور پاکیزہ و نظیف و لطیف روحانیت اور ملت ابراہیمی سے دوری اور بے تعلقی کے اس پست درجہ پر تھی، جہاں دنیا کی بہت کم قومیں ہوں گی۔

یہ چھٹی صدی کے وسط کا عرب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اس کے سرد و تاریک افق سے آفتاب اسلام کے طلوع سے پہلے ہمیں نظر آتا ہے۔
اللہ تعالیٰ نے بالکل صحیح ارشاد فرمایا ہے:-

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ (سورۂ یٰسین-۶)	(یہ قرآن) خدائے غالب مہربان نے نازل کیا ہے تاکہ تم ان لوگوں کو جن کے باپ دادا کو متنبہ نہیں کیا گیا تھا متنبہ کردو وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

۱۔ اس فصل کی تفسیر و حدیث میں آنے والے اقتباسات کی رہنمائی سے نیز حقیقی معلومات پر جسے تیار کیا ہے مدد لی گئی ہے کتاب الاصنام لابن الکلبی (م ۲۰۴ھ) سیرت ابن ہشام ج۱ ص ۷۷ تا ۸۳، اخبار مکہ لابی الولید محمد الازرقی ج۱ ص ۱۲۳ تا ۱۳۰، بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب سید محمود شکری الآلوسی ج۲ ص ۱۹۷ تا ۲۲۲، نیز تاریخ مکہ از استاد احمد السباعی اور کتاب مکہ والمدینہ فی الجاہلیۃ و عہد الرسول از استاذ ابراہیم الشریف

ولادت باسعادت سے آغازِ نبوّت تک

عبداللہ اور آمنہ

قریش کے سردار عبد المطلب کے دس[1] صاحبزادے تھے جو سب ممتاز اور نامور تھے، عبداللہ اپنے سب بھائیوں میں بہت سی[2] خوبیوں اور صفات اور مرکزی حیثیت کے مالک تھے۔[3] اُن کے والد نے ان کی شادی بنی زُہرہ کے سردار وہب کی صاحبزادی آمنہ سے کی جو اس وقت اپنی عالی نسبی اور عزت و وجاہت میں قریش کی سب سے معزز خاتون سمجھی جاتی تھیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم شکمِ مادر میں تھے کہ آپ کے والد عبداللہ کا انتقال ہو گیا۔ حضرت آمنہ کو آپ کی ولادت سے پہلے ایسی بہت سی نشانیاں اور آثار نظر آئے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے فرزند کا مستقبل میں بڑی شان ہونی ہے۔[4]

آپ کی ولادت باسعادت اور عالی نسبی

آپ کی ولادت شریفہ ۱۲ ربیع الاول[5] عام الفیل (مطابق ۵۷۱ء عیسوی)

۱؎ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۰۸ ۲؎ ایضاً ص ۱۰۲ ۳؎ ایضاً ص ۱۵۸ ۴؎ مشہور روایت یہی ہے لیکن فلکیات کے مشہور مصری عالم اور محقق محمود پاشا کی تحقیق یہ ہے کہ آپ کی ولادت شریفہ دو شنبہ کے دن ۹ ربیع الاول کو واقعۂ فیل کے پہلے سال ہوئی جو ۲۰ اپریل ۵۷۱ء عیسوی کے مطابق ہے۔

دوشنبہ کے دن ہوئی یہ تاریخ انسانیت کا سب سے روشن اور مبارک دن تھا۔

آپ کا نسب مبارک اس طرح ہے محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرۃ بن کعب بن لوئی بن غالب بن فہر بن مالک بن النضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

عدنان کا نسب سیدنا اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام تک پہونچتا ہے[1] جب آپ کی ولادت ہوئی تو آپ کی والدہ ماجدہ نے آپ کے دادا کو یہ اطلاع بھجوائی وہ آئے محبت سے آپ کو دیکھا اور گود میں لے کر کعبہ کے اندر داخل ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی اور دعا کی[2] اور آپ کا نام محمد رکھا یہ نام بالکل نیا تھا چنانچہ عربوں کو اس پر بہت تعجب ہوا۔[3]

ایام رضاعت

چند دن آپ کو آپ کے چچا ابولہب کی باندی ثویبہ نے دودھ پلایا پھر عبد المطلب نے اپنے یتیم پوتے کے لئے (جن سے زیادہ وہ اپنی اولاد میں ان کو کوئی محبوب نہ تھا) دیہات

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱-۲ نیز سیرت تاریخ اور انساب کی دیگر اہم کتب ہم نے عدنان تک آپ کا نسب بیان درج کیا جس پر کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ [2] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۵۹-۱۶۰

[3] ابن کثیر ج ۱ ص ۲۱۰ و ابن ہشام ص ۱۵۹ سہیلی کی کتاب "الروض الانف" اور ابن فورک کی "الفصول" سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے پوری تاریخ عرب میں صرف تین آدمی ایسے ملتے ہیں جن کو اہل کتاب نے یہ بتا کر کہ جزیرۃ العرب میں ایک نبی ظاہر ہونے والے ہیں جن کا نام محمد ہوگا ان کو یہی بتایا تھا کہ اس کا وقت قریب ہے ان کی بیویاں حمل سے تھیں اس وقت اس امید میں انھوں نے یہ نذر مانی کہ لڑکا ہوا تو اس کا نام محمد رکھیں گے چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا بعض لوگوں نے اس سے زیادہ بھی تعداد بیان کی ہے لیکن راقم سطور کا خیال ہے کہ یہ مسئلہ ابھی بہت تحقیق طلب ہے اس لئے کہ قریش کے بزرگوں نے اس پر حیرت اور تعجب کا اظہار کیا تھا نیز اس روایت کی فنی جانچ پڑتال کی بھی ضرورت ہے۔

کی کسی دودھ پلانے والی کی تلاش شروع کی عرب اس زمانہ میں اپنے بچوں کی رضاعت اور ابتدائی پرورش کے لئے شہروں سے زیادہ دیہاتوں کو پسند کرتے تھے اس لئے کہ وہاں کی آب ہوا زیادہ صاف و پاکیزہ اور وہاں کے رہنے والوں کے اخلاق میں اعتدال اور سلامتی طبع زیادہ نمایاں تھی شہر کے مفاسد سے بھی حفاظت تھی اور وہاں کی زبان بھی صحیح اور فصیح مانی جاتی تھی۔

قبیلہ بنی سعد کی عورتیں اس کام میں اور فصاحت و بلاغت میں خاص شہرت رکھتی تھیں ان میں حلیمہ سعدیہ بھی تھیں جن کو یہ دولت عظمیٰ ہاتھ آئی یہ بچوں کی تلاش میں اپنے گاؤں سے آئی تھیں خشک سالی کا زمانہ تھا اور لوگ سخت پریشانی میں مبتلا تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ان سب عورتوں کے سامنے پیش کیا گیا، لیکن اکثر نے یہ سوچ کر کہ یتیم بچہ ہے اس کے والد ہوتے تو کچھ نفع کی امید تھی، ماں اور دادا سے کیا مل پائے گا؟ آپ کی طرف زیادہ التفات نہ کیا پہلے پہل حلیمہ نے بھی آپ کی طرف کچھ خاص توجہ نہ کی اور ان کا رخ بھی دوسری طرف ہونے لگا لیکن اچانک ان کے دل میں آپ کی محبت پیدا ہو گئی اور کوئی دوسرا بچہ بھی سامنے نہیں تھا، چنانچہ وہ واپس آئیں اور آپ کو لے کر اپنے قافلہ میں واپس گئیں اور اسی وقت آپ کی برکت کھلی آنکھوں انھوں نے دیکھ لی ان کی ہر چیز میں ایک دوسرا رنگ نظر آنے لگا ان کو دودھ میں جانوروں میں رزق میں ہر چیز میں صاف برکت محسوس ہوئی ان کے ساتھ کی جتنی دودھ پلانے والیاں تھیں اب انھوں نے کہنا شروع کیا کہ حلیمہ تم کو بہت مبارک بچہ ملا ہے بہت مبارک جان ہے ان کو بی بی حلیمہ سے حسد بھی ہونے لگا۔ دوسری طرف خیر و برکت کا سلسلہ برابر قائم رہا یہاں تک کہ بنی سعد کے

اس قبیلہ میں آپ کی عمر مبارک کے دو سال پورے ہو گئے اور بی بی حلیمہ نے آپ کا دودھ چھڑا دیا۔ آپ کا نشوونما عام بچوں سے مختلف طور پہ ہو رہا تھا۔ اس موقع پر وہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو لے کر آپ کی والدہ کے پاس حاضر ہوئیں اور ساتھ ہی یہ خواہش ظاہر کی کہ کچھ مدت کے لیے ان کو اور دے دیا جائے چنانچہ بی بی آمنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے پاس واپس لوٹا دیا۔

واپسی کے بعد جب آپ بنی سعد میں تھے، دو فرشتے آئے آپ کا سینۂ مبارک شق کیا، آپ کے قلب مبارک سے گوشت کے ٹکڑے یا لوتھڑے کی مانند ایک سیاہ چیز نکال کر پھینک دی، پھر آپ کے قلب کو خوب اچھی طرح دھو کر اور صاف کر کے اپنی جگہ واپس کر دیا، اور وہ اسی طرح ہو گیا جیسے پہلے تھا۔[۲]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے رضاعی بھائیوں کے ساتھ جنگل میں بکریاں بھی چرایا کرتے تھے، اور سادگی و جفا کشی، فطرت صحیحہ اور گاؤں کی صاف ستھری زندگی، شہر کی آلائشوں سے محفوظ آپ ہوا، اور فصاحت و بلاغت کے ماحول میں آپ کی پرورش ہوئی تھی جس میں بنی سعد کا بڑا نام تھا۔ آپ صحابۂ کرام سے

---

[۱] رضاعت کی یہ طویل و دلنواز کہانی سیرت ابن ہشام میں بہت اچھے انداز میں بیان کی گئی ہے دیکھیے ص ۱۶۲-۱۶۴

[۲] اس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں ملاحظہ فرمائیں، امام مسلم نے انس بن مالک کی روایت سے کتاب الایمان باب الاسراء برسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے تحت اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ فرشتے ظاہر ہوئے آپ کے سینۂ مبارک کو شق کر کے دل کو اس میں سے نکالا اور اس کو ایمان و حکمت سے بھر دیا۔ یہ عالم مثال اور عالم شہادت کے درمیانی حالات کا واقعہ ہے جس سے اس طرح کا تجربہ کی تعبیر جس کا عمر میں تجربہ ہوا ہے اس کو دہرایا، سینے کا اثر آپ کے سینۂ مبارک پر باقی رہا عالم مثال اور عالم شہادت جہاں ملتے ہیں وہاں اللہ تعالی کے علم کے مطابق ایسا ہی ہوتا ہے (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ باب ۸)

کبھی کبھی فرمایا بھی کرتے تھے "میں تم سب سے زیادہ عربی ہوں، قریشی ہوں اور بنی سعد بن بکر کے قبیلہ میں میں نے دودھ پیا ہے"[1]

بی بی آمنہ اور دادا عبدالمطلب کی وفات

جب آپ کا سن چھ سال کا ہوا تو آپ کی والدہ آپ کو آپ کے دادا کا ننھیال دکھانے کے لئے یثرب لے گئیں، وہ اپنے محبوب شوہر عبداللہ بن عبدالمطلب کی قبر پر بھی جانا چاہتی تھیں[2] مگر واپس ہوتے ہوئے ایک مقام پر جس کو "الابواء"[3] کہتے ہیں بی بی آمنہ کا انتقال ہو گیا، اب ایک طرف محبوب اور چاہنے والی ماں کی جدائی کا غم تھا، دوسری طرف مسافرت کی تنہائی، آپ کی ولادت سے برابر آپ کے ساتھ کچھ اسی قسم کا معاملہ پیش آتا رہا، یہ تربیت الٰہی کے وہ اسرار ہیں، جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، ایک باندی ام ایمن برکہ حبشیہ آپ کو لے کر مکہ آئیں، اور یہ خدائی امانت آپ کے دادا عبدالمطلب کے سپرد کی، اس کے بعد آپ دادا کے سایۂ شفقت میں رہے، جو آپ کو دل و جان سے زیادہ چاہتے تھے اور کسی وقت آپ سے غافل نہ ہوتے تھے، کعبہ کے سایہ میں اپنے فرش پر آپ کو اپنے ساتھ بٹھاتے اور طرح طرح سے محبت و شفقت کا اظہار کرتے۔

---

[1] ابن ہشام ج ۱ ص ۱۶۷ [2] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سفر کی کچھ باتیں بیان فرماتے تھے، ہجرت کے بعد آپ نے بنی النجار کے مکانات کو دیکھ کر فرمایا کہ میری ماں یہیں اتری تھیں اور بنی عدی کا یہ تالاب ہے جس میں میں نے خوب تیرنا سیکھا تھا (شرح المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۱۶۴-۱۶۵) [3] یہ مقام مستورہ کے قریب ہے جو اس وقت مکہ اور مدینہ کے درمیان کا مشہور منزل اور نصف راستہ ہے۔

جب آپ کی عمر مبارک آٹھ سال کی ہوئی تو دادا عبدالمطلب کا بھی انتقال ہوگیا اور آپ کو یتیمی کا ذائقہ پھر چکھنا پڑا جو پہلے سے زیادہ تلخ اور سخت تھا۔ اپنے والد کو تو آپ نے دیکھا بھی نہیں تھا، اور ان کی شفقت و محبت کے مزے سے بھی آپ ناواقف تھے اس لئے ان کے انتقال کا صدمہ عقلی اور روایتی سے زیادہ نہ تھا لیکن دادا کے لطف و محبت سے محرومی کا احساس حسی اور تجرباتی تھا، اور ان دونوں کا کھلا ہوا فرق ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

چچا ابوطالب کے ساتھ

دادا کے انتقال کے بعد آپ اپنے چچا ابوطالب[1] کے ساتھ رہنے لگے جو آپ کے والد کے حقیقی بھائی تھے عبدالمطلب ان کو آپ کی خبر گیری اور حسن سلوک کی وصیت برابر کرتے رہتے تھے اس لئے وہ یکسو ہوکر آپ کی طرف متوجہ ہوگئے اور اپنے صاحبزادوں علی، جعفر اور عقیل (رضی اللہ عنہم) سے زیادہ نرمی، شفقت اور نگہداشت و پرورش کا معاملہ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رکھا۔[2]

بیان کیا جاتا ہے کہ جس وقت ابوطالب تجارت کے لئے ایک قافلہ میں شامل ہوکر شام جانے لگے اس وقت آپ کی عمر نو یا بارہ سال[3] تھی، آپ یہ دیکھ کر اپنے چچا سے لپٹ گئے ابوطالب پر اس کا بہت اثر پڑا، اور انھوں نے اس سفر میں آپ کو اپنے ساتھ لے لیا۔

جب یہ تجارتی قافلہ بُصریٰ کے مقام پر پہونچا جو شامی علاقہ میں واقع ہے تو یہاں اس نے پڑاؤ کیا، یہاں ان کی ملاقات بحیری راہب سے ہوئی جو اپنے مسیحیوں کا عالم تھا

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۱۶۸-۱۶۹ [2] ایضاً صفحہ ۱۶۹ [3] زیادہ صحیح روایت کے مطابق۔

میں رہتے تھے بحیری راہب نے معمول کے خلاف قافلہ کی میزبانی کی اور بہت اچھی طرح اس کا استقبال کیا، اس لئے کہ ان کو اس قافلہ کے ساتھ خدا کا خاص معاملہ اور غیر معمولی واقعات نظر آرہے تھے، جب انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو آپ کی اور زیادہ پذیرائی کی، اور اس کا اطمینان کیا کہ نبوت کی نشانیاں آپ کے اندر موجود ہیں، انھوں نے ابوطالب کو آپ کے شان اور مرتبہ کی بلندی کی طرف متوجہ کیا اور کہا کہ اپنے بھتیجے کو لے کر وطن واپس جائیں، اور یہود سے آپ کی خاص طور پر حفاظت کریں، اس لئے کہ تمھارے بھتیجے کی آگے چل کر بڑی شان ہونے والی ہے، چنانچہ ابوطالب آپ کو بحفاظت گھر واپس لے آئے۔[1]

---

[1] یہ واقعہ سیرت ابن ہشام اور سیرت کی دوسری کتابوں میں بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور اس کی صحت میں محدثین ناقدین کو روایتاً و درایتاً دونوں لحاظ سے کلام ہے، علامہ شبلی نعمانی "سیرۃ النبی" میں لکھتے ہیں کہ "امام ترمذی اس حدیث کے بعد لکھتے ہیں 'حدیث حسن غریب لانعرفہ الامن ھذا الوجہ'" اس کے راویوں میں عبدالرحمن بن غزوان کا بھی نام آتا ہے جن کے بارے میں کلام کیا گیا ہے، علامہ ذہبی کہتے ہیں کہ وہ منکر احادیث روایت کرتے ہیں اور ان سب سے زیادہ منکر حدیث وہ ہے جس میں بحیری کا قصہ آیا ہے (ج ۱ ص ۱۰۱)

ایک اور بات قابل گرفت یہ ہے کہ اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ ابوطالب نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بلال کے ساتھ روانہ کیا، علامہ ابن القیم نے "زاد المعاد" میں لکھا ہے کہ ترمذی وغیرہ کی کتابوں میں یہ آتا ہے کہ انھوں نے آپ کے ساتھ بلال کو روانہ کیا، یہ بالکل غلط ہے، اس لئے کہ بلال شاید اس وقت موجود بھی نہ تھے اور اگر تھے بھی تو آپ کے چچا یا حضرت ابوبکر کے ساتھ ہرگز نہ تھے (زاد المعاد ج ۱ ص مستشرقین اور بہت سے مؤلفین ایسے مواقع ہمیشہ ڈھونڈتے رہتے ہیں جیسا کہ [illegible])

آسمانی تربیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نشو ونما خاص محفوظ و معصوم طریقے پر ہوئی۔

(باقی مقلّد کا) بحیرہ راہب سے آپ کی اس سرسری ملاقات کو، جس کے حقیقی اور علمی مرتبہ کا کچھ نام و نشان ہی نہیں ملتا) الصوفی رائی کا پربت بنا دیا اور اس پر پورا ہوائی قلعہ تعمیر کر لیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عقیدۂ توحید کی یہ تمنا ئے دل تعلیمات آپ نے در اصل بحیرہ عیسائی عالم سے حاصل کی ہیں اس سے زیادہ قابل تعجب بات یہ ہے کہ ایک فرانسیسی مستشرق CARRA DE VEAUX نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب تصنیف کی اور اس کا نام مصنف قرآن رکھا اور اس میں یہ دعویٰ کیا کہ اس مختصر ملاقات میں بحیرہ نے پورا قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو املا کرا دیا۔

اگر بحیرہ راہب سے ملاقات کا واقعہ صحیح بھی تسلیم کیا جائے تب بھی کوئی سمجھدار و عاقل شخص جس کے ہوش و حواس سلامت ہیں اور اس میں انصاف کا کوئی ذرہ موجود ہے اس بات پر یقین کرنے کا بھی روادار نہ ہوگا یہ بات کس کی عقل میں آ سکتی ہے کہ ایک کم سن بچہ جس کی عمر سب سے صحیح روایت کے مطابق نو سال اور زیادہ سے زیادہ بارہ سال بتائی گئی ہے ایک ایسے مسن راہب شخص سے جس کی زبان سے بھی وہ ناآشنا تھا اور جس کو صرف ایک وقت کے کھانے پر ساتھ بیٹھنے کا موقع ملا ہے ایسے دقیق و اہم مسائل و نازک تفصیلات پر تبادلۂ خیالات کرے گا، اور چھٹی صدی عیسوی میں عیسائیت کے مسخ شدہ مشرکانہ عقائد و خیالات کی ان باریکیوں سے آگاہ ہو جائے گا جہاں تک پروٹسٹنٹ مذہب کے بڑے بڑے پادریوں اور عالموں کی رسائی نہ ہو سکی، پھر تیس چالیس سال کے بعد جب بحیرہ راہب کی چند باتیں بھی حافظہ سے نکل چکی ہوں گی وہ قرآن کی شکل میں ان سب کو مرتب کر کے پیش کر دے گا!
یہ بات صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کو تعصب نے اندھا کر دیا ہو یا جہالت آرائی اور غرض پرستی پر تُلا ہو تصنیف کرنے میں اس کو کمال ہو اور اگر یہ قصہ سیرت کی کتابوں میں نہ ہوتا تو اس کو کسی بہانہ سے تراشتے۔

اور جاہلیت کی تمام پستیوں اور بُری عادتوں سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہمیشہ دور اور پاک رکھا۔ آپ اپنی قوم میں شریف ہی سے سب سے زیادہ حمیدہ صفات و عالی ہمت، حسنِ اخلاق سے آراستہ تھے اور راست گفتار، امانت دار اور بدکلامی اور فحش بیانی سے بہت دور سمجھے جاتے تھے یہاں تک کہ آپ کی قوم کے لوگ آپ کو امین[1] کے نام سے یاد کرنے لگے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان تمام باتوں اور جاہلیت کی عادتوں سے محفوظ رکھا تھا جو آپ کے شان و رتبہ کے مطابق نہ تھیں اگرچہ اس معاشرہ میں ان کے اندر کوئی حرج نہ سمجھا جاتا تھا، ان باتوں پر کسی کی نگاہ نہ پہنچتی تھی۔ آپ رشتوں کا خیال کرتے، لوگوں کا بوجھ ہلکا کرتے اور ان کی ضرورتیں پوری فرماتے، مہمان کا اکرام کرتے اور خیر و تقویٰ کے کاموں میں دوسروں کی مدد[2] کرتے، محنت کرکے روزی حاصل کرتے اور معمولی اور ضرورت بھر غذا پر اکتفا فرماتے تھے۔

آپ کی عمر چودہ (۱۴) یا پندرہ (۱۵) سال کی تھی کہ قریش اور قبیلہ قیس کے درمیان حربِ فجار شروع ہو گئی اور آپ نے اس کو قریب سے دیکھا بلکہ آپ دشمن کے استعمال کئے ہوئے تیروں کو قریش تک پہونچا لیتے تھے جو جنگ کا خاص طریقہ ہے۔ اس موقع پر آپ کو جنگ کا عملی تجربہ ہوا اور شہسواری و سپہ گری سے شناسائی ہوئی۔[3]

جب عمرِ مبارک کچھ اور زیادہ ہوئی تو آپ نے ذریعۂ معاش کی طرف توجہ کرنا ضروری سمجھا اور بکریاں چرانے کا پیشہ اختیار کیا جو اس زمانہ کا ایک شریفانہ

---

۱ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۸۳ ۲ ملاحظہ ہو حضرت خدیجہ کی شہادت جو انھوں نے آپ کے غارِ حرا سے واپسی پر آپ کے اخلاق کے بارے میں دی۔ ۳ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۸۶

ذریعہ معاش ہونے کے علاوہ نفسیاتی تربیت اور کمزوروں و محتاجوں پر شفقت و محبت کے جذبات پیدا کرنے تیز ہوا کا لطف لینے اور جسم کی تقویت و ورزش کا سامان بھی اپنے اندر رکھتا ہے اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ انبیاء کی سنت ہے چنانچہ نبوت کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں، پوچھا گیا کہ آپ نے بھی اے اللہ کے رسول؟ فرمایا ہاں میں نے بھی۔

آپ نے پہلے بنی سعد میں اپنے رضاعی بھائیوں کے ساتھ بکریاں چرائی تھیں اس لئے آپ اس کام سے کچھ ناواقف اور بے خبر نہ تھے صحاح سے ثابت ہے کہ آپ مکہ میں چند قیراط[1] کے عوض (جو آپ بکریوں کے مالکوں سے لیتے تھے) بکریاں چراتے تھے۔

حضرت خدیجہ سے رشتۂ ازدواج

جب آپ پچیس سال کے ہوئے تو حضرت خدیجہ بنت خویلد کے ساتھ آپ نے نکاح کیا۔ حضرت خدیجہ قریش کی بہت باثر و بارسوخ خاتون تھیں، اور نہم و فراست

[1] علامہ شبلی سیرت النبی جلد اول میں لکھتے ہیں کہ قراریط کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے ابن ماجہ کے شیخ سوید بن سعید کی رائے ہے کہ قیراط ایک سکہ ہے جو درہم یا دینار کا ایک جز تھا اسی بنا پر ان کے نزدیک حدیث کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اجرت پر بکریاں چراتے تھے اور اسی وجہ سے بخاری نے باب الاجارۃ میں اس کا ذکر کیا ہے ابراہیم حربی کی تحقیق یہ ہے کہ یہ اجیاد کے قریب ایک جگہ کا نام ہے ابن جوزی نے بھی اسی قول کو ترجیح دی ہے اور علامہ عینی نے بہت قوی اور قابل ترجیح دلائل کے ساتھ اسی رائے کی توضیح کی ہے نور النبراس کے مصنف نے بھی طویل بحث کے بعد اسی کو اختیار کیا ہے۔ [2] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۸۹

اخلاق کریمانہ نیز مال و دولت کے لحاظ سے بھی نامور تھیں، یہ بیوہ تھیں اور ان کے شوہر ابو ہالہ کا انتقال ہو چکا تھا، اس شادی کے وقت آپ کی عمر شریف پچیس سال اور حضرت خدیجہؓ کی چالیس سال تھی۔[1]

حضرت خدیجہ تجارتی کاروبار بھی کرتی تھیں روپیہ ان کا ہوتا تھا اور دوسرے لوگ محنت کرتے تھے اور اپنی محنت کا معاوضہ پاتے تھے، قریش بڑی تاجر قوم تھی، حضرت خدیجہ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی راست گفتاری، حسن اخلاق اور جذبۂ خیر خواہی کا علم بھی آپ کے سفر شام سے پہلے ہو چکا تھا، جب آپ ان کا مال لے کر بغرض تجارت شام گئے تھے اور اس سفر میں جو انوکھے واقعات پیش آئے تھے اس کا بھی ان کو علم تھا، چنانچہ انھوں نے آپ سے رشتہ کی خواہش کی، حالانکہ اس سے پہلے وہ قریش کے بڑے بڑے سرداروں کی درخواست کو نامنظور کر چکی تھیں، آپ کے چچا سیدنا حمزہ نے یہ پیغام آپ تک پہونچایا، ابو طالب نے خطبۂ نکاح پڑھا اور آپ کی ازدواجی زندگی کا آغاز ہوا، اور آپ کے صاحبزادے ابراہیم کو چھوڑ کر (جن کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا) آپ کی ساری اولاد ان ہی سے ہوئی۔[2]

کعبہ کی تعمیر نو اور ایک بڑے فتنہ کا سدباب

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک پینتیس سال[3] کی ہوئی تو

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۸۹-۱۹۰ و سیرت ابن کثیر ص ۲۶۳-۲۶۵ [2] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۸۹-۱۹۰ [3] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۹۰ و دیگر کتب سیرت۔

قریش نے کعبہ کی تعمیر نو کا ارادہ کیا اور اس پر چھت ڈالنے کی تجویز کی اس سے پہلے اس کی نوعیت یہ تھی کہ مٹی اور گارے سے جوڑے بغیر بھاری پتھر تلے اوپر رکھ دیئے گئے تھے جس کی بلندی قد آدم سے زیادہ نہ تھی اب اس کو منہدم کر کے از سر نو تعمیر کیا جانا تھا جب دیواریں بلند ہو کر حجر اسود کی بلندی تک پہونچیں تو حجر اسود کے معاملہ میں سخت اختلافات پیدا ہو گیا ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ اس کو یہ شرف حاصل ہو اور وہ اس کو اٹھا کر اس کی صحیح جگہ نصب کرے یہ معاملہ بڑھتے بڑھتے جنگ جدال تک پہونچا اور دور جاہلیت میں اس سے معمولی معمولی باتوں پر جنگیں ہو چکی تھیں یہ تو ایک بڑی بات تھی۔

غرض کہ جنگ کی پوری تیاری کر لی گئی بنو عبد الدار نے خون سے بھری ہوئی ایک بڑی لگن تیار کی اور انھوں نے اور بنو عدی نے مرتے دم تک لڑنے کا آپس میں معاہدہ کیا اور خون کی لگن میں ہاتھ ڈال کر یہ معاہدہ اور عہد و پیمان پختہ کیا یہ ایک بڑی تباہی اور عظیم فتنہ و فساد کا پیش خیمہ تھا قریش کئی روز تک اسی الجھن میں رہے پھر اس پر ان سب کا اتفاق ہو گیا کہ جو شخص مسجد حرام میں سب سے پہلے داخل ہوگا وہ اس بات کا فیصلہ کرے گا چنانچہ سب سے پہلے مسجد حرام کے دروازہ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے اور آپ کو دیکھتے ہی سب نے بے ساختہ کہا کہ یہ محمد الامین ہیں ہم ان پر راضی ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک چادر منگوائی حجر اسود اٹھا کر اپنے دست مبارک سے اس میں رکھا پھر فرمایا کہ ہر قبیلہ چادر کا ایک کونہ پکڑ کر اٹھائے سب نے ایسا ہی کیا جب وہ جگہ قریب ہو گئی جہاں اس کو نصب کرنا تھا تو آپ نے

اپنے ہاتھ سے اٹھا کر اس کو اس جگہ رکھ دیا۔ اس کے بعد باقی عمارت کی تعمیر ہوئی۔[1]

اس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قریش کو بڑے کشت و خون سے بچا لیا۔ آپ نے اس معاملہ میں جس حکمت اور تدبر سے کام لیا اس سے بڑھ کر کوئی حکمت اور تدبیر نہیں ہو سکتی تھی۔ نبوت کے بعد آپ نے تمام انسانوں اور دنیا کی قوموں کو جس طرح جنگوں کی بھٹی سے نجات دی، یہ واقعہ دراصل اسی کا پیش خیمہ اور مبارک آغاز تھا اور آپ کے فہم و تدبیر بہترین تعلیمات نرمی و تلطف اور دفع نزاع و صلح جوئی کا ترجمان و آئینہ دار۔ یہ وہ بات تھی جس نے آپ کو رحمۃ للعالمین کا منصب عالی عطا کیا اور آپ اس سادہ اور ان پڑھ قوم کے ان جنگجو اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے قبائل کے لئے نبی رحمت ثابت ہوئے۔

حلف الفضول

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حلف الفضول میں بھی شریک رہے جو عربوں کا سب سے شریفانہ اور یادگار معاہدہ تھا۔ اس کا قصہ یہ تھا کہ زبید کا ایک شخص مکہ میں کچھ سامان تجارت لے کر آیا اور قریش کے ایک سردار عاص بن وائل نے یہ سامان خرید لیا لیکن اس کا حق اس کو نہیں دیا۔ زبیدی نے سرداران قریش کی حمایت حاصل کرنا چاہی لیکن عاص بن وائل کی حیثیت و وجاہت کی وجہ سے انھوں نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور اس کو سخت سست کہہ کر

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۹۷-۱۹۹

واپس کردیا۔ اب زبیدی نے اہل مکہ سے فریاد کی اور پھر کچھ حوصلہ صاحب ہمت اور حق و انصاف کے حامی شخص سے جو اسے مل سکا شکایت کی۔ آخر کار ان لوگوں کی غیرت نے جوش کیا اور یہ سب لوگ عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہوئے۔ انھوں نے ان سب کی دعوت و ضیافت کی۔ اس کے بعد انھوں نے اللہ کے نام پر یہ عہد و پیمان کیا کہ وہ سب ظالم کے مقابلہ اور مظلوم کی حمایت میں ایک ہاتھ کی طرح رہیں گے اور کام کریں گے جب تک ظالم مظلوم کا حق نہ دے دے۔ قریش نے اس معاہدہ کا نام "حلف الفضول" یعنی فضول کا معاہدہ رکھا، اور کہنے لگے کہ انھوں نے ایک فالتو کام میں یا جو ان کے فرائض میں نہیں آتا دخل اندازی کی ہے[1]۔ پھر سب مل کر عاص بن وائل کے پاس گئے اور زبیدی کا سامان و اسباب اس سے زبردستی لے کر زبیدی کو واپس کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس معاہدہ سے بہت خوش تھے اور بعثت کے بعد بھی آپ نے اس کی تعریف و تحسین کی اور فرمایا: "میں عبداللہ بن جدعان کے مکان پر ایک ایسے معاہدہ میں شریک تھا جس میں اگر اس کا اسلام کے بعد بھی مجھے بلایا جائے تو میں اس کی تعمیل کے لئے تیار ہوں۔ انھوں نے اس پر یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ حق حقدار تک پہونچائیں گے اور یہ کہ کوئی ظالم مظلوم پر غلبہ حاصل کر سکے گا"[2]۔

---

[1] سیرت ابن کثیر ج ۱ ص ۲۵۷-۲۵۸۔ اس کی ایک وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ قریش سے پہلے قبیلہ جرہم نے بھی ایک ایسا معاہدہ کیا تھا۔ اس میں جو لوگ شریک تھے ان میں سے تین کا نام فضل تھا۔ اس مناسبت کی وجہ سے قریش کے اس معاہدہ کا نام بھی یہی پڑ گیا۔ (الروض الأنف شرح سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۹۱ کے علاوہ اس کی اور توجیہات بھی ہیں)

[2] سیرت ابن کثیر ج ۱ ص ۲۵۸

جزیرۃ العرب کے حالات اور حجاز یہ کے دینی، تہذیبی و سیاسی مرکز، مکہ مکرمہ
کے احوال پر نظر رکھنے والا جانتا ہے کہ اس حلف پر باضمیر لوگوں کی تیاری کا سبب
محض کسی فرد واحد یا چند لوگوں کی حق طلبی کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اس کا قوی محرک انتشار،
بدامنی، بے اصولی اور لاقانونیت کی وہ حالت تھی جو مکہ اور اس کے ماحول پر طاری
تھی نیز اس کا ایک اور محرک امن وامان کی ـــ خصوصاً حرب فجار کے بعد ـــ
ضرورت اور حقوق کے احترام اور مکہ آنے والے تاجروں اور کاریگروں کی
حفاظت و حمایت کی اہمیت کا احساس بھی تھا۔

مبہم بے چینی

آپ اپنے اندر ایک مبہم بے چینی محسوس کرتے تھے جس کا سبب اور سرچشمہ اور اس
کا مستقبل اور مآل کار آپ کو معلوم نہ تھا۔ آپ کے دل میں کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہ آتا
تھا کہ اللہ تعالیٰ وحی و رسالت سے آپ کو سرفراز فرمانے والا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا
مِّنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ
وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا
نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ
وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيمٍ ۝ (سورہ شوریٰ ۵۲)

اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے تمہاری
طرف روح القدس کے ذریعہ قرآن
بھیجا ہے تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور
نہ ایمان کو لیکن ہم نے اس کو نور بنایا
ہے کہ اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو
چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور بے شک
اے محمد تم سیدھا رستہ دکھاتے ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ	اور تمھیں امید نہ تھی کہ تم پر کتاب
الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ	نازل کی جائے گی مگر تمھارے پروردگار
فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝	کی مہربانی سے (نازل ہوئی) تو تم
(سورۂ قصص ۔ ۸۶)	ہرگز کافروں کے مددگار نہ ہونا۔

اللہ تعالیٰ نے کی خاص حکمت و تربیت تھی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نشوونما بحیثیت اُمّی کے ہوئی آپ نہ پڑھ سکتے تھے نہ لکھ سکتے تھے اس طرح آپ دشمنان اسلام کی تہمت طرازیوں اور افترا پردازیوں سے بہت دور اور محفوظ رہے قرآن مجید نے اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ	اور تم اس سے پہلے کوئی کتاب
كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ	پڑھتے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے
اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝	لکھ ہی سکتے تھے ایسا ہوتا تو اہل باطل
(سورہ عنکبوت ۔ ۴۸)	ضرور شک کرتے۔

قرآن مجید میں اسی لئے آپ کو اُمّی کا لقب دیا گیا اور ارشاد ہوا:۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ	وہ جو (محمد) رسول اللہ کی جو
النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ	نبی اُمّی ہیں پیروی کرتے ہیں
مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ	جن کے اوصاف کو وہ اپنے ہاں
وَالْاِنْجِيْلِ	تورات اور انجیل میں لکھا ہوا
(سورۂ اعراف ۔ ۱۵۷)	پاتے ہیں۔

بعثت کے بعد

انسانیت کی صبحِ صادق

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب وقت اپنی عمر کے چالیسؓ سال پورے کئے،
اس وقت دنیا آگ کی ایک خندق کے بالکل کنارے بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ لبِ بام
کھڑی تھی پوری نسلِ انسانی تیزی کے ساتھ خودکشی کے راستہ پر گامزن تھی یہ وہ
نازک وقت تھا جب انسانیت کی صبح صادق طلوع ہوئی محروم و بدنصیب دنیا کی
قسمت جاگی اور بعثتِ محمدی کا مبارک وقت قریب ہوا اللہ تعالےٰ کی سنّت بھی
یہی ہے کہ جب تاریکی بہت بڑھ جاتی ہے اور قلوب سخت اور مردہ ہونے لگتے ہیں تو
اس کی رحمت کا کوئی جاں نواز جھونکا چلتا ہے اور انسانیت کے خزاں رسیدہ چمن
میں پھر بہار آجاتی ہے۔

دنیا میں اس وقت جس جہالت اور جاہلیت کی حکمرانی تھی خرافات اوہام
اور شرک و بت پرستی کی وبا عام تھی اس کو دیکھ کر آپ کی بے چینی خالق کائنات اور
خالق ارض و سماوات کی ہدایات اور اس کے احکام کا انتظار انتہا تک پہنچ چکا تھا
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیبی طاقت اور غیبی آواز آپ کو چلا رہی ہے اور آپ کی
رہنمائی کر رہی ہے اور اس بڑے منصب کے لئے آپ کو تیار کر رہی ہے۔

اس زمانہ میں تنہائی اور خلوت پسندی آپ کا شیوہ اور معمول بن گئی تھی، اور آپ کو سب سے علیحدہ ہو کر تنہا بیٹھنے سے بڑا سکون ملتا تھا آپ مکہ سے بہت دور نکل جاتے یہاں تک کہ شہر کے مکانات بھی آپ کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے آپ مکہ کی گھاٹیوں اور اندر کی وادیوں سے گزرتے تو شجر و حجر سے آواز آتی کہ "السلام علیک یا رسول اللہ" آپ اپنے داہنے بائیں اور پیچھے مڑ کر دیکھتے تو درختوں یا پتھروں کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔[1]

غارِ حرا میں

آپ زیادہ تر غارِ حراء میں قیام فرماتے اور متواتر کئی کئی راتیں وہاں گذرتیں، اس کا انتظام پہلے سے آپ کر لیتے تھے یہاں آپ ابراہیمی طریقہ پر اور فطرتِ سلیم کی رہنمائی سے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے۔[2]

بعثتِ مبارکہ

اسی طرح آپ ایک بار غارِ حراء میں تشریف فرما تھے کہ منصبِ نبوت سے آپ کو سرفراز کرنے کی مبارک ساعت آپہونچی۔

یہ ۱۷ رمضان[3] آپ کی ولادت کے اکتالیسویں سال کا واقعہ ہے،

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۳۴-۲۳۵ صحیح مسلم میں آپ کا یہ قول بھی مروی ہے کہ میں مکہ کے ایک پتھر سے اب بھی واقف ہوں جو بعثت سے پہلے مجھے سلام کرتا تھا (کتاب الفضائل باب فضل نسب النبی صلی اللہ علیہ وسلم) [2] دیکھئے حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا ــــ صحیح بخاری (باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) [3] ابن کثیر ج ۱ ص ۳۰۲ روایت ابو جعفر محمد الباقر۔

(مطابق ۱۰ اگست ۶۱۰ء) جو حالت بیداری اور شعور کی حالت میں پیش آیا، آپ کے سامنے غار حرا میں فرشتہ آیا اور کہا کہ پڑھیے، آپ نے جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کے بعد اس نے مجھے پکڑ کر دبایا یہاں تک کہ میں نے اس کی تکلیف محسوس کی پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھیے! میں نے جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، اس نے پھر مجھے پکڑا اور اتنی زور سے لپٹایا کہ مجھ پر اس کا سخت دباؤ پڑا، پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھیے! میں نے کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، اس نے پھر مجھے پکڑ کر دوبارہ اسی طرح دبایا اور چھوڑ دیا اور کہا:۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ	(اے محمد) اپنے پروردگار کا نام لے کر
خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝	پڑھو جس نے عالم کو پیدا کیا جس نے
اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي	انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا،
عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ	پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے
مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝	جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا
(سورۂ علق ۱-۵)[1]	اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا
	اس کو علم نہ تھا۔

یہ نبوت کا پہلا دن تھا، اور پہلی وحی اور قرآن کا حصہ[2]

---

[1] ابن کثیر ج ۳ ص ۲۱۲ روایت ابو جعفر محمد باقر۔ [2] ایک عجیب بات جو دنیا کے تمام سمجھ دار اور فکر پسند اہل مذہب و ثقافت کے ہر شخص کی توجہ چاہتی ہے، وہ اس پہلی وحی میں قلم کا تذکرہ ہے جو ایک اُمّی پر ایک اُمّی قوم میں اور ایک ایسے ملک میں نازل ہوئی جہاں قلم کا وجود بھی کم یاب تھا اور جہاں پڑھے لکھے افراد انگلیوں پر گنے جاتے تھے، اس نے اس مذہب (باقی صفحہ ۱۴۶ پر)

حضرت خدیجہؓ کے گھر میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس عجیب واقعہ سے خوف زدہ ہو گئے اس لئے کہ ایسا نہ کبھی آپ کے ساتھ پیش آیا تھا، اور نہ آپ نے اس طرح کی بات کبھی سنی تھی، نبوت اور انبیاء علیہم السلام کے عہد پر ایک طویل عرصہ گذر چکا تھا چنانچہ آپ کو اپنے لئے خطرہ محسوس ہوا اور آپ اپنے گھر تشریف لے گئے، شدتِ خوف سے آپ کے شانہ مبارک پر کپکپی طاری تھی آپ نے پہونچتے ہی حضرت خدیجہ سے کہا کہ مجھے جلد اڑھادو، مجھے جلد اڑھادو، مجھے کچھ خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔

حضرت خدیجہؓ نے آپ سے اس کا سبب پوچھا تو آپ نے سارا ماجرا بیان کیا وہ ایک عقلمند اور ذی شعور خاتون تھیں، نبوت، انبیاء، اور فرشتوں کے بارے میں انھوں نے بہت کچھ سن رکھا تھا وہ اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس (جنھوں نے عیسائیت قبول کر لی تھی، صحفِ سماویہ کا مطالعہ کیا تھا اور اہلِ توریت اور اہلِ انجیل سے ان کی نشست و برخاست تھی) کبھی کبھی جایا کرتی تھیں اور اہلِ مکہ

(باقی صفحہ ۱۴۷ کا) اور اس کی حامل اُمّت کی قراءت و کتابت اور قلم سے کام لینے کی صلاحیت اور اس کے رسوخ اور مضبوط ربط و تعلق کی اور دوسرے سابقہ مذاہب کے برخلاف قرآن فہمی کی دعوت کا اور جو اس کی عالمی علمی و تصنیفی تحریک کا ایک رمز تھا جس کی اقوام و ملل کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

وہ رمز آیت عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ کا اس وحی میں شامل ہوا تھا جو طلبِ علم، ذوقِ جستجو اور نئی معلومات کی تلاش اور پچھلے زمانوں میں دریافت نہ ہو سکنے والے نکات اور نئے علمی حقائق کے عدم انکار کا محرک ثابت ہوا۔

کی نامناسب باتوں اور عادتوں کو پسند کرتی تھیں جن کو فطرت سلیم اور ذہن مستقیم رکھنے والا کوئی شخص طبعاً پسند نہ کرے گا۔

وہ آپ کے رشتۂ زوجیت، شب و روز کی رفاقت اور آپ کی ہر ظاہر و پوشیدہ چیز سے واقفیت نیز اس خصوصی اعتماد و تعلق کی وجہ سے جو ان کو حاصل تھا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ سے سب سے زیادہ واقف تھیں، آپ کے شمائل و خصائل کو دیکھ کر ان کو اس کا پورا یقین ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق ہر لحظ آپ کے شامل حال ہے، آپ اللہ تعالیٰ کے منتخب و مقبول بندے ہیں، اور آپ کی سیرت بھی محبوب و پسندیدہ سیرت ہے، اور جو شخص ایسے اخلاق اور ایسی سیرت والا ایسا اعلیٰ و پاکیزہ خصائل کا حامل ہو گا، اس پر کسی شیطان یا جن اور آسیب کا اثر ہرگز نہیں ہو سکتا، یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت و شفقت سے بعید اور اس کی سنت جاریہ کے منافی ہے، انھوں نے بڑے یقین و اعتماد کے لہجہ میں اور پوری قوت کے ساتھ کہا :

"ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی ذلیل و رسوا نہ کرے گا۔
آپ صلہ رحمی اور رشتہ داری کا پاس و لحاظ کرتے ہیں، دوسروں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں، محتاجوں کے کام آتے ہیں، مہمان کی ضیافت و خاطر مدارات کرتے ہیں، راہ حق کی تکلیفوں اور مصیبتوں میں مدد کرتے ہیں"[1]

ورقہ بن نوفل کی مجلس میں

حضرت خدیجہؓ نے یہ بات عقل سلیم اور فطرت صحیح نیز اپنی زندگی کے تجربوں

---

[1] صحیح بخاری (باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم)

اور لوگوں سے واقفیت کی بنیاد پر کہی تھی، لیکن یہ معاملہ بہت بڑا تھا، اور اس میں کسی ایسے شخص کے مشورہ کی ضرورت تھی، جو مذاہب اور ان کی تاریخ، نبوت اور اس کے مزاج نیز اہلِ کتاب سے اچھی طرح واقف ہو، جن کے پاس انبیاء کے واقعات اور ان کے علم کا کچھ اندوختہ موجود ہے۔

انھوں نے سوچا کہ اپنے عالم و فاضل چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل سے مدد لینی چاہیے، چنانچہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر ان کے پاس گئیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ورقہ کو پورا واقعہ سنایا، ورقہ نے سنتے ہی کہا، قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے آپ اس امت کے نبی ہیں، اور آپ کے پاس وہی ناموس اکبر آیا تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تھا، اور ایک زمانہ آئیگا کہ آپ کی قوم آپ کو جھٹلائے گی، اور ایذا پہونچائے گی، آپ کو نکالے گی، اور آپ سے جنگ کرے گی، جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ جملہ سنا کہ قوم آپ کو نکال دے گی تو آپ کو کچھ تعجب ہوا، اس لئے کہ آپ قریش میں اپنی حیثیت و مرتبہ سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ صادق و امین کہتے ان کی زبان نہ تھکتی تھی، آپ نے تعجب کے ساتھ پوچھا کہ کیا وہ مجھے نکال دیں گے؟ ورقہ نے جواب دیا کہ ہاں، جب بھی کوئی وہ پیغام لیکر آیا جو آپ لائے ہیں تو لوگوں نے اس کی دشمنی پر کمر باندھ لی اور اس سے جنگ کی، یہی ہوتا آیا ہے، اگر مجھے وہ دن نصیب ہوگا، اور میری زندگی نے وفا کی تو میں آپ کی پوری قوت کے ساتھ مدد کروں گا۔[1]

---

[1] ماخوذ از صحیح بخاری، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم، و سیرت ابن ہشام ص ۲۳۸

اس کے بعد ایک عرصہ تک وحی کا سلسلہ بند رہا پھر جاری ہوا اور قرآن مجید کا نزول شروع ہوا۔

حضرت خدیجہؓ کا قبول اسلام اور ان کا کردار

سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ نے اسلام قبول کیا اور رشتۂ زوجیت کی وجہ سے ان کو آپ کی خدمت و رفاقت اور نصرت و اعانت کا خوب موقع تھا اور انھوں نے ہر موقع پر آپ کی پشت پناہی اور حمایت کی اور لوگوں سے آپ کو جو تکلیفیں پہونچتی تھیں وہ ان کو ہمیشہ ہلکا کرنے کی کوشش کرتیں اور آپ کی ہمت بندھاتیں۔

حضرت علی اور زید بن حارثہ کا قبول اسلام

اس کے بعد حضرت علی بن ابی طالب اسلام لائے اس وقت ان کی عمر دس سال تھی، اسلام سے پہلے وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی گود میں کھیلے تھے آپ نے پریشانی و قحط سالی کے زمانہ میں ان کو ابو طالب سے مانگ لیا تھا اور اپنے گھرانہ میں شامل کر لیا تھا، اس کے بعد زید بن حارثہ (جو آپ کے غلام تھے اور آپ نے ان کو متبنٰی کیا تھا) اسلام لائے۔

ان حضرات کا قبول اسلام دراصل ایسے لوگوں کی شہادت اور گواہی تھی جو آپ سے سب سے زیادہ قریب تھے اور آپ کے صدق و اخلاص اور حسن کردار سے سب سے زیادہ واقف اور گھر والوں کی طرح ہر چھپی ڈھکی چیز سے باخبر تھے۔

۱؎ سیرت ابن ہشام ص ۲۴۵ ۲؎ ایضاً ص ۲۴۷

حضرت ابوبکرؓ کا قبول اسلام اور دعوت الی اللہ میں ان کا حصہ

حضرت ابوبکرؓ بن ابی قحافہ کا قبول اسلام بھی کچھ کم اہم نہ تھا اس لیے کہ ان کی دانش مندی، فہم و فراست، عالی ہمتی اور اعتدال و میانہ روی کی وجہ سے قریش میں ان کو ایک خاص درجہ حاصل تھا، انھوں نے اسلام کا اعلان و اظہار بھی کیا، وہ بڑی محبوب و دلکش شخصیت اور سادہ طبیعت کے مالک تھے قریش کے انساب و تاریخ سے واقف تھے اور ایک با اخلاق و کامیاب تاجر بھی چنانچہ اپنے اعتماد کے لوگوں، جاننے پہچاننے والوں اور اپنے پاس اٹھنے بیٹھنے والوں میں انھوں نے اسلام کی تبلیغ شروع کی[1] سن رسیدہ و بالغ مردوں میں وہ پہلے مسلمان تھے۔

شرفائے قریش کا قبول اسلام

ان کی تبلیغ و دعوت سے قریش کے بہت سے نامی گرامی سردار اسلام لائے جن میں عثمان بن عفانؓ، زبیر بن العوامؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، طلحہ بن عبیداللہؓ قابل ذکر ہیں حضرت ابوبکرؓ ان لوگوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے اور انھوں نے اسلام قبول کیا۔[2]

ان کے بعد بھی قریش کے اور بہت سے لوگ جن میں سے متعدد بڑی عزت و مرتبے کے مالک تھے اسلام لائے ان میں چند کے نام یہ ہیں، ابو عبیدہ بن الجراحؓ، ارقم بن ابی الارقمؓ، عثمان بن مظعونؓ، عبیدہ بن الحارثؓ بن عبدالمطلب،

---

[1] سیرت ابن ہشام ص ۲۴۹-۲۵۰ [2] ایضاً ص ۲۵۰-۲۵۱

سعید بن زید، خباب بن الارت، عبد اللہ بن مسعود، عمار بن یاسر، صہیب وغیرہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

اس کے بعد لوگوں نے بڑی تعداد میں اسلام قبول کرنا شروع کیا، پوری کی پوری جماعتیں اور وفود اسلام لاتے اور ان میں عورت و مرد دونوں ہوتے یہاں تک کہ اسلام کی آواز مکہ کی فضا میں آسانی سے بلند ہونے لگی اور جگہ جگہ اس کا چرچا ہونے لگا۔[1]

کوہ صفا پر پہلا اعلان حق

ابتدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعوت و تبلیغ کے اس کام کو چھپ کر کرتے رہے اور تین سال اس حال میں گذر گئے، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو اس کے برملا (اظہار و اعلان) کا حکم ہوا اور ارشاد ہوا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ	پس جو حکم تم کو خدا کی طرف سے ملا ہے
عَنِ الْمُشْرِكِينَ ۝	وہ (لوگوں کو) سنا دو اور مشرکوں کا
(سورۂ حجر- ۹۴)	(ذرا) خیال نہ کرو۔
وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ	اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈر
وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ	سنا دو اور جو مومن تمہارے پیرو ہو گئے
مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (سورۂ شعراء- ۲۱۴)	ہیں ان سے تواضع سے پیش آؤ۔
وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ ۝	اور کہہ دو کہ میں تو علانیہ ڈر سنانے
(سورۂ حجر- ۸۹)	والا ہوں۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ص ۲۶۲

اس حکم کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کوہ صفا کی چوٹی پر چڑھے اور بلند آواز میں یہ صدا لگائی "یا صباحاہ" یہ نعرہ عربوں کے لئے جانا پہچانا تھا اور اس وقت لگایا جاتا تھا جب کسی دشمن یا غنیم کے حملہ کا فوری خطرہ ہوتا "یا صباحاہ" کا نعرہ سننا تھا کہ قریش کا سارا قبیلہ وہاں جمع ہو گیا جو کسی وجہ سے نہیں آسکا اس نے اپنا نمایندہ بھیجا۔ اس وقت آپ ان سے مخاطب ہوئے اور ارشاد فرمایا :۔

"اے بنی عبد المطلب! اے بنی فہر! اے بنی کعب! اگر میں تم کو یہ اطلاع دوں کہ اس پہاڑ کے دامن میں ایک لشکر کھڑا ہے اور تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو کیا تم اس بات پر یقین کروگے؟"

عرب حقیقت پسند اور عملی لوگ تھے انھوں نے ایک شخص میں سچائی امانت دیانت اور خیر خواہی کا بار ہا تجربہ کیا تھا جب انھوں نے دیکھا کہ یہ شخص (جس کے متعلق اب تک ان کی یہ رائے رہی ہے) پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہے اور پہاڑ کی دوسری طرف بھی اس کی نظر ہے وہ صرف اپنے سامنے کی چیز دیکھ رہے ہیں تو ان کی ذہانت انصاف پسندی اور اس امین وصادق مخبر کی اطلاع وخبر نے ان کی رہنمائی کی اور ان سب نے کہا کہ ہاں ہم یقین کریں گے۔

دعوت وتربیت کا حکیمانہ انداز

جب یہ فطری اور ابتدائی مرحلہ طے ہوا اور سننے والوں کے اعتماد ویقین کا علم ہو گیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "فَاِنِّیْ نَذِیْرٌ لَّکُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ" تو یہ سمجھو کہ میں تم کو ایک سخت عذاب سے ڈرانے اور آگاہ کرنے

آیا ہوں جو بالکل تمہارے ہاتھوں کے سامنے ہے۔

یہ دراصل منصب نبوت کی صحیح تعریف اور نشان دہی تھی اور غیبی حقائق اور دینی علوم میں نبوت کو جو خصوصیت و انفرادیت حاصل ہے اس کی بڑی حکمت و بلاغت کے ساتھ ترجمانی جس کی نظیر ہم کو مذاہب اور نبوت کی تاریخ میں نہیں ملتی واقعہ یہ ہے کہ اس سے مختصر و آسان راستہ SHORT CUT اور اس سے زیادہ قابل فہم اور واضح پیرایہ بیان کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ سنتے ہی مجمع پر ایک خاموشی چھا گئی لیکن ابولہب نے کہا سارے دن تمہارے لئے خرابی ہو کیا صرف یہی کہنے کے لئے تم نے ہمیں بلایا تھا۔[1]

اس طریقے سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک بے نظیر پیغمبرانہ حکمت کے ساتھ ان کو اس حقیقت پر متنبہ کیا کہ سب سے خطرناک دشمن خود ان کے اندر چھپا ہوا اور ان کے گھروں میں بیٹھا ہوا ہے حقیقتاً اس سے ڈرنے اور اس کے گزند سے بچنے کی ضرورت ہے کسی پہاڑ کی کمین گاہ یا کسی دیوار کی اوٹ میں بیٹھنے والے اور مناسب وقت پر چھاپہ مارنے والے دشمن کی جانی و مالی تاخت اور جو نقصان وہ پہونچا سکتا ہے اس کی اس تباہ کن و خونخوار دشمن کے سامنے کیا حقیقت ہے جو ان کے تمدن میں موجود ہے؟ اس کائنات کے خالق و حاکم اور اپنے محسن و منعم کی ذات و صفات حقوق و فرائض اور اس کے اسمائے حسنیٰ سے غفلت، کھلی

---

[1] یہ واقعہ ابن کثیر ج ۱ صفحہ ۴۵۶-۴۵۵ میں امام احمد بن حنبل کی روایت سے نقل کیا گیا ہے جو حضرت ابن عباس سے اس کی روایت کی ہے ابن کثیر کہتے ہیں کہ شیخین (امام بخاری ؒ امام مسلم) نے بھی اس مفہوم کی روایت اعمش سے کی ہے۔

شرک و بت پرستی، اندھا دھند نفس اور خواہشات کی غلامی، اوہام و خرافات کی پیروی، حدود الٰہیہ سے تجاوز اور ممنوعات و محرمات، ظلم و شقاوت، قطع رحمی و ناانصافی میں سر سے پاؤں تک ڈوبے رہنا، کسی گھات لگانے والے لشکر اور چھاپہ مار دستے سے زیادہ نقصان رساں اور خطرناک ہے جس کے اندیشہ سے ان کی نیند اڑ جاتی ہے اور اس کی اطلاع کی ایک آواز پر وہ دیوانہ وار دوڑ پڑتے ہیں۔

دشمنی و ایذا رسانی کا آغاز اور ابوطالب کی مدافعت و شفقت

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا برملا اور بلا خوف و خطر اعلان کرنا شروع کیا تو اس وقت تک آپ کی قوم نے اس کی زیادہ پروا نہیں کی اور اس کو زیادہ خطرہ محسوس نہیں ہوا اور انھوں نے اس کے رد اور جواب کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی لیکن جب آپ نے ان کے معبودوں کی مذمت کرنی شروع کی تو یہ بات ان کو بہت بری لگی اور وہ سب آپ کی مخالفت پر کمربستہ اور متحد ہو گئے۔

اس موقع پر آپ کے چچا ابوطالب آپ کی مدافعت کے لئے سینہ سپر ہو گئے اور آپ کے ساتھ بہت شفقت و نرمی کا معاملہ کیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے اس اعلانِ حق اور تبلیغ و دعوت میں جان و دل سے مشغول ہو گئے، اور آپ کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لائے دوسری طرف ابوطالب آپ کے لئے سینہ سپر ہو گئے اور آپ کی ہر طرح حفاظت کرتے رہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور ابوطالب کا مکالمہ

اب قریش میں ہر طرف اور ہر وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا چرچا ہونے لگا لوگ ایک دوسرے کو آپ کی مخالفت اور دشمنی پر آمادہ کرتے اور اس کے لئے فضا تیار کرتے چنانچہ ایک بار پھر یہ سب لوگ ایک پیادہ وفد بنا کر ابوطالب کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ :-

"اے ابوطالب آپ سن رسیدہ بزرگ ہیں اور ہماری نگاہ میں آپ کی خاص قدر و منزلت ہے ہم نے آپ سے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ آپ اپنے بھتیجے کو منع کر دیں لیکن آپ نے اس سلسلے میں کچھ نہ کیا اب خدا کی قسم ہم اس سے زیادہ صبر نہ کر سکیں گے جتنا صبر کا ثبوت ہم نے اب تک دیا ہے اب ہم اپنے آباء و اجداد کی مذمت اور ہمیں نا سمجھ و بے وقوف ٹھہرانے اور ہمارے معبودوں کو عیب لگانے کی کوشش زیادہ برداشت نہیں کر سکتے ، یا تو آپ ان کو اس حرکت سے باز رکھیں یا پھر ہم ان سے اور آپ سے سمجھ لیں گے یہاں تک کہ ہم میں سے کوئی ایک فریق ختم ہو جائے"[۱]

ابوطالب پر اپنی قوم کی جدائی اور دشمنی بھی شاق تھی اور وہ اس پر بھی راضی نہ تھے کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مدد سے ہاتھ اٹھا لیں اور ان کو قوم کے حوالے کر دیں، انھوں نے آپ کو بلا بھیجا اور کہا کہ :-

"میرے بھتیجے! تمھاری قوم کے لوگ میرے پاس آئے تھے ، اور ایسا ایسا

---

[۱] سیرت ابن ہشام صفحہ ۲۶۵-۲۶۶

کہہ دیے تھے، ذرا میری جان کا بھی خیال کرو اور اپنی جان کا بھی، مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جسے میں اٹھا نہ سکوں۔

اگر میرے داہنے ہاتھ میں وہ سورج رکھ دیں اور بائیں ہاتھ میں چاند

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ سن کر خیال ہوا کہ شاید ابوطالب اب ان کے معاملہ میں متردد ہیں اور اب آپ کی زیادہ حمایت و پشت پناہی نہ کر سکیں گے، آپ نے فرمایا کہ:-

"چچا! خدا کی قسم اگر وہ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں اور یہ چاہیں کہ میں اس کام کو چھوڑ دوں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو غالب کرے یا میں اس راستے میں ہلاک ہو جاؤں، تب بھی میں اس سے باز نہ آؤں گا۔"

یہ کہہ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپ رو دیے۔ اس کے بعد آپ اٹھے اور تشریف لے جانے لگے، آپ کو اس طرح جاتا دیکھ کر ابوطالب نے آپ کو آواز دی اور کہا کہ میرے بھتیجے! آؤ، آپ سامنے تشریف لائے، انھوں نے کہا جاؤ اور جو تمہارا دل چاہے کہو اور جس طرح چاہو تبلیغ کرو، خدا کی قسم میں تم کو کبھی کسی کے حوالہ نہ کروں گا۔[1]

قریش کے ہاتھوں مسلمانوں پر مظالم

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دعوت الی اللہ کا کام پورے زور شور سے

---

[1] سیرت ابن ہشام صفحہ ۲۶۵-۲۶۶

شروع کردیا جب قریش آپ سے اور آپ کے چچا ابوطالب سے مایوس ہو گئے تو ان کا سارا غصہ ان کے قبیلے کے ان افراد پر اترنے لگا جنھوں نے اسلام قبول کیا تھا اور ان کا کوئی حامی نہ تھا۔

ہر قبیلہ اپنے قبیلے کے ان اشخاص پر ٹوٹ پڑا جنھوں نے اسلام قبول کیا تھا ان کو قید، زد و کوب، بھوک پیاس اور مکہ کی سخت گرمی اور جھلسا دینے والی تپش کی اذیتوں سے دوچار ہونا پڑا۔

حضرت بلال حبشی کو جو اسلام لا چکے تھے ان کے آقا امیہ ٹھیک تپتی ہوئی دوپہر میں باہر لاتے پیٹھ کے بل لٹاتے پھر حکم دیتے کہ ایک بہت بڑا پتھر لا کر ان کے سینہ پر رکھا جائے پھر کہتے کہ نہیں! خدا کی قسم نہیں، تم کو اس وقت تک اسی حال میں رکھا جائے گا جب تک تمہارا دم نہ نکل جائے یا تم محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کا انکار کر دو اور لات و عزیٰ کی پرستش کرنے لگو، لیکن وہ اس سخت ابتلاء و آزمائش میں بھی اعلان توحید سے باز نہ آتے اور کہتے "احد احد" وہ ایک ہے وہ ایک ہے۔

اس حالت میں ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے گزرے اور امیہ کو ایک زیادہ مضبوط و توانا اور سیاہ فام غلام دے کر حضرت بلال کو آزاد کرا دیا۔[1]

بنی مخزوم عمار بن یاسر اور ان کے والد اور والدہ (اس لئے کہ یہ اسلام کی نعمت سے سرفراز ہو چکے تھے) کو باہر لاتے اور ان کو مکہ کی سخت گرمی اور تپش میں مختلف قسم کی تکلیفیں پہونچاتے اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ادھر گزر ہوتا تو فرماتے آل یاسر ذرا صبر! تمہاری منزل جنت ہے ان کی والدہ کو مشرکین نے اس وقت

---

[1] سیرت ابن ہشام صفحہ ۳۱۷-۳۱۸ ج ۱

شہید بھی کر دیا، اس حالت میں کہ وہ اسلام کے سوا ہر چیز کا انکار کر رہی تھیں۔[1]

مصعبؓ بن عمیر مکہ کے بہت خوش پوشاک نوجوان تھے اور ناز و نعم میں پلے تھے، وہ اپنے والدین کے بڑے لاڈلے تھے، ان کی والدہ صاحب ثروت تھیں اور ان کو اچھے سے اچھا لباس پہناتی تھیں، خوشبوؤں کے استعمال میں بھی اہل مکہ میں ان سے بڑھ کر کوئی نہ تھا، حضرمی جوتے جو بہت قیمتی ہوتے ہیں ان کے استعمال میں تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے تھے، میں نے مکہ میں مصعب بن عمیر سے زیادہ خوش وضع و خوبرو، جامہ زیب اور ان سے زیادہ نازپروردہ کسی اور کو نہیں دیکھا۔

مصعبؓ بن عمیر کو جب یہ اطلاع ملی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دار ارقم میں دعوت اسلام دیتے ہیں تو وہ بھی وہاں پہنچے، اسلام قبول کیا، اور آپ کی تصدیق کی، وہاں سے نکل کر یہ بات اپنی والدہ اور اپنی قوم کے ڈر سے ظاہر نہیں کی اور چھپ چھپ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملتے رہے، عثمان بن طلحہ نے ایک بار ان کو نماز پڑھتے دیکھ لیا، اور ان کی والدہ اور ان کے قبیلہ والوں کو خبر کر دی، وہ ان کو پکڑ لے گئے اور قید کر دیا، اور جب تک حبشہ کی طرف پہلی ہجرت نہ ہوئی وہ جیل ہی میں رہے، اس پہلے قافلہ کے ساتھ انھوں نے ہجرت کی، پھر مسلمانوں کے ساتھ اس شان سے واپس ہوئے کہ ان کی حالت یکسر تبدیل ہو چکی تھی، وہ زردی اور مرقع اسلامی کی جگہ کھردرا پن پیدا ہو گیا تھا، ان کی والدہ بھی اس تغیر حال کو دیکھ کر ان کو لعنت و ملامت کرنے سے باز رہیں۔[2]

بعض مسلمانوں نے مشرکین کی پناہ بھی لی تھی، یہ مشرکین قریش کے بااثر و ذی وجاہت سردار تھے، اور ان کی پوری حفاظت کرتے تھے، عثمان بن مظعون نے ولید بن المغیرہ کی

---

[1] سیرت ابن ہشام صفحہ ۳۱۹-۳۲۰۔ [2] طبقات ابن سعد ج ۳ صفحہ ۸۲، استیعاب ج ۱ صفحہ ۲۸۶

پناہ دی تھی لیکن ان کی غیرت نے اس کو گوارا نہ کیا، اور انھوں نے ان کی حمایت کی ذمہ داری ان کو واپس کر دی، انھوں نے کہا کہ مجھے اس کی خواہش اور تمنا ہوئی کہ میں عبداللہ کی پناہ نہ لوں، ان سے اور کسی مشرک سے کچھ بات ہوئی اس پر اس مشرک کو غصہ آگیا اور اس نے اٹھ کر ان کی آنکھ پر ایک ایسا طمانچہ مارا کہ آنکھ جاتی رہی، ولید بن المغیرہ قریب ہی بیٹھا دیکھ رہا تھا، اس نے کہا کہ خدا کی قسم میرے بھتیجے تمھاری آنکھ اس صدمہ سے محفوظ تھی، اور تم ایک مضبوط پناہ میں تھے (تم نے خواہ مخواہ اس حیثیت کو ذلت دی) حضرت عثمان بن مظعون نے جواب دیا کہ واللہ میری اچھی آنکھ بھی یہ تمنا کر رہی ہے کہ اس کے ساتھ وہی حادثہ پیش آئے، اور اے عبدشمس! میں تو اس کے جوار اور اس کی پناہ میں ہوں جو تم سے زیادہ صاحب عزت اور با اقتدار ہے۔[1]

جب حضرت عثمان بن عفانؓ اسلام لائے تو ان کو ان کے چچا الحکم بن ابی العاص بن امیہ نے خوب مضبوطی سے باندھ دیا، اور اس کے بعد کہا کہ تم اپنے آباء و اجداد کا دین چھوڑ کر ایک نئے دین کو اختیار کرتے ہو، خدا کی قسم میں تم کو اس وقت تک نہ کھولوں گا جب تک تم اپنے اس دین کو نہ چھوڑ دو گے، حضرت عثمانؓ نے کہا کہ واللہ میں اس کو کبھی نہ چھوڑوں گا، جب حکم نے اپنے دین پر ان کی یہ مضبوطی اور یہ یقین دیکھا تو ان کو رہا کر دیا۔[2]

خباب بن الارتؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن قریش کے لوگ مجھے پکڑ کر لے گئے، آگ جلائی اور اس میں مجھے گھسیٹ کر ڈال دیا، پھر ایک شخص نے میرے سینہ پر اپنا پیر اس طرح رکھ دیا کہ میری پیٹھ زمین سے بالکل لگ گئی۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱، ص ۳۷۰-۳۷۱ [2] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۳۷

پھر انھوں نے اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی تو معلوم ہوا کہ ساری پیٹھ پر چھری کے داغ پڑ گئے تھے۔[۱]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے قریش کی دشمنی اور ایذا رسانی کی مختلف کوششیں

جب ان نوجوانوں اور سرفروشانِ اسلام کو اسلام سے پھیرنے کی یہ کوششیں جو قریش کی طرف سے ہو رہی تھیں، ناکام ہوتی نظر آئیں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں بھی کوئی نرمی پیدا نہ ہوئی تو یہ بات اسلام کے دشمنوں پر بہت گراں گذری، انھوں نے کچھ بے وقوفوں اور اوباش لوگوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا، انھوں نے آپ کو جھٹلایا اور طرح طرح کی تکلیفیں دینا شروع کیں، آپ پر جادوگری اور شاعری، کہانت اور جنون کے الزامات لگائے اور آپ کی ایذا رسانی کے لئے نئے نئے طریقے استعمال کئے اور ہر قسم کے حربے آزمائے۔

ایک دن سردارانِ مکہ حجر[۲] میں جمع تھے کہ اچانک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور طواف کرتے ہوئے ان کے قریب سے گذرے، انھوں نے کچھ فقرہ بازی کی اور آپ پر طنز کیا، تین مرتبہ جب آپ ان کے قریب سے گذرے، انھوں نے اسی طرح آپ کا مذاق اڑایا، آخر میں آپ رک گئے اور فرمایا کہ قریش کے لوگو! کیا تم سنتے ہو، قسم اس کی

---

[۱] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۶۸ [۲] حجر حطیم اور دیوار کعبہ کی درمیانی جگہ کو کہتے ہیں، اس کا نام حجر اسماعیل بھی ہے، حطیم اس حصہ کا نام ہے جو کہ ان نیو دیوار اور کعبہ شریف کے درمیان ہے، اس کے دونوں کنارے بیت اللہ کی شمالی دیوار جہت سے ملتے ہیں، یہ پہلے کعبہ میں شامل تھا، جب بعثت سے قبل ایک سیلاب میں کعبہ کی دیوار منہدم ہو گئی اور قریش نے نئے سرے سے اس کی تعمیر کی تو حلال روپیہ کی کمی کی وجہ سے انھوں نے اس کو احاطہ ہی رہنے دیا اور بقیہ حصہ کو ایک چھوٹی سی دیوار سے گھیر دیا جو کمان کی شکل کی ہے۔

جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں تمھارے لئے ہلاکت لے کر آیا ہوں۔" آپ کے
ان الفاظ سے سب اس طرح خاموش ہو گئے کہ معلوم ہوتا تھا کسی میں جان ہی نہیں ہے۔
اس کے بعد انھوں نے آپ سے ملاطفت اور تملق کی باتیں کرنی شروع کر دیں۔

دوسرے روز بھی یہی قصہ پیش آیا۔ وہ لوگ اسی جگہ جمع تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ
علیہ وسلم تشریف لائے وہ سب ایک ساتھ آپ پر ٹوٹ پڑے اور آپ کو گھیر لیا۔ ان میں سے
ایک شخص نے آپ کی چادر پکڑ کر اس طرح کھینچنی شروع کی کہ گلوئے مبارک کو اذیت پہونچی
یہ دیکھتے ہی حضرت ابو بکر صدیقؓ آپ کے اور اس شخص کے بیچ میں آگئے اور رو رو کر
یہ کہنے لگے " اتقتلون رجلاً ان یقول ربی اللہ کیا تم ایک شخص کو محض اتنی بات پر
جان سے مار ڈالنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے" اس پر انھوں نے آپ کو تو
چھوڑ دیا لیکن حضرت ابو بکرؓ اس حالت میں گھر واپس ہوئے کہ ان کا سر کھل گیا تھا
ان کی داڑھی پکڑ کر کھینچتے ہوئے ان کو باہر لے جایا گیا۔

ایک دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نکلے تو آپ کو دن بھر سخت اذیتوں کا
سامنا کرنا پڑا۔ کوئی ایسا شخص (آزاد یا غلام) نہ ملا جس نے آپ کی تکذیب نہ کی ہو
اور آپ کو کسی نہ کسی قسم کی تکلیف نہ پہونچائی ہو۔ جب آپ اپنے گھر پر تشریف لائے تو
تکلیف کے اثر سے آپ چادر اوڑھ کر لیٹ گئے۔ اس وقت سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات
نازل ہوئیں اور آپ کو یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ کہہ کر خطاب کیا گیا۔[1]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۲۸۹-۲۹۱ امام بخاریؒ نے بھی یہ واقعہ
مختصراً بیان کیا ہے۔ باب مالقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ من
المشرکین بمکۃ۔

حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ کفار قریش کا معاملہ

ایک دن حضرت ابوبکرؓ ایک مجمع میں تبلیغ کی نیت سے کھڑے ہوئے اور اللہ اور اس کے رسول کی دعوت دینی شروع کی تو مشرکین غیظ و غضب کے عالم میں ان پر ٹوٹ پڑے اور ان کو بہت زیادہ زدوکوب کیا۔ عتبہ بن ربیعہ دو پیوند لگے پرانے جوتوں سے ان کے چہرے کو اس طرح مارتا رہا کہ بعد میں ان کے چہرے کے خدوخال پہچانے نہ جاتے تھے۔

بنو تیم حضرت ابوبکرؓ کو اس حالت میں اٹھا کر لے گئے کہ ان کو ان کی موت میں کوئی شبہ نہ تھا۔ دن ڈھلے آپ کو ہوش آیا اور پہلا لفظ جو آپ کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا کہ بتاؤ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خیریت سے ہیں؟ انھوں نے اس پر ان کو بُرا بھلا کہا کہ اس حال میں بھی ان کو اپنے سے زیادہ ان کی فکر ہے جن کی وجہ سے یہ ساری پریشانی اٹھانی پڑی۔ اسی وقت ام جمیل جو اسلام لا چکی تھیں ان سے قریب ہوئیں تو انھوں نے ان سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں دریافت کیا۔ انھوں نے کہا آپ کی والدہ قریب کھڑی ہیں یہ سن لیں گی تو انھوں نے کہا کہ ان کے سامنے کوئی حرج نہیں، ام جمیل نے بتایا کہ آپ بخیر و صحیح سالم ہیں، انھوں نے کہا میری اللہ سے نذر ہے کہ میں اس وقت تک نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیوں گا جب تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت بابرکت میں حاضر نہ ہو جاؤں لیکن وہ دونوں رکی رہیں جب لوگوں کی آمدورفت بند ہوئی اور سناٹا ہوا تو وہ دونوں حضرت ابوبکرؓ کو سہارا دے کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائیں۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر حضور پر بہت اثر ہوا، آپ نے ان کی والدہ کے لئے بہت دعا کی اور ان کو اسلام کی ترغیب

آمادہ کیا اور وہ اُسی وقت مسلمان ہو گئیں۔[1]

لوگوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بدگمان کرنے میں قریش کا تردد و پریشانی

قریش رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں بہت پریشان تھے اور اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آپ کی کیا ایسی بات بیان کریں جس سے لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں اور آپ کے پاس آنے سے باز آئیں، وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح ان قافلوں کو جو دور دور سے آتے تھے اور آپ کا پیغام سنتے تھے آپ سے دور رکھا جائے، وہ سب مل کر ولید بن المغیرہ کے پاس (جو اُن سب میں زیادہ معمر تھا اور حج کا موسم بھی آچکا تھا) پہنچے اور ان سے مشورہ چاہا، انھوں نے کہا کہ اے جماعت قریش! حج کا زمانہ آچکا ہے اس موسم میں عرب کے مختلف وفود آئیں گے اور ان سب کے کانوں میں یہ بات پہنچ چکی ہے اس لئے ان صاحب (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) کے بارہ میں کوئی ایسی متفقہ بات اور کوئی ایسا صیغہ طے کرو جس سے ایک دوسرے کی تکذیب نہ ہو اور سب ایک ہی بات کہیں، بہت دیر تک اس مسئلہ میں غور و خوض ہوتا رہا، اور مختلف تجویزیں سامنے آئیں لیکن ولید کو کسی بات پر اطمینان نہ ہوا، اور اُس نے اُن کی ساری تجویزوں کو ناقص ٹھہرایا، اب انھوں نے خود اس کی رائے پوچھی، اس نے جواب دیا کہ میرے خیال میں تو سب سے زیادہ دل لگنے والی بات یہی ہوگی کہ سب مل کر یہ کہو، وہ جادوگر ہے جادو کرنے آیا ہے، وہ اپنے جادو سے باپ بیٹے بھائی بھائی، میاں بیوی اور خاندان والوں میں جدائی پیدا کر دیتا ہے۔

یہ پیغام لے کر وہ وہاں سے واپس ہوئے، جب موسم حج کا آغاز ہوا اور قافلوں کی

---

[1] سیرت ابن کثیر ج ۱ ص ۳۳۲-۳۳۱

آمد شروع ہوئی تو یہ سب مختلف گزرگاہوں اور عام شاہراہوں پر بیٹھ گئے جو بھی مکہ آتا وہ اسے آپ کے پاس جانے سے روکتے اور یہ سب باتیں جو طے کی گئی تھیں دہراتے۔[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایذارسانی میں قریش کی سنگدلی و بے رحمی

قریش نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایذارسانی میں سنگدلی و بے رحمی کی انتہا کر دی مختلف طریقوں سے آپ کو سخت تکلیفیں پہنچائیں نہ قرابت اور رشتہ کا پاس کیا نہ انسانیت کا لحاظ۔

ایک مرتبہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں سربسجود تھے اور آپ کے قریب قریش کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے کہ عقبہ بن ابی معیط کہیں سے اونٹ کی ایک اوجھڑی لایا اور آپ کی پیٹھ پر پھینک دیا آپ اسی طرح سجدہ میں پڑے رہے یہاں تک کہ صاحبزادی فاطمہ رضی اللہ عنہا تشریف لائیں اور اس کو آپ کی پیٹھ سے ہٹایا اور جس نے یہ حرکت کی تھی اس کے لئے بددعا کی، آپ نے بھی ان لوگوں کے لئے بددعا کی۔[2]

حضرت حمزہ کا قبول اسلام

ایک دن ابوجہل صفا کے پاس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قریب سے گزرا اور آپ کو بہت برا بھلا کہا اور اذیت پہونچائی آپ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، تھوڑی دیر میں حضرت حمزہ تیر کمان لگائے ہوئے ایک شکار سے واپس آئے، یہ قریش کے سب بہادر اور حوصلہ مند نوجوان سمجھے جاتے تھے، ان کو عبداللہ بن جدعان کی باندی نے سب ماجرا

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۷۰ باختصار [2] بخاری کتاب ذکر ما لقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ من المشرکین بمکۃ۔

بنایا، وہ غصہ میں اسی وقت مسجد حرام میں داخل ہوئے، دیکھا کہ ابو جہل اپنے آدمیوں کے حلقہ میں بیٹھا ہوا ہے، وہ اس کے قریب گئے اور بالکل سر کے اوپر کھڑے ہو کر یہی کمان اس کے سر کے اوپر ماری اور اس کو سخت زخمی کر دیا، اور کہا کہ تمہاری یہ جرأت کہ تم ان کو برا بھلا کہو اور گالی دو حالانکہ میں ان ہی کے دین پر ہوں اور جو وہ کہتے ہیں وہی میں کہتا ہوں، ابو جہل خاموش رہا، حضرت حمزہ اسلام لے آئے اور قریش کو ان کی شجاعت رسوخ اور وجاہت کی وجہ سے اس بات سے سخت ضرب پہونچی۔[1]

عتبہ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بات چیت

جب قریش نے دیکھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حامیوں اور ایمان لانے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے تو عتبہ بن ربیعہ نے یہ تجویز پیش کی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کے ذریعہ مفاہمت کی کوئی شکل پیدا کی جائے اس نے قریش سے اجازت چاہی کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے مل کر کچھ پیش کش اور تجویزیں ان کے سامنے رکھنا چاہتا ہے، ممکن ہے وہ اس کو قبول کر کے اپنی دعوت و تبلیغ سے باز آجائیں، قریش نے اس کو اجازت دیدی اور اپنا نمائندہ بھی قرار دیا۔

عتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، آپ کے سامنے بیٹھ گیا اور کہا کہ میرے بھتیجے! تم ہمارے درمیان جس حیثیت کے مالک ہو اس کا تمہیں علم ہے، تم نے ایک بڑے جھگڑے کی بات اپنی قوم میں کھڑی کر دی ہے، تم نے ان کے شیرازہ کو

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۹۱-۲۹۲

متشرکیا، ان کو بے وقوف و جاہل ٹھہرایا، ان کے معبودوں اور ان کے مذہب کو عیب لگایا، ان کے اسلاف اور آباء و اجداد کے طریقہ کا انکار کیا، اب میں کچھ باتیں تمہارے سامنے رکھتا ہوں، ممکن ہے ان میں سے کوئی بات تمہارے لیے قابل قبول ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ابو الولید" کہو میں سن رہا ہوں!

اس نے کہا کہ میرے بھتیجے! جو طریقہ و دین تم لئے ہو اگر اس سے تمہارا مطلب مقصود مال و دولت ہے تو ہم یہ مال و دولت تمہارے لئے اتنا اکٹھا کر دیں گے کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ گے اگر عزت اور ناموری چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سردار تسلیم کر لیں گے اور کوئی فیصلہ تمہاری مرضی کے بغیر نہیں کریں گے اگر بادشاہت چاہتے ہو تو ہم تم کو بادشاہ بنا لیں گے اگر آسیب اور جن وغیرہ کا اثر ہے یہ بات ہے جس کا دفعیہ تمہارے پاس نہیں ہے تو اس کے لئے ہم معالجین فراہم کر سکتے ہیں اور اس پر پوری فیاضی سے اپنا مال خرچ کر سکتے ہیں یہاں تک کہ تم کو اس سے شفاء کامل حاصل ہو جائے۔

جب عتبہ سب کہہ چکا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا جو کچھ کہنا تھا تم کہہ چکے؟ اس نے کہا۔ ہاں!

آپ نے فرمایا اب مجھ سے سنو!!

اس کے بعد آپ نے سورۂ فصلت کی کچھ آیتیں سجدہ تک اس کے سامنے تلاوت کیں عتبہ کے کان میں جب یہ کلام پڑا تو اس نے خاموشی کے ساتھ اس کو سننا شروع کیا، اس نے دونوں ہاتھ پشت کی طرف ٹیک لئے تھے اور کان کلام ربانی سننے میں محو تھے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آیت سجدہ تک پہونچے تو آپ نے سجدہ فرمایا

اور ارشاد ہوا: اے ابو الولید تمھیں جو کچھ سننا تھا سن لیا۔ اب جیسا تم سمجھو۔

عتبہ جب اٹھ کر اپنے ساتھیوں میں آگیا تو لوگ اس کی صورت دیکھ کر کہنے لگے ہم قسم کھا کے کہتے ہیں کہ ابو الولید جس چہرے کے ساتھ گئے تھے یہ چہرہ اس سے بدلا ہوا ہے جب وہ بیٹھا تو لوگوں نے فوراً پوچھا ابو الولید کیا خبر ہوئی ہے؟ کہنے لگا خبر یہ ہے کہ میں نے ایک ایسا کلام سنا ہے جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں سنا تھا خدا کی قسم اے قریشیو! نہ وہ شعر ہے، نہ وہ سحر ہے، نہ کہانت اور علم نجوم ہے۔ میری بات مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اس پر انھوں نے اس کو برا بھلا کہنا شروع کیا اور انھوں نے کہا کہ واللہ اس کی زبان کا جادو تم پر چل گیا۔

اس نے کہا میری رائے یہی ہے اب جو تمھاری مرضی ہو کرو۔[1]

مسلمانوں کی حبشہ کی طرف ہجرت

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ آپ کے اصحاب و رفقاء کو سخت آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور آپ ان کی حفاظت و مدافعت پر قادر نہیں ہیں تو آپ نے ان سے فرمایا اگر تم لوگ حبشہ کی طرف نکل جاؤ تو اچھا ہے وہاں کا جو بادشاہ ہے اس کی وجہ سے کوئی دوسرے پر ظلم نہیں کرتا، وہ ملک اچھا ملک ہے یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ تمھارے لئے نجات و کشادگی کا کوئی سامان پیدا کر دے۔

اس موقعہ پر مسلمانوں کی ایک جماعت نے حبشہ کی طرف ہجرت کی، یہ اسلام میں پہلی ہجرت تھی، یہ دس آدمی تھے اور انھوں نے اپنا امیر عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۹۳-۲۹۴

کو مقرر کیا تھا۔ اس کے بعد جعفر بن ابی طالبؓ نے ہجرت کی، پھر بہت سے مسلمان یکے بعد دیگرے وہاں پہونچے ان میں سے کچھ لوگ تنہا تھے، اور کچھ اہل وعیال کے ساتھ تھے ان لوگوں کی جنھوں نے حبشہ کی ہجرت کی کل تعداد تراسی بتائی گئی ہے۔[1]

ہجرت حبشہ کا واحد محرک قریش کی ایذا رسانی سے نجات ہی نہ تھی بلکہ اسلام کی دعوت اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فکر کو عام کرنا بھی تھا۔

مہاجرین کی فہرست کے جائزہ سے اس کے دائرہ کی وسعت وتنوع کا اندازہ ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس میں معاشرہ کے تمام طبقات کی نمائندگی ہے امیر و فقیر بھی نظر آتے ہیں بوڑھے اور جوان بھی، مرد بھی اور عورتیں بھی، اور ان کی اکثریت کا تعلق مکہ کے قدیم خاندانوں سے تھا جس سے دعوت اسلامی کی زبردست تاثیر اور اس کی قوت و وسعت کا پتہ چلتا ہے۔

قریش کا تعاقب

قریش نے یہ دیکھا کہ مسلمان وہاں پہونچ گئے ہیں، اور آرام و سکون سے ہیں تو انھوں نے عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عمرو بن العاص بن وائل کو وہاں بھیجا، اور ان کے ساتھ نجاشی اور اس کے جنگجو سرداروں اور سپہ سالاروں کے لئے بہت سے تحائف اور ہدایا بھی بھیجے جو مکہ کی خاص سوغات سمجھے جاتے تھے، یہ دونوں نجاشی کے دربار میں حاضر ہوئے اس کے سپہ سالاروں اور سرداروں کو طرح طرح کے تحفے دے کر وہ پہلے ہی ہموار کر چکے تھے، بادشاہ کے دربار میں دونوں نمایندوں نے اپنی گفتگو

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۳۲۱-۳۲۲

اس طرح شروع کی :-

"بادشاہ معظم کے ملک میں ہمارے یہاں کے کچھ بے وقوف لڑکوں نے آکر
پناہ لی ہے جنھوں نے اپنا دین بھی چھوڑا ہے اور آپ کا دین بھی قبول نہیں کیا
بلکہ ایک نیا دین ایجاد کیا ہے جس کو نہ ہم جانتے ہیں نہ آپ ہمیں آپ کے
پاس ان کی قوم کے کچھ سربرآوردہ و ذمہ دار لوگوں نے (جو ان کے باپ چچا
اور قریبی عزیز ہوتے ہیں) بھیجا ہے تاکہ آپ ان لڑکوں کو واپس کردیں
اس لئے کہ یہ ان کے معاملات سے زیادہ واقف اور ان سے زیادہ قریب ہیں۔"

جو سردار بادشاہ کے گرد و پیش تھے یک زبان ہوکر بولے "یہ دونوں بالکل
صحیح کہہ رہے ہیں آپ ان کو ان کے سپرد کردیں" نجاشی کو اس بات پر بہت غصہ
آیا اور اس نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور یہ پسند نہیں کیا کہ جو اس کی
پناہ لینے آئے اس کو اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے! اس نے اس پر
قسم کھائی اور مسلمانوں کو بلایا اور اپنے پادریوں کو جمع کیا اور مسلمانوں کی طرف
روئے سخن کرتے ہوئے کہا، وہ دین کیا ہے جس کے لئے تم نے اپنی قوم کو چھوڑ دیا
ہے اور اس کو ترک کرنے کے بعد نہ میرے دین کو قبول کیا، اور نہ کسی اور معروف
دین و مذہب کو اختیار کیا ہے؟

جاہلیت کی تصویر کشی اور اسلام کا تعارف جعفر بن ابی طالبؓ کی زبان سے

اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی جعفر بن ابی طالبؓ
کھڑے ہوئے اور انھوں نے حسب ذیل تقریر کی :-

نے بادشاہ! ہم ایک جاہلیت والی قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، مردار
کھاتے تھے، ہر قسم کی بے حیائیوں اور گناہوں میں آلودہ تھے، ہم میں جو طاقتور
ہوتا وہ کمزور کو پچھاڑ کھاتا، ہم اسی حال میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم میں سے
ایک رسول بھیجا جس کے خاندان و نسب و حسب اور جس کی سچائی،
امانت داری اور عفت و پاکبازی سے ہم پہلے سے واقف تھے،
انھوں نے ہم کو یہ دعوت دی کہ ہم صرف ایک اللہ پر ایمان لائیں اور
اسی کی عبادت کریں اور ہم اور ہمارے باپ دادا جن بتوں اور پتھروں
کو پوجتے تھے اس کو بالکل چھوڑ دیں اور ان سے قطع تعلق کر لیں،
انھوں نے ہم کو سچ بولنے، امانت ادا کرنے، رشتہ داری کا خیال کرنے،
پڑوسی سے اچھا سلوک کرنے، ناجائز و حرام باتوں اور نا حق خون سے
پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے، بے حیائی کے کاموں، جھوٹ فریب، یتیم کا مال کھانے،
پاک دامن و پاکباز عورتوں پر الزام لگانے سے منع فرمایا، انھوں نے ہم کو
حکم دیا ہے کہ ہم صرف ایک اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی
شے کو شریک نہ ٹھہرائیں، انھوں نے ہم نماز کا، زکوٰۃ کا، روزہ کا حکم
دیا، اس موقع پر انھوں نے اس طرح کے دوسرے ارکان اسلام بیان کئے،
ہم نے ان کی تصدیق کی، ان پر ایمان لائے اور جو طریقہ اور تعلیم وہ اللہ
کی طرف سے لائے ہیں اس کی پیروی کی، صرف ایک اللہ کی عبادت
اختیار کی، اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کیا، جو انھوں نے حرام کیا
اس کو حرام مانا، جو انھوں نے حلال کیا اس کو حلال تسلیم کیا، اس پر

ہماری قوم ہماری دشمنی پر کمربستہ ہو گئی، انھوں نے ہم کو طرح طرح کی تکلیفیں پہونچائیں اور ہم کو اس دین سے پھیرنے کے لئے مختلف آزمائشوں میں ڈالا اور اس کی کوشش کی کہ اللہ کی عبادت کو چھوڑ کر ہم بت پرستوں کی عبادت کو اختیار کرلیں اور جن گناہوں اور جن جرائم کو پہلے جائز سمجھتے تھے پھر جائز اور حلال سمجھنے لگیں۔

جب انھوں نے ہمارے ساتھ بہت زور زبردستی کی ہم پر ظلم کیا، ہمارا جینا دوبھر کردیا اور ہمارے دین کے راستہ میں دیوار بن کر کھڑے ہو گئے تو ہم آپ کے ملک میں پناہ لینے کے لئے آئے، اور اس کے لئے آپ ہی کا انتخاب کیا، آپ کے جوار و پناہ کی خواہش کی، اے بادشاہ ہم یہاں یہ امید لے کر آئے ہیں کہ ہم پر کوئی ظلم نہ کیا جا سکے گا۔"

نجاشی نے یہ پوری تقریر بیکون و وقار سے سنی اور کہا کہ تمھارے نبی، اللہ کے پاس سے جو کچھ لائے ہیں، اس کی کوئی چیز تمھارے پاس ہے؟

حضرت جعفرؓ نے کہا کہ ہے۔

نجاشی نے کہا کہ مجھے وہ پڑھ کر سناؤ۔

حضرت جعفرؓ نے سورہ مریم کی ابتدائی آیتیں تلاوت کیں، تو نجاشی رو پڑا اور اس کے آنسوؤں سے اس کی داڑھی تر ہو گئی، اس کے دربار کے پادریوں پر بھی گریہ طاری ہو گیا، یہاں تک کہ ان کے (مذہبی) صحیفے آنسوؤں سے بھیگ گئے۔

حضرت جعفرؓ کی حکمت و بلاغت

شاہ حبشہ کے سامنے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی تقریر اور اسلام کی دعوت

اُن کی حکمت، موقع و محل کی رعایت اور نفسیات انسانی کی واقفیت کا دل آویز نمونہ ہے۔ اس سے لفظی بلاغت سے کہیں زیادہ عقلی بلاغت کا اظہار ہوتا ہے جس کی ہدایت ربانی اور تائید غیبی کے سوا کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی، اسی کے ساتھ اس سے حضرت جعفرؓ کی سلامتیٔ طبع اور دور اندیشی کا بھی پتہ چلتا ہے جس میں بنو ہاشم قریش پر اور قریش تمام عرب پر فائق تھے۔ اس موقعہ پر حضرت جعفرؓ نے اپنی تقریر کو عرب جاہلیت کی صورت حال پیش کرنے اور یہ بتانے تک محدود رکھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالےٰ نے رسول بنا کر بھیجا، آپ نے اللہ کی طرف بلایا اور دین حق کی دعوت، مکارم اخلاق کی تعلیم دی، جو لوگ اس پر ایمان لائے ان کی زندگیوں میں انقلاب عظیم رونما ہوا، یہ صورت حال کی ایسی وضاحت و تصویر کشی ہے جو ایک آپ بیتی کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کے بیان کرنے والے کی صداقت میں شبہ کی گنجائش نہیں، حکیمانہ دعوت و بیان حقیقت کا ایک ایسا اسلوب ہے جو پیش کرنے والے کے لئے نہ تو مشکلات و شبہات پیدا کرنے والا ہے نہ مخالفین و معترضین کو جرح کرنے اور سامعین کو مخالفت پر آمادہ کرنے کا موقعہ دینے والا ہے، ایک امر واقعہ اور ایک معاشرہ کی سچی سرگزشت ہے جس میں ایک نبی کی دعوت و تعلیم نے قبول کرنے والوں کو انسانیت کی پست ترین سطح سے اٹھا کر بلند ترین سطح پر پہونچا دیا جس کو جی چاہے اس کو جانچ لے اور اس انقلاب حال کو آنکھوں سے دیکھ لے۔[1]

وفد قریش کی ناکامی

نجاشی نے کہا کہ بلاشبہ یہ اور جو کچھ حضرت عیسیٰؑ لائے تھے ایک ہی نور کی

---

[1] "روائع من اسالیب الدعوۃ فی القرآن والسیرۃ" از مؤلف صفحہ ۱۲۲-۱۲۳

کر ان بھیج دو قریش کے دونوں قاصدوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہا تم یہاں سے چلے جاؤ خدا کی قسم میں ان کو تمہارے حوالے کرنے والا نہیں۔

اس موقع پر عمرو بن العاص نے اپنے ترکش کا آخری تیر چلایا، یہ ایک زہر میں بجھا ہوا تیر تھا۔ انھوں نے کہا کہ

بادشاہ سلامت! یہ لوگ حضرت مسیح کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہیں جن کا زبان سے نکالنا بھی مشکل ہے۔

نجاشی نے پوچھا کہ تم لوگ حضرت مسیح کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

جعفر بن ابی طالب نے جواب دیا ہم ان کے بارے میں وہی کہتے ہیں جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تعلیم دی ہے وہ اللہ کے بندے ہیں اس کے رسول ہیں اور اس کی روح اور کلمہ ہیں جو اس نے کنواری پاکیزہ مریم پر القا کیا، یہ سن کر نجاشی نے اپنا ہاتھ زمین پر مارا اور ایک تنکا اٹھا کر کہا کہ خدا کی قسم جو کچھ تم نے بیان کیا حضرت عیسیٰؑ اس سے اس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں ہیں۔

اس نے مسلمانوں کو بہت اعزاز و اکرام سے رخصت کیا، ان کو امان دی اور قریش کے وہ دونوں قاصد ذلیل و خوار ہو کر وہاں سے نکلے اور مسلمانوں نے بہت اچھے گھر اور اچھے پڑوس میں عزت کی جگہ پائی۔[1]

مسلمانوں کا جذبۂ احسان شناسی

اسی زمانہ میں نجاشی کے کسی دشمن نے اس پر حملہ کیا، مہاجر مسلمانوں نے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۳۴-۳۳۸ باختصار۔

دینے بارے میں نجاشی نے قابلِ تعریف موقف اور اس کے احسان کے جواب بالحق کا ساتھ دیا جو اسلام کی اخلاقی تعلیمات کے مطابق اور مسلمانوں کے اخلاق کے شایانِ شان تھا۔

حبشہ میں دین کی دعوت اور اسلام کا تعارف

حبشہ کی ہجرت سنہ ۵ نبوی میں ہوئی تھی جہاں جعفر بن ابی طالبؓ اپنے ساتھیوں کے ساتھ سنہ ۷ھ تک رہے اور وہ غزوۂ خیبر کے موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے، اس طرح وہ تقریباً پندرہ سال حبشہ میں رہے جو ایک طویل مدت ہوتی ہے جس سے حضرت جعفرؓ نے دعوتِ اسلامی کے سلسلہ میں ضرور فائدہ اٹھایا ہوگا کہ وہ ملک دوسرے نصرانی ممالک کے مقابلہ میں رواداری اور مظلوموں کو پناہ دینے میں خاص امتیاز رکھتا تھا، اور اس کا حاکم اپنے انصاف اور انسانیت کے لئے معروف تھا، مگر وہ زمانہ تفصیلی و تحریری تاریخ نگاری کا نہیں تھا، اس لئے اس کے ثبوت میں اگرچہ ہمارے سامنے تاریخی و دستاویزی حقائق تو نہیں ہیں لیکن یہ بات ہر طرح قرینِ قیاس ہے کہ انھوں نے اس طویل قیام سے (جس سے کوئی اور فائدہ اٹھانا مقصود نہ تھا) دین کی دعوت اور اسلام کے تعارف میں پورا فائدہ اٹھایا ہوگا۔

حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کا واقعہ

پھر اللہ تعالیٰ نے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے ذریعہ اسلام

لہ مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۲۰۲

اور مسلمانوں کی نصرت و حمایت کا غیبی سامان کیا۔ حضرت عمرؓ قبیلہ قریش کے ایک معزز شخص تھے' وہ بہت بارعب' پرجلال اور طاقتور شخصیت کے مالک تھے' رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کی بڑی خواہش اور آرزو تھی کہ وہ مسلمان ہو جائیں' آپ اس کے لئے دعائیں فرمایا کرتے تھے۔

ان کے اسلام لانے کا واقعہ یہ ہے کہ ان کی بہن فاطمہ بنت الخطابؓ اسلام لا چکی تھیں اور ان کے بعد ان کے شوہر سعید بن زیدؓ بھی مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے' لیکن دونوں نے اپنے قبول اسلام کو حضرت عمرؓ کے رعب و دبدبہ نیز اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ان کی سخت گیری کی وجہ سے اب تک ظاہر نہیں کیا تھا' خبابؓ بن الارتؓ فاطمہؓ کو قرآن پڑھاتے تھے۔

حضرت عمرؓ ایک مرتبہ تلوار لٹکائے ہوئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرامؓ کی تلاش میں نکلے' ان کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ یہ سب حضرات اس وقت صفا کے قریب کسی گھر میں جمع ہیں' راستہ میں ان کو نعیم بن عبد اللہ ملے جو ان ہی کے قبیلہ بنی عدی سے تعلق رکھتے تھے اور اسلام لا چکے تھے' انھوں نے پوچھا عمرؓ کہاں کا ارادہ ہے؟ کہنے لگے کہ (نعوذ باللہ) محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کا فیصلہ کرنے جا رہا ہوں' جس نے بے دینی اختیار کی' قریش کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا' ان کو جاہل دبے وقوت قرار دیا' ان کے دین کو عیب لگایا' معبودوں کو گالیاں دیں' آج ان کا قصہ ہی تمام کر دیتا ہے۔

نعیم نے کہا عمرؓ تم کس دھوکہ میں پڑے ہو' اپنے گھر والوں کی خبر لو اور پہلے ان کو ٹھیک کرو' حضرت عمرؓ نے پوچھا میرے گھر میں کون؟

انھوں نے جواب دیا "تمھارے بہنوئی اور چچا زاد بھائی سعید بن زید تمھاری بہن فاطمہ، یہ دونوں مسلمان ہو چکے ہیں اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کا دین اختیار کر چکے ہیں، پہلے ان کو دیکھ لو۔

حضرت عمرؓ الٹے پاؤں اپنی بہن اور بہنوئی کی طرف چل دیئے، اس وقت ان کے پاس خباب بن الارتؓ بیٹھے ہوئے تھے ان کے ساتھ ایک صحیفہ تھا جس میں سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی، اور وہ ان کو یہ سورہ پڑھا رہے تھے، جب ان کو حضرت عمر کی آہٹ محسوس ہوئی تو خبابؓ گھر کے ایک اندرونی کمرہ میں چھپ گئے، فاطمہ نے یہ صحیفہ جلدی سے ران کے نیچے دبا لیا، لیکن حضرت عمر نے خباب بن الارتؓ کی تلاوت و قراءت سن لی تھی، جب اندر داخل ہوئے تو پوچھا کہ "یہ کیا کھسر پھسر ہو رہی تھی؟" ان دونوں نے جواب دیا کہ کیا تم نے کچھ سن لیا؟ انھوں نے کہا "ہاں سنا ہے، اور مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم نے محمدؐ کا دین قبول کر لیا ہے" پھر وہ اپنے بہنوئی سعید بن زید کو مارنے دوڑے، ان کی بہن فاطمہؓ ان کو بچانے کے لئے اٹھیں، تو انھوں نے ان کی بھی خبر لی اور زخمی کر دیا۔

جب یہ سب کچھ کر چکے تو ان کی بہن اور بہنوئی نے کہا کہ ہاں بے شک ہم مسلمان ہو چکے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لا چکے ہیں، اب تم ہمارا جو چاہے کر لو۔

جب عمرؓ نے اپنی بہن کے جسم پر خون کے دھبے دیکھے تو ان کا جوش ٹھنڈا ہوا اور ان کو اپنے اس فعل پر ندامت سی ہوئی، وہ رک گئے، اور کہنے لگے، مجھے وہ صحیفہ دو جو ابھی میں نے پڑھتے ہوئے تم دونوں کو سنا تھا، میں دیکھوں کہ محمدؐ کی

تسلیم کیا ہے؟ حضرت عمرؓ پڑھے لکھے تھے، جب انھوں نے یہ کہا تو ان کی بہن بولیں کہ
ہمیں ڈر ہے کہ معلوم نہیں تم اس کے ساتھ کیا کرو، انھوں نے کہا تم ڈرو نہیں اطمینان
رکھو، انھوں نے اپنے معبودوں کی قسم کھا کر ان کو اس کا یقین دلایا، جب انھوں نے
ایسی باتیں کہیں تو ان کی بہن کو یہ لالچ ہوئی کہ شاید عمر اسلام لے آئیں، انھوں نے
نرمی سے کہا، بھائی جان آپ شرک کی وجہ سے نجس و ناپاک ہیں اور اس صحیفہ کو
صرف پاک آدمی چھو سکتا ہے۔

حضرت عمر کھڑے ہوئے، جا کر غسل کیا، تب ان کی بہن نے یہ صحیفہ ان کے
ہاتھ میں دیا، اس میں سورۂ طٰہٰ درج تھی، تھوڑا ہی سا پڑھا تھا کہ حضرت عمر
بول اٹھے کیا پاکیزہ اور لائق احترام کلام ہے؟

جب خبابؓ نے یہ سنا تو اپنے حجرے سے نکل کر سامنے آگئے اور کہنے لگے اے عمر!
خدا کی قسم مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی دعوت سے آپ کو سرفراز کرے گا
اس لئے کہ میں نے کل ہی حضورؐ کو یہ دعا کرتے سنا تھا، اے اللہ اسلام کی ابوالحکم بن
ہشام (ابوجہل) یا عمر بن الخطاب کے ذریعہ مدد فرما، اے عمر! اب تو تم کو کچھ اللہ کا
خوف اور شرم و لحاظ آنا چاہیے۔

اس وقت عمر نے کہا، خباب! مجھے محمدؐ کے پاس لے چلو، میں ان کے ہاتھ پر
اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں، خبابؓ نے کہا کہ وہ صفا کے پاس ایک گھر میں ہیں
آپ کے ساتھ اور کئی ہمراہی ہیں، حضرت عمرؓ نے تلوار حمائل کی، اور رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف چلے اور دروازہ پر دستک دی، جب انھوں نے ان کی آواز
سنی تو ایک صحابیؓ نے کھڑے ہو کر اور پہلے دروازہ کی دراز سے جھانک کر اطمینان

کرنا چاہا، دیکھا کہ وہ تلوار لٹکا کر آئے ہیں وہ گھبرائے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ! عمر بن الخطاب ہیں اور تلوار لٹکا کر آئے ہیں۔ حضرت حمزہؓ بولے آنے دو! اگر وہ نیک ارادے سے آرہے ہیں تو بسم اللہ اور نہیں تو ہم ان ہی کی تلوار سے ان کا کام تمام کر دیں گے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اجازت دے دو چنانچہ اہل صحابیؓ نے حضرت عمر کو آنے کی اجازت دے دی۔

حضرت عمر آنے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھ کر حجرہ میں ان سے ملے اور ان کا دامن یا گریبان مضبوطی سے پکڑ کر کھینچا اور فرمایا! ابن خطاب! یہاں کس ارادہ سے آئے ہو خدا کی قسم مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ جتا تم سے پہلے تمہیں کوئی سخت آفت یا مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

حضرت عمر نے کہا یا رسول اللہ میں آپ کے پاس اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے اور اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت اور تعلیم ان کے ذریعہ بھیجی ہے اس کو قبول کرنے حاضر ہوا ہوں۔

وہ بیان کرتے ہیں کہ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نعرۂ تکبیر بلند کیا، اس تکبیر سے اس گھر میں جتنے صحابہ کرام تشریف رکھتے تھے سب سمجھ گئے کہ عمرؓ مسلمان ہو گئے ہیں۔[1]

حضرت عمر کے اسلام لانے سے مسلمانوں کے اندر خودداری اور عزت نفس کا احساس پیدا ہوا، حضرت حمزہؓ پہلے ہی اسلام قبول کر چکے تھے، وہ جانتے تھے کہ کفار قریش پر اس واقعہ کا کتنا سخت ردِ عمل ہوگا اور عمرؓ کی زندگی میں اس کا

---

[1] سیرت ابن ہشام ص ۳۴۲-۳۴۳

کیا اثر محسوس کیا جائے گا، اور ان کا یہ خیال کچھ خوش فہمی پر مبنی نہ تھا اس لئے کہ مشرکین پر کسی شخص کا اسلام لانا اتنا شاق نہیں گذرا تھا، اور اس کو وہ اہمیت نہیں دی گئی تھی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کو دی گئی۔

حضرت عمرؓ نے اپنے مسلمان ہونے کا کھل کر اعلان کیا، یہ بات قریش میں فوراً پھیل گئی، وہ حضرت عمرؓ سے بھی لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے، اور حضرت عمرؓ بھی پوری طرح مقابلہ پر آ گئے، اور آخر کار مخالفین اور دشمنان اسلام شکست و نامراد ہو کر اور ہمت ہار کر بیٹھ رہے۔[۱]

قریش کی طرف سے بنی ہاشم کا مقاطعہ اور محاصرہ

اسلام قبائل عرب میں تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا تو قریش کو بڑی فکر ہوئی انھوں نے ایک مشاورتی اجتماع کیا اور اس میں یہ بات طے کی گئی کہ ایسا معاہدہ تحریر کیا جائے جس کے ذریعہ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کو اس کا پابند کر دیا جائے کہ وہ کسی اور جگہ شادی نہیں کر سکتے ہیں، دوسرے ان سے شادی کرنے کے مجاز ہوں گے نہ کوئی چیز ان کے ہاتھ فروخت کریں گے نہ اُن سے خریدیں گے، اجتماع کے بعد انھوں نے ان دفعات کو ایک تحریری شکل میں قلم بند کیا پھر سب نے ایک عہد نامہ اور میثاق کی حیثیت سے اس کو باضابطہ طور پر منظور اور واجب العمل قرار دیا، اور مزید توثیق کے لئے یہ معاہدہ کعبہ کے اندر آویزاں کر دیا گیا۔

---

[۱] سیرت ابن ہشام ج ۱/ ص ۳۴۹

شعب ابی طالب میں

جب قریش نے ایسا معاملہ کیا تو بنو ہاشم اور بنو المطلب ابو طالب کے ساتھ ہو گئے اور اس گھاٹی یا وادی میں ان کے ساتھ محصور ہو گئے، یہ سات بعد بعثت کا واقعہ ہے۔ بنو ہاشم میں سے ابولہب بن عبد المطلب اس میں شامل نہ تھا وہ قریش کا ہم نوا تھا۔ بنو ہاشم ایک عرصہ تک اسی طرح محصور رہے اس محاصرے نے اتنا طول کھینچا کہ ببول کے پتے کھا کر گذارا کرنے کی نوبت آئی ان کے بچے بھوک سے روتے اور بلبلاتے تھے اور ان کے رونے کی آواز دور تک جاتی تھی۔ قریش تاجروں کو بھی ان کے خلاف بھڑکاتے تھے چنانچہ ان تاجروں نے چیزوں کی قیمت اتنی زیادہ کر دی کہ وہ یہ سامان خرید ہی نہ سکیں۔

تین سال اس سخت حال میں گزرے، اس زمانہ میں خفیہ طریقہ سے کچھ ضروریات زندگی ان کے پاس پہونچ پاتی تھیں، قریش کے وہ لوگ جو ان کے ساتھ سلوک و صلہ رحمی کا معاملہ کرنا پسند کرتے تھے، وہ ان کی اس طرح در پردہ مدد کرتے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس حال میں بھی اپنی قوم میں تبلیغ و دعوت کا فریضہ دن رات، خفیہ و علانیہ ہر طریقہ سے انجام دیتے اور بنو ہاشم صبر اور امید اجر کے ساتھ ان تمام تکلیفات کو برداشت کرتے۔

عہد نامہ کی تنسیخ اور مقاطعہ کا خاتمہ

اسی دوران میں قریش کے کچھ باضمیر و عالی حوصلہ اشخاص کے دل میں ...
ہشام بن عمرو بن ربیعہ جیسا پیش پیش تھے اس ظالمانہ معاہدے کے خلاف ناپسندیدگی کا

جذبہ پیدا ہوا، اور اس کو انھوں نے ایک خلافِ انسانیت فعل قرار دیا، ہشام جن کو لوگ اور صلہ رحمی کرنے والے شخص تھے، اپنی قوم میں ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، انھوں نے اس سلسلہ میں قریش کے ان اشخاص سے جن کے اندر کچھ نرم خوئی، حوصلہ مندی اور عالی ظرفی محسوس ہوئی، رابطہ قائم کیا اور ان کی شرافت وانسانیت کو غیرت دلائی، اور اس پر آمادہ کیا کہ اس ظالمانہ معاہدہ کو ختم کیا جائے، یہ پانچ اشخاص تھے، اور ان سب نے اس کو کالعدم قرار دینے پر اتفاق کر لیا، دوسرے دن جب قریش کی محفلیں آراستہ تھیں، جیسے اس محفل میں زُہیر بن ابی امیہ جن کی ماں عاتکہ بنت عبد المطلب تھیں، لوگوں کے سامنے آئے اور کہنے لگے۔

"اے مکہ والو! ہم مزے سے کھائیں پئیں اور بنو ہاشم واند وانہ کو ترسیں اور جان بلب ہوں، ان کے ساتھ خرید و فروخت تک بند ہو، خدا کی قسم میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا، جب تک کہ اس ظالمانہ معاہدہ کو پرزہ پرزہ نہ کر دیا جائے۔"

اس موقع پر ابو جہل نے مداخلت کرنا چاہی لیکن اس کی کچھ چل نہ سکی، مُطعم بن عدی اس معاہدہ کو پھاڑنے کی غرض سے اس کی طرف بڑھے تو دیکھا کہ دیمک پورے کاغذ کو چاٹ کر ختم کر چکی ہے، صرف باسمک اللّٰھم کے الفاظ باقی ہیں۔ (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس بات کی ابو طالب کو اطلاع پہلے سے فرما چکے تھے۔)

بہر حال اس معاہدہ کو پھاڑ کر پھینک دیا گیا اور جو کچھ اس میں تحریر تھا وہ سب کالعدم ہو گیا۔[1]

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱/ ص ۳۵۰-۳۵۱

ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات

بعثت کے دسویں سال، ایک ہی سال کے اندر ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ دونوں کا انتقال ہو گیا، ان دونوں کا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو محبت، حسن سلوک، وفاداری اور نصرت وحمایت کا جو معاملہ تھا وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے ابوطالب نے اسلام قبول نہ کیا، اس حادثہ کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پے درپے کئی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

قرآن مجید کی انقلاب آفرینی وسچائی اور قلب سلیم پر اس کے اثرات

طفیل بن عمرو دوسی جو عرب کے ایک سربرآوردہ ومعزز شخص اور ممتاز شاعر تھے مکہ آئے تو قریش نے حسب معمول ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے سے روکنا چاہا اور ان کو آپ سے قریب ہونے اور آپ کی بات سننے سے بہت ڈرایا اور کہا کہ ہمیں ڈر ہے کہ تمہیں تمہارے ساتھ اور تمہاری قوم کے ساتھ وہی پیش نہ آئے جو یہاں ہم کو پیش آرہا ہے اس لئے تم ان سے کچھ بات کرنا نہ ان کی سننا۔ طفیل کہتے ہیں کہ واللہ وہ میرے پیچھے پڑے رہے یہاں تک کہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ ان کی سنوں گا نہ ان سے بات کروں گا اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی اور حرم کی طرف گیا، اچانک میری نگاہ اٹھی تو کیا دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کعبہ کے نزدیک نماز پڑھ رہے ہیں میں آپ کے پاس کھڑا ہو گیا، اور اللہ نے آپ کا کچھ کلام مجھے زبردستی سنوا ہی دیا،

کہتے ہیں کہ میں نے بہت اچھا کلام سنا، میں نے اپنے دل میں کہا، میری ماں مجھے روئے خدا کی قسم میں سخن ور بھی ہوں اور سخن شناس بھی کلام کی اچھائی برائی مجھ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی آخر یہ کلام سننے سے مجھے کیا چیز مانع ہو رہی ہے اگر وہ واقعی اچھی بات ہے تو میں اسے قبول کر لوں گا، بری بات ہے تو چھوڑ دوں گا۔"

اس کے بعد طفیل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے آپ کے گھر میں ملے اور پورا بیان کیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام لانے کی دعوت دی اور ان کے سامنے قرآن مجید کی تلاوت کی چنانچہ وہ مسلمان ہو گئے اور اسلام کے داعی و مبلغ بن کر اپنی قوم دوس میں واپس ہوئے انھوں نے اپنے گھر والوں کے ساتھ رہنے سے بھی انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہوں گے میں ان سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا اس بات پر وہ سب لوگ بھی دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے انھوں نے اپنے قبیلہ دوس کو اسلام کی دعوت دی اور اس قبیلہ میں اسلام کی خوب اشاعت ہوئی۔[1]

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ شروع میں اپنے گھر ہی میں نماز پڑھتے تھے پھر ان کی طبیعت اس پر راضی نہ ہوئی اور انھوں نے اپنے گھر کے صحن میں نماز کی ایک جگہ بنالی اور اس میں نماز پڑھتے اور قرآن مجید کی تلاوت کرنے لگے جب وہ تلاوت کرتے تو مشرکین کی عورتیں اور بچے ان پر ٹوٹے پڑتے ان کو دیکھتے رہتے اور تعجب کرتے، حضرت ابو بکرؓ بہت رقیق القلب تھے تلاوت کرتے وقت ان کی آنکھیں بے ساختہ اشکبار ہو جاتی تھیں، اس بات نے مشرکین کے سرداروں کو بہت خوفزدہ کر دیا انھوں نے ابن الدغنہ کو جنھوں نے حضرت ابو بکرؓ کو پناہ دی تھی بلوا بھیجا، جب وہ ان کے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۸۲-۳۸۳ باختصار۔

سامنے آئے تو ان سب نے ان سے کہا کہ تم نے ابوبکر کو جو پناہ دی تھی ہم نے اس کو اس شرط پر تسلیم کیا تھا کہ وہ اپنے گھر کے اندر اللہ کی عبادت کریں لیکن انھوں نے اپنی نماز اور قراءت سب کچھ علی الاعلان کرنا شروع کر دیا ہے ہمیں ڈر ہے کہ وہ ہمارے لڑکوں اور عورتوں کو متاثر و مسحور کر دیں، اب اگر وہ اس پر راضی ہوں کہ اپنے گھر کے اندر اللہ کی عبادت کریں تو ٹھیک ہے اگر اس سے انکار کریں تو ان سے کہو کہ تمہاری پناہ اور حفاظت واپس کر دیں اس لئے کہ نہ ہم تمہارے عہد کو توڑنا چاہتے ہیں نہ ابوبکر کو علانیہ عبادت و تلاوت کی اجازت دینے پر راضی ہیں۔

جب ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکرؓ کو قریش کے اس مطالبہ سے آگاہ کیا، تو انھوں نے جواب دیا کہ میں تمہاری پناہ اور ضمانت کو واپس کرتا ہوں اور اللہ کی ضمانت و حفاظت پر راضی ہوں[1]۔

طائف کا سفر اور سخت اذیتوں کا سامنا

ابوطالب کے انتقال کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو وہ بہت سی تکلیفیں اور اذیتیں پہونچیں جن کی ہمت ابوطالب کی زندگی میں قریش والے نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ آپ کے سر پر مٹی بھی پھینکی گئی، جب ان اذیتوں کا سلسلہ دراز ہونے لگا، اور مشرکین و کفار کی اسلام سے کراہت اور اس کی ناقدری اور حقارت اور بڑھ گئی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے طائف کا قصد فرمایا[2]، آپ کی نیت یہ تھی کہ

---

[1] بخاری شریف بروایت عائشہ رضی اللہ عنہا از باب ہجرۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم و اصحابہ الی المدینہ کے ساتھ

[2] راجح قول یہ ہے کہ طائف کا یہ سفر دسویں سال شوال کی آخری تاریخوں میں ہوا (خاتم النبیین۔ از شیخ محمد ابو زہرہ مرحوم ج ۱ ص ...)

قبیلۂ ثقیف کو اسلام کی دعوت دیں۔ وہاں سے نصرت کی توقع رکھنا یوں آپ کو اہلِ طائف سے کچھ جیسی کی امید تھی، اور اس میں تعجب کی بھی کوئی بات نہیں اس لئے۔ آپ کے ایام رضاعت قبیلۂ بنی سعد میں گزرے تھے جو طائف کے قریب آباد تھے۔

طائف کی اہمیت

طائف کا شہر اپنی اہمیت آبادی کے پھیلاؤ اور خوش حالی و فارغ البالی میں مکہ کے بعد دوسرے نمبر پر تھا۔ قرآن مجید میں قریش کی زبان سے اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :-

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ	اور یہ بھی کہنے لگے کہ یہ قرآن دونوں
عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ	بستیوں (یعنی مکہ اور طائف) میں سے
عَظِيْمٍ (سورۂ زخرف ۳)	کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ کیا گیا۔

یہ شہر مشہور بت "لات" کی عبادت کا بھی مرکز تھا، جہاں باقاعدہ لوگ تبرک کے لئے آتے تھے۔ اس بات میں وہ مکہ کا ہمسر و ہم ردیف تھا جو قریش کے سب سے بڑے بت "ہبل" کی عبادت کا مرکز تھا۔ امراء و خوش حال طبقہ یہیں گرمیاں گزارتا تھا۔ عہدِ اسلامی اور اس کے بعد بھی اس کو یہ اہمیت حاصل رہی۔

اموی شاعر عمر بن ابی ربیعہ کہتا ہے،

تشتو بمكة نعمة ومصيفها بالطائف[1]

اہلِ طائف جائداد اور زمینوں کے مالک تھے۔ ان کے پاس بڑے بڑے

---

[1] وہ ناز پروردہ جاڑے مکہ میں گزارتی ہے، اور گرمیاں طائف میں۔

باغات اور مزرعے تھے، اس دولت وخوش حالی نے ان کے اندر غرور وناز پیدا کر دیا تھا، اور وہ اس آیت کا مصداق اور نمونہ تھے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن	اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے
نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا	والا نہیں بھیجا مگر وہاں کے
إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ	خوش حال لوگوں نے کہا کہ جو چیز
وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا	دے کر تم بھیجے گئے ہو ہم اس کے
وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ	قائل نہیں اور (یہ بھی) کہنے لگے کہ
(سورۂ سبا ۳۴۔۳۵)	ہم بہت سا مال اور اولاد رکھتے
	ہیں اور ہم کو عذاب نہیں ہوگا

اہلِ طائف کا سلوک اور آپ کی دعا

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم طائف تشریف لائے تو سب سے پہلے ثقیف کے سرداروں اور ذمہ دار لوگوں سے ملنے تشریف لے گئے، اور ان کے پاس بیٹھ کر ان کو دینِ حق کی دعوت دی، لیکن آپ کو اس کا بہت بُرا اور سخت جواب ملا، انھوں نے آپ کا مذاق بھی اُڑایا، اور شہر کے اوباش لوگوں اور غلاموں کو آپ کے ستانے پر آمادہ کر دیا، یہ لوگ آپ کو گالیاں دیتے شور مچاتے اور آپ پر پتھر پھینکتے، اسی بے کسی اور کرب کے عالم میں آپ پناہ لینے کے لئے ایک کھجور کے سایہ میں تشریف فرما ہوئے، طائف میں آپ کو جتنا ستایا گیا وہ مشرکین مکہ کی ایذا رسانیوں سے کہیں زیادہ تھا، انھوں نے راستے کے دونوں طرف

اپنے آدمی کھڑے کر دیئے آپ ایک قدم بھی اٹھاتے تو کسی طرف سے پتھر آپ پر پھینکا
جاتا حتی کہ آپ کے دونوں پیر زخموں سے لہولہان ہو گئے۔ اس وقت بے ساختہ
آپ کے قلب و زبان پر یہ دعا جاری ہوئی اور آپ نے اللہ تعالےٰ سے اپنی کمزوری،
بے سروسامانی اور لوگوں کی نگاہ میں بے وقعتی کی فریاد کی اور اللہ کی نصرت و تائید
کے ان الفاظ میں خواستگار ہوئے آپ نے فرمایا۔

اللهم إليك أشكو ضعف قوتي	الٰہی اپنی کمزوری بے سروسامانی اور
وقلة حيلتي، وهواني على	لوگوں میں تحقیر کے بابت تیرے سامنے
الناس، يا أرحم الراحمين	فریاد کرتا ہوں تو سب رحم کرنے والوں سے
أنت رب المستضعفين إلى	زیادہ رحم کرنے والا ہے درماندہ اور
من تكلني، إلى بعيد يتجهمني	عاجزوں کا مالک تو ہی ہے اور
أم إلى عدو ملكته أمري؟	میرا مالک بھی تو ہی ہے مجھے کس کے
ان لم يكن بك غضب علي فلا	سپرد کیا جاتا ہے کیا بیگانہ ترش
أبالي، غير أن عافيتك هي	روئے یا اس دشمن کے جو کام پہ
أوسع لي، أعوذ بنور وجهك	قابو رکھتا ہے اگر مجھ پر تیرا غضب
الذي أشرقت له الظلمات	نہیں تو مجھے اس کی پرواہ نہیں
وصلح عليه أمر الدنيا والآخرة	لیکن تیری عافیت میرے لئے زیادہ
من أن ينزل بي غضبك أو يحل	وسیع ہے میں تیری ذات کے نور
علي سخطك، لك العتبى	سے پناہ چاہتا ہوں جس سے
حتى ترضى ولا حول	سب تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں

ولا قوة الا باللہ .

اور دنیا و دین کے کام اس سے
ٹھیک ہو جاتے ہیں کہ تیرا غضب
مجھ پر اترے یا تیری نارضامندی
مجھ پر وارد ہو مجھے تیری ہی رضامندی
اور خوشنودی درکار ہے اور نیکی کرنے
یا بدی سے بچنے کی طاقت مجھے
تیری ہی طرف سے ملتی ہے۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کے فرشتے کو آپ کے پاس بھیجا اور اس نے آپ سے اس کی اجازت طلب کی کہ وہ ان دونوں پہاڑوں کو جن کے درمیان طائف واقع ہے ملا دے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس سے ارشاد فرمایا کہ نہیں مجھے امید ہے کہ ان کی اولاد میں سے کوئی ایسا پیدا ہوگا جو خدائے واحد کی عبادت کرے گا اور اس کے ساتھ کسی اور ہستی کو شریک نہ ٹھہرائے گا۔[1]

جب عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ نے آپ کی یہ حالت دیکھی تو ان کا دل کچھ نرم پڑا اور ان کی انسانیت کی رگ میں کچھ جنبش پیدا ہوئی ان دونوں نے اپنے ایک نصرانی غلام کو بلایا جس کا نام عداس تھا اور اس سے کہا کہ یہ انگور کا خوشہ ایک طباق میں رکھ کر اس شخص کے پاس لے جاؤ اور کہو کہ یہ ان کے کھانے کے لئے ہے عداس نے اس پر عمل کیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی گفتگو سن کر اور آپ کے اخلاق کریمانہ دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔[2]

---

[1] زاد المعاد ج ا ص ۳۰۲ [2] سیرت ابن ہشام ۱/ ۴۱۹-۴۲۱ . و سیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۰-۱۵۳

و زاد المعاد ج ا ص ۳۰۲ باختصار و تلخیص۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم طائف سے مکہ تشریف لائے تو آپ کی قوم آپ کی مخالفت، دشمنی اور آپ کے تمسخر و ایذا رسانی میں اسی طرح سرگرم تھی۔

واقعۂ معراج

اس کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی، راتوں رات آپ کو قدرتِ غیبی کے ساتھ مسجدِ حرام سے جایا گیا، وہاں سے مسجدِ اقصیٰ پہونچایا گیا، اس کے بعد ان مقاماتِ قرب و اختصاص، ساتوں آسمانوں کی سیر، اللہ تعالےٰ کی نشانیوں کے مشاہدے اور انبیاء کرام سے ملاقات کے وہ تمام واقعات پیش آئے جن کے متعلق اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ○	ان کی آنکھ نہ تو اور طرف مائل ہوئی
لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ	اور نہ (حد سے) آگے بڑھی بالتحقیق
الْكُبْرٰى ○[1]	اپنے پروردگار کی قدرت کی کتنی ہی
(سورۃ النجم ۱۷-۱۸)	بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

یہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے آپ کی ایک ضیافت و عزت افزائی تھی جو آپ کی دل داری و دل نوازی اور طائف کے ان زخموں کو مندمل کرنے اور اس اذیت ناک اور بیگانگی و بیوفائی کی تلافی کے لئے تھی جس کے سخت امتحان سے آپ ابھی گزرے تھے۔

جب صبح ہوئی تو آپ نے لوگوں کو اس واقعہ کی خبر دی، قریش نے اس پر

---

[1] دیکھئے سورۂ اسراء و سورۂ نجم و کتب حدیث و سیرت، واقعۂ معراج کی حقیقت اور اس کے اسرار و حِکَم کے سمجھنے کے لئے حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ حصہ دوم "الاسراء الی المسجد الاقصیٰ ثم الی سدرۃ المنتہیٰ" کا مطالعہ کیا جائے۔

بہت تعجب کا اظہار کیا، اس کو ایک محال اور ناممکن امر قرار دیا، اور آپ کو جھٹلایا، اور مذاق اڑایا، حضرت ابوبکرؓ نے یہ سن کر کہا کہ اگر آپ نے ایسی بات کہی ہے تو سچ کہی ہے، تم کو اس پر تعجب کیوں ہے؟ خدا کی قسم آپ مجھے یہ خبر دیتے ہیں کہ وحی آپ کے پاس دن رات کے کسی حصہ میں آسمان سے زمین تک آجاتی ہے، تو میں آپ کی تصدیق کرتا ہوں، یہ تو اس سے بھی مشکل اور بعید ہے جس پر تم لوگ تعجب کر رہے ہو۔[1]

معراج کے بلند و لطیف مطالب و معانی

واقعۂ معراج محض ایک جزئی و شخصی واقعہ نہ تھا جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کرایا گیا اور آسمان و زمین کی بادشاہت بے پردہ و بے حجاب ہو کر آپ کے سامنے آگئی، نبوت کے اس غیبی و آسمانی سفر میں اس کے علاوہ بھی بہت بلند و لطیف مطالب و معانی پوشیدہ ہیں، اور اس میں بہت دور رس اشارات کئے گئے ہیں، یہ دونوں سورتیں (سورۂ اسراء اور سورۂ نجم) جو واقعۂ معراج کے سلسلہ میں نازل ہوئیں، یہ اعلان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دونوں قبلوں (مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ) کے نبی اور دونوں سمتوں مشرق و مغرب کے امام اور اپنے پیشرو تمام انبیاء کرام کے وارث اور بعد میں آنے والی پوری نسل انسانی کے رہبر و رہنما ہیں، آپ کی شخصیت اور آپ کے سفر معراج میں گویا بیت المقدس سے اور مسجد حرام مسجد اقصیٰ سے ہم آغوش ہو گئی، آپ کی امامت میں تمام انبیاء نے نماز پڑھی اور یہ دراصل آپ کے پیغام و دعوت کی عمومیت، آفاقیت، آپ کی امامت کی

---

[1] سیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۹۶ وسیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۹۹

ابدیت اور ہر طبقۂ انسانی کے لئے آپ کی تعلیمات کی ہمہ گیری و صلاحیت کی دلیل و علامت تھی۔

یہ واقعہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا صحیح تعارف اور اس کی صحیح نشان دہی، آپ کی امامت و قیادت کا بیان، آپ کی امت (جس میں آپ مبعوث ہوئے) کے اصل مقام و حیثیت عرفی کا تعین اور اس پیغام و دعوت اور مخصوص کردار کی پردہ کشائی کرتا ہے، جو اس امت کو اس وسیع و عریض دنیا اور عالمی برادری میں انجام دینا ہے۔

واقعۂ معراج دراصل ایک محدود، مقامی اور عارضی نوعیت اور نبوت کی ابدی اور عالمگیر شخصیت کے درمیان خطِ فاصل اور امتیازی لکیر کی حیثیت رکھتا ہے، اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم، کوئی قومی یا مقامی لیڈر، کوئی ملکی و وطنی رہنما، کسی خاص نسل کے نجات دہندہ اور کسی نئی شوکت و عظمت کے بانی ہوتے تو آپ کو اس معراج آسمانی کی ضرورت نہ تھی، اس کے لئے آپ کو نہ آسمان و زمین کی وسیع بادشاہت کے سیر و مشاہدہ کی حاجت تھی نہ اس کی ضرورت تھی کہ آپ کے ذریعہ آسمان و زمین کا یہ نیا تعلق قائم ہو، اس وقت آپ کی سرزمین، یہ ماحول اور یہ سوسائٹی آپ کے لئے کافی ہوتی، اس کو چھوڑ کر آپ کو کسی اور خطۂ زمین کی طرف توجہ کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی، چہ جائیکہ بلند آسمانوں اور سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچنے کی یا مسجد اقصیٰ شریف لے جانے کی جو آپ کے شہر سے بہت دور اور عیسائی مذہب اور طاقتور رومی شہنشاہی کے زیر اقتدار تھا۔

واقعۂ معراج یہ اعلان کرتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان قومی اور سیاسی رہنماؤں کی صف سے کوئی تعلق نہیں رکھتے جن کی صلاحیتوں اور

کوششوں کا دائرہ ان کے ملک یا ان کی قوم تک محدود رہتا ہے اور ان سے صرف انھیں نسلوں اور قوموں کو فائدہ پہونچتا ہے جن سے ان کا تعلق ہوتا ہے اور اسی ماحول تک ان کا اثر باقی رہتا ہے جس میں وہ پیدا ہوتے ہیں آپ جس گروہ اور جماعت سے تعلق رکھتے ہیں وہ خدا کے بھیجے ہوئے نبیوں اور رسولوں کی صف ہے جو آسمان کا پیغام زمین والوں کو اور خالق کا پیغام مخلوق کو پہونچاتے ہیں اور ان سے پوری نوع انسانی (زمانہ و تاریخ، رنگ و نسل اور ملک و قوم سے قطع نظر) سرفراز و سربلند ہوتی ہے اور اس کی قسمت جاگتی ہے۔

نماز کی فرضیت

اس موقع پر اللہ تعالےٰ نے آپ پر اور آپ کی امت پر پچاس وقتوں کی نماز فرض فرمائی اور آپ برابر اس میں تخفیف کا سوال کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے اس کو دن و رات میں پانچ وقت تک محدود کر دیا اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ جو ایمان و احتساب کے ساتھ یہ نمازیں پڑھے گا اس کو اجر پچاس نمازوں ہی کا ملے گا۔[1]

قبائل عرب کو دعوت اسلام

اب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حج کے موسم میں قبائل عرب کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنی شروع کی اور ان سے حمایت و نصرت کے خواستگار ہوئے آپ نے ان سے مخاطب ہو کر یہ فرمایا کہ اے بنی فلاں! میں تمھاری طرف اللہ کا رسول

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب (کیف فرضت الصلوٰۃ)

بنا کر بھیجا گیا ہوں جو تم کو اللہ کی عبادت کا حکم دیتا ہے اور اس کا حکم دیتا ہے کہ تم اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہراؤ اور اُن تمام ہستیوں سے جن کو تم نے اس کا ہمسر بنا لیا ہے اور ان کی عبادت کرتے ہو، قطع تعلق کر لو اور اس پر ایمان لاؤ اور اس کی تصدیق کرو، اور میری اس وقت تک حفاظت کرو جب تک اللہ نے جو چیز دے کر مجھے بھیجا ہے وہ میں اچھی طرح کھول کر بیان نہ کر دوں!!

جب آپ اپنی بات فرما چکے تو ابولہب کھڑا ہوا اور چیخ لگا کر لے بنی فلاں! یہ تم کو اس بات کی دعوت دے رہے ہیں کہ تم لات و عزیٰ کی بندگی و وفاداری کا طوق اپنی گردن سے اتار پھینکو اور اپنے مددگار جنوں سے بھی ترک تعلق کر کے اس بدعت و گمراہی کو اختیار کرو جو یہ لائے ہیں، اس لئے تم نہ ان کی بات ماننا اور نہ ان کی سننا۔[1]

اسلام کا راستہ

یہ راستہ جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی طرف جاتا تھا کانٹوں سے اٹا ہوا ہر قسم کے اندیشوں اور خطرات سے بھرا ہوا تھا جس پر اپنی جان کا خطرہ مول لئے بغیر چلنا اور منزل مقصود تک پہونچنا ممکن نہ تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے مکہ تک پہونچنے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں حاضر ہونے اور قبول اسلام کا جو واقعہ بیان کیا ہے، اس سے اس پر روشنی پڑتی ہے وہ کہتے ہیں:-

"جب ابوذر کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۲۲-۲۲۳

اپنے بھائی سے کہا کہ تم اس وادی میں جاؤ اور ذرا ان صاحب کا کچھ پتہ
لگاؤ جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے، ان کی
گفتگو سنو اور پھر مجھے آکر بتاؤ، وہ روانہ ہوئے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ
وسلم سے ملے آپ کی بات سنی پھر واپس جاکر ابو ذر رضی اللہ عنہ سے یہ کہا کہ
میں نے دیکھا کہ وہ بہت پسندیدہ و اعلیٰ ترین اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں اور
ایسا کلام میں نے سنا جو شعر نہیں کہا جاسکتا، انھوں نے کہا کہ میں جو کچھ
جاننا چاہتا تھا اس بارے میں میری تشفی نہیں ہوئی، پھر انھوں نے خود سفر
کی تیاری کی اور پانی کا مشکیزہ لے کر روانہ ہوئے، مکہ پہنچے، حرم شریف
میں پہنچ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تلاش کرنا شروع کیا، وہ آپ
کو پہچانتے نہ تھے اور کسی سے دریافت کرنا مناسب نہ سمجھتے تھے، اسی
تلاش میں رات ہوگئی، اس وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان کو
دیکھا اور ان کو اندازہ ہوگیا کہ یہ کوئی نووارد مسافر ہے، وہ ان کے
پیچھے ہولئے لیکن کسی نے ایک دوسرے سے کچھ نہ پوچھا جب صبح ہوئی
تو وہ اپنا مشکیزہ اور زادِ راہ لے کر پھر اسی مسجد میں چلے گئے اور یہ دن بھی
اسی طرح گزر گیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو دیکھا،
اسی پر شام ہوئی، وہ پھر اپنے سونے کی جگہ چلے گئے، اس وقت حضرت
علیؓ ان کے قریب سے گزرے اور یہ کہا کہ کیا ابھی تک اس مسافر کے لئے
یہ وقت نہیں آیا کہ اس کو اپنی منزلِ مقصود معلوم ہو، تیسرے روز
حضرت علیؓ اسی طرح ان کے پاس پہنچے، ان کو اٹھایا اور کہا کہ تم

مجھے بتاؤ گے نہیں کہ کیا چیز تمھیں یہاں لائی ہے؟ انھوں نے کہا اگر تم
مجھ سے اس کا وعدہ اور عہد کرو کہ میری رہنمائی کروگے تو میں بتا سکتا
ہوں، جب انھوں نے یہ وعدہ کیا تو وہ ان کے ساتھ چلنے پر تیار ہوگئے
وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہونچے تو یہ بھی ان کے
ساتھ حاضر خدمت ہوئے آپ کی بات سنی اور اسی جگہ مسلمان ہوگئے
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اپنی قوم میں واپس جاؤ
اور یہ دعوت ان لوگوں کو پہونچاؤ یہاں تک کہ میری بات اچھی طرح
ظاہر ہو جائے انھوں نے کہا کہ اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان
ہے میں ان کے درمیان چیخ چیخ کر یہ دعوت دوں گا پھر نکل کر مسجد حرام
میں آئے اور اعلان کیا ۔ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وان محمدًا
رسول اللہ ۔ یہ سن کر لوگوں نے انھیں گھیر لیا اور اتنا مارا کہ بے دم
ہو کر زمین پر لیٹ گئے ۔ اتنے میں حضرت عباس آئے ان کو جھک کر
دیکھا اور لوگوں سے کہا کہ تم جانتے نہیں کہ یہ قبیلہ غفار سے تعلق
رکھتے ہیں اور تمھارے تاجروں کا راستہ جو شام تک جاتا ہے اسی
قبیلہ سے ہو کر گزرتا ہے پھر انھوں نے ان کو بچایا ۔ دوسرے دن بھی
انھوں نے یہی کیا ، اور لوگوں نے اشتعال میں آکر ان کو زد و کوب کیا
اور حضرت عباس نے آکر ان کی مدد کی۔[1]

---

[1] بخاری شریف باب اسلام ابی ذر رضی اللہ عنہ ۔

انصار کے قبولِ اسلام کا آغاز

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حج کے زمانہ میں تبلیغ اسلام کی مہم پر دوانہ ہوئے عقبہ[1] کے پاس انصار کے قبیلہ خزرج کے کچھ لوگ آپ کو ملے آپ نے ان کو اللہ کی طرف دعوت دی، اسلام ان کے سامنے پیش کیا، اور قرآن مجید کی تلاوت کی۔ یہ لوگ مدینہ میں یہودیوں کے پڑوس میں رہتے تھے اور ان سے یہ سنتے رہتے تھے کہ قریبی زمانہ میں کوئی نبی آنے والا ہے، وہ آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ واللہ یہ وہی نبی معلوم ہوتے ہیں جن کی خبر ہم کو یہود دیتے تھے، دیکھو اب کوئی اس میں تم سے سبقت نہ لے جائے، چنانچہ انھوں نے اسی وقت آپ کی تصدیق کی، اور آپ سے یہ عرض کیا کہ ہم اپنی قوم کو چھوڑ کر آئے ہیں، اور اس قوم میں جتنا شر و فساد اور تفرقہ ہے اتنا کسی اور قوم میں نہیں ہے، شاید آپ کے ذریعہ اللہ ان کو متحد کر دے، ہم وہاں جا کر ان کو اس معاملہ سے آگاہ کریں گے اور اس کی دعوت دیں گے، آپ بھی ان پر وہ چیز پیش کریں جس کو ہم نے قبول کیا ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے ان کو آپ پر متحد کر دیا تو آپ سے زیادہ عزت والا پھر کوئی نہ ہوگا[2]۔

وہ ایمان لانے کے بعد اپنے وطن واپس ہوئے، جب مدینہ پہونچے تو اپنے دوسرے بھائیوں سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا، اور ان کو بھی اسلام کی

---

[1] عقبہ کے معنی گھاٹی کے ہیں، منیٰ کے پہاڑوں کے اس کنارے پر جہاں سے مکہ کو راستہ جاتا ہے ایک پہاڑی جو ذرا اونچی سی ہے وہاں ایک جگہ تھی جس کو جمرۂ عقبہ کہتے ہیں، وہ جمرۂ عقبہ کے پاس ہی تھا، اسی وجہ سے جمرہ کو جمرۂ عقبہ کہتے ہیں، بیعت عقبہ کی یادگار کے طور پر وہاں کی جگہ پر بعد میں ایک مسجد تعمیر کر دی گئی تھی۔ [2] سیرت ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۴۲۸

دعوت دی یہاں تک کہ ان کی قوم اور برادری میں اسلام کی خوب اشاعت ہوگئی اور انصار کا کوئی گھر ایسا نہ بچا جہاں آپ کا چرچا نہ ہو۔[1]

بیعت عقبۂ اولیٰ

دوسرا سال ہوا اور حج کا موقع آیا تو انصار کے بارہ آدمی آپ سے بیعت عقبۂ اولیٰ کے موقع پر ملے اور آپ کے دست مبارک پر چوری، زنا، قتل اولاد سے پرہیز کرنے، اچھی باتوں میں اطاعت کرنے اور توحید پر بیعت کی۔ جب انھوں نے واپسی کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ مصعبؓ بن عمیر کو کر دیا اور ان کو ہدایت کی کہ ان کو قرآن مجید پڑھائیں، اسلام کی تعلیم دیں اور دین کے مسائل سے باخبر کریں چنانچہ ان کو مدینہ میں مُقری (پڑھانے والا) کہا جاتا تھا، وہ اسعد بن زرارہ کے ہاں مہمان ہوئے تھے اور وہاں امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔[2]

انصار کے قبول اسلام کا اصل سبب

اللہ تعالےٰ کا کرنا کہ ایسے نازک وقت میں اس نے اپنے رسول اور اپنے دین کی نصرت وحمایت کے لئے اوس و خزرج[3] کو کھڑا کر دیا، یثرب کے دو بہت بڑے اور اہم عرب قبیلے تھے، اور ان کو اس کا زرین موقع نصیب فرمایا کہ وہ اس نعمت کی

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۴۲۸-۴۳۸ [2] ایضاً ص ۴۳۴ باختصار [3] اوس و خزرج ازد کے دو قبیلے تھے جو قحطان کی شاخ سے تعلق رکھتے تھے ان کے مورث اعلیٰ ثعلبہ بن عمرو ستیا رب (یمن) کی تباہی و بربادی کے بعد (جب سیل عرم پیش آیا) حجاز منتقل ہوئے پھر مدینہ کو اپنا مستقر بنایا جیسا کہ آگے اس کی تفصیل آئے گی۔

جس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی نعمت نہیں مقدر کیا اور اسلام کے استقبال اور قبولیت میں اپنے ہم عصروں اور اہل حجاز پر سبقت لے جائیں اور اس وقت اس دین کو اپنے سینے سے لگائیں بلکہ اس کے لئے سینہ سپر ہو جائیں جب سب قبائل عرب اور خصوصیت سے قریش نے اس سے بالکل آنکھیں پھیر لی تھیں "وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ" (اور اللہ تعالٰے جس کی چاہتا ہے سیدھے راستہ کی رہنمائی فرماتا ہے۔)

مختلف اسباب و عوامل نے جو در اصل اللہ تعالٰے کی حکمت و مشیت ہی تھے اور ان کا مقصد اسلام کی اشاعت اور غلبہ کے لئے راستہ ہموار کرنا تھا اوس و خزرج کو اس سعادت عظمیٰ کے لئے تیار کر دیا تھا ان میں اور قریش میں کئی باتیں مابہ الامتیاز تھیں، اوس و خزرج کے یہ قبائل قریش مکہ کے برخلاف نرم مزاج اور نرم دل اور انتہا پسندی تشدد، تکبر اور انکار حق جیسے رذائل سے پاک تھے ان صفات کا تعلق ان نسلی و نسبی خصوصیات سے تھا جن کی طرف اشارہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یمن کے ایک وفد سے ملنے کے بعد فرمایا تھا ارشاد ہوا تھا کہ "أتاکم أھل الیمن أرق أفئدۃ وألین قلوبا" (تمہارے پاس اہل یمن آئے ہیں جو بہت نرم و گداز دل رکھنے والے ہیں) یہ دونوں قبیلے اپنی اصل میں یمن ہی سے وابستہ تھے زمانہ قدیم میں ان کے آباؤ اجداد وہیں سے یہاں منتقل ہوئے تھے اللہ تعالٰے ان کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:۔

وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ	اور ان لوگوں کے لئے بھی) جو
مِنْ قَبْلِھِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ ھَاجَرَ	مہاجرین سے پہلے (ہجرت کے گھر
اِلَیْھِمْ وَلَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِھِمْ	(یعنی مدینہ) میں مقیم اور ایمان میں

حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ
عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ
خَصَاصَةٌ (سورۂ حشر ۹)

(مستقبل) اپنے اور ان کی ہجرت
کر کے ان کے پاس آتے ہیں ان سے
محبت کرتے ہیں اور جو کچھ ان کو ملا
اس سے اپنے دلوں میں کچھ خواہش اور
خلش نہیں پاتے اور ان کو اپنی جانوں
سے مقدم رکھتے خواہ ان کو خود احتیاج ہو

[illegible]

اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ باہمی خانہ جنگیوں اور مستقل لڑائیوں نے ان کو چور چور کر دیا تھا، بعاث کی جنگ پر ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا، اس کی تلخ کامیوں سے ابھی ان کے کام و دہن پوری طرح آشنا تھے اور اب ان کے اندر اتحاد، صلح و صفائی اور جنگ سے بچنے کی ایک گونہ خواہش پیدا ہو گئی تھی، ان کے یہ الفاظ اس صورت حال کی ترجمانی اور ان کی اندرونی کیفیت کی غمازی کرتے ہیں "ہم اپنی قوم کو چھوڑ کر آئے ہیں، کسی قوم میں اتنا شر و فساد اور باہمی عداوت نہیں جتنی ان کے درمیان ہے، شاید اللہ آپ کے ذریعہ ان کو یکجا کر دے، اگر اللہ تعالیٰ نے ان کو متحد کر دیا تو پھر آپ سے زیادہ باعزت کوئی نہ ہوگا" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بعاث کی جنگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک تائید غیبی اور مدینہ کی ہجرت و نصرت کی ایک تمہید تھی۔

دوسری بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ قریش اور بقیہ تمام عرب کا تعلق نبوت اور انبیاء سے بہت طویل عرصے سے منقطع تھا اور بعد زمانہ کی وجہ سے وہ اس کے مطالب و مفہوم سے

بالکل نا آشنا ہو گئے تھے ان کی جہالت اور ناخواندگی نقطۂ عروج کو پہونچ گئی تھی، بت پرستی میں ان کو حد درجہ غلو و انہماک تھا، وہ ان اقوام و ملل (یہودی و عیسائی) سے بہت دور تھے جو اپنا انتساب ان انبیاء کی طرف کرتے تھے اور آسمانی صحیفوں کے (خواہ محرّف و مسخ شدہ شکل ہی میں ہی) حامل اور علمبردار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آیت مندرجہ ذیل میں اسی تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے:۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ	تاکہ تم ان لوگوں کو جن کے باپ دادا
فَهُمْ غٰفِلُوْنَ۔ (سورۂ یٰسین۔ ۶)	کو متنبہ نہیں کیا گیا تھا متنبہ کردو،
	وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس کے برخلاف اوس و خزرج یہود کو نبوت اور انبیاء کے بارے میں آپس میں گفتگو کرتے اور توریت کی تلاوت کرتے ہوئے برابر دیکھتے اور سنتے تھے، بلکہ یہودی اکثر ان کو خبر دیا کرتے تھے کہ آخر زمانہ میں ایک نبی مبعوث ہوگا، ہم اس کے ساتھ مل کر تم کو اس طرح قتل کریں گے جس طرح عاد اور ارم قتل کئے گئے[1]، ان ہی کی بابت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ	اور جب خدا کے ہاں سے ان کے
عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ	پاس کتاب آئی جو ان کی آسمانی کتاب
وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ	کی بھی تصدیق کرتی ہے اور وہ پہلے
عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا	(ہمیشہ) کافروں پر فتح مانگا کرتے
جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ	تھے تو جس چیز کو وہ خوب پہچانتے

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ صفحہ ۱۲۴

فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ (سورۃ البقرہ - ۸۹)

تھے جب ان کے پاس آ پہنچی تو اس سے کافر ہو گئے بس کافروں پر خدا کی لعنت۔

اوس و خزرج اور مدینہ کے قدیم باشندے جو عقیدۃً مشرک و بت پرست تھے دینی حقائق و اصطلاحات (نبوت و رسالت، وحی و الہام، حشر و نشر و آخرت) اور صفاتِ الٰہی سے اس قدر نابلد و ناآشنا اور نامانوس و اجنبی نہ تھے جتنے کہ قریش مکہ اور ان کے ہم سایہ قبائل مرورِ زمانہ سے ہو گئے تھے اس لئے کہ اوس و خزرج زمانۂ دراز سے یہودیوں کے ساتھ رہنے بسنے کی وجہ سے ان دینی حقائق و اصطلاحات اور انبیائے کرام کے ناموں اور جستہ جستہ حالات، مختلف زمانوں میں انبیاء کی بعثت اور ہدایت کے آسمانی نظام سے واقف ہو گئے تھے ان کا دن رات یہودیوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہوتا تھا جو اہلِ کتاب تھے صلح و جنگ عہد و معاہدہ اور تجارت و زراعت کے بھی تعلقات تھے اس لئے جب اوس و خزرج سے تعلق رکھنے والے مدینہ کے ان باشندوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا علم ہوا اور وہ حج کے موقع پر مکہ آئے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس ان کو اسلام کی دعوت دی تو ایسا معلوم ہوا کہ اچانک ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھ گیا اور گویا وہ پہلے سے اس کے لئے تیار تھے۔

یثرب کی خصوصیات اور اس کے انتخاب کی حکمتیں

مدینہ کے دار الہجرت اور مرکزِ دعوتِ اسلامی کی حیثیت سے انتخاب میں اہلِ مدینہ کے اکرام و عزت افزائی نیز ان اسرار کی وجہ سے جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ایک حکمت یہ بھی تھی کہ مدینہ کو جنگی اور جغرافیائی نقطۂ نظر سے ایک مستحکم قلعہ کی حیثیت

حاصل تھی۔

جزیرۃ العرب کا کوئی اور قریب کا شہر اس معاملہ میں اس کا ہمسر نہ تھا۔ حرۃ الوبرہ [1] مغربی جانب سے مدینہ کو اپنی حفاظت میں لئے ہوئے تھا، حرۃ واقم مشرقی سمت سے اس کو گھیرے ہوئے تھا۔ مدینہ کا شمالی حصہ ہی واحد راستہ تھا جو کسی پیش قدمی کے لئے کھلا تھا (یہ وہی علاقہ ہے جہاں ۵ھ میں غزوۂ احزاب کے موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خندق تیار کرنے کا حکم دیا تھا) مدینہ کی دوسری سمتیں کھجور کے گھنے باغات یا کھیتوں سے گھری ہوئی تھیں، اگر کسی حملہ آور فوج کا ان سے گزرنا ہوتا تو اس کے راستے میں ایسے تنگ راستے اور پگڈنڈیاں پڑتی تھیں جن کو پوری صف آرائی اور فوجی ڈسپلن کے ساتھ عبور کرنا آسان کام نہ تھا اور معمولی فوجی چوکیاں اس پیش قدمی میں رکاوٹ ڈالنے کے لئے کافی تھیں۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مدینہ کے ایک طرف کا حصہ یا راستہ کھلا ہوا تھا، بقیہ تمام سمتیں اور جہتیں آبادی اور کھجور کے باغات کی وجہ سے ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں اور کوئی دشمن اس میں سے ہو کر آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔

---

[1] حرۃ یا لابہ سیاہ جلے ہوئے اور آتش فشاں پتھروں کے علاقہ کو کہتے ہیں یا اس حصہ کو جو آتش فشاں کا لاوا بہہ کر کسی جگہ جم جانے سے وجود میں آیا ہو اس علاقہ میں اونٹوں اور گھوڑوں کا چلنا یا کسی لشکر کا گذرنا تو در کنار کسی ایک شخص کا پیدل چلنا بھی دشوار ہے علامہ مجد الدین فیروزآبادی (م ۸۱۷ھ) نے اپنی کتاب "المغانم المطابہ فی معالم طابہ" میں حرۃ الوبرہ کے ضمن میں بہت سے حرات کا ذکر کیا ہے جو مختلف جہتوں سے مدینہ کا احاطہ کئے ہوئے ہیں بعض جگہ بہت قریب کسی جگہ کچھ دور یہ اس کی بیرونی حملوں سے حفاظت کرتے ہیں یا کم از کم ہر شکل ان میں حرکت پیدا کر دیتے ہیں، دیکھئے کتاب مذکور (ص ۱۰۰ تا ۱۱۳)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی مدینہ کے انتخاب میں شاید خدا کی اسی حکمت و مصلحت کی طرف ہجرت سے قبل اشارہ فرمایا تھا اور یہ ارشاد ہوا تھا کہ "مجھے تمہارا دار الہجرت دکھایا گیا ہے یہ کھجور کے باغات والا علاقہ ہے اور لابتین (وہ جلے ہوئے سیاہ پتھروں والے دو علاقوں لابتین) کے درمیان واقع ہے اسی کے بعد جس کو ہجرت کرنا تھی اس نے مدینہ ہجرت کی۔[1]

مدینہ کے یہ دو قبیلے جو اوس و خزرج کے نام سے مشہور تھے غیرت قومی، خودداری، شہسواری اور قوت و مردانگی میں ممتاز تھے یہ آزادی کے خوگر اور عادی تھے، انھوں نے نہ کسی کے سامنے کبھی اپنا سر جھکایا تھا، نہ کسی بڑے قبیلہ یا حکومت کو ٹیکس اور تاوان ادا کیا تھا اس کی صراحت اوس کے سردار سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے اس جملہ میں موجود ہے جو انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے غزوۂ خندق کے موقع پر عرض کیا تھا "جب ہم اور یہ مشرک و بت پرستی میں مبتلا تھے، نہ ہم اللہ کی عبادت کرتے تھے نہ اس کو پہچانتے تھے، اس وقت بھی یہ مجال نہ تھی کہ مہمان داری یا قیمت دیئے بغیر یہ مدینہ کی ایک کھجور کھا لیں۔"[2]

"ابن خلدون" لکھتے ہیں:۔

"یہ دونوں قبیلے یا برادریاں یثرب میں یہود پر غالب تھیں اور عزت و وقار اور شان و شوکت میں نام پیدا کئے ہوئے تھیں ان کے قریب جو مضر کے قبائل آباد تھے، وہ بھی ان ہی کی گنتی میں تھے۔"[3]

---

[1] صحیح بخاری (باب ہجرۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم) [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۲۳ [3] تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۲۸۹

مشہور عرب مصنف ابن عبد ربہ "العقد الفرید" میں لکھتے ہیں :۔

"انصار قبیلۂ ازد سے ہیں یہ اوس و خزرج کہلاتے ہیں حارثہ بن عمرو بن عامر کے دو بیٹوں سے ان کی نسل چلی ہے یہ لوگ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ خوددار اور سب سے زیادہ عالی حوصلہ تھے اور کبھی بادشاہ یا حکومت کے باج گذار نہیں رہے۔"[1]

اس کے علاوہ بنی ہاشم کا بنی عدی بن النجار سے ننہالی تعلق تھا ہاشم نے ان کی ایک خاتون سلمیٰ بنت عمرو سے شادی کی تھی ۔

ہاشم کے ایک فرزند عبدالمطلب پیدا ہوئے، ہاشم نے ان کو ماں کے پاس چھوڑ دیا، جب یہ کچھ بڑے ہوئے اور بالغ ہونے کے قریب ہوئے تو ان کو ان کے چچا مکہ لے آئے عرب کی سماجی زندگی میں رشتہ داریوں اور قرابتوں کی بڑی اہمیت تھی، اور اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، ان ہی میں ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ تھے جن کے گھر میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچ کر قیام فرمایا۔

اوس و خزرج قحطان کی نسل سے تھے، مہاجرین اور جو لوگ مکہ اور اس کے اطراف میں ان سے قبل اسلام لا چکے تھے وہ عدنان کی نسل سے تھے، جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت کی اور انصار نے آپ کی حمایت و نصرت کی تو اس ذریعہ سے عدنان اور قحطان دونوں پرچم اسلام کے نیچے جمع ہو گئے اور ایک جان دو قالب بن گئے، عہد جاہلیت میں ان کے درمیان بڑی کش مکش اور رقابت تھی، اسلام کی برکت سے شیطان کو ان کی صفوں میں گھسنے اور وسوسہ

---

[1] العقد الفرید ج ۳ ص ۳۳۴

زندگی کا راستہ نہ بن سکا۔ اور جاہلی حمیت اور غطفانیت اور عدنانیت پر بے جا تعصب اور فخر و مباہات کا موقع جاتا رہا۔

ان تمام عوامل و اسباب اور تر جیحی خصوصیات کو دیکھتے ہوئے یثرب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرام کی ہجرت کے لئے مناسب ترین جگہ تھی۔ یہ شہر اس کا مستحق تھا کہ اس کو اسلامی دعوت کا مستقر و مرکز بنایا جائے یہاں تک کہ اسلام کو پوری قوت و استحکام حاصل ہو اس کے اندر پیش قدمی کرنے کی صلاحیت و طاقت پیدا ہو جائے اور وہ جزیرۃ العرب کو فتح کر سکے اور پھر اس وقت کی پوری متمدن دنیا پر اپنا پرچم ہدایت لہرا سکے۔

مدینہ میں اسلام کا فروغ

اب انصار (یعنی اوس و خزرج) کے گھرانوں میں اسلام کی اشاعت شروع ہوئی پہلے سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر جو اوس کی شاخ بنی الاشہل سے تعلق رکھتے تھے اور اپنی قوم کے سردار تھے اسلام لائے اس میں بڑا دخل ان پہلے مسلمان ہونے والوں کی حکمت ایمانی اور لطف و مہربانی اور مصعب بن عمیرؓ کے حسن تبلیغ و دعوت کو تھا اس کے بعد بنی عبد الاشہل نے بھی اسلام قبول کیا۔ اور بالآخر انصار کے گھروں میں سے کوئی گھر ایسا باقی نہ بچا جہاں کچھ مرد اور عورتیں مسلمان نہ ہوں[1]۔

بیعت عقبۂ ثانیہ

دوسرے سال مصعب بن عمیرؓ مکہ واپس ہوئے اور انصار کے کچھ مسلمان

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۴۳۶ - ۴۳۸ باختصار۔

مشرکین کی ایک جماعت کے ساتھ جو حج کی غرض سے جا رہی تھی مکہ پہونچے
اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عقبہ میں بیعت کا وعدہ کیا، جب وہ حج سے
فارغ ہوئے اور ایک تہائی رات گذر گئی تو وہ عقبہ کے نزدیک ایک گھاٹی میں جمع
ہوئے ان سب کی تعداد تہتر (۷۳) تھی جن میں دو عورتیں بھی شامل تھیں رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے آپ کے ساتھ آپ کے چچا عباس بن عبدالمطلب
بھی تھے اور وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے گفتگو فرمائی، قرآن مجید ان کو پڑھ کر
سنایا، ان کو اللہ کی طرف آنے کی دعوت دی اور اسلام قبول کرنے کا شوق دلایا،
پھر آپ نے فرمایا کہ میں تم سے اس پر بیعت لیتا ہوں کہ تم میرے ساتھ حفاظت
وخیال کا وہی معاملہ کروگے جو اپنے اہل وعیال کے ساتھ کرتے ہو، انھوں نے آپ سے
بیعت کی اور آپ سے یہ عہد لیا کہ آپ انھیں بے یار ومددگار نہ چھوڑیں گے اور
نہ اپنی قوم کی طرف واپس ہو جائیں گے، آپ نے ان سے وعدہ کیا اور فرمایا کہ میں
تم سے ہوں اور تم مجھ سے ہو جس سے تم جنگ کروگے اس سے میں بھی جنگ کروں گا جس سے
تم صلح کروگے اس سے میں بھی صلح کروں گا، پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے
بارہ ذمہ داروں اور سرداروں کا انتخاب کیا، نو خزرج کے اور تین اوس کے[1]

مدینہ ہجرت کرنے کی اجازت

جب انصار کے اس قبیلہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرلی

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱/ ص ۴۴۱-۴۴۳

اور آپ کے ماننے والوں کی حمایت و مدد کا عہد کیا تو بہت سے مسلمان ان کی
پناہ میں آگئے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان تمام مسلمانوں کو جو آپ کے ساتھ
مکہ میں تھے، مدینہ کی طرف ہجرت کرنے اور انصار سے مل جانے کا حکم دے دیا اور فرمایا کہ
"اللہ عزوجل نے تمہارے لئے کچھ بھائی اور گھر بار مہیا کر دیئے ہیں جہاں تم امن کے ساتھ
رہ سکتے ہو" یہ سن کر لوگ جماعتیں بنا بنا کر ہجرت کرنے لگے، خود رسول اللہ صلے اللہ
علیہ وسلم مکہ میں ٹھہر کر ہجرت کے بارہ میں حکم الٰہی کے منتظر رہے۔

مکہ سے مسلمانوں کی ہجرت کوئی آسان کھیل نہ تھا جس کو قریش ٹھنڈے کلیجے
برداشت کر لیتے، انھوں نے اس انتقال آبادی اور نقل و حرکت کے راستہ میں طرح طرح
کی رکاوٹیں کھڑی کر دیں اور مہاجرین کو مختلف آزمائشوں اور تکلیفوں میں ڈالنا
شروع کیا، لیکن مہاجرین بھی اس راستے کو بدلنے والے اور اپنا قدم پیچھے ہٹانے والے
نہ تھے، وہ کسی قیمت پر بھی مکہ میں رہنا پسند نہ کرتے تھے، چنانچہ کسی کو اپنی بیوی اور بچے
کو مکہ میں چھوڑ کر تنہا جانا پڑا، جیسا کہ ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا، کسی نے اپنی
زندگی بھر کی کمائی ہوئی پونجی سے ہاتھ دھوئے جیسا کہ صہیب رضی اللہ عنہ نے کیا۔

ام سلمہ رضی اللہ عنہا خود روایت کرتی ہیں کہ جب ابو سلمہؓ نے مدینہ ہجرت کا
پختہ عزم کر لیا تو سفر کے لئے اپنا اونٹ تیار کیا، مجھ کو اس پر سوار کرایا اور میرے لڑکے
سلمہ بن ابی سلمہ کو میری گود میں دے دیا، پھر اونٹ کی نکیل ہاتھ میں لی اور روانہ ہوگئے
جب بنی المغیرہ کے کچھ لوگوں کی نظر ان پر پڑی تو وہ ان کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ
تمہاری حد تک ٹھیک ہے تم اپنے کو بچا کر جا سکتے ہو، ان بی بی کو ہم تمہاری ہمرکابی کے لئے
کیسے چھوڑ سکتے ہیں، وہ بیان کرتی ہیں کہ یہ کہہ کر انھوں نے اونٹ کی نکیل ان کے

ہاتھ سے چھین لی اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے، یہ دیکھ کر بنو عبد الاسد میں جو ابوسلمہ کے
حامی تھے سخت اشتعال پیدا ہوا، انھوں نے کہا خدا کی قسم تم نے ان کو ہمارے بھائی
سے چھین لیا ہے لیکن ہم اپنے لڑکے کو اب ان کے پاس ہرگز نہیں چھوڑیں گے، اس کے بعد
دونوں میں میرے بچہ پر کشمکش شروع ہو گئی اور دونوں اس کو اپنی طرف کھینچنے لگے حتیٰ کہ
اس کا ہاتھ اکھڑ گیا، بنو عبد الاسد اس کو چھین لینے میں کامیاب ہو گئے اور اس کو اپنے
ساتھ لے گئے، بنو المغیرہ نے مجھے اپنی قید میں کر لیا، میرے شوہر مدینہ روانہ ہو چکے تھے
اس طرح میرے لڑکے میرے شوہر اور میں تینوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے،
میں ہر صبح کو باہر آتی اور "ابطح" میں بیٹھ جاتی اور شام تک روتی رہتی اسی پر پورا ایک
سال گزر گیا، ایک دن بنو المغیرہ ہی میں سے میرے چچا زاد بھائیوں میں سے ایک بھائی
کی مجھ پر نظر پڑی اور میری اس حالت کو دیکھ کر اسے رحم آیا اور اس نے بنو المغیرہ سے
کہا کہ اس غریب کو کیوں نہیں چھوڑ دیتے تم نے اس کو شوہر اور بیٹے دونوں سے
محروم کر دیا ہے؟ وہ کہنے لگے اگر تمھارا دل چاہے تو اپنے شوہر کے پاس چلی جاؤ،
اس وقت بنو عبد الاسد نے میرا لڑکا مجھے واپس کیا، میں نے اپنا اونٹ تیار کیا،
بچہ کو گود میں لیا اور مدینہ میں اپنے شوہر کی تلاش کے لئے چل کھڑی ہوئی اس حال
میں کہ اللہ کا کوئی بندہ میرے ساتھ نہ تھا، جب میں تنعیم تک پہونچی تو میری ملاقات
عثمان بن طلحہؓ سے ہو گئی جو بنی عبد الدار میں سے تھے، وہ دیکھتے ہی بولے ابی امیہ
کی لڑکی! کہاں جا رہی ہو؟ میں نے کہا مدینہ میں اپنے شوہر کے پاس جانا چاہتی ہوں
انھوں نے کہا تمھارے ساتھ کوئی ہے؟ میں نے جواب دیا میرے ساتھ اللہ کے سوا
اور اس بچے کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے کہنے لگے خدا کی قسم تمھیں منزل پر پہونچتا

آسان نہیں ہے انھوں نے اونٹ کی نکیل اپنے ہاتھ میں لے لی اور مجھے لے کر آگے
روانہ ہوئے خدا کی قسم جن لوگوں سے اب تک میرا واسطہ پڑا ہے میں نے کسی کو بھی
ان سے زیادہ شریف اور کریم النفس نہیں پایا، جب کوئی منزل آتی اور رکنا پڑتا تو
وہ اونٹ کو بٹھا کر علیحدہ ہٹ جاتے، جب میں اتر آتی تو اونٹ کے پاس آکر سامان
اتارتے پھر ایک درخت سے اس کو باندھتے پھر کسی درخت کے سایہ میں لیٹ جاتے
جب شام ہوتی اور روانگی کا وقت آتا تو اٹھتے اونٹ کو تیار کرتے سامان وغیرہ
اس کے اوپر لادتے پھر وہاں سے کچھ دور ہٹ جاتے اور مجھ سے کہتے کہ بیٹھ جاؤ جب
میں اچھی طرح بیٹھ جاتی تو آکر اس کی نکیل تھام لیتے اور اسی طرح دوسری منزل
تک پہونچتے، اسی طرح کرتے ہوئے انھوں نے مجھے مدینہ پہنچایا، جب ان کی نظر
بنی عمرو بن عوف کے گاؤں "قبا" پر پڑی تو مجھ سے کہنے لگے کہ تمہارے شوہر اسی گاؤں
میں ہیں، (ابوسلمہ یہیں مقیم تھے) اب تم اللہ کا نام لے کر وہاں چلی جاؤ، یہ کہہ کر انھوں نے
مجھے رخصت کر دیا اور مکہ کے لئے روانہ ہوگئے۔

وہ کہتی تھیں کہ اسلام میں کسی گھرانہ کو وہ تکالیف نہیں اٹھانی پڑیں جو
ابوسلمہؓ کے گھر والوں نے اٹھائی ہیں، اور میں نے کسی شخص کو عثمان بن طلحہؓ سے
زیادہ شریف اور باحوصلہ نہیں پایا۔[1]

جب صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے ہجرت کا ارادہ کیا تو کفار قریش نے ان سے
کہا کہ تم ایک حقیر سائل اور مفلس کی حیثیت سے ہمارے پاس آگئے تھے، ہمارے یہاں

---

[1] عثمان بن طلحہؓ بھی صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لائے تھے ہجرت کی اور فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کی کلید ان کے حوالے کی (ابن کثیر ج ۲ ص ۲۱۵-۲۱۶ و الاصابہ فی تمییز الصحابہ ج ۲)

سے کر تم اتنے دولت مند بن گئے اور یہ حیثیت تم نے حاصل کر لی اب تم چاہتے ہو کہ اپنے سارے سامان اور مال وجان کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤ خدا کی قسم یہ نہیں ہو سکتا۔ صہیبؓ نے ان سے کہا کہ اگر میں یہ مال واسباب تمھارے حوالے کر دوں تو کیا تم مجھے جانے دوگے؟

انھوں نے کہا ہاں۔

صہیبؓ نے جواب دیا کہ میں یہ سارا مال تمھیں دیتا ہوں۔

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا کہ ربح صہیب، ربح صہیب صہیب نفع میں رہے، صہیب نفع میں رہے[1]

اس موقع پر جن لوگوں نے مدینہ ہجرت کی ان میں حضرت عمرؓ، طلحہؓ، حمزہؓ، زید بن حارثہؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ، زبیر بن العوامؓ، ابو حذیفہؓ، عثمان بن عفانؓ اور بہت سے دوسرے صحابہ کرامؓ شامل تھے اس کے بعد ہجرت کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ میں دو آدمیوں کو چھوڑ کر یعنی حضرت ابوبکرؓ و حضرت علیؓ، صرف وہی باقی بچا جو کسی معذوری سے نہیں جا سکا، یا وہ جو کسی آزمائش اور فتنہ میں پڑ گیا۔[2]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف قریش کی سازش اور ناکامی

جب قریش نے یہ دیکھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مدینہ میں اس قدر حامی و مددگار پیدا ہو گئے ہیں اور وہاں ان کا کوئی زور نہیں چل سکتا تو انھوں نے

---

[1] ابن کثیر بحوالہ ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۲۲۳۔ [2] سیرت ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۴۶۹-۴۷۰۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مدینہ ہجرت سے بہت خطرہ اور خوف محسوس کیا، اور انھوں نے سوچا کہ اگر آپ تشریف لے گئے تو پھر آپ پر کوئی بس نہ چل سکے گا۔ یہ سوچ کر وہ سب لوگ "دارالندوہ" میں (جو اصل میں قصی بن کلاب کا گھر تھا اور قریش اپنے سارے اہم معاملات یہیں طے کرتے تھے) جمع ہوئے اور اس مسئلہ پر غور و خوض کیا گیا، اس موقع پر قریش کے بڑے بڑے سردار سب موجود تھے۔

آخر میں متفقہ طور پر یہ بات طے پائی کہ ہر قبیلے سے ایک باہمت اور عالی نسب جوان کا انتخاب کیا جائے اور وہ سب مل کر یکبارگی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور ہوں، اس طرح یہ خون سارے قبائل میں تقسیم ہو جائے گا اور کسی ایک پر اس کی ذمہ داری نہ ہوگی، اور بنی عبد مناف ساری قوم سے جنگ کا خطرہ مول نہ لیں گے۔ اس کے بعد لوگ منتشر ہو گئے اور اجتماعی جرم کا یہ منصوبہ طے ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سازش سے آگاہ کر دیا، آپ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ آپ کی چادر اوڑھ کر آپ کے بستر پر سو جائیں، آپ نے یہ بھی فرمایا کہ تم کو کوئی گزند ہرگز نہ پہونچے گا۔

ادھر یہ پوری ٹولی آپ کے دروازہ پر تیار کھڑی تھی اور حملہ کے لئے پوری طرح کمربستہ تھی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور تھوڑی سی مٹی اپنے ہاتھ میں لے لی، اسی وقت اللہ تعالیٰ نے ان کی بصارت سلب کر لی، آپ یہ مٹی ان کے سروں پر پھینکتے ہوئے اور سورۂ یٰسین کی آیات کی "فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ" تک تلاوت کرتے ہوئے صاف ان کے سامنے سے گزر گئے، اور کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔

اس درمیان میں کسی آنے والے نے آواز دی کہ تم لوگ کس چیز کے انتظار میں کھڑے ہو؟! انھوں نے کہا محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے انتظار میں! اس نے کہا نامرادو! وہ تو جا چکے اور اپنے کام کے لیے روانہ ہو گئے! انھوں نے جھانک کر دیکھا کہ کوئی شخص بستر پر لیٹا سو رہا ہے ان کو یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں، صبح ہوئی تو حضرت علیؓ بستر سے اٹھے، یہ دیکھ کر ان کو بڑی شرمندگی ہوئی اور سب ناکام و نامراد واپس گئے۔[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ اللہ تعالے نے مجھے یہاں سے نکلنے اور ہجرت کرنے کی اجازت عطا فرما دی ہے حضرت ابوبکرؓ نے کہا "الصحبة یا رسول الله" رسول اللہ! رفاقت و صحبت کا طلب گار ہوں، آپ نے فرمایا "الصحبة" ہاں تم بھی رفیق ہو گے۔ حضرت ابوبکرؓ یہ سن کر خوشی سے رو پڑے، اس کے بعد انھوں نے دو سواریاں پیش کیں جو اسی سفر کی غرض سے انھوں نے پہلے سے تیار کر رکھی تھیں، عبداللہ بن اُریقط کو انھوں نے بطور رہبر کے معاوضہ پر طے کر لیا۔

عجیب تضاد

قریش رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس قدر دشمنی اور آپ کی مخالفت

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱/ صفحہ ۴۸۳-۴۸۲

پر اس درجہ اعتماد کے باوجود آپ کی امانت و دیانت، سچائی، اور آپ کی عالی ظرفی و حوصلہ مندی پر کلی اعتماد کرتے تھے یہاں تک کہ اگر کسی کو اپنی چیز کے ضائع ہونے یا غصب کئے جانے کا اندیشہ ہوتا تھا تو وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ چیز رکھتا تھا، اس طور پر آپ کے پاس مختلف امانتیں جمع ہو گئی تھیں آپ نے حضرت علیؓ کو اس کا ذمہ دار بنایا کہ وہ اس وقت تک مکہ میں رہیں جب تک یہ امانتیں آپ کی طرف سے ادا نہ کر دی جائیں، اللہ تعالےٰ نے سچ ارشاد فرمایا ہے :-

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي	ہم کو معلوم ہے کہ ان (کافروں)
يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ	کی باتیں تمہیں رنج پہنچاتی ہیں
وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ	(مگر) یہ تمہیں جھوٹا نہیں کہتے
يَجْحَدُونَ ﴿۳۳﴾ (سورۂ انعام ۳۳)	بلکہ ظالم خدا کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں۔

ہجرت سے ایک سبق

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس ہجرت سے سب سے پہلی بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ دعوت اور عقیدہ کی خاطر ہر عزیز و محبوب اور ہر مانوس و مرغوب شے اور ہر اس چیز کو جس سے محبت کرنے، جس کو ترجیح دینے اور جس سے بہر صورت وابستہ رہنے کا جذبہ انسان کی فطرت سلیم میں داخل ہے بے دریغ قربان کیا جا سکتا ہے لیکن ان دونوں اول الذکر چیزوں کو ان میں سے کسی چیز کے لئے ترک نہیں کیا جا سکتا۔

کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جائے ولادت اور آپ کے اور صحابۂ کرامؓ کے مرکز
و وطن کے علاوہ دلوں کے لئے مقناطیس کی سی کشش رکھتا تھا اس لئے کہ اسی شہر میں بیت اللہ
ہے جس کی محبت ان کی روح اور خون میں پیوست تھی لیکن ان میں سے کسی ایک چیز نے بھی آپ
کو اور صحابۂ کرامؓ کو ترکِ وطن اور اہل وعیال کو خیرباد کہنے سے باز نہیں رکھا کیونکہ زمین
اس عقیدہ و دعوت کے لئے بالکل تنگ ہو چکی تھی اور مکہ والے ان دونوں چیزوں سے منہ پھیر چکے تھے۔
بشری وانسانی تعلق و محبت اور ایمانی قوت اور ذوق و شوق کے یہ ملے جلے
جذبات آپ کے اس جملہ سے بخوبی جھلک رہے ہیں جو ہجرت کے وقت آپ نے مکہ کو
مخاطب کرکے کہا تھا "ما اطیبك من بلد واحبك الیّ ولولا أن قومی اخرجونی
منك ماسکنت غیرك"[1] (تو کتنا اچھا شہر ہے اور مجھے کس قدر عزیز و محبوب ہے اگر
میری قوم مجھے یہاں سے نہ نکالتی تو میں تیرے سوا کسی اور جگہ سکونت اختیار نہ کرتا۔)
یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تعمیل تھی:۔

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ	اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو
اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ	میری زمین فراخ ہے تو میری ہی
فَاعْبُدُوْنِ ۞ (سورۂ عنکبوت ۵۶)	عبادت کرو۔

غارِ ثور کی طرف

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ مکہ سے چھپتے چھپاتے روانہ ہوئے،
ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے عبداللہ کو ہدایت کی کہ وہ ذرا غور سے سنیں کہ لوگ ان کے

[1] ترمذی بروایت ابن عباس بطریق مرفوع (باب فضل مکہ)

بارے میں کیا چہ میگوئیاں کر رہے ہیں اپنے غلام عامر بن فہیرہ کو حکم دیا کہ وہ دن بھر ان کی بکریاں چرایا کریں اور شام کو ان کا دودھ پہنچایا کریں۔ اسماء رات بھر کھانا پہنچایا کرتی تھیں۔

محبت کی کرشمہ سازیاں

محبت تخلیق انسانی سے لے کر آج تک ایک ایسے الہامی جذبہ کی حیثیت سے زندہ پائندہ اور تابندہ ہے جو نازک سے نازک باتوں کی طرف بطور خود رہنمائی کرتی ہے اور بات سمجھا دیتی ہے۔ "عشق است و ہزار بدگمانی" والا مضمون ہے وہ اپنے محبوب سے کسی وقت غافل نہیں ہوتی اور وہم سے موہوم چیز کا خطرہ محسوس کر لیتی ہے اس سفر میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کچھ یہی حال تھا چنانچہ روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم غار کی طرف روانہ ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ چلنے میں کبھی آپ سے آگے رہتے کبھی پیچھے چلنے لگتے یہاں تک کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو محسوس فرمایا اور کہا کہ ابوبکر کیا بات ہے کبھی تم میرے پیچھے چلتے ہو اور کبھی آگے؟ انھوں نے کہا کہ یا رسول اللہ مجھے تعاقب کا خیال آتا ہے تو میں پیچھے چلنے لگتا ہوں اور پھر گھات کا خطرہ ہوتا ہے تو آگے آجاتا ہوں[1]۔

جب دونوں حضرات غار تک پہنچ گئے تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ آپ ذرا توقف فرمائیں میں غار کو دیکھ بھال لوں اور صاف کر لوں اس کے بعد وہ

---

[1] البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۳ ص ۱۸۰ منقول از بیہقی بروایت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔

غار کے اندر گئے اور اس کو صاف کر کے اور سوراخ وغیرہ بند کر کے باہر آئے اس وقت ان کو یاد آیا کہ ایک بل باقی رہ گیا ہے جس کو وہ ٹھیک سے نہیں دیکھ سکے پھر انھوں نے کہا کہ یا رسول اللہ آپ ذرا اور توقف فرمائیں تب اس کو دیکھ لوں پھر اس کے اندر گئے اور جب اس کی طرف سے اطمینان ہوگیا تو کہا یا رسول اللہ اب آپ اندر اتر آئیں، چنانچہ آپ اندر تشریف لے آئے۔[1]

آسمانی کمک اور غیبی امداد

جب دونوں غار میں داخل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے مکڑی کو بھیجا، اس نے غار کے منہ پر جو درخت تھا اس کے درمیان ایک جالا بن دیا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو چھپا لیا، اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دو جنگلی کبوتریوں کو بھیجا جو اڑ پھڑ پھڑاتی ہوئی پھر آکر وہاں بیٹھ گئیں۔[2]

"وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (اور اللہ ہی کے ہاتھ میں آسمانوں اور زمین کے لشکر ہیں)

انسانی تاریخ کا سب سے نازک لمحہ

ادھر مشرکین نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا تعاقب شروع کیا، یہ انسانیت کے طول وطویل سفر کا سب سے نازک اور سب سے زیادہ فیصلہ کن لمحہ تھا، یا تو ایک ایسی بدنصیبی سامنے تھی جس کی کوئی انتہا نہیں یا ایک ایسی خوش نصیبی و اقبال مندی کا آغاز ہوتا تھا، جس کی کوئی حد نہ تھی، انسانیت نے چلنے سے اپنی سانس روک لی تھی اور بے حس و حرکت ہو کر ان جاسوسوں اور تعاقب کرنے والوں کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی جو اس وقت غار کے

---

[1] ایضاً ص ۱۸۱ [2] ابن کثیر ج ۲ ص ۱۸۲ (روایۃً عن ابن عساکر)

منہ پر بکھرے تھے اور صرف اتنی دیر باقی تھی کہ ان میں کوئی نیچے دیکھ لے لیکن خدا کی قدرت ان کے اور اس قدم کے درمیان حائل ہوگئی اور وہ دھوکہ کھا گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ غار کا منہ مکڑی کے جالے سے بند ہے تو ان کا ذہن بھی ادھر نہ جا سکا کہ اندر کوئی ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:۔

فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا (سورۂ توبہ۔ ۴۰)

تو خدا نے ان پر تسکین نازل فرمائی اور ان کو ایسے لشکروں سے مدد دی جو تم کو نظر نہیں آتے تھے۔

"لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا"

اس لمحہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نگاہ اوپر اٹھی تو انھیں مشرکین کے آثار نظر آئے۔ انھوں نے کہا یا رسول اللہ اگر ان میں سے کسی نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو ہمیں دیکھ لے گا۔ آپ نے جواب دیا "ماظنک باثنین اللّٰہ ثالثھما"[1] (ان دو کے بارہ میں تمھارا کیا گمان ہے جن کا تیسرا اللہ ہے) اسی سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی:۔

ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (سورۂ توبہ۔ ۴۰)

(اس وقت) دو ہی شخص تھے جن میں (ایک ابوبکرؓ تھے) دوسرے (خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے اس وقت پیغمبر اپنے رفیق کو تسلی دیتے تھے کہ غم نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، باب قولہ تعالیٰ "ثانی اثنین اذھما فی الغار" و کتاب التفسیر۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے تعاقب میں سُراقہ کی روانگی

قریش نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کر کے لائے گا اس کو سَو اونٹنیاں انعام میں دی جائیں گی ان لوگوں نے غار میں تین راتیں گذاریں پھر دونوں آگے کی طرف روانہ ہوئے (عامر بن فُہیرہ اور عبداللہ بن اریقط جن کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے راستہ بتانے کے لئے اُجرت پر ساتھ لیا تھا ساحل کی طرف سے آپ کو لے کر چلے۔

سُراقہ بن مالک بن جعشم کو انعام کی لالچ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے تعاقب پر آمادہ کیا اور سَو اونٹنیوں کے شوق میں اس نے ایک گھوڑے پر سوار ہو کر آپ کے نشانات قدم کی مدد سے تعاقب شروع کیا لیکن اس کے گھوڑے کو اچانک ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا لیکن اب بھی اس نے ہمت نہ ہاری اور آپ کے نشانات پر آگے بڑھتا رہا، دوسری مرتبہ اس کے گھوڑے نے پھر ٹھوکر کھائی اور وہ گرا پھر سوار ہوا اور تعاقب شروع کیا یہاں تک کہ یہ لوگ اس کو سامنے نظر آگئے۔ اور اسی وقت تیسری بار گھوڑے نے سخت ٹھوکر کھائی اور اس کے دونوں اگلے پاؤں زمین میں دھنس گئے، سُراقہ گر پڑا اسی کے ساتھ گویا آندھی کی شکل میں وہاں سے دھواں بھی اٹھا۔ سُراقہ نے جب یہ دیکھا تو سمجھ گیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ کی حمایت میں ہیں اور وہ ہر صورت میں غالب آئیں گے اس نے زور سے آواز دی اور کہا کہ میں سُراقہ بن جعشم ہوں مجھے بات کرنے کا موقع دیجئے، مجھ سے آپ لوگوں کو ہرگز کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا اس سے پوچھو کہ وہ ہم سے کیا چاہتا ہے۔ سُراقہ نے کہا کہ آپ ایک تحریر مجھے دیدیں جو ہمارے اور آپ کے درمیان ایک نشانی اور

یادگار کے طور پر محفوظ ہے عامر بن فہیرہ نے ہڈی یا جھلی پر ایک تحریر لکھ کر آپ کو دیدی۔[1]

ایک خلاف قیاس اور ماوراء عقل پیش گوئی

عین اس حال میں جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہجرت پر مجبور ہیں، مکہ میں رہنا ممکن نہیں، دشمن ہر طرف گھات میں ہیں، اور ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نگاہ اس دن کی طرف جاتی ہے جس دن آپ کے غلام کسریٰ کا تاج اور قیصر کا تخت اپنے پیروں سے روند رہے ہوں گے اور زمین کے خزانوں کے مالک ہوں گے آپ نے اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں اس درخشاں روشنی کی پیش گوئی کی اور سُراقہ سے ارشاد فرمایا سُراقہ! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب کسریٰ کے کنگن تم اپنے ہاتھوں میں پہنو گے؟

بے شک اللہ نے اپنے نبی سے نصرت و حمایت اور فتح مبین اور اپنے دین کے لئے غلبہ و عروج اور فتح مکمل کا وعدہ کیا تھا۔

هُوَ الَّذِيٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى — وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت
وَدِيۡنِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ — اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اس (دین)
كُلِّهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ ۝ — کو (دنیا کے) تمام دینوں پر غالب
(سورۂ توبہ - ۳۳) — کرے اگرچہ کافر ناخوش ہی ہوں۔

کوتاہ بین اور کم عقل لوگوں نے اس بات کا انکار کیا، قریش نے اس کو امر محال اور انہونی بات سمجھی لیکن نگاہِ نبوت دور کو قریب دیکھ رہی تھی۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخۡلِفُ الۡمِيۡعَادَ — بے شک خدا خلاف وعدہ نہیں کرتا۔

اور حرف بحرف اسی طرح ہوا، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے کسریٰ کے

---

[1] سیرت ابن ہشام ص ۴۸۹-۴۹۰ نیز بخاری شریف جلد اول (باب ہجرۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم الی المدینہ) الفاظ کے معمولی اختلافات کے ساتھ۔

کنگن اس کا پٹکا اور تاج حاضر کیا گیا تو انھوں نے سراقہ کو بلایا اور اس کو یہ پہنایا۔[1]
اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ سراقہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے زادِ راہ اور ضروری سامان کی بھی پیش کش کی لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول نہ فرمایا اور صرف اتنی بات کہی کہ اَخْفِ عَنَّا (ہماری اطلاع کسی کو نہ دینا)[2]

مُبارک شخص

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اپنے سفر کے دوران اُمّ معبد الخزاعیہ کے پاس سے گذرے اُن کے پاس ایک بکری تھی جس کا چارہ پانی کی کمی سے دودھ خشک ہوگیا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے تھنوں پہ ہاتھ پھیرا، اللہ کا نام لیا اور دعا کی چنانچہ اسی وقت دودھ تیزی سے جاری ہوگیا۔ آپ نے یہ دودھ اُم معبد کو اور اپنے ساتھیوں کو پلایا یہاں تک کہ سب خوب سیراب ہوگئے پھر آپ نے نوش فرمایا اور دوبارہ دوہا یہاں تک کہ برتن پورا لبریز ہوگیا۔ جب ابو معبد اپنے کام سے واپس آئے اور واقعہ دریافت کیا، تو اُم معبد نے ان سے کہا کہ خدا کی قسم! ایک مبارک شخص ہمارے پاس سے گذرے اور ایسی ایسی انھوں نے باتیں کیں، پھر انھوں نے بہترین الفاظ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعریف کی۔ یہ سن کر ابو معبد بولے: خدا کی قسم مجھے یہ قریش کے وہی شخص معلوم ہوتے ہیں جن کی قریش کو تلاش ہے۔[3]

رہبر نے ان دونوں کو ساتھ لے کر اپنا سفر جاری رکھا یہاں تک کہ یہ قُبا تک جو مدینہ کے مضافات میں ہے پہونچ گئے۔ یہ واقعہ ۱۲ ربیع الاول دوشنبہ کا ہے اور اسی سے اسلامی تقویم اور اسلامی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔

---

۱ الاستیعاب ج ۲ ص ۵۹۵ ۲ بخاری شریف (باب ہجرۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم) ۳ زاد المعاد ج ۲ ص ۵۴

عہدِ بعثت کے یثرب (مدینہ) پر ایک نظر

مکّی اور مدنی معاشروں کا فرق

شہر یثرب کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کا دارالہجرۃ، اسلام کی عالمی دعوت کا مرکز اور ظہورِ اسلام کے بعد قائم ہونے والے پہلے اسلامی معاشرہ کا گہوارہ بنایا، ہمیں اس کی تمدّنی، معاشرتی، اقتصادی صورتِ حال، قدیم قبائل کے باہمی تعلقات اور وہاں کے یہود کی معاشرتی، اقتصادی اور جنگی اہمیت اور اس زرخیز شہر کے معیارِ زندگی کو سمجھنا ہوگا جہاں متعدد مذاہب، ثقافتیں اور معاشرے دوش بدوش تھے جب کہ مکہ مکرمہ کا ایک رنگ، ایک طرز اور ایک ہی مذہب تھا، اس سلسلہ میں یہاں پر قارئین کے سامنے کچھ تفصیلات پیش کی جاتی ہیں جن کی مدد سے وہ زمانۂ بعثت کے شہر یثرب کی نوعیت اور صورتِ حال کا کسی قدر اندازہ کرسکتے ہیں۔

یہود

اس تاریخی حقیقت کو ترجیح حاصل ہے کہ یہود کی اکثریت جزیرۃ العرب میں عموماً اور شہر یثرب میں خصوصاً پہلی صدی عیسوی میں آئی (مشہور یہودی فاضل

ڈاکٹر اسرائیل ولفنسن لکھتا ہے:۔

"سنہ ۷۰ء میں جب یہودی اور رومی جنگ کے نتیجے میں فلسطین اور بیت المقدس برباد ہو گئے اور یہود دنیا کے مختلف علاقوں میں بکھر گئے تو یہود کی بہت سی جماعتوں نے بلاد عرب کا رخ کیا، جیسا کہ یہودی مورخ جوزیفس کا کہنا ہے جو خود بھی اس جنگ میں شریک تھا اور بعض مواقع پر اس نے یہودی ٹکڑیوں (UNITS) کی بھی قیادت کی تھی، عربی مآخذ بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔"[1]

مدینہ میں یہود کے تین قبیلے آباد تھے (جن میں بالغوں کی تعداد دو ہزار سے اوپر تھی) قینقاع، نضیر، قریظہ۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ بنو قینقاع کے لڑنے والوں کی تعداد سات سو تھی، نضیر کے آدمیوں کی تعداد بھی اتنی ہی تھی، جب کہ قریظہ کے بالغوں کی تعداد سات سو اور نو سو کے درمیان تھی۔[2]

---

[1] تاریخ الیہود فی بلاد العرب فی الجاہلیۃ و صدر الاسلام، اسرائیل ولفنسن (ابو ذؤیب) ص ۷۵ (قاہرہ ۱۹۲۷ء)

[2] یہ اندازہ سیرت ابن ہشام کے ان اعداد و شمار سے کیا گیا ہے جو جنگوں اور واقعات کے تذکرے میں آئے ہیں جیسے بنی نضیر کی جلا وطنی، بنی قریظہ کا قتل وغیرہ۔ بنو قینقاع، نضیر اور قریظہ بڑے قبیلے تھے جن کی ماتحت شاخیں بھی تھیں، جیسے بنی ہدل قریظہ کے تابع تھے جن میں سے بعض بڑے صحابی بھی ہوئے اور جیسے بنی زنباع جو بنی قریظہ کی شاخ ہے۔ بعض یہودی جماعتوں کے نام اس معاہدے میں بھی آئے ہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور یہود کے درمیان ہوا تھا، جیسے بنی عوف، بنی النجار، بنی ساعدہ، بنی ثعلبہ، بنی جفنہ، بنی الحارث وغیرہ۔ اس معاہدے میں ان جماعتوں کے ذکر کے بعد آیا ہے کہ "ان بطانۃ یہود کانفسہم" (یہود کے خواص اور ان کے متعلقین کا معاملہ بھی انہیں کی طرح ہے) اسی لئے سمہودی صاحب "وفاء الوفاء" کا کہنا ہے کہ یہود بیس قبیلوں سے زیادہ تھے۔ (وفاء الوفاء ۱؍۱۶۲)۔

ان تینوں قبائل کے باہمی تعلقات کشیدہ رہتے تھے اور کبھی لڑائیاں بھی ہوتی تھیں، ڈاکٹر ولفنسن کہتا ہے:۔

"بنی قینقاع اور بقیہ یہود میں عداوت چلی آتی تھی جس کا سبب یہ تھا کہ بنی قینقاع بنی خزرج کے ساتھ "یوم بعاث" میں شریک تھے اور بنی نضیر اور بنی قریظہ نے بنی قینقاع کا بڑی بے دردی سے کشت و خون کیا تھا اور ان کا شیرازہ بری طرح سے منتشر کر دیا تھا، حالانکہ انھوں نے گرفتار ہونے والے تمام یہود کا فدیہ بھی ادا کر دیا تھا، چنانچہ یوم بعاث" کے بعد یہودی قبائل میں باہمی تنازع چلی آرہی تھی، جب قینقاع اور انصار کے درمیان جنگ ہوئی تو انصار کے مقابلہ پر ان کا کسی یہودی نے بھی ساتھ نہیں دیا۔"[1]

قرآن مجید نے بھی یہود کی باہمی عداوت کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ	اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ تم
دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنفُسَكُم	آپس میں خون نہ بہاؤ گے اور اپنوں
مِّن دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنتُمْ	کو اپنے وطن سے نہ نکالو گے پھر
تَشْهَدُونَ ۝ ثُمَّ أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ	تم نے اقرار کیا اور تم مانتے ہو پھر
تَقْتُلُونَ أَنفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ	تم ہی اپنوں کو قتل کرتے ہو اور
فَرِيقًا مِّنكُم مِّن دِيَارِهِمْ	اپنے ایک فرقے کو ان کے گھروں سے
تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِم بِالْإِثْمِ	نکالتے ہو ان پر چڑھائی کرتے ہو

[1] الیہود فی بلاد العرب صفحہ ۱۲۹

وَإِنْ يَّأْتُوْكُمْ أُسَارٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ (سورۃ البقرۃ ۲-۸۵)

گناہ اور ظلم کے طور پر اور اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو تم فدیہ دیتے ہو حالانکہ ان کا نکال دینا بھی تم پر حرام ہے۔

یہود مدینہ کی مختلف بستیوں اور محلوں میں رہتے تھے جو انھیں کے لئے مخصوص تھیں، بنو قینقاع کو جب بنو نضیر اور بنو قریظہ نے مدینہ کے نواحی محلے سے بھگا دیا تو وہ شہر کے اندر ایک خاص محلے میں رہنے لگے، بنو نضیر مدینہ سے دو تین میل کی دوری پر وادی بطحان کی بلندی پر رہتے تھے، جو کھجوروں اور کھیتوں سے مالا مال تھی، بنو قریظہ مدینہ کے جنوب میں چند میلوں پر واقع مہزور کے علاقے میں رہتے تھے۔[1] مدینہ میں یہود کی مخصوص بستیاں تھیں جن میں قلعے اور مستحکم عمارتیں بنی ہوئی تھیں ان میں وہ مستقل طور پر رہتے تھے، انھیں یہودی حکومت بنانے کا موقع نہیں ملا، بلکہ وہ قبائلی سرداروں کی حمایت و حفاظت کے تحت چین سے رہتے تھے اور اس حمایت کے بدلے میں انھیں سالانہ محصول ادا کرتے تھے، جس کے سبب وہ بدوؤں کے حملوں سے بھی محفوظ رہتے تھے، اس خطرے کے پیش نظر یہودی معاہدوں پر مجبور تھے، چنانچہ ہر یہودی سردار اعراب اور رؤسائے عرب میں سے کسی نہ کسی کو اپنا حلیف بنائے رکھتا تھا۔[2]

---

[1] بنو اسرائیل فی القرآن والسنۃ، ڈاکٹر محمد سید الطنطاوی ص ۷۵

[2] تلخیص از تاریخ العرب قبل الاسلام ج ۲ ص ۲۳ از ڈاکٹر جواد علی (بغداد)

مذہبی امور

یہودی اپنے کو ایک مستقل مذہب اور آسمانی شریعت کا حامل سمجھتے تھے چنانچہ وہ اپنے مدرسوں میں (جن کو مدراس کہتے تھے) اپنے دینی اور دنیوی امور، شرعی احکام، تاریخ اور اپنے انبیاء اور رسولوں کے حالات پڑھتے اور پڑھاتے تھے اسی طرح مخصوص عبادت گاہوں میں وہ اپنی عبادات اور دینی شعائر انجام دیتے تھے، وہ انہی جگہوں پر اپنے تمام دینی اور دنیوی امور کے سلسلے میں مشورہ اور تبادلۂ خیالات کے لئے جمع ہوتے تھے یہودی اپنے مخصوص دینی قوانین پر عمل کرتے تھے جن میں سے کچھ انہوں نے اپنی کتابوں سے اخذ کئے تھے اور کچھ ان کے کاہنوں اور عالموں نے اپنی طرف سے ایجاد کر لئے تھے اسی طرح وہ اپنی عیدیں الگ مناتے تھے کچھ خاص دنوں جیسے یوم عاشورہ میں روزے رکھتے تھے۔[1]

یہود کی مذہبی و اخلاقی حالت

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہود مدینہ کا اپنے اصل دین اور اپنی کتابوں کی تعلیمات سے تعلق بہت کمزور ہو گیا تھا، اور مرور ایام سے وہ بھی اپنے ہمسایہ عربوں کی طرح ہو گئے تھے مگر توحید کا کچھ اثر اور کھانے پینے میں حلال و حرام کی تمیز باقی رہ گئی تھی لیکن جب اسلام خالص و قطعی عقیدۂ توحید کے ساتھ آیا (جو قرآن میں ہے) تو ان کا رہا سہا یہ امتیاز بھی ختم ہو گیا۔

---

[1] بنو اسرائیل فی القرآن والسنۃ ص۱۰۰

وہ اخلاقی پستی کی انتہا کو پہونچ گئے تھے اپنی حاجت روائی کے لئے سفلی اعمال سحر وغیرہ اپنے مخالفین سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کھانے میں زہر کی ملاوٹ، طنز و تعریض اور دھوکہ میں ڈالنے والے ذو معنی کلمات بول کر اپنے مجروح دل کو تسکین دینا ان کی عادت بن گئی تھی یہ جوان پست ذہنیت، شکست خوردہ معاشروں کی پہچان ہوتی ہے، جو مردانگی اور اخلاقی جرأت سے محروم ہوتے ہیں، فنون سحر و کہانت میں یہود کی مہارت تاریخ کے مسلمات میں ہے اور ان کے علماء و اکابر اس کا فخریہ اظہار بھی کرتے ہیں، اور قرآن مجید نے بھی آیت :-

وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ	انھوں نے (اس سحر و جادو) کی
عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ الخ	بھی پیروی کی جس سے شیاطین سلیمان
(سورۃ البقرہ - ۱۰۲)	کی سلطنت اور عہد میں کام لیتے تھے

سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے، یہود کا یہ شغف عہد رسالت تک باقی تھا، مشہور یہودی مستشرق مارگولیتھ (MARGOLIOUTH) (جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام کے بارے میں اپنے تعصب کے لئے بھی مشہور ہے) لکھتا ہے:-

"مدینہ کے یہود فن سحر میں بڑے ماہر تھے اور بجائے جنگ اور مردانہ وار صف آرائی پر کام کرنے کے سحر (جادو) کو ترجیح دیتے تھے۔"[1]

غزوۂ خیبر کے بیان میں بکری کے گوشت میں زہر ملانے کا واقعہ آئے گا جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش کی گئی، مگر آپ محفوظ رہے اور بشر بن براء بن معرور جنھوں نے کھانے میں شرکت کی تھی انتقال کر گئے۔[2]

---

[1] D. S. MARGOLIOUTH: MUHAMMAD & THE RISE OF ISLAM P. 189

[2] صحیح بخاری باب "الشاۃ التی سمت للنبی صلی اللہ علیہ وسلم بخیبر"

معروف کلمات کو ایک خاص طرز سے استعمال کرنے اور ان سے بُرے معنی مراد لینے کا ذکر قرآن شریف میں اس طرح آیا ہے :-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا	اے ایمان والو تم "راعنا" مت کہا
رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا	کرو اور "انظرنا" کہہ دیا کرو اور
وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ	سن لیجیو کافروں کو سزا دردناک
(سورۃ البقرۃ ـ ۱۰۴)	ہوگی۔

ابو نعیم نے دلائل میں ابن عباس رضؓ سے نقل کیا ہے کہ "یہود آہستہ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے "راعنا" کہتے تھے جو ان کی زبان میں ایک بُری گالی تھی، وہ یہ کہہ کر آپس میں ہنستے تھے" اس پر اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، اور اس کے سدِّ باب اور مسلمانوں کو مشابہت سے بچانے کے لئے اس سے روک دیا گیا، اور یہودیوں کے یہاں اس کلمہ کے معنی اسمع لاسمعت (سنو! خدا تم کو سننا نصیب نہ کرے) کے ہیں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ (نعوذ باللہ) انھوں نے آپ کی نسبت "رعن" سے کی جو رعونت سے نکلا ہے، جس کے معنی جہل و حماقت کے ہیں اور الف تحقیر صوت کے لئے ہے۔[1]

بخاری نے حضرت عائشہ رضؓ سے عروہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ وہ فرماتی تھیں کہ یہود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو سلام کرتے وقت "السّام علیک" کہتے تھے[2] اور اس سے مراد موت لیتے تھے۔

---

[1] روح المعانی از علامہ آلوسی بغدادی ج ۱ ص ۳۴۵ ـ ۳۴۹

[2] جامع صحیح، کتاب الدعوات۔

حدیث میں آتا ہے کہ نقل حاء ودا علیک السام" (موت کے سوا ہر بیماری کی دوا ہے)
اسی بارے میں یہ آیت نازل ہوئی کہ ۔

وَإِذَا جَاءُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللَّهُ

اور وہ لوگ جب آپ کے پاس آتے ہیں آپ کو ایسے لفظ سے سلام کرتے ہیں جس سے اللہ نے آپ کو سلام نہیں فرمایا۔

اسی طرح وہ ایسی اخلاقی پستی میں مبتلا ہوئے جس کی کسی مہذب صاحب کتاب اور شرعی و آسمانی تعلیمات پر مبنی معاشرہ سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس رجحان کا پتہ اس عرب عورت کے قصہ سے بھی ہوتا ہے جو بنو قینقاع کے بازار میں ایک کاریگر کے پاس کسی کام سے گئی تو یہود نے اس سے چہرہ سے نقاب اتارنے کے لئے اصرار کیا اور اس کے انکار پر کاریگر نے اس کی نقاب پیچھے سے باندھ دی اور جب وہ کھڑی ہوئی تو اس کی بے پردگی پر سب ہنس پڑے اور عورت نے ایک چیخ ماری جسے سن کر ایک مسلمان نے لپک کر اس کاریگر کا کام تمام کر دیا اور پھر یہود نے اس مسلمان کو شہید کر دیا۔
بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ نہ تھا ورنہ اسواق عرب میں اس کا امکان مشکل تھا۔

اقتصادیات

دوسری قوموں سے ان کے بیشتر مالی معاملات رہن اور سود پر قائم تھے

لہ مجمع بحار الانوار ج ۳ ص ۱۳۵ ۔ سے المجادلہ ۸ ۔ دیکھئے روح المعانی اور تفسیر ابن کثیر ۔ سے سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۹

اور مدینہ جیسے زراعتی علاقے کے پیش نظر انھیں اس کا سنہرا موقع بھی حاصل تھا کیونکہ کسانوں کو کھیتی کے موقع پر اکثر قرض کی ضرورت پیش آتی ہے۔[1]

رہن کا نظام صرف زیور تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ مجبوری کی حالت میں عورتیں اور بچے بھی رہن رکھ لئے جاتے تھے، چنانچہ کعب بن الاشرف کے قتل کے سلسلے میں امام بخاریؒ نے یہ روایت نقل فرمائی ہے۔

قال له محمد بن مسلمة	محمد بن مسلمہؓ نے کعب سے کہا کہ ہم چاہتے
قد اردنا ان تسلفنا وسقا	ہیں کہ تم ایک وسق یا دو وسق غلہ
او وسقين فقال نعم	ہمیں قرض دو اس نے کہا کہ ٹھیک
ارهنوني قالوا اي شيء	تم میرے پاس کچھ رہن رکھو انھوں نے
تريد؟ قال ارهنوني	پوچھا کہ تم کیا چیز چاہتے ہو کعب نے
نساءكم قالوا	کہا تم میرے پاس اپنی عورتوں کو
كيف نرهنك نساءنا	رہن رکھو۔ انھوں نے کہا کہ ہم
وانت اجمل العرب	اپنی عورتوں کو تمہارے پاس کیسے
قال: فارهنوني ابناءكم	رہن رکھدیں جبکہ تم عربوں میں
قالوا كيف نرهنك	خوبصورت ترین انسان ہو
ابناءنا فيسب احدهم	اس نے کہا کہ تب اپنے بیٹوں کو
فيقال رهن بوسق	رہن رکھ دو اس پر انھوں نے
او وسقين قال هذا	کہا کہ ہم تمہارے پاس اپنے بیٹوں کو

---

[1] بنو اسرائیل فی القرآن والسنۃ صفحہ ۱۸

عار علینا ولکن نرھنك اللأمة۔ — کیسے رکھ دیں کہ آگے انہیں طعنہ دیا جائے کہ وہ ایک یا دو وسق کے بدلے رہن رکھے گئے تھے اور یہ ہمارے لئے بڑی شرم کی بات ہوگی البتہ ہم تمہارے پاس ہتھیار رہن رکھ سکتے ہیں۔[1]

اس قسم کے رہن کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ راہنوں اور مرتہنوں کے درمیان نفرت و عداوت پیدا ہو جائے خصوصاً اس وقت جبکہ عرب اپنی عورتوں کے سلسلے میں غیرت و حمیت کے لئے شہرت رکھتے تھے، مدینہ کی اقتصادیات پر یہود کے اس تسلط کا یہ نتیجہ تھا کہ ان کا معاشی دباؤ بہت بڑھ گیا، اور وہ منڈیوں میں من مانی کرنے لگے اپنی مصلحت و منفعت کے مطابق مصنوعی قلت پیدا کر کے چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی سے کام لینے لگے، اس لئے مدینہ کی اکثریت ان کی دھاندلی اور حد سے زیادہ سود خوری اور نفع اندوزی کی ایسی شرمناک حرکتوں کی وجہ سے ان سے نفرت کرنے لگی تھی جن سے ایک عرب آئے دن دوچار رہتا ہے۔[2]

ان کی جبلی خباثت حرص و ہوس اور توسیع پسندی کے پیش نظر (DE LACY O' LEARY) نے اپنی کتاب "عرب قبل محمد" میں لکھا ہے کہ:۔

---

[1] بخاری نے اسے کتاب المغازی میں باب "قتل کعب بن الاشرف" میں ذکر کیا ہے ابن ہشام نے بھی تھوڑے فرق کے ساتھ تہذیب السیرۃ النبویہ ج۲ ص۱۰ پر نقل کیا ہے۔ [2] بحوالہ اسرائیل فی القرآن والسنۃ

۔ اصل بدوی باشندوں[1] اور نو آباد یہودیوں کے تعلقات ساتویں صدی مسیحی میں بہت خراب ہو گئے تھے کیونکہ ان یہودیوں نے اپنی کاشت کے علاقے ان بدوؤں کی چراگاہوں تک وسیع کر لئے تھے۔[2]

اوس وخزرج (مدینہ کے عرب باشندے) اور یہود کے تعلقات ذاتی نفع اور استحصال پر مبنی تھے یہود ان دونوں قبیلوں کو لڑانے پر بھی اپنے فائدے کی صورت میں بہت خرچ کرتے تھے جیسا کہ اوس وخزرج کی متعدد لڑائیوں میں انھوں نے کیا تھا جن کے نتیجے میں یہ دونوں قبیلے تباہ ہو رہے تھے ان کے پیش نظر صرف یہی رہتا تھا کہ مدینے پر ان کا مالی تسلط برقرار رہے آنے والے نبی کے سلسلے میں یہود کی گفتگو نے بھی اوس وخزرج کو داخل اسلام ہونے پر آمادہ کر دیا تھا۔[3]

دینی وثقافتی حالت

بلاد عرب کے یہود کی زبان فطری طور پر عربی ہی تھی لیکن وہ خالص نہیں رہ گئی تھی بلکہ اس میں تھوڑی سی عبرانی کی بھی آمیزش ہو گئی تھی کیونکہ انھوں نے عبرانی کا استعمال پوری طرح نہیں چھوڑا تھا وہ اپنی عبادتوں اور تعلیمی امور میں اس کا استعمال کرتے رہتے تھے۔[4]

---

[1] ان سے عرب قبائل مراد ہیں، جیسے اوس وخزرج اور دوسرے عرب جو مدینہ کے اطراف میں ان کے پڑوسی تھے

[2] ARABIA BEFORE MOHAMMAD, (LONDON 1927) P. 124

[3] بنو اسرائیل فی القرآن والسنۃ للدکتور محمد سید الطنطاوی ص ۱۰۱-۱۰۲

[4] مکۃ والمدینۃ فی الجاہلیۃ وعہد الرسول: احمد ابراہیم الشریف ص ۳۰۲۔

یہود کے دینی و دعوتی پہلو کے بارے میں ڈاکٹر اسرائیل ولفنسن لکھتا ہے:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ یہود کو عرب میں اپنا دینی اقتدار وسیع کرنے کے وسائل حاصل تھے اور وہ اگر چاہتے تو حاصل کردہ اقتدار سے کہیں زائد اثر و نفوذ حاصل کر سکتے تھے لیکن تاریخ یہود کا ہر جاننے والا جانتا ہے کہ یہود نے دوسری قوموں کو اپنے دین کے قبول کرنے پر کبھی آمادہ نہیں کیا اور بعض وجوہ سے اشاعت دین یہود کے لئے ممنوع بھی ہے۔"[1]

یہود (اپنے قومی مزاج کے مطابق) اپنے معاشرہ کو نئے حالات و تغیرات کے مطابق ڈھالنے، نئے چیلنج کو سمجھنے اور موقع سے فائدہ اٹھانے، اور اسلام کو اختیار کر کے اپنی ثقافت و ذہانت اور تجربہ و صلاحیت کے لائق مقام پانے میں ناکام رہے اور یہی افسوس ناک انجام ہر اس معاشرہ کا ہوتا ہے جو اپنے ماضی، نام و نسب پر فخر اور خواب و خیال کی دنیا میں رہتا ہے اور کھوکھلی قیادت کا سہارا لیتا ہے۔

یہود اپنے کو صحیح طور پر نمایاں کرنے اور ایک صاحب پیغام اور اہل کتاب اور انبیاء سابقین کی امت و ذریت ہونے کے لحاظ سے اپنی صلاحیت و فوقیت ثابت کرنے میں ناکام رہے، اور عرب کی گھٹیا بت پرستی اور پست ترین جاہلیت کو دیکھ کر ان میں کوئی بے چینی نہیں پیدا ہوئی اور انھوں نے (کم سے کم) اس عقیدۂ توحید کی بھی دعوت نہیں دی جس کے وہ صدیوں سے (اپنے اخلاقی

---

[1] الیہود فی بلاد العرب، اسرائیل ولفنسن ص ۷۲۔

انحطاط اور قومی کمزوریوں کے باوجود) حامل چلے آتے تھے جس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ اپنے دین کی طرف کسی غیر اسرائیلی فرد کو دعوت دینے کے قائل ہی نہ تھے یہودیت کو نسلی دین و اعزاز سمجھنے کا عقیدہ ان کا دائمی شعار تھا۔ (جیسا کہ اسرائیل ولفنسن اور سابق امریکی یہودی اور حال کی مسلم فاضلہ مریم جمیلہ کا کہنا ہے) اس کے ساتھ ان کی آرام طلبی اور حد سے زائد تجارتی و معاشی سرگرمی بھی ان کے لئے ایک رکاوٹ تھی۔

لیکن یہ یقینی بات ہے کہ اوس و خزرج اور دوسرے عرب قبائل سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد نے یہودیت کو اپنی مرضی سے یا رشتہ داری یا یہودی ماحول میں پرورش پانے کے سبب اختیار کر لیا تھا عرب کے یہودیوں میں یہ سب قسمیں پائی جاتی تھیں یہ بھی معلوم ہے کہ ممتاز یہودی تاجر اور مشہور شاعر کعب بن الاشرف (جو نضری کی نسبت سے بھی معروف ہے) قبیلہ طے کا ایک فرد تھا اس کے باپ نے بنی نضیر میں شادی کی تھی چنانچہ کعب ایک پر جوش یہودی کی صورت میں پروان چڑھا، ابن ہشام لکھتے ہیں کہ :۔

"اس کا آبائی تعلق قبیلہ طے پھر بنی نبہان سے تھا اس کی ماں بنی نضیر سے تھی"[1]

عربوں میں ایک رسم یہ تھی کہ جس کا لڑکا زندہ نہ رہتا تھا وہ یہ نذر مانتا تھا کہ اگر وہ زندہ رہا تو اس کو یہودیوں کے سپرد کر دے گا کہ وہ اس کو اپنے میں شامل کر لیں چنانچہ بہت سے عرب اس طرح بھی یہودی بن گئے تھے سنن ابوداؤد میں حسب ذیل

---

[1] ابن ہشام ج ۱ ص ۱۴۵

روایت ملتی ہے :۔

عن ابن عباسؓ قال کانت المرأۃ تکون مقلاۃ فتجعل علی نفسہا ان عاش لہا ولد ان تہودہ فلما اجلیت بنو النضیر کان فیہم من ابناء الانصار فقالوا لا ندع ابناءنا فانزل اللہ تعالیٰ : لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔[1]

جس عورت کا بچہ زندہ نہ رہتا تھا وہ نذر مانتی تھی کہ اگر بچہ زندہ رہا تو اسے یہودی بنائے گی چنانچہ جب بنو نضیر جلاوطن ہوئے تو ان میں سے انصار کے لڑکے بھی تھے اس لیے وہ کہنے لگے کہ ہم اپنے بیٹوں کو نہیں چھوڑیں گے اس پر یہ آیت اتری لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔

اوس و خزرج

اوس و خزرج (مدینہ کے عرب باشندوں) کا سلسلۂ نسب یمن کے قبیلۂ ازد سے ملتا ہے جہاں سے یثرب کی طرف ہجرت کی لہریں مختلف وقفوں میں اٹھتی رہیں جس کے کئی اسباب تھے ان میں یمن کی غیر یقینی صورت حال، حبش کا تسلط، سدِّ مارب کے انہدام و شکستگی کے بعد آبپاشی کی دقت وغیرہ بھی ہیں اس طرح اوس و خزرج مدینہ میں یہود کے بعد آئے[2] اوس کے قبائل مدینہ کے جنوب و مشرق

---

[1] سنن ابو داؤد کتاب الجہاد باب الاسیر یکرہ علی الاسلام ج ۲ [2] جمہرۃ انساب العرب ابن حزم ص ۳۲۲ ، نیز ملاحظہ ہو ابو الفضل مجد الدین کا قول کہ خزرج نے بھی یثرب کو اپنا وطن بنایا (سلسلہ میں ان کا قیام یثرب میں تسلسل کے ساتھ رہا) تاریخ العرب قبل الاسلام از جواد علی ج ۴ (ترجمہ مولوی)

میں آباد ہوئے جو عوالی کا علاقہ کہلاتا ہے۔ خزرج کے قبائل وسطی اور شمالی علاقے میں آباد ہوئے جو مدینہ کا نشیبی حصہ ہے۔ ان کے بعد مغرب میں حرۃ الوبرۃ تک اور کچھ نہیں پہنچے۔[1] خزرج چار قبیلے تھے (۱) مالک (۲) عدی (۳) مازن (۴) دینار۔ یہ سب کے سب بنو نجار سے تعلق رکھتے تھے جنھیں "تیم اللات" کہا جاتا ہے۔ بنو نجار کے قبائل مدینہ کے اس وسطی حصے میں آباد ہوئے جہاں اب اس وقت مسجد نبوی واقع ہے۔ اوس مدینہ کے زرخیز زراعتی علاقوں میں مقیم ہوئے اور یہود کے اہم قبیلوں اور جماعتوں کے پڑوسی بنے۔ خزرج جہاں ٹھہرے وہ زیادہ سرسبز علاقہ نہ تھا۔ ان کا صرف ایک بڑا یہودی قبیلہ قینقاع ہی پڑوسی تھا۔[2]

اب اوس و خزرج کے افراد کی یقینی تعداد معلوم کرنا بہت دشوار ہے لیکن حالات و حوادث پر نظر رکھنے والا ان کی جنگی قوت کا اندازہ ان جنگوں سے کر سکتا ہے جن میں وہ ہجرت نبوی کے بعد شریک ہوئے۔ چنانچہ فتح مکہ کے دن ان کے لڑنے والے افراد کی تعداد چار ہزار تھی۔[3]

مدینہ میں ہجرت کے وقت عربوں ہی کو بالادستی اور اقتدار حاصل تھا۔ یہود اپنے ان حریفوں کے مقابلے میں متحد اور منظم نہیں تھے۔ ان کے مختلف قبیلوں میں پھوٹ تھی کچھ قبیلے اوس کے ساتھ معاہد کئے ہوئے تھے اور کچھ خزرج کے ساتھ تھے۔ لڑائی کے وقت وہ اپنے ہم مذہبوں کے مقابلے پر عربوں سے زیادہ سخت گیر واقع ہوئے تھے۔ قینقاع اور بنی نضیر اور بنی قریظہ کی باہمی عداوت ہی کے نتیجے میں بنی قینقاع

۱؎ عمدۃ المدینہ ص [illegible] ۲؎ ایضاً ۳؎ امتاع الاسماع بما للرسول من الابناء والاموال والحفدۃ والمتاع (علامہ تقی الدین احمد بن علی المقریزی) ص [illegible]

اپنے کھیت چھوڑ کر صنعت و حرفت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے تھے[1]

اسی طرح اوس و خزرج کے درمیان بھی بہت سی جنگیں ہوئیں جن میں سے پہلی جنگ سمیر تھی اور آخری جنگ بعاث تھی جو ہجرت سے ۵ سال پہلے ہوئی تھی[2] یہود اوس و خزرج کو باہم لڑانے کے لئے سازشیں کرتے اور اختلافات اور مقابلے کی آگ بھڑکاتے رہتے، تاکہ عرب ان کی طرف سے غافل رہیں، عرب بھی اس بات کو محسوس کرتے تھے اس لئے ان کو ثعالب (لومڑی) کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

اس سلسلے میں ابن ہشام نے ابن اسحاق کی روایت سے جو واقعہ لکھا ہے اس سے اس پر خاصی روشنی پڑتی ہے اس واقعہ میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک بوڑھے یہودی شمعون بن قیس نے ایک جگہ اوس و خزرج کو اسلام قبول کرنے کے بعد ایک مجلس میں بیٹھے لطف و محبت کی باتیں کرتے ہوئے سنا اس کو یہ منظر دیکھ کر سخت تکلیف ہوئی اور وہ برداشت نہ کر سکا اس نے ایک یہودی نوجوان کو جس کے انصار سے تعلقات تھے اشارہ کیا کہ وہ اس مجلس میں شریک ہو جائے پھر کسی تقریب سے جنگ بعاث اور اس سے پہلی جنگوں کا ذکر چھیڑ دے اور ان موقعوں پر کہے ہوئے اشعار پڑھے تاکہ دونوں قبیلوں کے زخم ہائے کہن تازہ ہو جائیں اور حمیت جاہلیت اپنا رنگ دکھائے۔

یہ سازش نتیجہ خیز ہوئی یہاں تک کہ دونوں قبیلوں کی جو حریفوں اور دشمنوں کی طرح لڑتے تھے رگ حمیت پھڑک اٹھی، قریب تھا کہ تلواریں میانوں سے نکل آئیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین کے ساتھ تشریف لے آئے اور اپنے

---

[1] کرد المدینہ ۳۲۲ [2] فتح الباری ج ۷ ص [3] جنگ بعاث کی تفصیلات اور اسباب و محرکات کے لئے ملاحظہ ہو کامل ابن الاثیر

ارشادات نے ان کے ایمان کی چنگاری کو فروزاں اور ان کے دینی جذبہ کو بیدار کر دیا، ان کو فوراً احساس ہوا کہ وہ ایک گہری سازش کا شکار ہو گئے، ان کی آنکھوں سے سیل اشک رواں ہو گیا، اوس و خزرج باہم بغل گیر ہوئے اور ایسا معلوم ہوا کہ کچھ نہیں ہوا تھا۔[1]

طبعی اور جغرافیائی کیفیت

یثرب ہجرت نبوی کے وقت مختلف حصوں میں بٹا ہوا تھا جن میں یہودی اور عرب قبائل رہتے تھے اور ہر علاقہ کسی نہ کسی قبیلے کے حصہ میں تھا، ان علاقوں کی دو قسمیں تھیں، ایک قسم زراعتی زمینوں اور مکانات اور ان کے رہنے والوں پر مشتمل تھی، اور دوسری قسم میں آطام یا اُطم[2] یا گڑھیاں اور قلعہ بند محلے تھے، یہود کی ان گڑھیوں (آطام) کی تعداد ۵۹ تھی[3] ڈاکٹر ولفنسن ان آطام (گڑھیوں) کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"یثرب میں آطام (گڑھیوں) کی بڑی اہمیت تھی، جہاں دشمن کے حملے کے وقت قبیلے کے لوگ پناہ لیتے تھے اور خاص طور پر عورتوں، بچوں اور معذور لوگوں کو اس وقت ٹھکانا ملتا تھا جب مرد لڑنے کے لئے چلے جاتے تھے، یہ گڑھیاں گودام کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھیں جن میں غلے اور پھل جمع کئے جاتے تھے کیونکہ وہ کھلی جگہوں پر لوٹ اور غارت گری کا نشانہ بن سکتی تھیں، اس کے علاوہ وہاں مال اور ہتھیار بھی رکھے جاتے تھے، یہ دستور تھا کہ سامان سے لدے ہوئے تجارتی قافلے گڑھیوں کے

---

[1] ملاحظہ ہو ابن ہشام ج ۱ ص ۵۵۵-۵۵۶ [2] ماخوذ از تاریخ الیہود فی بلاد العرب: اسرائیل ولفنسن ص ۱۱۶ - [3] وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ للسمہودی - ۱/۱۱۶

قریب ہی اترتے تھے اور ان ہی گرجیوں کے دروازوں پر بازار بھی لگتا
تھا خیال کیا جاتا ہے کہ ان گرجیوں میں عبادت گاہیں اور مدارس
(یہودی مدارس) بھی ہوتے تھے اس لئے کہ جو مدرسہ اور دارِ مدراس رہا[1]
رہتا تھا اس سے اسی کا پتہ چلتا ہے، وہاں دینی کتابیں بھی رکھی تھیں
چنانچہ وہاں بحث و مشورہ کے لئے یہودی سردار جمع ہوتے جہاں وہ
کسی اہم معاملے کو طے کرنے یا عہد معاہدے کے وقت کتب مقدسہ کی قسمیں
کھاتے تھے۔[2]

ڈاکٹر مذکور "اطم" کی تشریح کرتے ہوئے مزید لکھتا ہے:۔

"عبرانی زبان میں اس کے معنی بند اور مسدود کر دینے کے ہوں گے دیواروں
کے ساتھ جب یہ لفظ آتا ہے تو اس کے معنی ان کھڑکیوں کے ہوتے ہیں جو
باہر سے بند مگر اندر سے کھولی جا سکتی ہوں۔ اس کا استعمال فصیل یا زبردست
حفاظتی دیوار کے لئے بھی ہوتا تھا۔ اس طرح ہم فرض کر سکتے ہیں کہ یہود
"اطم" کو چھوٹے قلعے کے معنی میں استعمال کرتے تھے۔ اس میں باہر سے
روشندان ہوتے تھے جو باہر سے بند اور اندر سے کھولے جاتے تھے"[3]

یثرب ان ہی محلوں اور قلعہ بندیوں کا نام تھا جو در اصل قریب قریب کی
بستیوں کا مجموعہ تھا جن سے شہر بن گیا تھا قرآن نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔

مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ	جو کچھ دیا اللہ نے اپنے رسول کو
مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ (سورہ حشر: ۷)	بستیوں والوں سے۔

---

[1] الیہود فی بلاد العرب ۱۱۶-۱۱۷ [2] ایضاً ۱۱۷

نیز دوسری جگہ فرمایا گیا۔

لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي	وہ تم سے اکٹھے نہیں لڑتے مگر یہ کہ
قُرًى مُّحَصَّنَةٍ أَوْ مِن وَرَاءِ	قلعہ بند بستیوں میں یا دیواروں
جُدُرٍ (سورۃ حشر-۱۴)	کے پیچھے ہوں۔

مدینہ طیبہ میں حرات کی بھی بڑی اہمیت تھی حرۃ لابہ[1] جیسے ہوئے سیاہ پتھروں کے اس علاقہ کو کہتے ہیں جن کو آتشیں سیال مادہ نے ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے اور جو بالکل بے ترتیب اور سخت نوکیلے اور آڑے ترچھے میلوں کی مسافت میں پھیلے ہوئے ہیں ان پر پیدل چلنا آسان ہے اور نہ اونٹوں اور گھوڑوں کا گذرنا۔ مدینے کے دو حرے مشہور ہیں ایک جانب مغرب جس کو حرۃ الوبرۃ کہتے ہیں لو ایک جانب مشرق جو حرۃ واقم کے نام سے مشہور ہے علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے اپنی کتاب "المغانم المطابۃ فی معالم طابۃ" میں متعدد حرات کا ذکر کیا ہے جو مدینے کے گرد پھیلے ہوئے ہیں[2] ان دونوں حرات (حرۃ الوبرۃ اور حرۃ واقم) نے مدینے کو ایک قلعہ بند شہر بنا دیا ہے جس پر صرف شمالی جانب سے فوج کشی ہو سکتی تھی (اور یہی وہ جانب ہے جس کو غزوۂ احزاب میں خندق کھود کر محفوظ کر دیا گیا تھا) جنوبی جانب گھنے نخلستانوں اور باغات اور گنجان آبادی کے ایک دوسرے سے ملے ہوئے مکانات سے ایسی گھری ہوئی ہے کہ ادھر سے بھی بیرونی حملہ مشکل ہے ہجرت کے لئے مدینے کے انتخاب میں مدینے کے اس قدرتی استحکام اور فوجی مصلحت

---

[1] لابہ یا لاوہ (LAVA) متقارب الصوت اور متقارب المعنی الفاظ ہیں یہ اس مادہ آتش گیر مادہ کو کہتے ہیں جو کسی کوہ آتش فشاں سے یا طبقۃ الارض کی کسی تبدیلی سے باہر نکل آتا ہے۔ [2] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۱۲-۱۱۴

کو بھی دخل تھا۔[1]

حرّہ واقم جو مدینے کے مشرق میں تھا وہ حرّۃ الوبرہ سے زیادہ آباد تھا، جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یثرب کو ہجرت فرمائی تو حرّہ واقم میں یہود کے اہم قبائل جیسے بنو نضیر و بنو قریظہ وغیرہ رہتے تھے، ان کے ساتھ اوس کی اہم شاخیں بنو عبدالاشہل، بنو ظفر، بنو حارثہ، بنو معاویہ بھی وہیں مقیم تھے، واقم بنی الاشہل ہی کے علاقے میں تھا جس کے نام پر حرّہ واقم تھا۔[2]

دینی حالت اور معاشرتی حیثیت

مدینے کی عرب آبادی بیشتر معاملات میں قریش ہی کے تابع رہتی تھی، اور اہل مکہ قریش کو کعبہ کا متولی، دینی رہنما اور عقیدہ و عمل میں لائق تقلید و مثال سمجھتے تھے، وہ جزیرۃ العرب میں پھیلی ہوئی بت پرستی کے تو تابع تھے ہی لیکن خاص طور پر انہی بتوں کو پوجتے تھے جنہیں قریش اور اہل حجاز پوجتے تھے، الا یہ کہ بعض قبائل کی بعض علاقائی بتوں سے زیادہ وابستگی تھی، اس طرح مناۃ اہل مدینہ کا سب سے محبوب اور پرانا بُت تھا اور اوس و خزرج اس کو مقدس ترین سمجھتے تھے، اور اسے خدا کا شریک ٹھہراتے تھے، یہ بت جبل قدید کے مقابل مُشلّل کے مقام پر واقع تھا جو ساحل کی طرف مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے۔ "لات" اہل طائف کا محبوب بت تھا، عزّیٰ اہل مکہ کا قومی بت تھا، اس لئے ان شہروں کے لوگ اپنے اپنے ان بتوں سے جذباتی تعلق رکھتے تھے، اہل مدینہ میں سے جو کوئی لکڑی یا کسی چیز کا بت اپنے گھر میں رکھتا تو

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب کا باب یثرب کی خصوصیات۔ [2] منزل الوحی ڈاکٹر محمد حسین ہیکل ص ۵۵

اسے "مناۃ" ہی کے نام سے پکارتا جیسا کہ بنی سلمہ کے ایک سردار عمرو بن الجموح نے اسلام لانے سے پہلے بنا رکھا تھا۔[۱]

امام احمدؒ نے عروہؓ کے حوالے سے حضرت عائشہؓ سے "اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰہِ" الآیہ کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا "انصار اسلام لانے سے پہلے مناۃ کے نام پر تلبیہ پڑھتے تھے اور جس کی وہ مشلل کے پاس پوجاکرتےتھےاوراس کے نام پر حج شروع کرنے والا صفا و مروہ کی سعی صحیح نہیں سمجھتا تھا تعجب لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں پوچھتے ہوئے کہا کہ یا رسول اللہ ہم زمانہ جاہلیت میں صفا و مروہ کے طواف میں حرج سمجھتے تھے تو اللہ تعالے نے یہ آیت نازل فرمائی "اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰہِ" الآیہ۔[۲][۳]

ہم مدینے میں کسی اور بت کے بارے میں نہیں جانتے کہ وہ لات و مناۃ یا عزیٰ و ہبل کی طرح مشہور ہوا ہو اور لوگ اس کی عبادت کرتے اور اس کے لئے مدینے کے باہر سے آتے ہوں، کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مکہ کی طرح مدینہ میں بتوں کی کثرت نہ تھی اس لئے کہ مکے کے ہر گھر میں ایک خاص بت ہوتا تھا مکہ میں بتوں کو لوگ پھیری میں لے کر نکلتے اور بیچتے تھے بہر حال مکہ بت پرستی میں مقتدی اور رہنما کی حیثیت رکھتا تھا اور مدینے کی حیثیت ذیلی تھی۔

اہل مدینہ سال کے دو دنوں میں کھیل کود کا تہوار مناتے تھے نبی صلے اللہ علیہ وسلم جب مدینے تشریف لائے تو اہل مدینہ سے فرمایا "قد ابدلکم اللّٰہ تعالیٰ بہما

---

۱ ماخوذ از بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب از علامہ محمود شکری الآلوسی ج ۱/۳۴۶ - ۲/۲۰۴

۲ اس میں صحابہ سے اور کئی روایتیں بھی منقول ہیں۔ ۳ سورۂ بقرہ - ۱۵۸

خیر امنہما یوم الفطر والاضحیٰ[1]" (اللہ تعالیٰ نے تمھیں ان دو کی جگہ دونوں سے بہتر دن عطا کیے ہیں: یوم فطر اور عید الاضحیٰ) بعض شارحین حدیث نے ان دونوں کے متعلق بتایا ہے کہ وہ نوروز اور مہرجان کے دن تھے جنھیں شاید ان لوگوں نے اہل ایران سے لیا تھا۔[2]

اوس و خزرج کی شرافت نسب کا اعتراف قریش کو بھی تھا جو عرب عاربہ سے تعلق رکھنے والے بنو قحطان کی شاخ ہیں سے تھے قریش ان سے شادی بیاہ کا تعلق بھی رکھتے تھے چنانچہ سید قریش ہاشم بن عبد مناف نے بنی النجار میں شادی کی تھی ان کی شادی سلمٰی بنت عمرو بن زید سے ہوئی تھی جو بنی عدی بن النجار سے تھیں جو خزرج کی ایک شاخ ہے اس کے باوجود قریش اپنے کو مدینہ کے عرب قبائل سے برتر سمجھتے تھے غزوۂ بدر کے دن جب عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ نے مسلمانوں کو دعوت مبارزت دی اور ان کے مقابلہ پر انصار کے کچھ نوجوان نکلے تو انھوں نے پوچھا تم کون ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم انصار ہیں تو انھوں نے کہا کہ ہمیں تم سے مطلب نہیں پھر ان میں سے ایک آدمی نے آواز دی کہ اے محمد ہمارے مقابلے پر ہمارے ہم قوم اور ہمارے ہمسر افراد کو بھیجو اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عبیدہ بن الحارث! اٹھو، حمزہ! اٹھو، علی! تم کھڑے ہو تو جب یہ لوگ ان کے قریب گئے اور اپنے نام بتائے تو قریش نے کہا کہ ہاں یہ شریف ہمارے جوڑ کے ہیں۔[3]

اس کی وجہ یہ ہے کہ قریش کاشت کاری کو جس کے اہل مدینہ اپنے علاقائی

---

[1] صحیحین [2] بلوغ الارب [3] ابن ہشام ج ۲ ص ۲۲۵

ان سے بیع و شراء میں مدد لی جاتی تھی، اس طرح کھجور کے باغ اہل مدینہ کی زندگی میں بڑے خیر و برکت کا سرمایہ تھے ان سے وہ غذا بھی حاصل کرتے اور صنعت و تعمیر اور ایندھن اور جانوروں کو کھلانے کے کام میں بھی لاتے تھے۔[1]

مدینے کے کھجوروں کی بہت سی قسمیں تھیں جن کا احاطہ مشکل ہے۔[2] اہل مدینہ کو طویل تجربے سے کھجوروں کی پیداوار کی افزائش اور عمدگی کے بہت سے طریقے معلوم تھے جن میں سے نر و مادہ کی تمیز اور ان کے زیروں کا استعمال بھی تھا جس کو تابیر کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے۔[3]

باغبانی اور زراعت کا مطلب یہ نہیں کہ مدینہ میں کوئی تجارتی سرگرمی تھی ہی نہیں، البتہ مکہ کی طرح اس کی گرم بازاری نہ تھی کیونکہ بے آب و گیاہ وادی مکہ کے لوگوں کا انحصار قدرتی طور پر تجارت اور موسم سرما و گرما کے تجارتی سفروں پر تھا۔

مدینہ کی بعض صنعتیں یہودیوں ہی کے ساتھ مخصوص تھیں شاید وہ یمن سے لائے تھے بنی قینقاع کے لوگ عام طور پر سناری اور زرگری کا پیشہ کرتے تھے اور یہود مدینہ میں سب سے زیادہ مالدار تھے ان کے گھر مال و دولت اور سونے چاندی سے بھرے ہوئے تھے۔[4]

---

[1] ملاحظہ ہو بخاری کتاب العلم باب طرح الامام المسألۃ علی اصحابہ لیختبر ما عندہم من العلم اور اس کی شرح ابن حجر کی فتح الباری اور عینی کی عمدۃ القاری۔ [2] ملاحظہ ہو [3] کھجور سے متعلق عربی میں الفاظ کا جو وسیع ذخیرہ پایا جاتا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عربوں کی زندگی میں عموماً اور اہل مدینہ کی زندگی میں خصوصاً کھجور کو کیسی اہمیت و مرکزیت حاصل تھی، مثال کے طور پر ابن قتیبہ کی ادب الکاتب، ثعالبی کی فقہ اللغہ اور ابن سیدہ کی المخصص ملاحظہ ہوں، بعض اہل علم نے کھجور پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ [3] تابیر کا مطلب مادہ کھجور کے خوشوں کو چیر کر نر کھجور کے زیرے ڈالنے کے ہیں (شرح مسلم للنووی) [4] الیہود فی بلاد العرب ص ۲۳

مدینہ کی زمین آتش فشاں علاقوں (حرات) کی موجودگی کی وجہ سے بہت زیادہ زرخیز واقع ہوئی ہے جس کی وادیوں میں سیلاب کا پانی بھی خوب بہتا ہے اور زمینوں کے ساتھ کھیتوں اور باغوں کو بھی سیراب اور شاداب کرتا جاتا ہے ان میں سب سے مشہور وادی عقیق تھی جو مدینے کی تفریح گاہ بھی تھی اس میں پانی بافراط رہتا تھا، اور باغوں کی کثرت تھی۔ مدینے کی زمین کنویں کھودنے کے لئے بھی بہتر تھی جن کا باغات میں عام رواج تھا۔ باغات کے گرد چہار دیواری بھی ہوتی تھی۔ ایسے باغ کو اہل مدینہ حائط کہتے تھے[1]

اسی طرح مدینے کے بہت سے کنویں اپنے پانی کی فراوانی و شیرینی کے لئے مشہور تھے، وہاں نہریں اور رہٹ کا انتظام بھی تھا جس کے ذریعہ وہ اپنے باغوں تک پانی پہنچاتے تھے۔[2]

غلوں میں اوّلیت جَو اور پھر گیہوں کو حاصل تھی۔ اور سبزیوں اور ترکاریوں کی تو بہتات تھی۔ کھیتی کے معاملات کی کئی قسمیں تھیں مثلاً مزابنہ، محاقلہ، مخابرہ، معاومہ[3]

---

[1] صحیح بخاری (کتاب المغازی) میں کعب بن مالک کی غلطی کا واقعہ دیکھئے جس میں آیا ہے کہ جب مجھ پر لوگوں کی سختی اور بے اعتنائی بڑھ گئی تو میں حائط ابی قتادہ کی دیوار پر چڑھ گیا جو میرا چچیرا بھائی تھا الخ

[2] ابوہریرہؓ کی وہ حدیث پڑھیں جسے مسلم نے روایت کیا ہے اور جس میں ایک باغ کے سیراب کرنے کا ذکر آیا ہے اور اس میں شراج (پانی کی نالیاں) اور مسحاۃ (پھاوڑے) سے پانی لانے کا بھی ذکر ہے۔

[3] صحاح میں حرث و مزارعۃ کے ابواب دیکھئے۔ مزابنہ درخت میں لگی ہوئی کھجوروں کو نقد کھجوروں کے بدلے بیچنے کو کہتے ہیں۔ محاقلہ خوشوں میں لگے ہوئے غلے کو نقد غلے یعنی جَو گیہوں کے بدلے گیہوں کے بدلے تول کر بیچنے کو کہتے ہیں۔ مخابرہ اور مزارعہ ایک ہی ہیں یعنی زمین کی پیداوار کی تہائی یا چوتھائی پر معاملہ کرنے کو کہتے ہیں لیکن مزارعہ میں بیج مالک کے ہوتے ہیں اور مخابرہ میں کاشتکار کے۔ اہل لغت کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ وہ ایک ہی ہیں۔ مزارعہ و مخابرہ کی صحت میں خلف و سلف کا اختلاف مشہور ہے (ماخوذ از شرح مسلم للنووی) معاومہ کئی سال کی فصلوں کو بیچ دینے کو کہا جاتا ہے جیسے درخت کے پھل دو تین سال یا زیادہ کے لئے بیچ دیئے جائیں۔

ان شکلوں میں سے بعض کو اسلام نے باقی رکھا اور بعض کو منع کر دیا یا اس کی اصلاح کر دی۔ مکہ اور مدینہ میں جو سکے رائج تھے وہ ایک ہی تھے اور ہم ان کی تفصیل سود کے سلسلے میں ذکر کر چکے ہیں۔ اہل مکہ کے مقابلے میں اہل مدینہ کو ناپ تول کے پیمانوں سے زیادہ واسطہ پڑتا تھا کیونکہ وہاں کے باشندوں کا سرمایہ غلے اور پھل ہی تھے۔ مدینے میں استعمال ہونے والے پیمانے یہ تھے: مُد، صاع، فرق، عرق، وسق[1] اور وزن کے لئے یہ چیزیں تھیں: درہم، مثقال، دانق، قیراط، نواۃ، رطل، قنطار اور اوقیہ[2]۔

مدینہ اپنی زرخیزی کے باوجود غذائی طور پر خود کفیل نہ تھا اس لئے وہاں کے باشندے باہر سے بھی غذائی اشیاء درآمد کرتے تھے۔ وہ میدہ کا آٹا بھی اور شہد شام سے لاتے تھے۔ جیسا کہ ترمذی نے قتادہ بن نعمانؓ سے روایت کیا ہے جس میں آیا ہے کہ مدینے کے لوگوں کی غذا کھجوریں اور جو تھے اور جب آدمی خوشحال ہوتا اور جب شام سے ضافطہ (تاجر) میدہ[3] لے کر آتا تو اس سے اپنے لئے وہ چیزیں خرید لیتا لیکن اہل و عیال کھجوریں اور جو ہی کھاتے تھے[4]۔ یہ قصہ مدینہ کی غذائی صورت حال اور معیار زندگی کے اختلافات پر کافی روشنی ڈالتا ہے جو ہجرت کے بعد اچانک سامنے ہی آ گئی تھی۔

یہودیت کی فطرت اور تاریخ ہر جگہ یکساں رہی ہے۔ مدینہ میں بھی عربوں سے زیادہ

---

[1] تفصیل کے لئے حدیث اور لغات کی کتابیں دیکھیں اور اوزان کے لئے دیکھیں التراتیب الاداریہ ۱/۴۱۵۔ [2] ضافطہ کے متعلق علامہ محمد طاہر پٹنی لکھتے ہیں: ضافطہ وہ قافلہ کہا جاتا تھا جو مال و اسباب شہروں تک پہنچاتا تھا۔ یہ نبطی قوم کے افراد ہوتے تھے جو مدینے کو آٹا، تیل وغیرہ پہنچاتے تھے۔ (مجمع بحار الانوار ۳/۱۴۰ طبع حیدرآباد) [3] یہاں درمک کا لفظ آیا ہے جو سفید میدے کو کہتے ہیں [illegible]

[4] ملاحظہ ہو آیت [illegible] (سورۃ النساء [illegible])

بالدار واقع ہوئے تھے، عرب اپنے بدوی اور قومی مزاج کی وجہ سے مستقبل کے بارے میں زیادہ سوچنے کے عادی نہ تھے کہ اس کے لئے مال جمع کرنے کی فکر کرتے، اس کے ساتھ ہی وہ مہمان نواز اور فیاض بھی تھے، اس وجہ سے یہود سے قرض لینے پر مجبور ہو جاتے تھے اور یہ قرض اکثر سودی یا رہنی ہوتا تھا۔

اہل مدینہ کے پاس اونٹ، گائیں اور بکریاں بھی تھیں، اونٹ کو زمین کی سینچائی کے لئے بھی استعمال کرتے تھے اور ایسے اونٹوں کو الابل النواضح کہتے تھے، ان کے پاس چراگاہیں بھی تھیں، جن میں مشہور "زغابہ" اور "غابہ" تھیں، جہاں سے لوگ لکڑیاں بھی حاصل کرتے اور مویشیوں کو چراتے بھی تھے،[1] گھوڑوں کو وہ جنگوں میں استعمال کرتے تھے، اگرچہ وہ کمی کی حیثیت، کم تعداد میں پائے جاتے تھے، بنو سلیم گھوڑوں کے لئے مشہور تھے، جنہیں وہ باہر سے درآمد کرتے تھے۔

مدینے میں کئی بازار بھی تھے، جن میں سب سے اہم سوق بنی قینقاع تھا، جو سونے اور چاندی کے زیورات و مصنوعات اور کپڑے والوں کا خاص بازار تھا، اس وقت مدینے میں سوتی اور ریشمی کپڑے، رنگین غالیچے اور منقش پردے[2] عام طور پر موجود تھے، عطر فروش مختلف قسم کے عطر اور مشک فروخت کرتے تھے، اسی طرح عنبر اور پارے کے تاجر بھی پائے جاتے تھے، خرید و فروخت کی بہت سی

---

[1] یاقوت حموی کی "معجم البلدان" اور سمہودی کی "وفاء الوفاء" ملاحظہ ہو [2] حضرت عائشہؓ کی حدیث ملاحظہ ہو جسے شیخین نے روایت کیا ہے، اس میں قرام کا ذکر آیا ہے، قرام کے بارے میں علامہ طیبی کہتے ہیں کہ وہ باریک پردہ یا کئی رنگوں کی اون کی چادر یا وہ پردہ ہوتا ہے جو حجلۂ عروسی میں لگتا ہے کہا جاتا ہے کہ وہ مزین و منقش بھی ہوتا ہے (مجمع بحار الانوار ۴/۲۵۰) [3] التراتیب الاداریۃ ۲/۹۰

قسمیں تھیں بعض کو اسلام نے باقی رکھا اور بعض کو روک دیا جیسے بیع نجش و احتکار، تلقی الرکبان، بیع المصراۃ (جانوروں کے تھن میں دودھ محفوظ کرکے بیچنا) بیع نسیئہ بیع الحاضر للبادی، بیع المجازفۃ، بیع المزابنۃ اور مخابرۃ[1]۔ اوس و خزرج کے کچھ لوگ بھی سودی کاروبار کرنے لگے تھے، مگر وہ یہود کی نسبت بہت ہی کم تھا۔

مدینے کی تمدنی زندگی میں وہاں کے باشندوں کے مزاج و خوش مذاقی کے سبب خاصی ترقی ہو چلی تھی، چنانچہ دو منزلہ مکان بننے لگے تھے[2]۔

بعض گھروں کے ساتھ پائیں باغ بھی تھے، وہ میٹھے پانی کے عادی تھے جسے انھیں کبھی دور سے بھی لانا پڑتا تھا، بیٹھنے کے لئے کرسی کا استعمال بھی ہوتا تھا[3] شیشے اور پتھر کے پیالے اور آبخورے استعمال میں آتے تھے اور مختلف قسم کے چراغ استعمال ہوتے تھے[4]، گھر اور کھیت کے کاموں میں چھوٹی ٹوکریاں اور زنبیلیں کام میں لائی جاتی تھیں، مال داروں خصوصاً یہود کے گھروں میں خاصا فرنیچر پایا جاتا تھا، قسم قسم کے زیورات بھی استعمال ہوتے تھے جیسے کنگن اور بازوبند، پازیب اور کڑے، کان کے بندے اور بالیاں، انگوٹھیاں اور سونے یا یمنی دانوں کے ہار وغیرہ[5]۔

---

[1] کتب حدیث و فقہ کے ابواب بیع اور مجمع بحار الانوار ملاحظہ ہوں، جہاں ان معاملوں کی تشریح اور ان کی حلت و حرمت کے احکام ملیں گے۔ [2] ملاحظہ ہو حدیث ہجرت اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مکان میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قیام فرمانے کا واقعہ۔

[3] التراتیب الاداریہ ۱/۹۷ [4] ایضاً ص۱۰۲ [5] واقعۂ افک میں حضرت عائشہؓ کی حدیث ملاحظہ ہو جسے بخاری نے کتاب المغازی میں نقل کیا ہے، اس میں جزع ظفار کا لفظ ہے جو سیاہ و سفید رنگ کے دانوں کو کہتے ہیں۔

عورتوں میں تنے اور کاتنے کا عام رواج تھا، اور سلائی، رنگائی، معماری
اور خشت سازی اور سنگ تراشی اِن صنعتوں میں تھیں جو ہجرت سے بہت پہلے
ہی مدینے میں معروف تھیں۔

یثرب کا پیچیدہ اور ترقی یافتہ معاشرہ

اس طرح یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ
وسلم اور مہاجرین نے مکہ سے یثرب نام کے کسی گاؤں کی طرف سفر نہیں کیا تھا بلکہ
وہ حضرات ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف منتقل ہوئے تھے اگرچہ یہ دوسرا
شہر پہلے شہر کے مقابلے میں زندگی کے بہت سے مظاہر میں مختلف تھا اور
سینہ مکہ سے کچھ چھوٹا بھی تھا لیکن وہاں کی زندگی پیچیدگی میں مکہ سے بڑھی ہوئی
تھی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پیش آنے والے مسائل مختلف نوعیت کے
تھے کیونکہ وہاں کئی مذاہب اور معاشرے اور ثقافتیں موجود تھیں جن پر قابو
پانے اور مدینہ کو ایک عقیدے اور ایک دین کے رنگ میں رنگنے کا کام مؤید من اللہ
رسول ہی کر سکتا تھا، جسے اللہ نے حکمت و بصیرت اور قوتِ فیصلہ اور انسانیت
کے بکھرے شیرازے کو جمع کرنے اور متحارب قوتوں اور نظریوں کو ہدایت اور
تعمیر انسانیت کے کام میں ایک دوسرے کا مددگار بنانے کی غیر معمولی صلاحیت
سے نوازا تھا، اور جسے ایک دلکش شخصیت عطا کی تھی، اللہ تعالیٰ نے کتنا صحیح
کہا ہے کہ:۔

ھُوَ الَّذِیْ اَیَّدَکَ بِنَصْرِہٖ — وہی ہے جس نے اپنی مدد سے طاقت دی

وَبِالْمُؤْمِنِينَ ۝ وَأَلَّفَ
بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۚ لَوْ أَنفَقْتَ
مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا
أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ
وَلَٰكِنَّ اللَّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۚ
إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝

(سورۃ الانفال ۔ ۲ ۔ ۶۳)

کے ذریعہ آپ کی پشت پناہی
کی اور ان کے دل ملا دیئے اگر
آپ دنیا کی ساری دولت بھی
خرچ کر دیتے تب بھی ان کے
دلوں کو نہیں جوڑ سکتے تھے،
لیکن اللہ ہی نے ان میں جوڑ اور
اتفاق پیدا کر دیا، وہ غالب
اور حکمت والا ہے ۔

مدینہ میں

مدینہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا استقبال کس طرح کیا؟

انصار کو یہ اطلاع ہو گئی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکہ سے روانہ ہو چکے ہیں، چنانچہ انھوں نے اپنا یہ معمول بنا لیا کہ روزانہ فجر کی نماز کے بعد شہر کے آخری کنارہ پر پہونچ جاتے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا انتظار شروع کر دیتے، اور اس وقت تک وہاں سے نہ ہٹتے جب تک کہ دھوپ بہت تیز اور نا قابل برداشت نہ ہو جاتی اور وہ سائے کی پناہ لینے پر مجبور ہوتے اس وقت وہ اپنے اپنے گھروں میں چلے جاتے، یہ گرمی کا موسم اور سخت تپش کا زمانہ تھا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جس وقت مدینہ تشریف لائے اس وقت انصار انتظار کے بعد اپنے گھروں میں جا چکے تھے، سب سے پہلے آپ پر ایک یہودی کی نظر پڑی، یہ یہودی انصار کی دوڑ دھوپ دیکھتے تھے، آپ کو دیکھ کر اس نے بہت زور سے آواز نکالی اور انصار کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی اطلاع دی، وہ سب یہ سنتے ہی نکل پڑے اور دیکھا کہ حضور ایک کھجور کے درخت کے نیچے تشریف فرما ہیں اور آپ کے ساتھ حضرت ابو بکرؓ ہیں جو آپ ہی کے ہم عمر معلوم ہوتے تھے، ان میں سے اکثر لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس سے پہلے زیارت نہیں کی

اس لئے ان لوگوں نے اپنے ذوق و شوق میں دونوں کو گھیر لیا اور ہجوم بڑھنے لگا، حضرت ابوبکرؓ نے یہ محسوس کر لیا کہ لوگ یہ نہیں سمجھ پا رہے ہیں کہ ان میں مخدوم کون ہے اور خادم کون؟ چنانچہ انھوں نے ایک چادر لے کر حضورؐ کے سر پر سایہ کر لیا، اور اس سے یہ شبہ زائل ہو گیا۔[۱]

تقریباً پانچ سو انصاریوں نے اس مبارک قافلہ کا استقبال کیا اور آخر میں ادب کے ساتھ عرض کیا حضور! تشریف لے چلیں، آپ ہر طرح مامون و محفوظ ہیں اور آپ کی ہر بات میں اطاعت کی جائے گی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفیق سفر اس قافلے کے جلوس میں روانہ ہوئے اور ادھر سارا مدینہ آپ کے استقبال اور خوش آمدید کے لئے نکل کھڑا ہوا، خواتین گھروں کی چھتوں سے نئے قافلے کو دیکھ رہی تھیں اور ایک دوسرے سے کہتی تھیں کہ دیکھو ان میں حضورؐ کون ہیں؟ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ پھر ہم نے کبھی ایسا منظر نہیں دیکھا۔[۲]

لوگ راستوں اور گزرگاہوں پر اور مکانوں کی چھتوں پر نکل پڑے اور جوق در جوق جمع ہو گئے تھے لڑکے اور نوکر خدمت گار ہر طرف کہتے تھے اللہ اکبر جاء رسول اللہ اللہ اکبر جاء محمد، اللہ اکبر جاء محمد، اللہ اکبر جاء رسول اللہ (اللہ اکبر رسول اللہ تشریف لے آئے، اللہ اکبر محمد تشریف لائے، اللہ اکبر رسول اللہ تشریف لے آئے۔)[۳]

براء بن عازبؓ جو اس وقت کم سن تھے بیان کرتے ہیں کہ میں نے اہل مدینہ کو کسی چیز سے اتنا خوش ہوتے نہیں دیکھا جتنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی آمد سے،

---

[۱] سیرۃ ابن ہشام ص ۴۹۲ [۲] امام احمد بروایت انس بن مالکؓ (ابن کثیر ج ۲ ص ۲۶۹)

[۳] صحیح بخاری و مسلم بطریق اسرائیل بروایت ابوبکر رضی اللہ عنہ (حدیث ہجرت)۔

لونڈیاں تک پکارتی پھرتی تھیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے[1]۔

مسلمانوں نے آپ کی آمد آمد سے خوش ہو کر جوش و مسرت کے ساتھ نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ اس سے بڑھ کر ان کے لئے کوئی مسرت نہ ہو سکتی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مدینہ اس وقت مسکرا اور فخر و مسرت سے اٹھلا رہا ہو انصار کی بچیاں بڑے سرور و مستی کے عالم میں یہ اشعار پڑھتی تھیں[2]۔

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع
ایھا المبعوث فینا جئت بالامر المطاع[3]

---

[1] صحیح بخاری (باب مقدم النبی صلے اللہ علیہ وسلم واصحابہ الی المدینہ) [2] ابن کثیر ج ۳ ص ۱۹۷ بیہقی بروایت عائشہ

[3] حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں اس موقع پر ایک علمی بحث پیدا کر دی ہے وہ کہتے ہیں کہ ثنیۃ الوداع جس کا ذکر ان اشعار میں آیا ہے مکہ سے مدینہ آنے والے کے راستہ میں (جو جنوب سے شمال کی طرف آتا ہے) نہیں پڑتا تھا اس لئے کہ ثنیۃ الوداع شام جانے والے یا شام سے آنے والے کے راستے میں واقع ہے، ان کی تحقیق ہے کہ یہ اشعار اس موقع پر پڑھے گئے جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تبوک سے بڑی عزت و کامرانی کے ساتھ واپس تشریف لا رہے تھے، خود صحیح بخاری میں غزوۂ تبوک کی واپسی پر ثنیۃ الوداع کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن عام طور پر اہل سیر حتیٰ کہ اہل سیرت کے قدیم مصنفین بھی شامل ہیں ان اشعار کو مکہ سے تشریف آوری کے موقع پر نقل کرتے ہیں، راقم نے بعض ایسے حضرات سے دریافت کیا جو مدینے کی گلی کوچے سے واقف تھے انھوں نے کہا کہ مکہ سے آنے والا بھی یہ راستہ اختیار کر سکتا ہے اور ہجرت جیسی حالت میں جبکہ آئی (؟) یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ آپ نے عام راستہ چھوڑ کر ثنیۃ الوداع سے مدینہ کا رخ فرمایا ہو (زرقانی ج ۱ ص ۳۵۹ تا ۳۶۰)

ہمارے ہاں (مدینہ) تشریف لائے۔[1]

مسجد قُباء اور مدینہ کا پہلا جمعہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے "قُباء" میں چار روز قیام فرمایا اور ایک مسجد کی بنیاد رکھی جمعہ کے روز آپ وہاں سے آگے روانہ ہوئے جمعہ بنی سالم بن عوف کی برادری میں پڑا چنانچہ جمعہ کی نماز آپ نے ان ہی کی مسجد میں ادا کی جمعہ کی یہ پہلی نماز تھی جو آپ نے مدینہ میں پڑھی۔[2]

ابو ایوب انصاریؓ کے گھر میں

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم شہر سے گذرے تو راستوں میں جا بجا تقریباً لوگوں نے آپ سے اس کی درخواست کی کہ آپ ان کے ہاں قیام فرمائیں وہ کہتے تھے آپ ہمارے ہاں اقامت فرمائیں تعداد سامان اور عزت و شوکت کے ساتھ یہی لوگ آپ کی اونٹنی کی نکیل اپنے ہاتھ میں لے لیتے آپ فرماتے کہ اس کو جانے دو یہ اللہ کی طرف سے مامور ہے (یہ بات کئی بار ہوا۔

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بنی النجار کے محلہ سے گزرے تو بچیوں اور باندیوں نے ان اشعار سے آپ کا استقبال کیا۔

نحن جوار من بنی النجار　　یا حبذا محمد من جار[3]

ہم بنی نجار کی لڑکیاں ہیں۔　　اے خوشا بخت کہ محمد ہمارے پڑوسی ہیں۔

---

[1] دارمی بروایت انسؓ　[2] ابن ہشام ص۴۹۲　[3] بیہقی بروایت حضرت انسؓ (ابن کثیر ص۲۸۲)

جب آپ بنی مالک بن النجار کے گھر تک پہونچے تو اونٹنی ایک جگہ پر جہاں آج مسجد نبوی کا دروازہ ہے خود بخود ٹھہر گئی، اس وقت اس جگہ کھجوروں کا ایک کھلیان تھا، جو بنی نجار کے دو یتیم لڑکوں کی ملکیت تھا، اور وہ آپ کے نانیہالی رشتہ دار بھی تھے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اونٹنی سے اترے ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ (خالد بن زید النجاری الخزرجی) نے فوراً آپ کا سامان اتروایا اور اٹھا کر لے گئے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انہیں کے یہاں قیام فرمایا۔ ابو ایوب انصاری نے آپ کی میزبانی، ضیافت، خاطر مدارات اور ادب و تعظیم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، بالائی منزل میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بلند ہو کر رہنا ان کو گوارا نہ ہوا وہ نیچے آگئے اور حضور سے درخواست کی کہ آپ اوپر تشریف رکھیں، وہ اور ان کے گھر والے نیچے رہیں گے آپ نے ارشاد فرمایا، ابو ایوب ہم کو اور ہمارے ملنے والوں کو اسی میں زیادہ راحت ہوگی کہ ہم نیچے رہیں۔

ابو ایوب انصاری کچھ خوش حال لوگوں میں نہ تھے لیکن آج اپنے گھر میں آپ کے قیام سے ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی اور اس سرفرازی اور عزت (جو اللہ تعالٰی نے ان کو عطا کی تھی) کے شکر ادا کرنے سے ان کی زبان قاصر تھی، محبت، خدمت اور آستانہ رسالت کے آداب خود سکھا دیتی ہے، ابو ایوب انصاری کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے رات کا کھانا تیار کر کے بھیجتے اگر آپ کا پس خوردہ واپس آتا تو میں اور ام ایوب اس طرف سے جہاں سے آپ نے کھایا ہوتا بچا ہوا کھاتے اور برکت حاصل کرتے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نیچے کی منزل میں تشریف رکھتے تھے اور ہم لوگ اوپر تھے، ایک مرتبہ مٹکا جس میں ہم پانی رکھتے تھے ٹوٹ گیا، میں نے اور ام ایوب نے اپنی چادر سے جس کے علاوہ ہمارے پاس اوڑھنے کی کوئی چیز نہ تھی اس پانی کو خشک کیا کہ کہیں

خدانخواستہ نیچے نہ ٹپکنے لگے اور آپ کو تکلیف پہنچے۔

مسجد نبوی اور مکانات کی تعمیر

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان دو لڑکوں کو جو اس کھلیان کے مالک تھے، بُلا بھیجا اور ان سے یہ جگہ مسجد کی تعمیر کے لئے خریدنا چاہی، دونوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ ہماری طرف سے ہدیہ ہے لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس طرح قبول نہ فرمایا اور کسی نہ کسی طرح قیمت دے کر قطعۂ زمین حاصل کیا اور وہاں مسجد کی تعمیر کی۔[1] آپ نے مسجد کی تعمیر میں بنفس نفیس شرکت فرمائی، آپ اینٹیں یہاں پہونچاتے تھے اور مسلمان آپ کی پیروی کرتے تھے اس موقع پر آپ یہ ارشاد فرماتے تھے۔

اللھم ان الاجر اجر الآخرۃ فارحم الانصار والمھاجرۃ[2]

اے اللہ اصل اجر تو آخرت کا اجر ہے پس انصار اور مہاجرین پر رحم فرما۔

مسلمان اس وقت بہت مسرور اور شادمان تھے شوقیہ اشعار پڑھتے اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتے۔[3]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر میں سات ماہ قیام فرمایا۔[4]

---

[1] ابن اسحاق بروایت ابو ایوب انصاری (از ابن کثیر ج ۲ صفحہ ۲۷۰) [2] صحیح بخاری باب "مقدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ الی المدینۃ" [3] ابن کثیر ج ۲ صفحہ ۲۵۱

[4] ابن کثیر ج ۲ صفحہ ۲۷۹ یہ ابن سعد کے نزدیک واقدی کی روایت ہے اور فتح الباری میں ابن حجر نے بھی اس کی توثیق کی ہے اور ابن اسحاق کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ آنے کے سال میں ربیع الاول سے صفر تک قیام کیا، اور وہاں مسجد (نبوی) تعمیر کی اور سکونت کے لئے گھر بنائے اس طرح آپ (صلے اللہ علیہ وسلم) کا حضرت ابو ایوب کے یہاں دس ماہ سے زیادہ قیام رہا۔

جب آپ کی مسجد اور رہائشی مکانات تعمیر ہو گئے تو آپ وہاں سے یہاں منتقل ہو گئے۔

مہاجرین آپ کے بعد مسلسل مدینہ آتے رہے یہاں تک کہ مکہ میں صرف دو قسم کے آدمی بچے یا تو وہ جو کسی فتنہ اور آزمائش میں پڑ گئے یا وہ جو دشمنوں کی قید میں تھے اور وہاں سے رہائی کی کوئی سبیل نہ تھی، دوسری طرف انصار کا کوئی گھر ایسا نہ بچا جہاں لوگوں نے اسلام قبول نہ کیا ہو۔

مہاجرین و انصار میں بھائی چارہ کا معاہدہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار میں ایک دوسرے کی غم خواری اور ہمدردی و اعانت کی بنیاد پر بھائی چارہ اور مؤاخات کا ایک معاہدہ بھی کرایا۔ انصار مہاجرین کے ساتھ بھائی چارہ کے لئے اس طرح ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے کہ قرعہ اندازی کی نوبت آجاتی تھی، وہ مہاجرین کو اپنے مکانات گھر کے اثاثہ، مال و دولت، زمین جائداد ہر چیز میں اختیار و تصرف دے دیتے تھے اور ان کو اپنے پر مقدم رکھتے تھے۔

ایک انصاری اپنے مہاجر بھائی سے کہتا، دیکھو میرا نصف مال جتنا ہو لے لو، میرے پاس دو بیویاں ہیں ان میں سے جو تم کو پسند آئے بتاؤ تو میں اس کو طلاق دے کر تمہارے حوالہ کر دوں، مہاجر جواب دیتا، اللہ تعالیٰ تمہارے گھر والوں اور مال و اسباب میں برکت عطا کرے، تم مجھے بس بازار کا راستہ بتا دو، ہم قسمت آزمائی کر لیں گے۔

لے ابن ہشام ج ۱ ص ۴۹۹-۵۰۰

انصار کا کام ایثار تھا، مہاجرین کا استغناء اور خود داری۔[1]

مؤاخاۃ اور اس کی اہمیت

یہ مواخاۃ (بھائی چارہ) اپنی نوعیت کی منفرد اسلامی و عالمی اخوت کی اساس ایک صاحب دعوت اُمت کے قیام کا مقدمہ تھی جو ایک نئی دنیا کی تعمیر کے لئے برپا ہو رہی تھی، اور جو صحیح و یقین عقائد اور دنیا کو بدبختی و بدنظمی سے نجات دینے والے نیک مقاصد اور ایمان و معنوی اُخوت اور متحدہ سرگرمی کے تعلقات کے لئے قائم ہو رہی تھی، اس طرح مہاجرین و انصار کے درمیان یہ محدود اخوت دنیا کے انسانیت کی نئی زندگی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ایک چھوٹے شہر کی ایک چھوٹی سی جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:۔

إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ	اگر یہ نہ کروگے تو زمین میں (بڑا)
وَفَسَادٌ كَبِيرٌ (سورۃ الانفال ع ۱۰)	فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔

حضورؐ کی تحریر اور یہود سے امن و امان کا معاہدہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر مہاجرین و انصار کے لئے ایک تحریر تیار فرمائی جس میں یہود سے امن و امان کا معاہدہ تھا، اور ان کے

---

[1] صحیح بخاری باب اخاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم بین المہاجرین والانصار اور باب (کیف آخی صلی اللہ علیہ وسلم بین اصحابہ) میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور سعد بن الربیعؓ کا واقعہ ملاحظہ فرمائیں۔

اپنے دین و مذہب پر رہنے اور مال و جائداد کی حفاظت و بقا کو تسلیم کیا گیا تھا اور ان کے حقوق اور ذمہ داریوں دونوں کی نشان دہی کی گئی تھی۔[1]

اذان کا حکم

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں امن و اطمینان حاصل ہوا اور اسلام کو استحکام نصیب ہوا تو آپ نے نماز کے لئے اطلاع و دعوت کے وہ طریقے جو یہود اور نصاریٰ میں رائج تھے مثلاً ناقوس گھنٹہ یا مشعل وغیرہ ناپسند فرمائے اس وقت تک مسلمان بغیر کسی دعوت و اعلان کے نماز کے اوقات میں خود جمع ہو جاتے تھے اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اذان سے سرفراز فرمایا اور خواب میں بعض صحابہ کو اس کا مشاہدہ کرایا گیا چنانچہ آپ نے اسی اذان کو متعین فرما دیا اور شرعی طور پر اس کا اجرا ہو گیا یہ خدمت حضرت بلال بن رباح حبشیؓ کے حوالے ہوئی وہ رسول اللہ

---

[1] ملاحظہ کیجئے ابن ہشام ص ۵۰۱ ۔ اس سیاسی دستاویز کی اہمیت معلوم کرنے کے لئے (جسے دنیا کا قدیم ترین باضابطہ تحریری دستور کہا جا سکتا ہے جو مکمل شکل میں آج بھی موجود ہے) اور اس عہد کے سیاسی تمدنی اور جنگی مشکلات حکمت نبوی اور بصیرت رسالتؐ اور حالات کے متوازن جائزہ کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر محمد حمید اللہ رسالہ اتحاد بین الاقوامی قانون حاملہ تھیسس جیدرآباد کا مقالہ جس کا عربی ترجمہ بولف ذکی تابت یمن حکومت کے قلم سے مجموعہ مباحث علمیہ ص ۱۰۲ (دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد ۱۳۵۰ھ میں شائع ہوا تھا۔

اس دستاویز کا متن سیرت ابن ہشام ق ۱ ص ۵۰۱ تا ۵۰۴ (طبع مصطفیٰ البابی مصر) کتاب الاموال لابی عبید البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر ج ۳ ص ۲۲۴ تا ۲۲۶ اور مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ ص ۱۵ تا ۲۱ از ڈاکٹر محمد حمید اللہ (طبع لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر قاہرہ) میں ملاحظہ ہو۔

صلے اللہ علیہ وسلم کے مؤذن کے لقب سے سرفراز ہوئے اور قیامت تک کے لئے مؤذنین کے امام قرار پائے۔

مدینہ میں نفاق اور منافقین کا ظہور

مکہ میں نفاق نہ تھا[1] اور یہ بات اس لئے تھی کہ اسلام وہاں مغلوب اور مجبور تھا اس ایسی صورت حال کو بدلنے کی کوئی طاقت نہ تھی وہ کسی کو نفع یا نقصان بھی نہیں پہونچا سکتا تھا بلکہ اسلام قبول کرنے کے معنی ہی وہاں یہ تھے کہ ہر قسم کے خطرہ اور ضرر کو گوارا کیا جائے، دشمنی مول لی جائے اور دشمنوں کو جانتے بوجھتے مشتعل کیا جائے اس کی ہمت صرف وہی کرتا تھا جو اپنے قول میں سچا اور ارادہ میں پکا ہوتا جس کا ایمان مضبوط ہوتا اور وہ اپنی زندگی اور مستقبل کو خطرہ میں ڈالنے پر آمادہ ہوتا، وہاں دو ہی ایک طاقتیں نہ تھیں مشرک طاقتور اور غالب تھے اور مسلمان مظلوم اور کمزور، قرآن مجید نے اس صورت حال کی اپنے بلیغ انداز میں اس طرح تصویر کھینچی ہے:-

وَاذْكُرُوا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ	اور (اس وقت کو) یاد کرو جب تم
مُّسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ	زمین (مکہ) میں قلیل اور ضعیف
تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ	سمجھے جاتے تھے اور ڈرتے رہتے
(سورۃ انفال ـ ۲۶)	تھے کہ لوگ تمہیں اڑا نہ لے جائیں
	(یعنی بے خانماں نہ کر دیں۔)

---

[1] اکثر مفسرین و محدثین کی یہی رائے ہے قرآن مجید کی وہ تمام سورتیں جن میں نفاق یا منافقین کا ذکر کیا گیا ہے مدینہ ہی میں نازل ہوئیں اسی بنا پر کہا گیا ہے "وَمِمَّنْ حَوْلَكُم مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ" (سورۃ توبہ ـ ۱۰۱)

جب اسلام مدینہ منتقل ہوا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کو امن و استحکام کا موقع حاصل ہوا، اسلام کو فروغ ہونے لگا اور اسلامی معاشرہ اپنے سارے شرائط و لوازمات کے ساتھ وجود میں آ گیا، تو اس وقت صورت حال میں ایک خاص تبدیلی واقع ہوئی اور نفاق نے سر نکالا، یہ ایک بالکل فطری اور نفسیاتی بات تھی جس سے مفر ممکن نہ تھا، اس لئے کہ نفاق ہمیشہ وہیں پیدا ہوتا ہے اور ہاتھ پیر نکالتا ہے جہاں دو متقابل دعوتیں اور حریف قیادتیں موجود ہوں، اس موقع پر یہ مذبذب اور متردد گروہ ان دونوں دعوتوں اور قیادتوں کے درمیان جھکولے کھاتا رہتا ہے اور متردد و فکر مند رہتا ہے کہ کس دعوت کو اختیار کرے اور کس کو چھوڑے، کبھی وہ کسی ایک دعوت کو قبول کر لیتا ہے اور اس کے کیمپ میں چلا جاتا ہے اور جذباتی لگاؤ اور وفاداری کا تعلق بھی اس سے قائم کر لیتا ہے، لیکن اس کی دنیاوی مصلحتیں اور متقابل دعوت کا فروغ اور اس کا غلبہ و عروج اس کو اپنے صحیح موقف اور پہلی دعوت کے پرچم کے نیچے آجانے کے اعلان سے باز رکھتا ہے، اور وہ اپنے قدیم ماحول سے رشتہ بالکل منقطع نہیں کر پاتا، قرآن مجید نے تردد اور اضطراب کی اس کیفیت اور حالت کی بہت نازک اور بولتی ہوئی تصویر کھینچ دی ہے،

ارشاد ہوتا ہے:-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ	اور لوگوں میں بعض ایسا بھی ہے
عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ	جو کنارے پر (کھڑا ہو کر) خدا کی
خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ	عبادت کرتا ہے اگر اس کو کوئی
اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى	(دنیاوی) فائدہ پہنچے تو اس کے

وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝

(سورۂ حج۔۱۱)

سبب مطمئن ہو جائے اور اگر کوئی آفت پڑے تو منہ کے بل لوٹ جائے (یعنی پھر کافر ہو جائے) اس نے دنیا میں نقصان اٹھایا اور آخرت میں بھی یہی تو نقصان صریح ہے۔

اسی گروہ کی صفت دوسری جگہ یہ بیان کی گئی ہے:۔

مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ

(سورۂ النساء۔۱۴۳)

بیچ میں پڑے لٹک رہے ہیں، نہ ان کی طرف (ہوتے ہیں) نہ ان کی طرف۔

ان منافقین کی جو اوس و خزرج اور یہود سے تعلق رکھتے تھے سربراہی و رہنمائی عبداللہ بن اُبَی بن سلول کے ہاتھوں میں تھی "بعاث" کی جنگ کے بعد سب نے متفقہ طور پر اس کو اپنا سردار تسلیم کر لیا تھا جب اسلام کا یہاں داخلہ ہوا اس وقت اس کی "تاج پوشی" کی پوری تیاری تھی جب اس نے دیکھا کہ لوگ بہت بڑی تعداد میں اور سرعت کے ساتھ اسلام قبول کر رہے ہیں تو یہ بات پھانس بن کر اس کے دل میں چبھ گئی، اس کو کسی کل قرار نہیں آتا تھا۔ ابن ہشام بیان کرتے ہیں کہ جس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اس وقت عبداللہ بن اُبَی بن سلول مدینہ والوں کا سردار تھا، اوس و خزرج اسلام کی آمد سے قبل اس کے سوا کبھی بھی کسی پر متفق نہ ہو سکے تھے اور ان دونوں قبیلوں کے کسی ایک شخص کو اپنا سردار بنانے پر راضی نہ تھے اس کی قوم نے اس کی تاج پوشی کے لئے کوڑیوں کا ایک تاج بھی

تیار بیٹھا تھا اور اس کو بادشاہ بنانے کی تجویز تھی کہ کیفیت بدل گئی یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو یہاں بھیج دیا اور جب اس کی قوم اس کو چھوڑ کر مسلمان ہو گئی تو اس کے دل میں حضرت کے لیے حسد پیدا ہو گیا اور اس کو افسوس ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس سرداری اور عزت سے محروم کر دیا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی قوم کسی حالت میں بھی اسلام کو ترک کرنے والی نہیں تو وہ بھی بادل ناخواستہ داخل اسلام ہوا اور اپنے نفاق چھپانے اور کینہ پر پردہ ڈالنے لگا۔[1]

ایسے تمام لوگ اسلام دشمنی پر اتر آئے جن کے دل میں کوئی کجی تھی اور جو ریاست کے خواہاں تھے وہ اس نئے دین سے گھٹن محسوس کرنے لگے جس نے ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا اور امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا اور جس نے مدینہ کا رنگ بدل کر مہاجرین وانصار کی یکدل و یک جان جماعت پیدا کر دی تھی جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر جان چھڑکتی اور آپ کی محبت کو اپنے ماں باپ اور بیویوں کی محبت پر بھی ترجیح دیتی تھی یہ منظر دیکھ کر ان منافقین کے دل بجھ گئے اور حسد سے بھر گئے اور وہ آنحضرت کے خلاف منصوبے بنانے اور سازشیں کرنے لگے اس طرح مدینے کے اسلامی معاشرے کے اندر ہی ایک مخالف محاذ پیدا ہو گیا جس کی طرف سے مسلمانوں کو ہوشیار رہنا ضروری تھا کیونکہ یہ گروہ مار آستین کی حیثیت رکھتا تھا اور اسلام اور مسلمانوں کے لئے کھلے دشمنوں سے زیادہ خطرناک تھا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کثرت سے ان کا ذکر کرتا اور ان کے کرتوتوں سے پردہ اٹھاتا ہے اسلام کا ان کے ساتھ مختلف نوع کا تعلق رہا ہے اس لئے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۵۸۴-۵۸۵

سیرت کی کتابوں میں ناگزیر طور پر ان کا ذکر آتا ہے اور اس کتاب میں بھی آئے گا۔

یہود کی دشمنی کا آغاز

ابتدا میں کسی قدر غیر جانب داری اور خاموشی کے بعد پہلی بار یہود کی دشمنی اور کینہ پروری کی علامتیں ظاہر ہونا شروع ہوئیں، ان کا موقف پہلے مسلمانوں و مشرکوں اور اہلِ مکہ اور اہلِ مدینہ میں غیر جانب داری کا تھا، بلکہ شاید وہ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی طرف نسبتاً زیادہ مائل تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ نبوت، رسالت اور روزِ آخرت پر ایمان میں (خواہ بعض تفصیلات میں اختلاف ہو) نیز اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور عقیدۂ توحید میں وہ مسلمانوں سے بہت قریب تھے، اگرچہ یہ عقیدہ بھی جاہلی اقوام کے پڑوس میں ایک طویل عرصہ تک رہنے اور بت پرستی کے ماحول میں جلاوطنی کی بہ طویل مدت گزارنے کی وجہ سے بہت کمزور پڑچکا تھا، اور اس میں غلو اور بعض انبیاء کی تقدیس بھی شامل ہوگئی تھی جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان کیا گیا ہے۔[1]

تمام قرائن یہ بتاتے تھے کہ اگر وہ اسلام کا ساتھ نہیں دیں گے تو کم از کم اس معاملہ میں غیر جانب دار ضرور رہیں گے، اس لئے کہ اسلام ان کی مذہبی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل کے تمام انبیاء پر ایمان کی دعوت دیتے ہیں، قرآن مجید اہلِ ایمان کی زبان سے کہتا ہے:-

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ   سب خدا پر اور اس کے فرشتوں پر اور

---

[1] دیکھئے باب "عہد جاہلیت"۔

وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۔
(سورۂ بقرہ۔ ۲۸۵)

اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں (اور کہتے ہیں) ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔

اگر ایسا ہو سکتا تو آج نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ تاریخ عالم کا رخ دوسرا ہوتا، اور اسلامی دعوت کو ان مشکلات و مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑتا جو اسلام و یہودیت کی آویزش اور ان اولین مسلمانوں (جو اپنی نشوونما کے دور میں تھے) اور ان یہودیوں (جو طاقتور، بااثر، دولت مند اور تعلیم یافتہ تھے) کی کشمکش نے پیدا کر دیئے تھے اور جس کے صرف دو بنیادی سبب تھے، ایک یہودیوں میں حسد، تنگ دلی اور جمود و تعصب کا مادہ، اور دوسرے ان کے عقائد باطلہ، اخلاق رذیلہ اور قبیح عادتیں جن پر قرآن مجید میں جا بجا تنقید کی گئی ہے اور ان کی اس طویل تاریخ کا پردہ چاک کیا ہے جو انبیاء کرام سے برسر جنگ ہونے، ان کے پیغام و دعوت کا مقابلہ کرنے، ان کو شہید کرنے کی جسارت، عناد و سرکشی، راہ حق سے روکنے، اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھنے، دولت سے عشق، باوجود ممانعت کے سودی کاروبار سے دلچسپی، ناجائز طور پر لوگوں کا مال کھانے، حرام مال کا شوق، توریت میں اپنی حسب مرضی رد و بدل اور ترمیم و اضافہ، زندگی سے حد سے بڑھی ہوئی محبت اور بہت سے ان قومی و نسلی خصوصیات سے بھری ہوئی ہے۔

اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جگہ کوئی سیاسی رہنما ہوتا تو اس پیچیدہ صورت حال کا (جو اس وقت مدینہ میں قائم تھی) اندازہ لگا کر اس کی روشنی میں مصلحت آمیز قدم اٹھاتا، وہ اگر یہودیوں کے ساتھ خوشامد اور چشم پوشی کا معاملہ

نہ کرتا تو کم از کم ان کو مشتعل کرنے اور ان کی دشمنی مول لینے سے ضرور احتیاط کرتا لیکن
آپ تبلیغ رسالت، دین حق کے صاف و واشگاف طریقہ پر اعلان، حق و باطل کی تمیز
اور رشد و گمراہی کے مقابلہ اور موازنہ پر اللہ تعالےٰ کی طرف سے مامور تھے اور آپ کے
اس کا ذمّہ دار بنایا گیا تھا کہ آپ دنیا کی تمام قوموں اور افراد اور جماعتوں کو جن میں
یہود و نصاریٰ جیسے اہل کتاب بھی شامل ہیں، اسلام کی برملا دعوت دیں، خواہ اس کی
آپ کو بڑی سے بڑی قیمت دینی پڑے اور طرح طرح کی مشکلات اٹھانی پڑیں، یہ نبوت کا
وہ مزاج اور منہج ہے جس پر سارے انبیاء ہمیشہ کاربند رہے یہی مزاج اور منہج سیاست
اور نبوت کی راہوں کو الگ کرتا اور انبیاء اور قومی زعماء میں بنیادی فرق پیدا کرتا ہے۔

یہود کے عقائد اور ان کی زندگی اور سیرت و کردار پر ان باتوں سے ضرب کاری
لگی اور اس نے ان کو اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت اور دشمنی پر کمربستہ کر دیا چنانچہ
انھوں نے اپنا پرانا رویہ بدل دیا، اور خفیہ و علانیہ دونوں طریقوں سے اسلام کی
مخالفت پر اتر آئے اور مقابلہ کے لئے میدان میں آگئے، یہودی فاضل
"اسرائیل ولفنسن" نے اس نزاع و دشمنی کے اسباب پر کسی قدر جرأت اور صفائی
کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتا ہے :-

"اگر رسول کی تعلیمات صرف بت پرستی کی مخالفت تک محدود رہتیں تو
یہود سے ان کی رسالت تسلیم کرنے کا مطالبہ نہ کیا جاتا تو یہود اور مسلمانوں
میں کوئی جھگڑا پیدا نہ ہوتا، اور یہود احترام و تعظیم کی نگاہ سے رسول کی
تعلیمات کو دیکھتے، ان کی حمایت کرتے اور جان و مال سے ان کی مدد
کرتے یہاں تک کہ آپ ان بتوں کو پاش پاش کر دیتے، جزیرۃ العرب

میں دو ز ذرہ تھا) اور بت پرستانہ عقائد کا خاتمہ ہو جاتا جو سارے
عرب میں پھیلے ہوئے تھے لیکن اس کی شرط یہی تھی کہ وہ ان سے اور ان کے
دین سے کوئی سروکار نہ رکھیں اور نہ ان کو نئی رسالت قبول کرنے پر
مجبور کریں اس لئے کہ یہودی ذہنیت کسی ایسی چیز کے سامنے نرم نہیں
پڑ سکتی جو اس کو اس کے دین سے ہٹانا چاہتی ہو، وہ بنی اسرائیل کے
سوا کسی اور نسل کے کسی نبی کو تسلیم کرنے پر راضی نہیں ہو سکتی۔[1]

یہودیوں میں اس بات نے مزید اشتعال پیدا کر دیا کہ ان کے بعض عالم جیسے عبداللہ بن سلام جن کا وہ بڑا احترام کرتے تھے اسلام لے آئے یہود کو اس کا خیال بھی نہیں آ سکتا تھا کہ ان جیسا شخص مسلمان ہو جائے گا، اس نے ان کے سینہ میں حسد اور جلن کی آگ اور بھڑکا دی۔[2]

یہود نے صرف اسلام کی مخالفت اور اس سے نفرت و وحشت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ مشرکوں اور بت پرستوں کو ان مسلمانوں پر کھلی ترجیح دینے لگے جو عقیدۂ توحید میں یہود کے شریک و ہمنوا تھے تو خود اس کی حقانیت اور معقولیت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ جب قریش کے مذہب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کا موازنہ ہوگا اور ان میں ترجیح و انتخاب کا مسئلہ سامنے آئے گا تو وہ

---

[1] تاریخ الیہود فی بلاد العرب (دلفنسن) ص ۱۲۲

[2] یہود کے جو لوگ مسلمان ہوئے اور ان کو شرف صحبت حاصل ہوا ان کی تعداد دو درجن تک پہنچتی ہے اور ان کے نام اور حالات تذکرہ کی کتابوں خصوصاً الاصابہ اور الاستیعاب اور اسد الغابہ میں محفوظ ہیں، ان میں بعض بڑے جلیل القدر علماء اور اجلۂ صحابہ شامل تھے ان کی تعداد مولانا حبیب اللہ کی کتاب اہل کتاب صحابہ و تابعین شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی میں لکھی ہے ملاحظہ ہو۔

مسلمانوں سے اپنے اختلاف کے باوجود شرک و بت پرستی پر اسلام کی حقانیت و برتری کی شہادت دیں گے لیکن اسلام دشمنی نے ان کو اس کی اجازت نہ دی، چنانچہ جب ایک موقع پر یہودی علماء سرداران قریش سے مکہ میں ملنے گئے تو سرداران قریش نے کہا کہ آپ لوگ سب سے اول اہل کتاب ہیں اور ہمارے اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے درمیان جو اختلاف چل رہا ہے وہ آپ کو معلوم ہے آپ کیا کہتے ہیں ہمارا مذہب بہتر ہے یا ان کا؟ انھوں نے جواب دیا آپ لوگوں کا دین ان کے دین سے بہتر ہے اور آپ زیادہ حق پر ہیں۔[1]

یہی یہودی فاضل ڈاکٹر اسرائیل ولفنسن اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"لیکن ایک بات جس پر ان لوگوں کو واقعی ملامت کی جاسکتی ہے اور جس سے ہر اس شخص کو تکلیف پہونچے گی جو خدائے واحد پر ایمان رکھتا ہے خواہ وہ یہودیوں میں سے ہو یا مسلمانوں میں سے، وہ گفتگو ہے جو کچھ یہودیوں اور قریش کے بت پرستوں میں ہوئی تھی اور جس میں ان یہودیوں نے قریش کے مذہب کو پیغمبر اسلام کے لائے ہوئے دین پر ترجیح دی تھی!"

آگے بڑھ کر وہ لکھتے ہیں:-

"جنگی ضرورتوں نے قوموں کے لئے حیلہ سازی اور دروغ گوئی اور دشمن پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے فریب دہی کی مختلف تدبیروں کو جائز قرار دیا ہے لیکن سب کے باوجود یہودیوں کو اس سنگین غلطی کا ارتکاب ہرگز نہ کرنا چاہئے تھا

---

[1] ابن ہشام ج ۲ ص ۲۱۴۔

اور قریش کے ذمہ داروں کے سامنے اس کی صراحت نہ کرنی چاہیے تھی کہ بتوں کی پرستش اسلامی توحید سے بہتر ہے خواہ اس کی وجہ سے ان کے مقاصد پورے نہ ہو پاتے اس لئے کہ بنی اسرائیل جو طویل صدیوں تک بت پرست اقوام کے مقابلہ میں اپنے قدیم آباء و اجداد کے نام پر توحید کا پرچم بلند کئے رہے اور جنھوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں اس عقیدہ کی خاطر ناقابل شمار مصائب برداشت کئے اور قتل و خون کے سخت مرحلوں سے گزرے ان کا آج یہ فرض تھا کہ وہ مشرکین کو ناکام و نامراد کرنے کے لئے اپنی متاع حیات اور نفیس سے نفیس شے کی قربانی دیتے۔[1]

قرآن مجید نے اس آیت میں اسی صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا	بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا
مِّنَ الْكِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ	جن کو کتاب سے حصہ دیا گیا ہے کہ بتوں
وَالطَّاغُوْتِ وَیَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ	اور شیطان کو مانتے ہیں اور کفار
كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ	کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا (سورہ نساء)	مومنوں کی نسبت سیدھے رستے پر ہیں

قبلہ کی تبدیلی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمان اب تک بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے تھے مدینہ تشریف آوری کے بعد ایک سال چھ مہینے تک نماز

---

[1] الیہود فی بلاد العرب ص ۱۲۲

اسی رُخ پر پڑھی جاتی ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ کعبہ کو مسلمانوں کا قبلہ بنا دیا جائے یہ عرب مسلمان بھی (جن کی نشوونما کعبہ کی محبت اور تعظیم پر ہوئی تھی اور یہ محبت اور تعظیم ان کے گوشت پوست اور خون میں پیوست تھی) دل سے یہی چاہتے تھے کہ کعبہ ان کا قبلہ ہوتا، وہ کسی جگہ کو بھی کعبہ اور سیدنا ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے قبلہ کے مقابلہ کا نہیں سمجھتے تھے اور بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا اور اس کو اپنا قبلہ تسلیم کرنا ان کے لئے ایک شدید امتحان تھا، لیکن بے چون و چرا انھوں نے اس حکم کو تسلیم کیا اور "سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا" (اور ہم نے سنا اور اطاعت کی) اور "اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا" (ہم ایمان لائے جو کچھ ہے ہمارے رب ہی کی طرف سے ہے) کے سوا ان کی زبان سے کچھ اور نہ نکلا، وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے کے علاوہ اور کچھ نہ جانتے تھے، خواہ وہ ان کی خواہش و رغبت اور ان کی عادت اور مذاقِ طبیعت کے موافق ہو یا نہ ہو۔ جب اللہ تعالےٰ نے ان کے دلوں کا یہ امتحان لے لیا، اور انھوں نے تقویٰ اور اطاعت کا پورا ثبوت دے دیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمانوں کا رُخ کعبہ کی طرف کروا دیا گیا۔ قرآن مجید میں آتا ہے:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا	اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل
لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ	بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر
وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا	(آخر الزمان) تم پر گواہ بنیں اور جس
وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ	قبلہ پر تم (پہلے) تھے، اس کو ہم نے
عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ	اس لئے مقرر کیا تھا کہ معلوم کریں کہ
الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى	کون (ہمارے) پیغمبر کا تابع رہتا ہے اور

عَقِبَيْهِ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ

(سورۂ بقرہ – ۱۴۳)

کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے اور یہ بات (بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا) گراں معلوم ہوئی مگر جن کو خدا نے ہدایت بخشی (وہ اسے گراں نہیں سمجھتے تھے)

مسلمانوں نے خدا اور رسول کی اطاعت کرتے ہوئے اپنا رخ اسی وقت کعبہ کی طرف کر لیا اور وہی قیامت تک کے لیے مسلمانوں کا قبلہ قرار پایا (مسلمان خواہ دنیا کے کسی حصہ میں ہوں) اپنا منھ اسی کی طرف کر کے نماز پڑھنے کے لئے مامور ہیں۔[1]

مدینہ کے مسلمانوں سے قریش کی چھیڑ چھاڑ

جب مدینہ میں اسلام کے قدم جم گئے، اور قریش نے دیکھا کہ اس کی وسعت اور مقبولیت میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے اور اگر یہ صورت حال کچھ دن اور باقی رہ گئی تو زمام کار ان کے ہاتھ سے بالکل نکل جائے گی اور اس کے بعد وہ اس کا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے، یہ دیکھ کر انھوں نے مخالفت اور دشمنی کے لئے اپنی طرح کمر کس لی اور ہر طرف اس کے خلاف ایک شور و غوغا شروع ہو گیا، لیکن مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صبر اور عفو و درگذر کا حکم اور "كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ" (اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو) کی تعلیم تھی، اس کا مقصد یہ تھا کہ زندگی اور اس کی لذتیں اور راحتیں ان کی نظر میں ارزاں اور بے قیمت ہو جائیں اور اطاعت نفس کی مخالفت اور ایثار و قربانی

---

[1] دیکھئے صحاح ستہ اور قرآن مجید کی ان آیات کی تفسیر جن میں تبدیلی قبلہ کا ذکر ہے۔

مشکل کام ان کے لئے آسان ہو جائے۔

قتال کی اجازت

جب ان کی طاقت کچھ اور بڑھی اور ان کے بازو مضبوط ہو گئے تو اس وقت ان کو قتال کی اجازت دیدی گئی لیکن یہ صرف اجازت تھی اس کو فرض قرار نہیں دیا گیا تھا فرمایا۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ	جن مسلمانوں سے (خواہ مخواہ) لڑائی کی
ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی	جاتی ہے ان کو اجازت ہے کہ (وہ
نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ	بھی لڑیں) کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے
(سورۂ حج - ۳۹)	اور خدا ان کی مدد کرے گا یقیناً
	وہ ان کی مدد پر قادر ہے۔

عبداللہ بن جحشؓ کا سریہ اور غزوہ ابواء

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبائل اور علاقوں میں سرایا اور چھاپے بھیجنے کا آغاز فرمایا ان کی نوعیت اکثر باقاعدہ جنگ کی نہ ہوتی تھی اس کو ہم کسی قدر طاقت آزمائی یا حرب اور چھاپہ سے تعبیر کر سکتے ہیں جس کا مقصد مشرکین کو مرعوب و خوف زدہ کرنا اور اسلام کی شان و شوکت اور سرگرمی و فعالیت کا مظاہرہ کرنا تھا اور یہ فائدہ ان سرایا اور چھاپوں سے پوری طرح حاصل ہوا۔

اس موقع پر ہم خصوصیت سے عبداللہ بن جحشؓ کے سریہ کا ذکر کریں گے اس لئے کہ

لے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو زاد المعاد ص ۱۵ - ۳۶۴

اس سریہ کے متعلق ایک آیت بھی نازل ہوئی نیز اس سے اس اہم حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ قرآن مجید مسلمانوں کی کسی کوتاہی اور غلطی کا ساتھ نہیں دیتا بلکہ وہ مختلف قوموں اور جماعتوں کے بارے میں کوئی فیصلہ دینے یا رائے قائم کرنے میں میزانِ عدل ہے جس پر ہر عمل کو تولا جائے گا، یہ واقعہ مختصراً یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن جحش الاسدی کو رجب ۲ھ میں ایک مہم پر روانہ فرمایا اور مہاجرین کے آٹھ آدمی ان کے ساتھ کیے، آپ نے ان کو ایک تحریر بھی لکھ کر دی اور یہ حکم فرمایا کہ اس تحریر کو ابھی نہ دیکھیں جب دو دن کی مسافت طے کرلیں تب اس کو کھول کر پڑھیں اور پھر جو کچھ اس میں ہے اس کی تعمیل کریں، لیکن اپنے کسی رفیق کو اس کی تعمیل پر مجبور نہ کریں۔

جب عبداللہ بن جحش نے دو دن کی مسافت طے کرلی تو یہ خط کھول کر دیکھا، اس میں لکھا ہوا تھا "جب یہ خط تم دیکھ لینا تو آگے بڑھ کر مکہ اور طائف کے درمیان نخلستان میں اتر جانا اور وہاں سے قریش کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا اور ان کی خبریں ہمارے پاس بھیجتے رہنا" عبداللہ بن جحش نے خط پڑھ کر کہا "سمعاً وطاعۃً" آقا کا حکم سر آنکھوں پر، پھر اپنے رفقاء سے کہا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا ہے کہ آگے نخلستان میں اتر کر وہاں سے قریش کی سرگرمیوں پر نظر رکھوں اور اس کی خبریں آپ کو پہنچاتا رہوں، مجھے آپ نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ میں کسی اور کو اس پر مجبور نہ کروں، اب تم میں سے جس کو شہادت کا شوق ہے وہ ہمارے ساتھ آئے اور جو یہ نہیں چاہتا وہ واپس لوٹ جائے، مجھے بہرحال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کرنی ہے، اس کے بعد وہ آگے روانہ ہوگئے اور ان کے سب ہی رفقاء

ان کے ساتھ سے ایک آدمی نے بھی پیچھے رہنا گوارا نہ کیا۔

آگے چل کر وہ اور ان کے سب رفقاء نخلستان میں مقیم ہوئے، اتنے میں قریش کا ایک قافلہ وہاں سے گذرا، اس میں عمرو بن الحضرمی بھی تھا، قریش اس قافلہ کو دیکھ کر ڈر سے گئے، ان کا پڑاؤ بھی قریب ہی تھا، اتنے میں عکاشہ بن محصن نے جن کا سر منڈا ہوا تھا، اپنا سر اٹھا کر دیکھا، قریش نے جب ان کو دیکھا تو اطمینان کا اظہار کیا اور کہا ان سے ڈرنے کی بات نہیں یہ تو عمرہ والے ہیں[1]، یہ رجب سنہ ۲ھ کے آخری دن کا واقعہ ہے[2]، اس کے بعد مسلمانوں نے آپس میں مشورہ کیا اور رائے یہ ہوئی کہ اگر تم نے ان کفار کو اس رات میں چھوڑ دیا تو یہ مسجد حرام میں داخل ہو جائیں گے اور تم کو وہاں جانے سے باز رکھیں گے اور اگر تم ان سے قتال کرتے ہو تو شہر حرام میں جنگ کرنا پڑے گی، اس بات سے لوگوں میں تردد کی کیفیت پیدا ہو گئی اور ان کو اس قسم کے اقدام سے ڈر سا محسوس ہوا، لیکن پھر انھوں نے اپنے کو اس پر آمادہ کر لیا اور سب کی متفقہ رائے یہ ہوئی کہ ان میں سے جتنے ممکن ہو سکیں ان کو تو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے اور ان کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیا جائے، چنانچہ ان میں سے واقد بن عبداللہ التمیمی نے پہلا تیر چلایا اور عمرو بن الحضرمی کا خاتمہ

---

[1] عرب ماہ رجب میں عمرہ کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ [2] رجب حرمت کے چار مہینوں میں پہلا مہینہ ہے، اشہر حرام میں جنگ کرنا ممنوع تھا اور یہ عہد جاہلیت اور اسلام کے ابتدائی دور میں عرب میں مروج رہا، جبکہ باقی تین مہینے ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم کے ہیں۔ جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ آیت سورۂ برأت کی اس آیت سے منسوخ ہو چکی ہے: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَافَّةً۔ سعید بن المسیب سے پوچھا گیا کہ کیا مسلمان شہر حرام میں کفار سے جنگ کر سکتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا ہاں۔ اسلامی فتوحات اور جنگ کا سلسلہ انہی مہینوں میں جاری تھا جس کی تاریخ گواہ ہے، اگر ہر سال ایک مہینہ رجب یا تین مہینے ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم میں جنگ بند کر دی جاتی ہوتی اور اسلامی فوجیں بیٹھی رہتیں تو ایسا آج کل ایسا۔

کر دیا، دو آدمیوں کو قیدی بنا لیا گیا، اور عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھی اس قافلہ اور دو قیدیوں کو لے کر واپس روانہ ہوئے۔

جب مدینہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان کی حاضری ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ میں نے تم کو شہر حرام میں جنگ کرنے کے لئے تو نہیں کہا تھا، پھر آپ نے ان میں سے کسی چیز کو لینے سے انکار کر دیا جو مال غنیمت میں لائے تھے۔

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تو ان کے ہاتھ پیر پھول گئے، اور خطرہ ہوا کہ اب ہلاکت یقینی ہے، دوسری طرف مسلمانوں نے بھی ان کو بہت سخت سست کہا اور لعنت ملامت کی، قریش نے کہا کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے شہر حرام میں بھی جنگ اور خون ریزی جائز کر دی! اس موقع پر اللہ تعالے نے یہ آیت نازل فرمائی:۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ	(اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم) لوگ تم سے
قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ	عزت والے مہینوں میں لڑائی کرنے
كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ	کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دو
وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ	کہ ان میں لڑنا بڑا (گناہ) ہے
وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ	اور خدا کی راہ سے روکنا اور اس سے
عِندَ اللَّهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ	کفر کرنا اور مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ
مِنَ الْقَتْلِ	میں جانے سے) روکنا، اور اہل مسجد کو
(سورۃ البقرہ ـ ۲۱۷)	اس میں سے نکال دینا (جو یہ کفار
	کرتے ہیں) خدا کے نزدیک اس سے بھی

ملہ سیرت ابن ہشام ص ۶۰۱-۶۰۵

زیادہ گناہ ہے اور فتنہ انگیزی
خوں ریزی سے بھی بڑھ کر ہے۔

علامہ ابن القیم "زاد المعاد" میں لکھتے ہیں:۔

"اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے دوستوں اور دشمنوں میں عدل و انصاف کا معاملہ فرمایا اور اپنے مقبول و پسندیدہ بندوں کی ان کے اس فعل پر کہ وہ شہر حرام میں گناہ کے مرتکب ہوئے حمایت نہیں کی بلکہ اس کو بہت بڑی بات قرار دیا اور ساتھ ہی اس کا بھی اظہار کر دیا کہ اس کے دشمن مشرک تھا ایک شہر حرام میں ارتکاب گناہ سے کہیں زیادہ قابلِ مذمت اور سزا کے لائق ہیں، خاص طور پر ایسی صورت کہ اس کے مقبول بندوں نے اس میں تاویل سے کام لیا تھا یا یہ کہنا چاہیئے کہ ان سے اس معاملہ میں ایک طرح کی تقصیر ہوگئی تھی جس کو اللہ تعالیٰ ان کے عقیدۂ توحید، طاعت و عبادت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت اور راہِ اللہ کے لئے قربانی کی بدولت معاف کرنے والا ہے"۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۃ الابواء[2] میں جس کو "ودان" بھی کہا جاتا ہے بنفس نفیس شرکت فرمائی، یہ آپ کا پہلا غزوہ ہے لیکن اس میں جنگ کی نوبت نہیں آئی چنانچہ آپ واپس تشریف لے آئے اس کے بعد متعدد سرایا و غزوات پیش آئے۔

روزہ کی فرضیت

جب عقیدہ مسلمانوں کے دلوں میں خوب راسخ ہوگیا اور ان کو نماز سے پوری مناسبت

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۴۳ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۵۹۱-۶۰۲

پیدا ہو گئی اور رفتہ رفتہ یہ بڑھتے بڑھتے عشق کے درجہ تک پہنچ گئی ان کے اندر احکامِ شرعیہ اور اوامرِ الٰہیہ کی تعمیل کرنے کا ایک ایسا مزاج پیدا ہو گیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان احکام کے انتظار میں رہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے روزہ کا حکم نازل فرمایا۔

یہ ہجرت کے دوسرے سال کا واقعہ ہے۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔

(سورۂ بقرہ - ۱۸۳)

مومنو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم پرہیزگار بنو۔

دوسری آیت یہ نازل ہوئی:۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔[1]

(سورۂ بقرہ - ۱۸۵)

(روزوں کا مہینہ) رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن (اول اول) نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے جس میں ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور جو حق و باطل کو الگ الگ کرنے والا ہے تو جو کوئی تم میں سے اس مہینہ میں موجود ہو چاہیے کہ پورے مہینہ کے روزے رکھے۔

---

[1] روزے کے اسرار و حکم معلوم کرنے اور اس کی مشروعیت کی تفصیلات کے لیے ہماری کتاب "ارکانِ اربعہ" ملاحظہ ہو۔

بدر کی فیصلہ کن جنگ

(سنہ ۲ھ)

جنگِ بدر کی اہمیت

ہجرت کے دوسرے سال رمضان ہی میں بدر کی وہ فیصلہ کن اور تاریخ ساز جنگ ہوئی جس میں اُمتِ اسلامیہ کی تقدیر اور دعوتِ حق کے مستقبل کا فیصلہ ہوا جس پر پوری نسلِ انسانی کی قسمت کا انحصار تھا۔

اس کے بعد سے آج تک مسلمانوں کو جتنی فتوحات اور کامیابیاں حاصل ہوئیں اور ان کی جتنی حکومتیں اور سلطنتیں قائم ہوئیں وہ سب اسی فتح مبین کی مرہونِ منت ہیں جو بدر کے میدان میں اس مٹھی بھر جماعت کو حاصل ہوئی اسی لئے اللہ تعالےٰ نے اس جنگ کو "یوم الفرقان" (فیصلہ کن دن) قرار دیا ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ۔	اگر تم خدا پر اور اس (کی نصرت) پر ایمان رکھتے ہو جو (حق و باطل میں) فرق کرنے کے دن (یعنی جنگ بدر میں) جس دن دونوں فوجوں میں مٹھ بھیڑ ہوگئی اپنے بندے (محمدؐ) پر نازل فرمائی۔
(سورۂ انفال۔ ۴۱)	

اس جنگ کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ ابو سفیان شام سے قریش کے ایک بڑے تجارتی کارواں کو لے کر جا رہا ہے جس میں بڑا مال و اسباب ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب مسلمانوں اور مشرکین میں معرکہ آرائی کا سلسلہ جاری تھا اور قریش نے اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کے مقابلہ راہ حق میں رکاوٹیں ڈالنے اور مسلمانوں کے لئے مختلف قسم کی مشکلات پیدا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی انھوں نے اپنے سارے مالی وسائل سامان جنگ اور ضروری اسباب اس کے لئے وقف کر رکھے تھے اور ان کے جنگی دستے مدینہ کے حدود اور چراگاہوں تک پہونچ جاتے تھے۔

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ ابو سفیان جو اسلام کا بدترین دشمن تھا اتنے بڑے قافلے کے ساتھ آرہا ہے تو آپ نے لوگوں کو آگے بڑھ کر اس کا سامنا کرنے کا حکم دیا لیکن اس کا بہت زیادہ اہتمام اور فکر نہیں کی گئی اس لئے کہ وہ بہرحال ایک تجارتی قافلہ تھا کسی لشکر کی فوج کشی نہ تھی۔

ادھر ابو سفیان کو یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس قافلہ کے مقابلہ کے لئے مدینے سے روانہ ہو چکے ہیں تو اس نے فوراً اپنا قاصد مکہ بھیجا اور قریش سے فریاد کی کہ وہ اس کی مدد کریں اور مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روکیں، جب یہ فریاد و پکار مکہ پہونچی تو قریش نے جنگ کی پوری تیاری شروع کر دی اور بہت تیزی کے ساتھ ایک لشکر جرار لے کر مقابلہ کے لئے روانہ ہوئے ان کے سرداروں میں سے کوئی سردار باقی نہیں بچا جو اس میں شریک نہ ہوا ہو انھوں نے اطراف کے تمام قبائل کو اس میں شریک کر لیا قریش کی مختلف شاخوں کے آدمی اس میں شامل تھے اور شکل کوئی باقی تھا یہ لشکر بڑی حمیت رعونت، غیظ و غضب اور انتقامی جذبے کے ساتھ روانہ ہوا۔

انصار کی پیش کش اور ان کی اطاعت شعاری وجاں نثاری

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ہوئی کہ قریش کا یہ زبردست لشکر روانہ ہوچکا ہے تو آپ نے اپنے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا لیکن اس وقت آپ کا روئے سخن انصار کی طرف تھا اس لئے کہ انھوں نے آپ سے اسی بات پر بیعت کی تھی کہ وہ مدینہ میں آپ کی پوری حفاظت اور مدد کریں گے جب آپ نے مدینہ سے روانگی کا قصد فرمایا تو آپ نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ اس وقت انصار کیا سوچ رہے ہیں پہلے مہاجرین نے اپنی بات کہی اور بہت اچھی طرح آپ کو اپنی حمایت کا یقین دلایا آپ نے دوبارہ مشورہ کیا مہاجرین نے پھر آپ کی تائید کی پھر جب تیسری بار آپ نے دریافت فرمایا تو انصار کو احساس ہوا کہ آپ کا روئے سخن انصار کی طرف ہے چنانچہ سعد بن معاذؓ نے فوراً اس کا جواب دیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ شاید آپ کا روئے سخن ہم لوگوں کی طرف ہے اور آپ ہماری بات سننا چاہتے ہیں یا رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) شاید آپ کو یہ خیال ہو رہا ہے کہ انصار نے صرف اپنے وطن اور اپنی سرزمین میں آپ کی نصرت کا ذمہ لیا ہے میں انصار کی طرف سے عرض کرتا ہوں اور ان کی جانب سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ آپ جہاں چاہیں روانہ ہوں جس سے چاہیں تعلق فرمائیں اور جس سے چاہیں ختم کریں ہمارے مال و دولت میں سے جتنا چاہیں لیں اور ہم کو جتنا پسند ہو عطا فرمائیں اس لئے کہ آپ جو کچھ لیں گے وہ ہم کو اس سے کہیں زیادہ محبوب ہوگا جو آپ چھوڑ دیں گے آپ کوئی حکم دیں گے تو ہماری رائے آپ کے تابع فرمان ہوگی خدا کی قسم اگر آپ چلنا شروع کریں یہاں تک کہ برک غمدان[1]

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۴۲ سیرت ابن ہشام میں برک غمدان کے بجائے برک الغماد کا لفظ (باقی حاشیہ ص پر)

تک پہنچ جائیں تب بھی ہم آپ کے ساتھ چلتے رہیں گے، اور خدا کی قسم اگر آپ سمندر میں داخل ہو جائیں گے تو ہم بھی آپ کے ساتھ اس میں کود جائیں گے۔

مقداد نے کہا ہم آپ سے ایسا نہیں کہیں گے جیسا موسیٰ کی قوم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ ۱؎ (جاؤ تم اور تمہارا رب دونوں مل کر جنگ کرو ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے) ہم تو آپ کے دائیں بائیں سے اور بائیں لڑیں گے آپ کے سامنے آ کر لڑیں گے اور آپ کے پیچھے لڑیں گے۔

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ گفتگو سنی تو روئے انور خوشی سے دمکنے لگا اور آپ کو اپنے صحابہ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر بڑی مسرت ہوئی، آپ نے فرمایا "سیروا وابشروا" ۲؎ (چلو اور بشارت حاصل کرو)۔

لڑکوں میں جہاد وشہادت کا شوق

جب مجاہدین میدان بدر کی طرف روانہ ہوئے تو ایک صاحبزادے جن کا نام عمیر بن ابی وقاص ۳؎ تھا اور جن کی عمر سولہ سال تھی مجاہدین کے ساتھ روانہ ہوئے

(باقی صفحہ ۲۸۱ کا) آباد ہے یمن کے علاقہ میں ایک مقام کا نام ہے ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ ہجر (بلاد ثمود) کا ایک دور دراز حصہ ہے سہیلی (سیرت ابن ہشام کے شارح) کہتے ہیں کہ میں نے تفسیر کی بعض کتابوں میں دیکھا ہے کہ وہ حبشہ کا شہر ہے بہرحال وہ کوئی ایسا مقام تھا جو مدینہ طیبہ سے بہت دور پڑتا تھا اور بُعد مسافت کے لئے ضرب المثل کی حیثیت رکھتا تھا، جیسے ہماری زبان میں کالے کوسوں یا کالا پانی مسافت و دوری کے لئے بولتے ہیں

۱؎ پ ۶ سورۃ المائدہ ۲۴ ۲؎ زاد المعاد ج ۱ ص ۳۴۲-۳۴۳ ۳؎ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۶۱۵ باختلاف بعض الفاظ، بخاری نے بھی کتاب التفسیر اور کتاب المغازی میں اور مسلم نے غزوۂ بدر کے باب میں باختصار یہ روایت نقل کی ہے

ان کو ڈر تھا کہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کو چھوٹا سمجھ کر واپس نہ فرما دیں چنانچہ وہ آپ کی نگاہ سے بچ رہے تھے ان کے بڑے بھائی سعد بن ابی وقاص نے ان سے چھپنے کی وجہ دریافت کی تو عمیرؓ نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مجھے کمسن سمجھ کر واپس نہ لوٹا دیں میں اس جہاد میں شریک ہونا چاہتا ہوں شاید اللہ تعالیٰ مجھے بھی شہادت نصیب فرمائے ان کو جس کا ڈر تھا یہی ہوا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس خیال سے کہ وہ ابھی جنگ کی عمر کو نہیں پہونچے ہیں ان کو واپس کرنا چاہا تو وہ رونے لگے یہ دیکھ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اثر پڑا اور آپ نے انھیں شرکت کی اجازت دے دی چنانچہ انھوں نے اسی معرکہ میں جام شہادت نوش کیا اور اپنی مراد کو پہونچے[1]

مسلمانوں اور کافروں کی جنگی طاقت کا زبردست فرق

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تیزی کے ساتھ میدان جنگ کی طرف روانہ ہوئے آپ کی ہمرکابی میں صرف تین سو تیرہ مسلمان تھے سامان جنگ کی قلت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مجاہدین اسلام کے پاس صرف دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے ایک ایک اونٹ پر دو دو تین تین آدمی باری باری سے بیٹھتے تھے[2] اس میں بلا لحاظ عام سپاہی اور افسر و ماتحت کی کوئی تفریق نہ تھی اس نظام میں خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور اجلّہ صحابہ سب شریک تھے۔

---

[1] دیکھئے اسد الغابۃ ج ۴ ص ۱۴۸ [2] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۴۲

عمومی پرچم جہاد (اللّٰہ) مُصعب بن عمیرؓ کو مہاجرین کا پرچم (رایۃ)
حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور انصار کا پرچم سعد بن معاذؓ کو عطا ہوا۔

جب ابوسفیان کو یہ اطلاع ملی کہ لشکرِ اسلامی روانہ ہو چکا ہے تو وہ نیچے ساحلِ سمندر کی طرف آ گیا اور یہ اطمینان کر کے کہ اب اس کو کوئی خطرہ نہیں ہے اور قافلہ بھی محفوظ ہے قریش کو یہ پیغام بھیجا کہ تم لوگ واپس لوٹ جاؤ اس لئے کہ تم قافلہ کی حفاظت کے لئے آئے تھے اور یہ مقصد حاصل ہو چکا ہے۔ یہ سن کر ان لوگوں نے واپس جانے کا ارادہ کیا لیکن ابوجہل کی ضد نے ان کو واپس جانے سے روک دیا۔ وہ اس پر کسی طرح تیار نہ ہوا کہ بغیر جنگ کئے واپس چلا جائے۔[1] قریش کے لشکر کی تعداد ایک ہزار سے اوپر تھی، اور اس میں گن گن کے تمام بڑے سردار، جنگ جُو نوجوان، مانے ہوئے شہسوار اور آزمودہ کار سپاہی شامل تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ مکہ نے آج اپنے سب جگر کے ٹکڑوں کو تمہارے سامنے ڈال دیا ہے۔

مشورہ کی اہمیت

قریش کے لشکر نے بدر پہنچ کر وادی کے ایک طرف پڑاؤ ڈالا۔ مسلمانوں نے دوسری طرف۔ اسی درمیان میں حُباب بن المنذرؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! کیا اس منزل پر ہمارا پڑاؤ اللہ تعالےٰ کے حکم سے ہے جس میں کوئی ردّ و بدل ہمارے لئے جائز نہیں یا اس کا تعلق

---

[1] زاد المعاد ج ۱ صفحہ ۳۴۳ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۶۱۸-۶۱۹

جنگی حکمت عملی اور تدبیر و انتظام سے ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں بہ تدبیر و حکمت کی بات ہے اور اس میں دشمن کو دھوکہ میں ڈالنے کی تمام چیزیں اختیار کی جا سکتی ہیں،
انھوں نے کہا یا رسول اللہ پھر میں عرض کروں گا کہ یہاں پڑاؤ اس نقطۂ نظر سے مناسب نہیں ہے؛ انھوں نے ایک دوسرے مقام کی نشان دہی کی جو جنگ کے لئے زیادہ موزوں اور سازگار تھا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے معقول بات کہی، اس کے بعد آپ اپنے تمام آدمیوں کے ساتھ اس مقام کی طرف چلے اور اس جگہ قیام کیا جو پانی سے قریب ترین تھی[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رات تک سب سے پہلے پانی کے پاس پہونچ گئے اور اس کے حوض تیار کر لئے، آپ نے کفار کو بھی اس سے پانی پینے کی اجازت دی[2]
اس رات کو اللہ تعالےٰ نے بارش کا انتظام بھی کر دیا جو کفار و مشرکین کے لئے تو بہت تنگی پڑی اور ان کی پیش قدمی رک گئی مسلمانوں کے لئے یہ رحمت کی بارش ثابت ہوئی جس نے ریت کو دبا دیا اور فضا ان کے حق میں خوش گوار اور سازگار کر دی، اور ان کے دلوں کو سکون و اطمینان نصیب فرمایا، اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:-

وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ	اور تم پر آسمان سے پانی برسا دیا تاکہ
مَاءً لِيُطَهِّرَكُمْ بِهِ وَيُذْهِبَ	تم کو اس سے (نہلا کر) پاک کر دے اور
عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ	شیطانی نجاست کو تم سے دور کر دے
عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ	اور اس لئے بھی کہ تمہارے دلوں کو
الْأَقْدَامَ ۝ (سورۂ انفال - ۱۱)	مضبوط کر دے اور اس سے تمہارے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۶۲۰   [2] ایضاً صفحہ ۶۲۲ باختصار۔

پاؤں جمائے رکھے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بحیثیت سپہ سالار

اس موقع پر آپ کی غیر معمولی اور بے مثال قائدانہ قابلیت (آپ کی ابدی وعالمگیر رسالت کے ساتھ جو اس سب کی بنیاد اور سرچشمۂ الہام و ہدایت ہے) پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ ریز تھی، آپ کی حکیمانہ صف بندی اور تنظیم، خطرات اور اچانک حملوں کے سد باب کی تدبیر، دشمن کی جنگی طاقت اس کی نفری، اس کے پڑاؤ اور مختلف دستوں کی تعیناتی کا صحیح اندازہ، یہ وہ چیزیں ہیں جن سے آپ کی غیر معمولی جنگی عبقریت کا اندازہ ہوتا ہے، اور اس کی ضروری تفصیلات سیرت کی کتابوں میں بیان کی گئی ہیں۔[1]

جنگ کی تیاری

آپ کے لئے ایک جگہ جو میدان جنگ کے سامنے ایک ٹیلہ پر تھی چھپر ڈال دیا گیا، اس کے بعد آپ میدان میں تشریف لے گئے اور جگہ جگہ اپنے دست مبارک کے اشارے سے فرماتے رہے کہ انشاء اللہ یہاں فلاں آدمی مارا جائے گا، یہاں فلاں آدمی ہلاک ہوگا، اس جگہ فلاں شخص قتل کیا جائے گا، چنانچہ ایک جگہ بھی اس کے خلاف

---

[1] جنگ بدر میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جو دفاعی و حفاظتی اقدامات اور مدبرانہ عسکری انتظامات فرمائے ان کی تفصیل و وضاحت پاکستانی میجر جنرل محمد اکبر خاں کی کتاب "حدیث دفاع" (اردو) میں نیز عراقی جنرل محمود شیت خطاب کی مایہ ناز تصنیف کی کتاب "الرسول القائد" عربی میں کی گئی ہے۔

نہیں ہوا، اور آپ کا فرمانا حرف بحرف صحیح ثابت ہوا، اور اس جگہ میں فرق نہیں پڑا جو جگہ آپ نے متعین فرمائی تھی۔

جب دونوں لشکر آمنے سامنے آکر کھڑے ہوئے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، "اے اللہ یہ قریش کے لوگ آج اپنے پورے غرور و تکبر کے ساتھ آئے ہیں، یہ تجھ سے جنگ پر آمادہ ہیں اور تیرے رسول کو جھوٹا ٹھہرا رہے ہیں۔"

یہ جمعہ کی رات تھی اور رمضان کی سترہ تاریخ، صبح نمودار ہوئی تو قریش اپنے تمام جنگی دستوں کے ساتھ سامنے آچکے تھے، اور دونوں فریق صف آرا تھے۔[1]

بارگاہِ الٰہی میں آہ وزاری اور دعا و مناجات

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صفیں درست فرمائیں پھر عریش میں واپس تشریف لے آئے، آپ کے ساتھ حضرت ابو بکرؓ بھی تھے، اس کے بعد آپ نے اللہ کے حضور میں گریہ وزاری اور دعا و مناجات کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا، آپ خوب جانتے تھے کہ اگر آج مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ تعداد و قوت کے اصول پر ہے تو نتیجہ معلوم ہے، یہ وہی نتیجہ ہے جو ایک طاقت ور اور بڑی جماعت کے مقابلہ میں کمزور اور قلیل التعداد جماعت کے ساتھ ہمیشہ پیش آتا ہے، آپ نے جب ترازو کے دونوں پلڑوں پر نظر کی تو آپ کو مشرکین کا پلڑہ کھلے طور پر بھاری نظر آیا، دونوں میں کوئی تناسب ہی نہ تھا، آپ نے مسلمانوں کے پلڑہ پر وہ پاسنگ رکھ دیا جس سے وہ اچانک بھاری ہو گیا، آپ نے اس مالک الملک اور شہنشاہ برحق کے سامنے اپنی فریاد

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۴۳-۳۴۴

رکھی اور اس سے نصرت وحمایت کے طالب ہوئے جس کے فیصلہ اور حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا، آپ نے اس چھوٹے سے اسلامی لشکر (جو ہر قسم کے ساز وسامان سے محروم تھا) کے حق میں اللہ تعالیٰ سے سفارش فرمائی، آپ نے فرمایا: "اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ لا تعبد بعدھا فی الارض" (اے اللہ! اگر آج تو نے اس مٹھی بھر جماعت کو فنا کر دیا تو پھر روئے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا) آپ بے خود وارفتہ ہو کر اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے تھے، اور یہ فرما رہے تھے کہ "اللھم انجز لی ما وعدتنی، اللھم نصرک" (اے اللہ تو نے مجھ سے جس چیز کا وعدہ کیا ہے، وہ پورا فرما، اے اللہ تیری مدد کی ضرورت ہے) آپ اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا فرما رہے تھے یہاں تک کہ آپ کی چادر شانۂ مبارک سے گر پڑی، حضرت ابو بکرؓ آپ کو تسلی دے رہے تھے اور اطمینان دلا رہے تھے، ان سے آپ کی اتنی زیادہ گریہ وزاری اور بے تابی وبے قراری دیکھی نہیں جاتی تھی۔[1]

امت کا صحیح تعارف اور اس کے اصل مقام وپیغام کا تعین

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چند پاکیزہ نفوس کے لئے اس نازک لمحہ

---

[1] دیکھئے زاد المعاد اور سیرت کی دوسری کتب، امام مسلم نے کتاب الجہاد والسیر میں یہ روایت حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی زبان سے بیان کی ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں جب بدر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تین سو انیس اصحاب کرام اور سرفروشان اسلام کے ساتھ میدان جنگ کا رخ کیا تو آپ قبلہ رخ ہو گئے اور اپنے ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دعا شروع کی کہ اے اللہ تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا فرما، جو تو نے وعدہ کیا تھا وہ مجھے عطا فرما، اے اللہ اگر اہل اسلام کی یہ مختصر سی جماعت آج ختم ہو جاتی ہے تو روئے زمین پر پھر تیری کوئی عبادت کرنے والا نہ ہوگا۔ (باب الامداد بالملائکۃ فی غزوۃ بدر)

میں جن مختصر الفاظ کے ساتھ دعا کی اس میں آپ کا ناز و اعتماد، اضطراب و بے قراری اطمینان قلب اور سکینت اور عجز و احتیاج کے تمام پہلو بیک وقت جلوہ گر تھے، یہ اس امت کا بہترین و صحیح تعارف اقوام عالم میں اس کے اصل مقام و پیغام اور دنیا کے بازار میں اس کی قیمت افادیت اور ضرورت کی پوری وضاحت و تعیین کے ساتھ نشان دہی تھی اور اس بات کا اظہار و اعلان تھا کہ یہ امت جس سرحد یا محاذ کی حفاظت پر مامور ہے، وہ دعوت الی اللہ اور اخلاص کے ساتھ اس کی عبادت اور کامل اطاعت کا محاذ ہے۔

اس فتح مبین نے (جس نے تمام اندازوں اور تجربات کو غلط ثابت کر دکھایا) آپ کے ان الفاظ پر ہمیشہ کے لئے مہر تصدیق ثبت کر دی اور اس کا عملی ثبوت فراہم کر دیا کہ یہ بات حرف بحرف درست تھی اور اس امت کی صحیح سچی اور بولتی ہوئی تصویر یہی ہے۔

پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لشکر کے سامنے تشریف لائے اور ان کو خدا کے راستہ میں جہاد و شہادت کا شوق دلایا، اسی درمیان میں عتبہ بن ربیعہ اس کا بھائی شیبہ اور اس کا بیٹا ولید سامنے آئے اور درمیان صف میں آ کر کھڑے ہوئے اور مبارز طلبی کی، ان کے جواب میں انصار کے تین نوجوان نکلے، ان کو دیکھ کر انھوں نے پوچھا تم کون لوگ ہو؟

انھوں نے کہا، ہم انصار میں سے ہیں۔

کہنے لگے شریف لوگ ہو لیکن ہمارے جوڑ کے نہیں ہو، ہمارے مقابلہ کے لئے ہمارے چچا زاد بھائیوں (قریش) میں سے کسی کو بھیجو، اس موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، عبیدہ بن الحارث، حمزہ، علی! تم تینوں ان کے مقابلہ کے لئے جاؤ۔

ان کو دیکھ کر انھوں نے کہا ہاں اب برابر کی جوڑی ہے۔

سب سے پہلے حضرت عُبیدہؓ نے جن کی عمران سب سے زیادہ تھی عتبہ کو للکارا حضرت حمزہؓ نے شیبہ کو دعوت مبارزت دی اور حضرت علیؓ نے ولید بن عتبہ سے دُو دُو ہاتھ کیے، حضرت حمزہؓ و حضرت علیؓ نے تو دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں کا کام تمام کر دیا۔ حضرت عبیدہ اور عتبہ میں کچھ ہاتھ ہوئے لیکن کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ حضرت حمزہؓ اور حضرت علی اپنی تلواریں لے کر عتبہ پر حملہ آور ہوئے اور اس کا کام تمام کر کے حضرت عبیدہؓ کو زخمی حالت میں واپس لائے، اور وہ شہادت سے سرخرو ہوئے۔[1]

آغازِ جنگ

اسی وقت دونوں لشکر برسرپیکار ہوگئے اور ایک دوسرے سے بالکل قریب ہو کر جنگ ہونے لگی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چلو بڑھو اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔

پہلا شہید

عُمیر بن الحمام انصاریؓ نے یہ جملہ سنا تو کہنے لگے کہ یا رسول اللہ وہ جنت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں! کہنے لگے واہ واہ! آپ نے فرمایا یہ بات کیا کہہ رہے ہو؟ انھوں نے کہا نہیں یا رسول اللہ اور کوئی بات نہیں یہ میرا خیال ہے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۶۲۵

کہہ رہا ہوں کہ شاید میری قسمت میں بھی یہ جنت ہو۔ آپ نے فرمایا، ہاں ہاں تمھیں یہ جنت نصیب ہوگی۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے ترکش سے کچھ کھجوریں نکالیں اور کھانے لگے پھر اچانک کہنے لگے کہ اگر میں نے ان کھجوروں کے ختم کرنے کا انتظار کیا تو بہت دیر لگا دوں گا۔ اتنا جینے کی تاب نہیں، یہ کہہ کر جو کھجوریں رہ گئی تھیں پھینک دیں اور میدانِ جنگ میں کود پڑے اور شہادت پائی۔ یہ جنگ بدر کے پہلے شہید تھے۔[1]

دوسری طرف مجاہدینِ اسلام صف بستہ اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح لشکرِ کفار کے مقابلہ پر ڈٹے ہوئے تھے۔ صبر و عزیمت کے پیکر، دل یادِ الٰہی میں مشغول اور زبانیں اس کے ذکر و تسبیح میں زمزمہ سنج۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھرپور طریقہ پر جنگ میں حصہ لیا، آپ دشمن سے سب سے زیادہ قریب تھے اور آپ سے زیادہ بہادر اور شجاع اس وقت کوئی دوسرا نظر نہ آتا تھا۔[2] اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد کے لئے فرشتے بھیجے، اور انھوں نے مشرکین کو تہس نہس کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ	جب تمھارا پروردگار فرشتوں کو
أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ	ارشاد فرماتا تھا کہ میں تمھارے
آمَنُوا سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ	ساتھ ہوں، تم مومنوں کو تسلی
الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ	دو کہ ثابت قدم رہیں، میں ابھی ابھی
فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ	کافروں کے دلوں میں رعب اور
وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ	ہیبت ڈالے دیتا ہوں تم بھی

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۴۳ سیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۴۲۱ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۲۴۶

بَنَانٍ ۝ ان کے سر اڑا دو اور
(سورۂ انفال ۔۱۲) ان کا پور پور (کر ٹکڑے) کر دو۔

شوقِ جہاد اور ذوقِ شہادت میں بھائیوں کا مقابلہ اور رسہ کشی

اس شہادت اور سعادت سے بہرہ مند و سرفراز ہونے میں آج سگے بھائیوں اور جگری دوستوں میں بھی مقابلہ اور رسہ کشی ہو رہی تھی۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں معرکۂ بدر میں اپنے دستہ میں تھا کہ اچانک میری نگاہ اٹھی میں نے دیکھا کہ میرے دائیں اور بائیں دو کمسن نوجوان ہیں ان دو نوجوانوں کو اپنے دائیں بائیں دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان نہ ہوا[1] ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے چھپاتے ہوئے میرے کان میں چپکے سے کہا چچا مجھے ذرا ابوجہل کو دکھا دیجئے! میں نے کہا کہ بھتیجے اس سے کیا مطلب ہے؟ انھوں نے کہا کہ میں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ جہاں کہیں بھی اس کو دیکھ لوں گا اس کو ضرور ٹھکانے لگاؤں گا یا اپنی جان دے دوں گا، دوسرے نے بھی میرے کان میں چپکے سے یہی بات کہی، حضرت عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں نے ابوجہل کی طرف اشارہ ہی کیا تھا کہ دونوں عقاب کی طرح اس پر جھپٹے اور اس کو وہیں ڈھیر کر دیا، یہ دونوں جانباز عفراء کے چشم و چراغ تھے۔[2]

جب ابوجہل ہلاک ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوجہل یہ اس امت کا فرعون تھا۔[3]

---

[1] کہا اگر کوئی نازک وقت آیا تو یہ دو کم عمر نوجوان میری کیا مدد کر سکیں گے۔ [2] صحیحین، یہ الفاظ صحیح بخاری کے ہیں (کتاب المغازی) باب قتل ابی جہل [3] سیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۴۲۲

فتح مبین

یہ جنگ مسلمانوں کی فتح مبین اور مشرکین و کفار کی ذلت آمیز شکست پر ختم ہوئی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اللہ اکبر الحمد للہ الذی صدق وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ" (خدا کا شکر ہے جس نے اپنا وعدہ پورا کیا اپنے بندہ کی مدد فرمائی اور تنہا ساری قوتوں اور گروہوں کو شکست دی)

قرآن مجید نے اس کیفیت کی ترجمانی اس آیت میں کی ہے:۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ	اور خدا نے جنگ بدر میں بھی تمہاری
وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ	مدد کی تھی اور اس وقت بھی تم
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○	بے سروسامان تھے پس خدا سے ڈرو
(سورہ آل عمران ۔ ۱۲۳)	(اور ان احسانوں کو یاد کرو) تاکہ شکر کرو۔

آپ نے حکم دیا کہ کفار کے سارے مقتولین اسی اندھے کنویں میں ڈال دیئے جائیں جو وہاں تھا وہ سب اس میں پھینک دیئے گئے۔ آپ وہاں تشریف لے گئے اور اوپر کھڑے ہو کر فرمایا اے کنویں والو کیا تم کو تمہارے رب کا کہنا سچ نظر آیا؟ میں نے تو اپنے رب کا وعدہ بالکل حق پایا ہے۔

اس جنگ میں کفار کے ستر چیدہ نامی گرامی سردار مارے گئے اور ستر ہی قیدی بنائے گئے[1]

مسلمانوں میں قریش کے چھ اور انصار کے آٹھ آدمی شہید ہوئے[2]

---

۱ صحیح بخاری بروایت براء بن عازبؓ (غزوۂ بدر کتاب المغازی) ۲ سیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۳۲۲

جنگِ بدر کے اثرات و نتائج

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مظفر و منصور مدینہ واپس تشریف لائے۔ مدینہ اور اس کے اطراف میں آپ کے دشمنوں پر اس فتح کے بعد آپ کا رعب و دبدبہ قائم ہو گیا اور بہت بڑی تعداد میں اہلِ مدینہ اسلام لے آئے۔

اس سے پہلے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ نویدِ مسرت سنانے کے لئے جن دو خاص نمائندوں کو شہر بھیجا ان میں عبد اللہ بن رواحہ بھی تھے۔ وہ مدینہ والوں کو خوش خبری دیتے اور کہتے جاتے کہ گروہِ انصار! رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی وسلامتی اور کفار کا قتل اور گرفتاری تمہیں مبارک ہو۔ قریش کے جو سردار اور جنگی قائد اس میں مارے گئے وہ ان میں سے ایک ایک کے نام کا اعلان کرتے اور گھر گھر جا کر یہ مژدہ سناتے۔ بچے ان کے ساتھ سرور و شوق میں مختلف اشعار پڑھتے اور ترانے گاتے کچھ لوگوں میں کسی کو اس خبر کی صداقت پر یقین تھا کسی کو تردد کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس مدینہ تشریف لے آئے۔ اس کے بعد قیدیوں کو لایا گیا۔ ان کے نگران رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے غلام "شقران رضی اللہ عنہ" تھے۔ جب آپ "روحا" پہونچے تو مسلمانوں نے آگے بڑھ کر آپ کا استقبال کیا، اور آپ کو اور آپ کے ساتھ جو مسلمان تھے ان کو اللہ تعالےٰ نے جو فتح نصیب فرمائی، اس کی مبارکباد پیش کی۔

مشرکینِ مکہ کے گھروں میں صفِ ماتم بچھ گئی اور مقتولین پر نوحہ و ماتم شروع ہو گیا۔ دشمنانِ اسلام کے دلوں میں رعب بیٹھ گیا۔ ابو سفیان نے نذر مانی کہ جب تک رسول اللہ

---

۱ سیرت ابن کثیر ج ۲ صفحہ ۴۷۴-۴۷۷ ۲ سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۶۴۳-۶۴۸

صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے اس کی دوبارہ جنگ نہیں ہوگی، اس وقت تک وہ اپنے سر پہ پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ڈالے گا، مکہ کے کمزور اور دبے ہوئے مسلمانوں نے اس سے اطمینان کی سانس لی اور انھوں نے اپنے اندر طاقت اور عزت محسوس کی۔

ایمان کا رشتہ خون کے رشتہ سے بالاتر

اس جنگ میں ابوعزیز بن عُمیر بن ہاشم بھی قیدی بنا کر لائے گئے، یہ مصعب بن عُمیرؓ کے سگے بھائی اور ایک ماں باپ کی اولاد تھے، مُصعب بن عُمیرؓ مسلمانوں کے پرچم بردار تھے اور ان کے بھائی لشکر کفار کے پرچم بردار۔

واقعہ یہ پیش آیا کہ جب مُصعبؓ ان کے پاس سے گزرے تو اس وقت ایک انصاری ان کے ہاتھ باندھ رہے تھے، مُصعبؓ نے انصاری سے کہا کہ ذرا اچھی طرح کسنا، اس کی ماں بڑی مالدار ہے، اس سے فدیہ کی اچھی رقم ہاتھ آنے کی امید ہے، ابوعزیز نے یہ سن کر اپنے بھائی مصعب کی طرف رُخ کر کے کہا کہ بھائی تم (بھائی ہو کر) یہ صلاح دے رہے ہو؟ مصعب بن عُمیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم میرے بھائی نہیں، میرا بھائی وہ ہے جو تمہاری مشکیں کس رہا ہے۔[1]

مسلمانوں نے قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کے ساتھ اچھا معاملہ کرنے کی نصیحت فرمائی اور ارشاد ہوا کہ [استوصوا بھم خیراً] (ان سے اچھا معاملہ کرنا)

---

[1] سیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۴۷۵

یہی ابو عزیز بیان کرتے ہیں کہ جب وہ مجھے بدر سے قیدی بنا کر لے گئے تو مجھے انصار کے ایک خاندان میں چھوڑ گئے وہ دونوں وقت اپنے کھانوں میں سے روٹی تو مجھے دیتے اور خود کھجور پر اکتفا کرتے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اسی نصیحت ہدایت کا اثر تھا کہ کسی کو بھی روٹی کا ایک ٹکڑا بھی مل جاتا تو مجھے لا کر دیتا مجھے شرم محسوس ہوتی اور میں اسے لوٹا دیتا لیکن وہ پھر بھی مجھے دیتا اور خود اسے ہاتھ بھی نہ لگاتا۔[۱]

انہیں قیدیوں میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا عباس بن عبد المطلب، اور آپ کے چچا زاد بھائی عقیل بن ابی طالب[۲] آپ کی صاحبزادی حضرت زینب کے شوہر ابو العاص بن الربیع بھی تھے ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا گیا جو معاملہ عام قیدیوں کے ساتھ تھا، وہی ان کے ساتھ بھی تھا۔

بچوں کی تعلیم کے معاوضہ میں قیدیوں کی رہائی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان قیدیوں سے عفو و درگذر کا معاملہ فرمایا اور ان کا فدیہ قبول کیا جو جتنا دولت مند ہوتا یہ فدیہ اسی کے بقدر اس سے لیا جاتا جس کے پاس دینے کے لئے کچھ نہ ہوتا آپ اس کو اپنی طرف سے رہائی کا حکم فرماتے[۳] غرض قریش نے اپنے بہت سے قیدی فدیہ دیکر آزاد کرائے۔

کچھ ایسے قیدی بھی تھے جن کا فدیہ نہیں ہو سکا، ان کا فدیہ آپ نے یہ تجویز کیا کہ وہ انصار کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں[۴] ایک قیدی پر دس مسلمانوں کی تعلیم ضروری قرار دی گئی[۵] زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اسی طریقہ سے تعلیم حاصل کی تھی اس حکم میں علم کی جتنی قدر دانی اور تعلیم کی جو ہمت افزائی مضمر ہے اس کی توضیح کی شاید ضرورت نہیں۔

۱؎ سیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۴۷۵ ۲؎ سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳ ۳؎ مسند احمد ج ۱ ص ۲۴۷ ۴؎ طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۴

دوسرے غزوات و سرایا

ابوسفیان نے جب [illegible] اور بگڑا تو یہ قسم کھائی تھی کہ جب تک مسلمانوں سے بدلہ نہیں لیا جائیگا
اس وقت تک وہ اپنے سر پر پانی کا ایک قطرہ نہ پڑنے دیں گے وہ اپنی قسم پوری کرنے کے لیے قریش
کے دو سو سواروں کے ساتھ حملہ کی نیت سے نکلے بنی النضیر کے سردار سلام بن مشکم سے اجازت
چاہی انھوں نے نہ صرف اجازت دی بلکہ ان کی خوب ضیافت و مہمان نوازی کی اور
مدینہ کے حالات سے مطلع کیا اور کچھ لوگوں کو بھیجا جنھوں نے انصار کے دو آدمیوں کو شہید کر دیا۔
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ ان کے تعاقب میں نکلے لیکن
ابوسفیان اور ان کے ہمراہی مسلمانوں کے پہونچنے سے پہلے نکل بھاگے اور اپنے پیچھے بہت بڑی مقدار
میں غلہ اور اجناس جن میں زیادہ تر ستو تھے چھوڑ گئے[2] اسی لئے اس کو غزوہ سویق بھی کہا جاتا ہے[1]

بنی قینقاع کے ساتھ معاملہ

بنو قینقاع پہلے یہودی تھے جنھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے معاہدہ کو
توڑا آپ سے جنگ کی مسلمانوں کو اذیت پہونچائی چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے
ان کا محاصرہ کر لیا اور پندرہ راتیں اسی حال میں گزار دیں یہاں تک کہ انھوں نے اپنا سر
جھکا دیا اور آپ کے فیصلہ پر راضی ہو گئے۔ ان کے حلیف عبد اللہ بن اُبی اور اس کے منافقین
نے آپ کی خدمت میں ان کی سفارش کی چنانچہ ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کا
لحاظ کر کے محاصرہ اٹھا لیا[4] یہ سات سو جنگ جو تھے اور زیادہ تر سناری لوہاری کا پیشہ کرتے تھے[3]

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۴۴-۴۵ [2] عربی میں ستو کو سویق کہتے ہیں [3] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۷

[4] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۴۸

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان یہود کے لئے اس شرط پر عفو عام کا حکم دے دیا،
کہ وہ مدینہ سے نکل کر کہیں بھی چلے جائیں۔ چنانچہ ان میں سے بہت سے اطمینان کے
ساتھ شام چلے گئے اور منقولہ سامان بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ بنو قینقاع اپنے تمرد و بدعہدی
کی وجہ سے سزائے موت کے منتظر تھے مگر وہ بھی سلامتی کے ساتھ یثرب سے چلے گئے۔[1]

کعب بن الاشرف بھی جو یہودیوں کا بڑا سردار تھا آپ کو برابر تکلیفیں پہنچاتا
رہتا تھا اور مسلمان شریف زادیوں کے بارے میں غزلیہ اشعار کہتا تھا۔ جنگ بدر کے بعد
اس نے مکہ میں جا کر کفار کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا
شروع کیا۔ اسی حال میں وہ مدینہ پہونچا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی آمد کی
خبر پا کر فرمایا: کعب بن الاشرف نے اللہ اور اس کے رسول کو بہت تکلیف پہونچائی ہے
اس کا کوئی انتظام کر سکتا ہے؟ انصار کے کچھ لوگ یہ خدمت انجام دینے کے لئے
اسی وقت کھڑے ہو گئے اور اس کا خاتمہ کر دیا۔[2]

---

[1] ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام ج ۲ ص [illegible] W. MONTGOMERY WATT اپنی کتاب "MOHAMMAD PROPHET AND STATESMAN" میں لکھتا ہے۔

"بنو قینقاع کا اخراج ایک اہم عامل تھا جس نے آنحضرت کے مرکز کو مضبوط کیا، ابن اسحاق کا سبب
بتاتے ہیں بنو قینقاع اور بعض مسلم [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
وہ مزید لکھتا ہے [illegible] یہود اور اپنے حریف قریش مکہ کے درمیان دوستانہ تعلقات کا بھی علم
ہوگا جو مسلمانوں اور یہود کے درمیان معاہدہ کی روح کے خلاف سمجھے گئے۔"
تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "غزوۂ بنی قینقاع" از استاذ محمد احمد باشمیل۔

[2] زاد المعاد ج ۲ ص [illegible] اختصار کے ساتھ۔

غزوۂ اُحُد

(شوال ۳ھ)

جاہلی حمیّت اور جذبۂ انتقام

جنگِ بدر میں جب قریش کے بڑے بڑے سردار مارے گئے اور باقی ماندہ فوج نے منتشر ہو کر مکّہ کی طرف راہِ فرار اختیار کی تو اس کا مکہ والوں پر بہت بُرا اثر پڑا، یہ واقعہ ان کے لئے ایک عظیم سانحہ سے کم نہ تھا چنانچہ وہ سب لوگ جن کے باپ بیٹے اور بھائی مارے گئے تھے جمع ہو کر ابو سفیان کے پاس گئے، اور اسی طرح قریش کے اس قافلہ میں جن لوگوں کا حصہ تھا ان لوگوں سے بھی اس معاملہ میں مشورہ کیا اور انھیں کے روپیہ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک نئی جنگ کی تیاری شروع کی شاعروں نے ان کو حسبِ معمول غیرت دلانی شروع کی اور ان کی حمیّتِ جاہلیت کو ابھارا۔

ہجرت کے تیسرے سال ماہ شوال کے وسط میں قریش کا لشکر اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ روانہ ہوا، قریش کے ان نوجوانوں کے ساتھ دوسرے قبائل کے لوگ بھی تھے، جو قریش کو اپنا سردار تسلیم کرتے تھے، ان کے ساتھ عورتیں بھی تھیں جو اپنے محمل میں لشکر کے ساتھ اس غرض سے بھیجی گئی تھیں کہ مردوں کی وجہ سے راہِ فرار نہ اختیار کر سکیں[1]

---

[1] ابن ہشام ج ۲ ص ۶۰-۶۲

قریش کے سترہ اپنی بیویوں کے ساتھ تھے غرض یہ لشکر روانہ ہوا اور اس نے مدینہ کے سامنے پڑاؤ ڈالا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ رائے تھی کہ مسلمان مدینہ میں ہی رہیں اور ان لوگوں سے کوئی تعرض نہ کریں اگر وہ خود حملہ کریں تو ان سے قتال کریں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم شہر چھوڑ کر اور باہر نکل کر ان سے مقابلہ پسند نہیں فرما رہے تھے عبداللہ بن اُبَی کی بھی رائے وہی تھی جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تھی لیکن بعض ان مسلمانوں نے جو بدر کی جنگ میں شریک نہیں ہو سکے تھے اور ان کو اس کی حسرت رہ گئی تھی یہ کہا کہ یا رسول اللہ آپ باہر نکل کر دشمنوں کا مقابلہ کریں کہیں ان کو یہ محسوس نہ ہو کہ ہم بزدلی اور کمزوری کی وجہ سے باہر نہیں نکل رہے ہیں یہ لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جب اسی قسم کی باتیں کر رہے تھے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دولت کدہ میں تشریف لے گئے اور زرہ پہن کر باہر تشریف لائے اس وقت ان لوگوں کو جو باہر نکل کر مقابلہ کے داعی تھے ندامت ہوئی انھوں نے کہا یا رسول اللہ ہم نے آپ کو آپ کی مرضی کے خلاف اس کام پر آمادہ کیا ہے جو ہمیں نہیں کرنا چاہیے اگر آپ چاہیں تو تشریف رکھیں اور یہیں رہ کر مقابلہ فرمائیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ مسلح ہونے کے بعد جنگ سے پہلے ہتھیار رکھ دے[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک ہزار صحابیوں کے ساتھ مقابلہ کے لئے تشریف لے چلے مدینہ سے کچھ دور پہنچے تھے کہ عبداللہ بن اُبی ایک تہائی آدمیوں کے ساتھ آپ کو چھوڑ کر واپس چلا گیا اس نے کہا کہ میری بات تو انھوں نے ٹھکرا دی اور نوجوانوں کی بات مان لی[2]

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۲ [2] ایضاً ص ۲۳

اُحُد کے دامن میں

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پیش قدمی کرکے اور پہاڑ کے دامن میں (جو مدینہ منورہ سے تین کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے) پڑاؤ ڈالا۔ آپ نے اپنی پشت اُحُد کی طرف کی اور لشکر کو بھی اسی حساب سے تعینات کیا۔[1] اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا کہ جب تک میں حکم نہ دوں کوئی جنگ کا آغاز نہ کرے پھر آپ نے جنگ کی باضابطہ تیاری فرمائی آپ کے ہمراہ اس وقت سات سو آدمی تھے تیر اندازوں پر آپ نے عبد اللہ بن جُبیرؓ کو مامور کیا ان کی تعداد پچاس تھی ان کو آپ نے صراحت کے ساتھ یہ حکم دیا کہ وہ تیر اندازی کے ذریعہ گھوڑ سواروں کی پیش قدمی روکیں اور اس کا خیال رکھیں کہ وہ ہماری پشت پر نہ آجائیں، خواہ جنگ کا پانسہ ہمارے حق میں ہو یا ہمارے خلاف ہو۔[2] آپ نے ان کو یہ بھی ہدایت کی کہ وہ اپنی پوزیشن کسی حالت میں نہ چھوڑیں اور اس جگہ سے ہرگز نہ ہٹیں خواہ چڑیاں مسلمانوں کے لشکر کو اچک لے جائیں۔[3]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر دوہری زرہ پہنی اور اسلامی لشکر کا پرچم مصعب بن عمیرؓ کو عطا فرمایا۔

ہم عمروں میں مقابلہ اور مسابقت

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احد میں کچھ نوعمر لڑکوں کو ان کی کم عمری

---

[1] میدان جنگ کی صحیح پوزیشن اور جنگی حکمت عملی کو سمجھنے کے لئے ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب حیدرآبادی حال مقیم پیرس کی کتاب "عہد نبوی کے میدان جنگ" کا مطالعہ کیا جائے۔ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۶۵ [3] زاد المعاد ج ۱ ص ۲۲۴ نیز صحیح بخاری باب "غزوۂ احد" کتاب المغازی۔

کی وجہ سے واپس فرما دیا تھا ان میں سمرہ بن جندبؓ اور رافع بن خدیجؓ بھی تھے ان دونوں کی عمریں پندرہ پندرہ سال سے زیادہ نہ تھیں۔ رافعؓ کے والد نے اپنے لڑکے کی سفارش کرتے ہوئے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرا لڑکا رافع بڑا تیر انداز ہے آپ نے ان کی سفارش قبول فرمائی اور ان کو اس غزوہ میں شرکت کی اجازت دے دی، پھر سمرہ بن جندبؓ آپ کے سامنے پیش کئے گئے یہ بھی رافعؓ کے ہم سن تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی واپس فرما دیا۔ سمرہؓ نے عرض کیا کہ حضور آپ نے رافعؓ کو اجازت دے دی اور مجھے واپس فرما دیا حالانکہ اگر میری اُن سے کشتی ہو تو میں ان کو پچھاڑ سکتا ہوں۔ دونوں میں کشتی ہوئی اور سمرہ نے رافع کو چت کر دیا اور اس طرح ان کو بھی غزوۂ احد میں شرکت کی اجازت مل گئی۔[1]

لڑائی کا آغاز

لڑائی شروع ہوئی اور دونوں فریق ایک دوسرے سے گتھ گئے ہند بنت عتبہ عورتوں میں موجود تھی۔ عورتیں دف بجا بجا کر مردوں کو جنگ پر آمادہ کر رہی تھیں یہاں تک کہ جنگ اپنے پورے شباب پر پہنچ گئی۔ ابودجانہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے تلوار لے کر میدانِ جنگ میں گھس گئے۔ جو کوئی ان کے سامنے آتا ان کی تلوار سے بچ کر نہ جاتا۔[2]

یہ ہفتہ کے روز ۷ شوال سنہ ۳ھ کا واقعہ ہے۔

حضرت حمزہ اور مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہما کی شہادت

حضرت حمزہؓ نے بھی اس لڑائی میں اپنی شجاعت کے خوب جوہر دکھائے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ صـ۶۶ [2] ایضاً صـ۶۷-۶۸

اور بڑے بڑے سرداروں کو موت کے گھاٹ اتارا کسی کو ان کے سامنے ٹھہرنے کی طاقت نہ تھی لیکن جبیر بن مطعم کا غلام وحشی ان کی گھات میں تھا وہ بھالا پھینک کر اپنے مقابل کو ختم کرنے میں خاص مہارت رکھتا تھا، جبیر نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ حمزہ کو قتل کر دے گا تو اس کو اس کے انعام میں آزاد کر دے گا، اس کا چچا طعیمہ جنگ بدر میں مارا گیا تھا اور اس کا ملال بھی اس کے دل میں تھا، دوسری طرف ہند اس کو حضرت حمزہؓ کے قتل پر اکسا رہی تھی، وہ ان کی شہادت سے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرنا چاہتی تھی، وحشی نے اپنا بھالا تان کر پوری طاقت سے حضرت حمزہؓ پر حملہ کیا، وہ ان کی ناف سے پار نکل گیا حضرت حمزہ تڑپ کر گرے اور جان بحق تسلیم ہوئے[1] مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سینہ سپر ہو کر لڑتے رہے اور آپ پر قربان ہوگئے، مسلمانوں نے اس غزوہ میں سرفروشی و جاں بازی کا حق ادا کر دیا اور راہ حق کی ہر آزمائش پر پورے اترے[2]۔

مسلمانوں کا غلبہ

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے مدد نازل فرمائی اور اپنا وعدہ پورا فرمایا، مشرکین و کفار کو سخت ہزیمت اٹھانی پڑی اور ان کی عورتوں نے جو مردوں کو غیرت دلانے آئی تھیں راہ فرار اختیار کی، وہ اپنے پائنچے اٹھا اٹھا کر بھاگتی نظر آ رہی تھیں[3]۔

مسلمانوں کے خلاف جنگ کا پانسہ کیسے پلٹا؟

جب مشرکین شکست کھا کر بھاگنے لگے اور اب ان کی عورتوں کی بھی باری

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۷۰-۷۲، یہ پورا واقعہ خود وحشی کی زبان سے صحیح بخاری میں نقل کیا گیا ہے دیکھئے غزوۂ احد باب قتل حمزہ رضی اللہ عنہ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۷۳ [3] ایضاً ص ۷۷

آ گئی تو تیر اندازوں نے یہ دیکھ کر اپنی پوزیشن چھوڑ دی اور لشکر سے آملے ان کو فتح کا پورا یقین تھا وہاں پہونچ کر انھوں نے نعرہ لگایا مالِ غنیمت! مالِ غنیمت! اس موقع پر ان کے امیر نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا عہد ان کو یاد دلایا لیکن اس جوش میں کسی نے ان کی بات نہ سنی اور پورا یقین کرتے ہوئے کہ اب مشرکین کو واپس آنا نہیں ہے یہ محاذ انھوں نے خالی کر دیا اور مسلمانوں کی پشت پر گھوڑ سواروں کی فوج کا راستہ کھل گیا۔[1] مشرکین کے پرچم کو جو لوگ سنبھالے ہوئے تھے مارے گئے، پرچم کے قریب آنے کی کوئی ہمت نہیں کر رہا تھا، اسی وقت مشرکین نے پیچھے آکر آواز لگائی کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) شہید ہو گئے، یہ سن کر مسلمانوں کا لشکر اچانک پیچھے کی طرف مڑا اور مشرکین کو دوبارہ حملہ کرنے کا موقع مل گیا اور اس نازک موقع سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا مسلمانوں کے لئے سخت آزمائش و ابتلاء کا دن تھا، اس درمیان میں دشمن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک پہونچ گئے ان میں عبداللہ بن قمئہ اور عتبہ بن ابی وقاص شقاوت اور اس جسارت میں پیش پیش تھے اس وقت ایک پتھر آپ کے لگا جس سے آپ دائیں پہلو پر غار میں گر گئے، سامنے والا ایک دانت زخمی ہوا، سر مبارک میں زخم آیا، اور لب مبارک خون آلود ہو گئے، خون چہرۂ انور پر بہہ رہا تھا، آپ اس کو پونچھتے جاتے تھے اور فرماتے تھے "وہ قوم کیسے کامیاب ہو سکتی ہے جس نے اپنے نبی کے چہرے کو خون سے تر کر دیا، جو ان کو ان کے رب کی طرف بلاتا تھا"[2]

مسلمانوں کو خبر نہ تھی کہ آپ کس جگہ ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو سہارا دیا اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے آپ کو اٹھایا، چنانچہ آپ کھڑے ہو گئے

---

[1] زاد المعاد ج ۱ صفحہ ۳۵۰   [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۹۰

مالک بن سنانؓ نے اس مبارک لہو کو جس سے آپ کا چہرۂ انور رنگین ہو گیا تھا جوش محبت میں نوش کر لیا۔[1]
یہ دراصل فرار نہ تھا بلکہ جنگی حکمت عملی تھی جو ہر فوج کو بوقت ضرورت اختیار کرنا پڑتی
ہے پھر منتشر کردہ دوبارہ حملہ آور ہوتی ہے مسلمانوں کو اس موقع پر آزمائش کی جو تلخی کا مزہ
چکھنا پڑا اور ان کو جو جانی نقصان ہوا اور متعدد ایسے صحابہ جو اسلام اور مسلمانوں کے لئے
سرچشمۂ قوت اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حامی و پاسبان تھے شہید ہوئے
وہ سب دراصل ان تیر اندازوں کی لغزش اور چوک کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے حضور صلے اللہ
علیہ وسلم کے اس صریح حکم اور ہدایت کی آخری لمحہ تک تعمیل نہ کی اور اپنی اس پوزیشن کو
چھوڑ دیا جہاں ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تعینات فرمایا تھا۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :-

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ	اور خدا نے اپنا وعدہ سچا کر دیا یعنی
اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ حَتّٰٓى اِذَا	اس وقت جب کہ تم کافروں کو اس کے
فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ	حکم سے قتل کر رہے تھے یہاں تک کہ
وَعَصَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ	جو تم چاہتے تھے خدا نے تم کو دکھا دیا
مَّا تُحِبُّوْنَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ	اس کے بعد تم نے ہمت ہار دی اور حکم
الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ	(پیغمبر) میں جھگڑا کرنے لگے اور اس کی
ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ	نافرمانی کی بعض تو تم میں سے دنیا کے
لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ	خواستگار تھے بعض آخرت کے طالب
عَفَا عَنْكُمْ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ	اس وقت خدا نے تم کو ان کے مقابلہ

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ

عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (سورۂ آل عمران - ۱۵۲)

سے پھیر (کر بھگا) دیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے اور اس نے تمھارا قصور معاف کر دیا۔ اور خدا مومنوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔

محبت اور جاں نثاری کی نئی نظیریں

حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ نے خود کی ایک کڑی کو اپنے دانتوں سے پکڑ کر نکالا تو اسی کے ساتھ ان کا ایک دانت بھی گر پڑا، دوسری کڑی نکالی تو دوسرا دانت بھی اس کے ساتھ آگیا۔ ابودجانہؓ ڈھال بن کر آپ کے سامنے کھڑے ہو گئے تیر ان پر گرتے رہے لیکن وہ اسی طرح آپ پر جھکے رہے یہاں تک کہ ان کی پیٹھ تیروں سے چھلنی ہو گئی۔ سعد بن ابی وقاصؓ اسی جگہ کھڑے حضورؐ کے دفاع میں دشمن پر تیر چلاتے رہے آپ ایک ایک تیر ان کو اپنے دست مبارک سے عنایت فرماتے اور ارشاد ہوتا "ارم فداک ابی وامی" تم پر میرے ماں باپ قربان ہوں، اسی طرح تیر چلاتے رہو۔[1]

قتادہ بن النعمانؓ کی آنکھ پر ایسی ضرب آئی کہ آنکھ نکل کر ان کے رخسار پر آگئی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اسے اسی جگہ کر دیا، وہ آنکھ ایسی اچھی ہوئی کہ اس کی بصارت پہلی آنکھ سے بھی تیز ہو گئی۔[2]

مشرکین آپ کی تلاش میں تھے لیکن تقدیر الٰہی کا فیصلہ کچھ اور تھا جب انھوں نے آپ پر ہجوم کیا تو تقریباً دسؓ آدمی آپ کے سامنے آگئے اور سب ایک ایک کر کے آپ پر

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۸۲ نیز صحیح بخاری بسلسلہ غزوۂ احد باب قول اللہ تعالیٰ "اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا"

[2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۸۲

قربان ہوگئے، پھر حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ سامنے کر دیا اور تیروں کو روکنا شروع کیا یہاں تک کہ ان کی سب انگلیاں زخموں سے لہولہان ہوگئیں اور ہاتھ مفلوج ہوگیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وہیں ایک چٹان پر چڑھنا چاہتے تھے لیکن زخموں کی وجہ سے ضعف ہوگیا تھا اور چڑھنا دشوار ہو رہا تھا، یہ دیکھ کر حضرت طلحہؓ آپ کے نیچے بیٹھ گئے تو ان کا سہارا لے کر آپ اس چٹان پر تشریف لے گئے نماز کا وقت آیا تو آپ نے بیٹھ کر نماز پڑھی[1]۔

یہ وقت تھا جب لوگ شکست کھا کر منتشر ہونے لگے تھے لیکن انس بن النضر (جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خادم انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا ہیں) نے اس وقت بھی شکست تسلیم نہ کی اور آگے بڑھتے رہے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ان کو راستہ میں ملے اور پوچھا کہ کدھر کا ارادہ ہے؟ کہنے لگے کہ سعد! مجھے جنت کی خوشبو احد پہاڑ کے اس طرف صاف محسوس ہو رہی ہے[2]۔ انس بن النضرؓ مہاجرین و انصار کے کچھ لوگوں کے پاس سے گذرے اور دیکھا کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں! انھوں نے کہا کہ تم لوگ یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم شہید ہوگئے، انس ابن النضرؓ نے کہا پھر آپ کے بعد زندہ رہ کے کیا فائدہ؟ اٹھو اور جس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جان دی ہے اسی پر تم بھی جان دے دو، یہ کہہ کر آگے بڑھے دشمن سے ڈٹ کر ہاتھ کئے اور جان دے دی[3]، ان کے بھتیجے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس دن ہم نے ان کے جسم پر ستر زخم شمار کئے، زخموں کی کثرت سے ان کو پہچاننا ناممکن ہو رہا تھا صرف ان کی بہن نے ان کی انگلی کے ایک پور سے ان کو پہچانا جس پر کچھ نشانی تھی[4]۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۸۶ و زاد المعاد ج ۱ ص ۳۲۵ [2] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۳۶، اصل روایت صحیحین میں ہے [3] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۸۳

زیاد بن السکن رضؓ پانچ انصاریوں کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتے ہوئے لڑ رہے تھے اور ایک ایک کر کے شہید ہوتے جا رہے تھے یہاں تک کہ یہ زخموں سے چور اور نڈھال ہو کر گر پڑے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کو میرے قریب لے آؤ، لوگوں نے اٹھا کر ان کو آپ کے سامنے لٹا دیا، آپ نے ان کے سر کو اپنے قدم مبارک پر رکھ لیا اور اس حالت میں ان کی جان نکلی کہ ان کے رخسار حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر تھے۔[1]

عمرو بن الجموح رضؓ کے پاؤں میں شدید لنگ تھا، ان کے چار صاحبزادے تھے سب جوان تھے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قربانی و سرفروشی کے ہر موقع پر حاضر بھی رہتے تھے، جب آپ غزوۂ احد کے لئے روانہ ہوئے تو عمرو بن الجموح نے بھی چلنے کا ارادہ کر لیا، ان کے بیٹوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے رخصت دی ہے اگر آپ تشریف نہ لے جائیں تو اچھا ہے ہم لوگ آپ کی طرف سے کافی ہیں آپ پر جہاد فرض نہیں ہے۔ عمرو بن الجموح رضؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرے بیٹے مجھے جہاد میں شرکت سے روک رہے ہیں اور خدا کی قسم میری آرزو ہے کہ میں بھی شہادت پاؤں اور جنت میں اسی طرح لنگڑاتا ہوا چلوں، رسول اللہ صلے اللہ

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۸۱۔ اس موقع پر مولانا شبلی نے سیرت النبی ج ۱ میں فارسی کا اور قاضی محمد سلیمان صاحب منصورپوری نے رحمۃ للعالمین ج ۲ میں اردو کا ایک ایک ایسا منتخب شعر لکھا ہے جس نے واقعہ کی تصویر کھینچ دی ہے اور سچ یہ ہے کہ اس سے بہتر شعر کا انتخاب مشکل ہے یہ دونوں شعر علی الترتیب یہ ہیں

بچہ ناز رفتہ باشد ز جہاں نیاز مندے ... کہ بوقت جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

سر وقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے ... یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اللہ نے جہاد سے تمہیں معافی دے دی ہے اور ان کے بیٹوں سے ارشاد فرمایا کہ کیا حرج ہے کہ تم ان کو جہاد میں جانے دو (وہ اپنا ارمان نکال لیں) چنانچہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ اُحد میں شریک ہوئے اور شہادت کی آرزو و تمنا پوری ہو گئی۔[1]

زید بن ثابتؓ بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے سعد بن الربیعؓ کی تلاش میں بھیجا اور فرمایا کہ اگر وہ نظر آجائیں تو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا ہے کہ اس وقت تمہیں کیسا محسوس ہو رہا ہے؟ کہتے ہیں کہ مقتولین کے درمیان میں ان کو تلاش کرتا پھر رہا تھا کہ ایک جگہ وہ مجھے نظر آئے میں قریب گیا دیکھا تو آخری وقت تھا ان کے جسم پر نیزہ تلوار اور تیر کے ستر زخم تھے میں نے کہا سعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تمہیں سلام کہا ہے اور فرمایا ہے کہ مجھے بتاؤ اس وقت تمہاری کیا کیفیت ہے انھوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سلام عرض کرنا اور کہنا کہ یا رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) مجھے اس وقت جنت کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے اور میری قوم انصار سے یہ کہنا کہ اگر دشمن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک پہونچ گئے اور تمہارے دم میں دم رہا تو اللہ تعالے کے لئے تمہارے پاس کوئی عذر نہ ہوگا یہ کہتے ہی ان کی روح پرواز کر گئی۔[2]

عبداللہ بن جحشؓ نے غزوۂ اُحد کے سلسلہ میں کہا اے اللہ مجھے تیری قسم کہ میں کل دشمن کا مقابلہ کروں وہ مجھے قتل کر دیں پھر میرا پیٹ چاک کر دیں اور میرے ناک کان کاٹ ڈالیں پھر تو مجھ سے پوچھے کہ یہ سب کس کے لئے تھا؟ میں جواب دوں تیرے لئے۔[3]

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۲۵۳ [2] ایضاً [3] ایضاً

مسلمانوں کا دوبارہ حملہ

جب مسلمانوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پہچان لیا تو ان کو نئی زندگی مل گئی اور وہ ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے آپ ان کو لے کر دوبارہ وادی کی طرف بڑھے راستہ میں اُبَی بن خلف نے آپ کو دیکھا، اور دیکھتے ہی کہنے لگا، محمد صلے اللہ علیہ وسلم، اگر تم سلامت ہے تو میری خیر نہیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس کو جانے دو لیکن جب وہ آپ سے بالکل قریب آ گیا تو آپ نے ایک صحابی سے نیزہ لے کر اس کی گردن میں مارا نیزہ لگتے ہی اس نے گھوڑے سے گر کر کئی قلابازیاں کھائیں[1] اس موقع پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنی ڈھال میں پانی بھر کر لائے اور چہرۂ انور پر جو خون تھا، اس کو دھویا، صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس کو دھوتی تھیں، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ ڈھال میں پانی لے کر ڈالتے تھے جب حضرت فاطمہؓ نے دیکھا کہ پانی سے خون کسی طرح بند نہیں ہوتا ہے بلکہ اور زیادہ بہنے لگا تو انھوں نے چٹائی کا ایک ٹکڑا لے کر اسے جلایا، اور اس کی راکھ زخم پر باندھ دی، اس سے یہ خون اسی وقت تھم گیا[2]

حضرت عائشہ اور ام سلیم رضی اللہ عنہا اس غزوہ میں مشکیزے اپنی کمر پر لاد کر مجروحین کو پانی پلاتیں جب مشکیزے خالی ہو جاتے تو واپس جا کر انھیں دوبارہ اور

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص۸۴ [2] صحیح بخاری غزوۂ احد باب ما اصاب النبی من الجرح یوم احد و صحیح مسلم باب غزوۂ احد، مسلم، الفاظ وقت کے ساتھ، نیز ابن ہشام ج ۲ ص۸۵ و زاد المعاد ج ۱ ص۲۵۲

مشک بار بار بھرتیں اور ان لوگوں کی پیاس بجھاتیں[1]، ام سلیطؓ ان کے مشکیزوں میں پانی بھر کر ان کے حوالے کرتی تھیں[2]۔

ہند بنت عتبہ نے کچھ اور عورتوں کے ساتھ مسلمان مقتولین کی لاشوں کی بے حرمتی اور ان کا مثلہ کرنا، اور کان و ناک کاٹنا شروع کیے۔ وہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جگر نکال کر اُسے چبانے لگی لیکن وہ اس کے گلے سے اتر نہ سکا، اور اس نے اُسے فوراً اگل دیا[3]۔

جب ابوسفیان واپس ہونے لگے تو پہاڑ پر کھڑے ہو کر بہت بلند آواز سے انھوں نے نعرہ لگایا: جنگ کا معاملہ ڈانواں ڈول ہے، آج اس کی فتح کل اس کی، ہبل کا نام اونچا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، عمر کھڑے ہو کر اس کا جواب[4] دو اور کہو کہ اللہ بہت بلند و بالا ہے، اس کے سوا کوئی نہیں، ہمارے مقتولین جنت میں ہیں اور تمہارے مقتولین دوزخ میں ہیں[5]۔ یہ سن کر ابوسفیان بولے "لنا العزیٰ ولا عزیٰ لکم" (ہمارے پاس عزیٰ (بت) ہے تمہارے پاس نہیں)۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس کا جواب دو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ ہم کیا کہیں؟ آپ نے فرمایا کہو "اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم" (اللہ ہمارا سرپرست ہے تمہارا کوئی سرپرست نہیں[6])۔ جب وہ اپنی طرف چلے اور مسلمان اپنی طرف روانہ ہونے لگے تو انھوں نے پھر آواز لگائی "آئندہ سال بدر میں پھر ہمارا تمہارا مقابلہ ہے"۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے فرمایا کہو ہاں، یہ تاریخ ہمارے تمہارے درمیان طے ہے[7]۔

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ احد باب "اذ ھمت طائفتان منکم ان تفشلا" و مسلم باب غزوۃ النساء مع الرجال [2] صحیح بخاری باب ام سلیطؓ [3] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۹۱

[4] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۹۳ [5] صحیح بخاری باب غزوۂ احد [6] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۹۴

لوگوں کو تو اپنے اپنے مقتولین کا غم تھا اور وہ ان کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر حضرت حمزہؓ کی شہادت کا بڑا اثر تھا جو آپ کے چچا اور رضاعی بھائی تھے اور ہمیشہ آپ کے لئے سینہ سپر رہے۔

ایک مومنہ کا صبر

صفیہ بنت عبد المطلب رضی اللہ عنہا جو ان کی حقیقی بہن تھیں ان کو دیکھنے آئیں تو آپ نے ان کے صاحبزادے زبیر بن العوامؓ سے فرمایا کہ ان سے مل کر ان کو واپس لوٹا دو وہ ان کے بھائی کی نعش کی جو بے حرمتی کی گئی ہے اس پر ان کی نظر نہ پڑے انھوں نے جا کر کہا کہ اماں! رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ آپ واپس جائیں کہنے لگیں کیوں؟ مجھے معلوم ہے کہ میرے بھائی کا مثلہ کیا گیا ہے لیکن یہ سب اللہ کی راہ میں ہے اس لئے میں انشاءاللہ اجر و ثواب کی نیت رکھوں گی اور پورے صبر سے کام لوں گی اس کے بعد وہ وہاں آگئیں اپنے بھائی کو دیکھا انا للہ پڑھا ان کے لئے دعائے مغفرت کی اور خوب دعائیں دیں، اس کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی تدفین کا حکم فرمایا اور وہ آنحضرت کی ہی شہادت گاہ میں آسودۂ خاک ہوئے[1]

مصعب بن عمیرؓ اور دیگر شہدائے احد کس طرح دفن کئے گئے؟

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پرچم بردار مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اسلام سے پہلے قریش کے بہت نازپروردہ نوجوان تھے اور اپنے تجمل اور خوش پوشاکی میں

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۹۷

ضرب المثل تھے ان کو ایک چادر کفن میں ملی جو اتنی چھوٹی تھی کہ جب سر چھپایا جاتا تو پیر کھل جاتے، پیر چھپائے جاتے تو سر کھل جاتا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کا سر چھپا دو اور پیروں پر اذخر گھاس ڈال دو۔[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دو، دو شہیدوں کو ایک چادر میں کفن دینے کا حکم دیتے، پھر فرماتے کہ قرآن مجید کے علم و حفظ میں کس کا حصہ زیادہ ہے جس کسی کی طرف اشارہ کیا جاتا آپ پہلے اس کو لحد میں اتارنے کا حکم دیتے اور فرماتے کہ میں قیامت کے روز ان کا گواہ ہوں گا، آپ نے ان کو اسی طرح زخمی حالت میں دفن کرنے کا حکم دیا، نہ ان کی نماز جنازہ ہوئی نہ غسل دیا گیا۔[2]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر صحابیات کی جاں نثاری

مسلمان مدینے پہونچے تو راستہ میں بنی دینار کی ایک خاتون کے مکان پر

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ احد [2] صحیح بخاری باب من قتل من المسلمین یوم احد۔ [3] شہیدوں کو غسل نہ دینے کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ان کو خون میں لتھڑا ہوا اسی طرح دفن کر دیا جاتا ہے کہ خدا کے حضور میں اسی طرح پہونچیں، البتہ نماز جنازہ کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے امام مالک، شافعی اور احمد کا مذہب نفی کا ہے امام ابو حنیفہ کا اور بعض دوسرے علماء اعلام (اوزاعی، سفیان ثوری اور اسحاق ابن راہویہ) اس کے قائل ہیں کہ نماز پڑھی جائے امام احمد سے بھی اس کی ایک روایت ہے ان کی دلیل بعض وہ روایات ہیں جن میں احد میں شہداء پر نماز جنازہ پڑھنے کا ذکر ہے خود عقبہ بن عامر سے امام بخاری وغیرہ نے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ایک دن احد تشریف لے گئے اور آپ نے وہاں کے شہیدوں پر ایسی نماز جنازہ پڑھی جیسے مرنے والے پر پڑھی جاتی ہے (بخاری کتاب الجنائز) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو شرح معانی الآثار طحاوی باب الصلوٰۃ علی الشہداء و نصب الرایہ للزیلعی باب احادیث الصلوٰۃ علی الشہید۔

ان کو گزر رہا جن کے شوہر، بھائی اور باپ سب اس جنگ میں کام آ گئے تھے جب مسلمانوں نے
ان کو یہ خبر سنائی تو انھوں نے سب سے پہلے یہ کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خیریت بتاؤ؟
ان لوگوں نے جواب دیا کہ اے اُمِّ فلاں! الحمدللہ حضور جیسا کہ تمھاری آرزو
ہے صحیح سلامت ہیں۔ کہنے لگیں کہ مجھے آپ کو دکھاؤ میں آپ کو خود دیکھنا چاہتی
ہوں لوگوں نے آپ کی طرف اشارہ کیا۔ انھوں نے پاس آ کر چہرۂ مبارک کو دیکھا
اور کہا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سلامت ہیں تو ہر مصیبت ہیچ ہے۔[1]

جاں نثاری اور فرماں برداری کی ایک مثال

ادھر دشمنانِ دین اور کفار مشرکین نے ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرنی
شروع کی، اور کہنے لگے تم نے کچھ کر کے نہیں دیا۔ تم نے ایک طرف تو ان کی قوت
اور شوکت کو مجروح کیا، اور ان کا زور توڑا، پھر ان کی پوری سرکوبی کئے بغیر ان کو
چھوڑ دیا۔ اس موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ دشمنوں کا تعاقب
کیا جائے، یہ وہ وقت تھا جب مسلمان زخموں سے چور چور ہو رہے تھے۔ دوسرے
دن یکشنبہ کو صبح کے وقت آپ کے منادی نے اعلان کیا کہ لوگ دشمن کے تعاقب
کے لئے نکل کھڑے ہوں ساتھ ہی یہ بھی اعلان کیا گیا کہ اس تعاقب میں وہی
شریک ہو سکتا ہے جو کل اس جنگ میں شریک تھا، حالت یہ تھی کہ کوئی ایک
مسلمان بھی ایسا نہ تھا جو کسی نہ کسی زخم اور تکلیف میں مبتلا نہ ہو، لیکن وہ سب کے
سب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ ایک شخص بھی ان میں سے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۹۹

پیچھے نہ رہا جب سب لوگ مدینہ سے آٹھ میل کی مسافت پر مقام حمراء الاسد تک پہونچ گئے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے وہاں قیام کیا آپ اور تمام مسلمان دوشنبہ سہ شنبہ چہارشنبہ تین روز وہاں مقیم رہے اس کے بعد مدینہ واپس تشریف لائے [1]

اللہ تعالٰے نے اس جذبۂ اطاعت اور جوش تسلیم و وفا کا ذکر اپنی لافانی کتاب میں اس طرح فرمایا ہے:۔

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ	جنھوں نے باوجود زخم کھانے کے
مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ	خدا اور رسول (کے حکم) کو قبول کیا
لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا	جو لوگ ان میں نیکوکار اور پرہیزگار
اَجْرٌ عَظِيْمٌ۝ اَلَّذِيْنَ قَالَ	ہیں ان کے لئے بڑا ثواب ہے (جب)
لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ	ان سے لوگوں نے آکر بیان کیا کہ
قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ	کفار نے تمھارے (مقابلہ کے) لئے
فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا	لشکر کثیر جمع کیا ہے تو ان سے
حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۝	ڈرو تو ان کا ایمان اور زیادہ ہو گیا
فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ	اور کہنے لگے ہم کو خدا کافی ہے اور
وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ	وہ اچھا کارساز ہے اور پھر وہ خدا
وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ	کی نعمتوں اور اس کے فضل کے
وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ۝	ساتھ (خوش و خرم) واپس آئے
اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ	ان کو کسی طرح کا ضرر نہ پہونچا

[1] سیرت ابن کثیر جلد ۳ صفحہ ۵۲

اَوْلِیَآءَہٗ فَلَا تَخَافُوْھُمْ
وَخَافُوْنِ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝
(سورۂ آل عمران ۔ ۱۷۳ ۔ ۱۷۵)

اور وہ خدا کی خوشنودی کے تابع
ہے اور خدا بڑے فضل کا مالک ہے
یہ (خوف دلانے والا) تو شیطان
ہے جو اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے تو
اگر تم مومن ہو تو ان سے مت ڈرنا
اور مجھ ہی سے ڈرتے رہنا۔

جان سے زیادہ عزیز

ہجرت کے تیسرے سال قبیلۂ عضل اور قبیلۂ قارہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ کچھ ایسے لوگ ان کو دیئے جائیں جو ان کو دین کی تعلیم دے سکیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام میں سے چھ حضرات کا ایک وفد اس کام کے لئے بھیجا جس میں عاصم بن ثابتؓ، خبیب بن عدیؓ اور زید بن الدثنہؓ بھی تھے جب وہ مقام "رجیع" میں پہونچے جو عسفان اور مکہ کے درمیان واقع ہے تو ان قبائل نے ان کے ساتھ غداری کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ہم اللہ کے سامنے عہد کرتے ہیں کہ تم کو کسی جان سے نہ ماریں گے کچھ مسلمانوں نے کہا کہ ہم مشرک کے کسی عہد کو قبول نہیں کرتے، انھوں نے مقابلہ کیا اور شہید ہوئے زید بن الدثنہؓ، خبیبؓ بن عدیؓ اور عبداللہ بن طارقؓ نے ہتھیار رکھ دیئے اور ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ عبداللہ بن طارقؓ راستہ میں شہید کر دیئے گئے۔ خبیبؓ اور زید بن الدثنہ رضی اللہ عنہما کو ان لوگوں نے قریش کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ خبیبؓ کو حجیر بن ابی اہاب نے خرید لیا تاکہ اپنے باپ اہاب کے بدلہ میں قتل کر سکے۔ زید بن الدثنہؓ

صفوان بن امیہ نے اپنے باپ امیہ بن خلف کے بدلے کے لئے خریدا۔ زید رضی اللہ عنہ کو حرم سے باہر قتل کے لئے لے جایا گیا تو اس وقت قریش کے بہت لوگ جمع تھے جن میں ابوسفیان بھی تھے انھوں نے حضرت زید سے کہا زید میں تم کو قسم دلا کر پوچھتا ہوں کیا تم پسند کرو گے کہ تم آرام سے اپنے گھر والوں میں ہو اور تمھاری جگہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) ہوں انھوں نے جواب دیا کہ مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ میں اپنے گھر میں آرام سے ہوں اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو ایک کانٹا بھی چبھے! ابوسفیان نے اس پر کہا کہ میں نے کسی کو کسی سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جتنی محبت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے ساتھی کرتے ہیں! اس کے بعد ان کو شہید کر دیا گیا۔[1]

جب یہ لوگ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو سولی دینے کے لئے لائے تو انھوں نے کہا کہ اگر اس میں کوئی حرج نہ سمجھو تو مجھے دو رکعت پڑھ لینے کی اجازت دے دو، انھوں نے کہا ہاں پڑھ لو۔ انھوں نے دو رکعت اطمینان اور پورے آداب کے ساتھ پڑھیں پھر ان کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ تم لوگ اس کو ڈر پر محمول کرو گے تو میں ابھی اور نماز پڑھتا اس کے بعد انھوں نے یہ اشعار پڑھے:۔

فلست أبالی حین أقتل مسلماً　　علی أی شق کان فی اللّٰہ مصرعی

(جب میں اسلام کے لئے قتل کیا جا رہا ہوں تو مجھ کو اس کی پروا نہیں کہ اللہ کی راہ میں کس پہلو پر گر کر جان دوں گا۔)

وذالک فی ذات الالٰہ وان یشأ　　یبارک علی أوصال شلو ممزع

(یہ جو کچھ ہے خاص اللہ کے لئے ہے اگر وہ چاہے گا تو اس پارہ پارہ جسم پر برکت نازل کرے گا)

---

[1] روایت ابن اسحاق ابن ہشام ج ۲ ص ۱۷۲

یہ شعر پڑھتے ہوئے راہِ حق میں شہید ہوئے۔[1]

بئرِ معونہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عامر بن مالک کی درخواست پر ان میں اسلام کی تبلیغ و دعوت کے لئے ایک جماعت بھیجی جس میں بشیر بن سعد بن وہب جیسے مسلمان شامل تھے یہ لوگ روانہ ہوئے اور بئرِ معونہ میں قیام کیا یہاں بنی سُلیم کے قبائل عُصَیّہ، رِعل اور ذکوان نے مل کر پورے قافلہ کو گھیر لیا جب انھوں نے یہ دیکھا تو تلواریں کھینچ لیں اور لڑ کر سب کے سب شہید ہو گئے۔ حضرت کعب بن زید باقی بچے جنھوں نے غزوۂ خندق میں شہادت پائی۔[2]

ایک مقتول کے آخری الفاظ جو قاتل کے قبولِ اسلام کا سبب بن گئے

اسی سریہ میں حرام بن ملحان بھی شہید ہوئے ان کو جبار بن سُلمی نے قتل کیا حرام ابن ملحان نے انتقال کے وقت جو الفاظ کہے وہی ان کے اسلام لانے کا سبب بن گئے جبار خود بیان کرتے ہیں کہ مجھے جس چیز نے اسلام کی طرف کھینچا وہ یہ واقعہ ہے کہ میں نے ان کے ایک آدمی کے دونوں شانوں کے درمیان ایک نیزہ مارا میں نے دیکھا کہ وہ سینہ کے پار ہو گیا ہے اسی وقت ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے "فزت ورب الکعبۃ" رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا میں نے اپنے دل میں حیرت سے کہا کیسی کامیابی؟ کیا میں نے ان کو قتل نہیں کیا! بعد میں میں نے ان کے الفاظ کی تحقیق کی تو لوگوں نے بتایا کہ ان کا مطلب شہادت تھا،

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۲۵-۱۲۶۔ و صحیح بخاری کتاب المغازی۔ باب التوحید والجہاد معمولی اختلاف کے ساتھ۔ تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۱۲۴-۱۲۵
[2] بخاری و مسلم و سیرت ابن ہشام۔

میں نے کہا خدا کی قسم وہ کامیاب ہو گئے اس طرح یہ جملہ ان کے اسلام کا سبب بنا۔[1]

بنی النضیر کی جلا وطنی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قبیلہ النضیر کے پاس تشریف لے گئے جو یہود کا بہت بڑا قبیلہ تھا، وہاں جا کر آپ نے ان سے بنی عامر کے دو مقتولین کی دیت میں مدد چاہی، ان کے اور بنی عامر کے درمیان عہد و معاہدہ تھا، انھوں نے اس موقع پر تو آپ سے بہت میٹھی باتیں کیں اور اچھی امیدیں دلائیں لیکن درپردہ وہ آپ کے خلاف سازش میں مشغول رہے، ایک مرتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کے ایک گھر کی دیوار کے نیچے تشریف فرما تھے، یہ دیکھ کر یہ لوگ آپس میں کہنے لگے کہ اس سے اچھی پوزیشن پھر تم کو ہاتھ نہ آئے گی! اگر ایک آدمی اوپر چڑھ کر ایک بھاری پتھر لڑھکا دے تو ہم سب کی جان چھوٹ جائے گی! آپ کے ساتھ اس موقع پر کئی حضرات صحابہ موجود تھے جن میں حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم بھی تھے۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ان کے ناپاک ارادوں سے آگاہ فرما دیا آپ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور مدینہ روانہ ہو گئے یہاں آ کر آپ نے ان سے جنگ کی تیاری شروع کی اور ان کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوئے اور آگے بڑھ کر ان کے قبیلے میں پڑاؤ کیا، یہ ماہ ربیع الاول سنہ ۴ھ کا واقعہ ہے آپ نے چھ راتوں تک ان کا محاصرہ کیا، ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے اتنا رعب ڈال دیا کہ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے خود درخواست کی کہ آپ ان کو یہاں سے جلا وطن کر دیں لیکن ان کو جان کی امان دے دیں

---

[1] اس واقعہ کو بخاری میں باب غزوۃ الرجیع (کتاب المغازی) میں بیان کیا گیا ہے، ابن ہشام ج ۲ ص ۱۸۶

اونٹ جتنا لے جا سکیں اس کے لے جانے کی ان کو اجازت ہوگی البتہ ہتھیار وہ منتقل نہ کر سکیں گے۔ آپ نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی اور وہ سارا سامان اپنے ساتھ لے گئے جو اونٹوں پر جا سکتا تھا پھر یہ منظر دیکھا گیا کہ ایک ایک وہ اپنا پورا پورا گھر خود اپنے ہاتھ سے گرا رہا ہے اور جتنا سامان لادنا ممکن ہے اونٹ پر لاد کر روانہ ہو رہا ہے[1] اس غزوہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

هُوَ الَّذِیْٓ اَخْرَجَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا	وہی تو ہے جس نے کفار اہل کتاب کو
مِنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ مِنْ دِیَارِهِمْ	حشر اول کے وقت ان کے گھروں سے
لِاَوَّلِ الْحَشْرِ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ	نکال دیا تمہارے خیال میں بھی نہ تھا کہ
یَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ	وہ نکل جائیں گے اور وہ لوگ یہ سمجھے ہوئے
حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ	تھے کہ ان کے قلعے ان کو خدا کے عذاب
اللّٰهُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا	سے بچا لیں گے مگر خدا نے ان کو وہاں
وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ	آلیا جہاں سے ان کو گمان بھی نہ تھا
یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَهُمْ بِاَیْدِیْهِمْ	اور ان کے دلوں میں دہشت ڈال دی
وَاَیْدِی الْمُؤْمِنِیْنَ فَاعْتَبِرُوْا	کہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں اور
یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ	مومنوں کے ہاتھوں اجاڑنے لگے تو
(سورۂ حشر ۲)	اے بصیرت کی آنکھیں رکھنے والو عبرت پکڑو

ان میں سے کچھ لوگ خیبر میں جا بسے کچھ لوگ شام چلے گئے اور مسلمانوں کو روز روز کی سازش اور منافقت کے ایک بہت بڑے اڈے سے نجات ملی اور قتال کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی۔ "وَکَفَی اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ الْقِتَالَ" ان کی جلاوطنی کے بعد

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۹۰-۱۹۱

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کا سب مال و دولت مہاجرین اولین میں تقسیم فرمایا۔

غزوۂ ذات الرقاع

چوتھے سال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نجد کے علاقہ کی طرف بغرض جہاد کوچ فرمایا، آپ کا مقصد بنی محارب اور بنی ثعلبہ (قبیلۂ غطفان) کو سبق دینا تھا، آپ روانہ ہو کر مقام نخل[1] میں اترے، ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم چھ اشخاص کے درمیان ایک ہی اونٹ تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ پیدل چلنے کی وجہ سے لوگوں کے پیر چھلنی ہو گئے، اور انگلیوں کے ناخن تک گر گئے، اور اس تکلیف سے بچنے کے لئے لوگوں نے اپنے پیروں پر پٹیاں اور چیتھڑے باندھ لئے، اور اسی لئے اس غزوہ کا نام "غزوۂ ذات الرقاع" یعنی "پٹیوں والا غزوہ" پڑ گیا۔[2]

فریقین ایک دوسرے سے قریب ہوئے لیکن جنگ کی نوبت نہ آئی، لوگ ایک دوسرے سے خائف تھے، اس موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ خوف بھی ادا فرمائی۔[3]

اس وقت تمہیں کون بچا سکتا ہے؟

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس غزوہ سے واپس ہوئے تو دوپہر کو آپ

---

[1] نجد میں غطفان کے علاقہ میں ایک مقام کا نام ہے۔ [2] صحیح بخاری بروایت حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ باب غزوۂ ذات الرقاع، امام بخاری نے تصریح کی ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع خیبر کے بعد پیش آیا، یہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کا بیان ہے۔ [3] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۰۴

ایسی جگہ آرام فرمایا جہاں ببول کے بہت سے درخت تھے اور لوگ ان درختوں کی طرف چلے گئے اور خود بدولت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ببول کے ایک پیڑ کے نیچے آرام فرمانے لگے اور اپنی تلوار اسی درخت پر لٹکا دی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اسی درمیان میں ہماری آنکھ لگ گئی اور ہم تھوڑا سو گئے تھے کہ محسوس ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمیں آواز دے رہے ہیں ہم نے دیکھا کہ ایک اعرابی آپ کے پاس بیٹھا ہوا ہے آپ نے فرمایا کہ میں سو رہا تھا کہ اس نے یہ تلوار اٹھائی میری آنکھ کھلی تو یہ تلوار میرے سر پر کھینچے ہوئے تھا اس نے مجھ سے کہا کہ اس وقت تمہیں کون بچا سکتا ہے؟ میں نے کہا اللہ تو یہ بیٹھا ہوا ہے لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو کوئی سزا نہیں دی۔[1]

کچھ غزوات جن میں قتال کی نوبت نہیں آئی

ہجرت کے چوتھے سال شعبان کے مہینہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بدر کا قصد فرمایا۔ ابوسفیان نے تاریخ طے کی تھی آپ نے وہاں پہونچ کر منزل کی اور آٹھ راتیں وہاں قیام فرمایا اور ابوسفیان کے انتظار میں رہے ابوسفیان بھی مقابلہ کے لئے نکلے لیکن واپسی ہی میں ان کو زیادہ عافیت معلوم ہوئی انھوں نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ یہ قحط اور خشک سالی کا زمانہ ہے میرا لوٹنے کا ارادہ ہے اور تم لوگوں کو بھی لوٹ چلنا چاہئے غرض اس طرح لڑنے کی نوبت نہ آسکی اور اللہ تعالے نے مسلمانوں کو ان کے شر سے محفوظ رکھا۔

دومۃ الجندل کے غزوہ میں بھی جنگ کی ضرورت پیش نہ آئی اور آپ مدینہ تشریف لائے۔[2]

---

[1] صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ ذات الرقاع [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۰۹-۲۱۳

غزوۂ خندق یا غزوۂ احزاب

(شوال ۵ھ)

غزوۂ خندق یا غزوۂ احزاب ماہ شوال ۵ھ میں پیش آیا[1] یہ ان اہم واقعات اور غزوات میں سے ہے جس کے اثرات اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ دعوت اسلامی کے مستقبل دین حق کے فروغ اور اسلام کی پیش قدمی میں بہت دور رس ثابت ہوئے یہ ایک فیصلہ کن لڑائی تھی اور ایسی سخت آزمائش جس کا تجربہ مسلمانوں کو اس سے قبل کبھی نہ ہوا تھا۔

إِذْ جَاءُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ	جب وہ تمھارے اوپر اور نیچے کی
أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ	طرف سے تم پر چڑھ آئے اور جب
الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ	آنکھیں پھر گئیں اور دل (مارے
الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ	دہشت کے) گلوں تک پہنچ گئے
الظُّنُونَا هُنَالِكَ ابْتُلِيَ	اور تم خدا کی نسبت طرح طرح
الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا	کے گمان کرنے لگے وہاں مومن
شَدِيدًا ○ (سورۃ الاحزاب ۱۰-۱۱)	آزمائے گئے اور سخت طور پر ہلائے گئے۔

اس غزوہ کا اصل سبب یہود تھے واقعہ اس طرح ہے کہ بنی النضیر اور بنی وائل

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۱۴

کے کچھ لوگ مکہ گئے اور قریش سے مل کر ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف اکسانا چاہا۔ قریش کو اس قسم کی جنگوں کا تجربہ تھا اور وہ بہت پہلے سے اسے بھگتے ہوئے تھے اس لئے ان کی ہمت نہ پڑتی تھی لیکن یہودیوں کے وفد نے صورت حال کو بہت سازگار اور خوشنما بنا کر ان کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ ہم لوگ سب آپ کے ساتھ ہوں گے اور جب تک اس دین کو جڑ بنیاد سے ختم نہ کر دیں گے دم نہ لیں گے۔ اس بات پر قریش بہت خوش ہوئے اور اس کے بعد انھوں نے جوش و مسرت کے ساتھ ان کی دعوت قبول کی۔ سب اس پر متحد ہو گئے اور تیاریاں شروع کر دیں۔ وفد وہاں سے چل کر قبیلۂ غطفان میں آیا اور ان کو بھی اس جنگ میں شرکت کی دعوت دی۔ ان کے مختلف قبائل میں گھوم پھر کر مدینہ پر حملہ کا یہ منصوبہ تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے رکھا اور قریش کی آمادگی سے بھی ان سب کو باخبر کیا۔[۱]

ان کوششوں کے نتیجہ میں ان کے درمیان ایک فوجی معاہدہ ہو گیا جس کے اہم شرکا میں قریش، یہود اور غطفان تھے انھوں نے کچھ اور شرائط پر بھی اتفاق کیا جس میں ایک اہم شرط یہ بھی تھی کہ غطفان اس متحدہ لشکر میں چھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ حصہ لیں گے اس کے معاوضہ میں یہود قبائل غطفان کو خیبر کے باغات کی پورے سال کی فصل دیا کریں گے۔ الغرض قریش نے چار ہزار جنگجو اس کے لئے اکٹھا کئے، غطفان نے چھ ہزار، کل تعداد دس ہزار ہوئی، لشکر کا سپہ سالار ابو سفیان کو مقرر کیا گیا۔[۲]

حکمت مومن کا گم شدہ مال ہے

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ملی کہ یہ لوگ اس طرح

۱؎ سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۲۱۴-۲۱۵ ۲؎ ایضاً صفحہ ۲۱۹-۲۲۰

متحد ہوکر مدینہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں اور اس کا عزم کرچکے ہیں کہ مسلمانوں کے وجود کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیں گے تو مسلمانوں نے بہت سنجیدگی کے ساتھ اس کا نوٹس لیا اور جنگ کے لئے تیار ہوگئے، انھوں نے مدینہ میں قلعہ بند ہوکر مدافعانہ جنگ کو ترجیح دی، لشکرِ اسلام اس وقت تین ہزار مجاہدین پر مشتمل تھا۔[1]

اس موقعہ پر سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے سامنے خندق کھودنے کا مشورہ دیا،[2] یہ ایرانیوں کی معروف جنگی حکمت عملی تھی، حضرت سلمانؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ! ایران میں جب ہم کو گھوڑ سوار لشکر کے حملہ کا خطرہ ہوتا تھا تو ہم لوگ اس کے مقابلہ کے لئے خندق کھودتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رائے پسند فرمائی اور مدینہ کے شمال مغرب میں واقع میدان میں خندق کھودنے کا حکم فرمایا، یہی وہ کھلا حصہ تھا جہاں سے دشمن کو دراندازی کا موقع مل سکتا تھا۔[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق کھودنے کا کام اپنے اصحاب کرام میں اس طرح تقسیم فرمایا کہ ہر دس آدمیوں کے ذمہ چالیس ہاتھ تھا،[4] خندق کا طول تقریباً پانچ ہزار ہاتھ تھا، گہرائی سات ہاتھ سے دس تک، چوڑائی بالعموم نو سے کچھ اوپر ہوتی تھی۔[5]

مسلمانوں میں ہمدردی و مساوات کی ایک نئی لہر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خندق کھودنے میں مسلمانوں کے ساتھ بنفس نفیس

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۲۲۴، [2] خندق دراصل لفظ "کندہ" کا معرب ہے، فارسی میں خندق کو کندک اسی معنی میں استعمال کرتے ہیں دیکھئے فرہنگ عمید، [3] کھدائی کا کام مدینہ کے شمال مشرق سے شروع ہوکر شمال مغرب تک کام ہوا، اس کا مشرقی کنارہ حرۃ واقم سے ملتا تھا اور غربی کنارہ وادی بطحان کے قریب جبل سلع مغربی (حرۃ الوبرۃ) واقع ہے (ملاحظہ ہو مدینہ طیبہ کے شہر کا نقشہ) مستفاد از آثار المدینۃ المنورۃ تالیف علامہ عبدالقدوس الانصاری۔ [4] سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۲۱۶، [5] غزوۃ الاحزاب استاذ احمد باشمیل۔

شریک ہوئے اور سب نے مل کر پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ یہ کام انجام دیا[1]۔ سردی بہت سخت تھی، غذا ان کو اتنی ملتی تھی کہ جسم و جان کا رشتہ قائم رہے، کبھی وہ بھی نہ ملتی تھی۔ حضرت ابو طلحہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھوک کی شکایت کی اور اپنا پیٹ کھول کر دکھایا جس پر ایک پتھر بندھا ہوا تھا، یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے شکم مبارک سے کپڑا اٹھایا اور ہم نے دیکھا کہ اس میں دو پتھر بندھے ہوئے ہیں[2]۔

اس کے باوجود سب خوش و خرم تھے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے، رجز پڑھتے تھے اور اس کی حمد کے ترانے گاتے تھے، اور ایک حرف شکایت ان کی زبان پر نہ آتا تھا۔

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خندق کے قریب تشریف لائے، آپ نے دیکھا کہ مہاجرین اور انصار صبح سویرے سخت ٹھنڈک میں خندق کھودنے میں مصروف ہیں، ان کے پاس غلام اور ملازم نہ تھے جو ان کے بجائے یہ کام انجام دیتے، آپ نے ان کی اس سخت محنت اور بھوک کو ملاحظہ فرمایا تو آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے۔

اللھم لا عیش الا عیش الآخرۃ فاغفر الانصار والمہاجرۃ

(اے اللہ زندگی تو دراصل آخرت کی زندگی ہے، پس معاف فرما انصار کو اور مہاجرین کو۔)

یہ سن کر اس کے جواب میں انھوں نے کہا:۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام ج ۲ ص۲۱۶ [2] ترمذی، علامہ طیبی شرح مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں کہ عرب میں اس عہد میں یہ رواج تھا کہ جس کو بھوک ستاتی تھی اور پیٹ بالکل چپک جاتا تھا، وہ اپنی کمر سیدھا رکھنے کے لئے پیٹ پر ایک پتھر باندھ لیتا تھا۔ مشکوٰۃ المصابیح مع حواشی ج ۲ ص۴۴۸

نحن الذین بایعوا محمدًا ۔ علی الجہاد ما بقینا ابدًا [1]

ہم وہ ہیں جنھوں نے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) سے جہاد پر اس وقت تک کے لئے بیعت کی ہے جب تک ہماری جان میں جان ہے۔

وہ بیان کرتے ہیں ایک مٹھی جو کہیں سے مل جاتے تو اس کا ملیدہ بنا لیا جاتا اور اس میں تھوڑی سی چربی شامل کر لی جاتی حالانکہ اس کا ذائقہ اور بو سب میں فرق آچکا ہوتا۔

تنگی و محاصرہ کی تاریکی میں اسلامی فتوحات کا نور

خندق کی کھدائی میں ایک جگہ ایک بڑی چٹان سامنے آگئی جس پر کدال کام نہیں کر رہی تھی، لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر آپ کو اس کی اطلاع کی، آپ نے اس کو دیکھا تو خود کدال اٹھائی اور بسم اللہ کہہ کر اس پر ایک ایسی ضرب لگائی کہ اس کا ایک تہائی حصہ ٹوٹ گیا، اس وقت آپ نے فرمایا، اللہ اکبر مجھے شام کی کنجیاں دی گئیں، اس کے بعد دوسرا تہائی حصہ بھی آپ نے توڑ ڈالا اور ارشاد فرمایا اللہ اکبر مجھے فارس کی کنجیاں دی گئیں، خدا کی قسم میں مدائن کا سفید محل اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، پھر تیسری بار آپ نے بسم اللہ کہہ کر اس پر ضرب لگائی اور باقی ماندہ پتھر بھی پاش پاش ہو گیا، آپ نے فرمایا اللہ اکبر مجھے یمن کی کنجیاں دی گئیں، خدا کی قسم میں اس وقت اسی جگہ سے صنعاء شہر کے دروازے دیکھ رہا ہوں [2]، یہ ارشاد اس وقت ہوا جب مسلمانوں کو اپنے زندہ سلامت رہنے کا بھی یقین نہ تھا، ایک طرف بھوک ان کو ہلکان کیے ڈال رہی تھی، دوسری طرف ٹھنڈک جان لیوا ثابت ہو رہی تھی، تیسری طرف دشمن سر پر تھا

---

[1] صحیح بخاری بروایت انس کتاب المغازی باب غزوۃ الخندق [2] مسند احمد بروایت براء بن عازب انصاری۔ (مسند ج ۴ ص ۳۰۳)

غزوہ خندق میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعض معجزات

اس غزوہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کئی معجزات ظاہر ہوئے جب مسلمانوں کو خندق کھودنے میں دشواری ہوتی اور اس طرح کی کوئی چیز رکاوٹ بنتی تو آپ کسی برتن میں پانی طلب فرماتے اس میں اپنا لعاب دہن ڈال دیتے اور جو کچھ اللہ تعالےٰ آپ سے کہلاتا آپ دعا فرماتے جب یہ پانی اس پتھر پر چھڑکا جاتا تو وہ ریت کے تودہ کی طرح نرم ہو جاتا۔[1]

کھانے میں ایسی کھلی برکت ہوتی کہ تھوڑا سا کھانا بہت بڑی تعداد کے لئے کافی ہو جاتا، اور نہ صرف کافی ہوتا بلکہ پورا لشکر سیر ہو جاتا۔

جابر بن عبداللہ رضؓ کہتے ہیں کہ ہم خندق کے روز کھدائی کر رہے تھے کہ ایک بڑا اور سخت پتھر سامنے آگیا، سب لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ یہ بہت سخت پتھر سامنے آگیا ہے جو خندق کھودنے میں رکاوٹ بن رہا ہے آپ نے فرمایا کہ میں اترتا ہوں پھر آپ ایسی حالت میں کھڑے ہوئے کہ آپ کے پیٹ پر ایک پتھر بندھا ہوا تھا اس وقت حالت یہ تھی کہ تین روز سے ہمارے منہ میں کوئی چیز نہ گئی تھی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کدال اٹھائی اور اس پتھر پر ماری پتھر ریت کی طرح بھربھرا ہو کر گر گیا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تھوڑی دیر کے لئے مجھے گھر جانے کی اجازت مرحمت فرمادیں گھر پہونچ کر میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس حال میں دیکھا ہے کہ جس کے دیکھنے کی مجھ میں تاب نہیں کیا تمہارے پاس کچھ کھانے پینے کا سامان ہے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۱۷-۲۱۸

انھوں نے کہا ہاں کچھ جَو ہے اور ایک بکری کا بچہ ہے میں نے بکری کے بچہ کو ذبح کیا اور جَو کو پیسا اور ایک دیگچی میں گوشت چڑھا دیا جب میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جانے لگا تو اس وقت آٹا گوندھ چکا تھا، دیگچی چولہے پر تھی اور تیار ہونے کے قریب تھی میں نے واپس آکر عرض کیا کہ میں نے تھوڑے بہت کھانے کا انتظام کیا ہے آپ اور دو ایک آدمی تشریف لے چلیں آپ نے دریافت فرمایا کتنا کھانا ہوگا میں نے تفصیل بتائی آپ نے یہ سن کر فرمایا یہ تو بہت ہے اور اچھا ہے اپنے گھر میں کہنا کہ دیگچی چولہے سے اس وقت تک نہ اتاریں اور نہ تنور سے روٹیاں نکالیں جب تک میں نہ آجاؤں پھر آپ نے فرمایا لوگو! بسم اللہ چنانچہ تمام مہاجرین اور انصار کھڑے ہو گئے اور میں اپنی بیوی کے پاس پہونچا اور کہا کہ کچھ خبر بھی ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سارے مہاجرین اور انصار اور جتنے بھی آدمی آپ کے ساتھ ہیں سب کو لے کر تشریف لا رہے ہیں کہنے لگیں کیا کھانے کے بارے میں آپ نے کچھ پوچھا؟ میں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا لوگو! اندر داخل ہو اور بھیڑ نہ لگاؤ آپ روٹی کے ٹکڑے کر کے اس پر گوشت رکھتے جاتے اور گوشت و روٹی لینے کے بعد دیگچی اور تنور کو ڈھک دیتے تھے اور اپنے اصحاب کرام کے سامنے کھانا پیش فرماتے تھے پھر کپڑا ہٹا کر اسی طرح روٹی توڑتے اور گوشت لیتے رہے اور اصحاب کرام کو عنایت فرماتے رہے یہاں تک کہ سب خوب شکم سیر ہو گئے اور اس کے بعد بھی کھانا بچ رہا پھر آپ نے جابر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ سے فرمایا اب تم کھاؤ اور دوسروں کو دو اس لئے کہ سب لوگ اس وقت بھوک اور فاقہ میں ہیں۔[1]

ایک دوسری روایت میں حضرت جابرؓ کے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ

---

[1] صحیح بخاری (باب غزوۃ الخندق)

آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور آہستہ سے عرض کیا یا رسول اللہ ہم نے ایک جانور ذبح کیا ہے، اور ہمارے پاس تھوڑا سا جو تھا اس کو پیس لیا ہے، آپ اور چند حضرات تشریف لے چلیں، آپ نے بلند آواز سے کہا کہ خندق والو! جابر نے ایک بڑی دعوت کا انتظام کیا ہے۔[1]

کڑی آزمائش

قریش نے آگے بڑھ کر مدینہ کے مقابل پڑاؤ ڈالا، ان کے لشکر کی تعداد دس ہزار تھی، غطفان بھی اپنے زیر اثر قبائل کے ساتھ اسی جگہ مقیم ہوئے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تین ہزار مسلمانوں کے ساتھ ان کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوئے، خندق ان دونوں لشکروں کے درمیان حائل تھی، مسلمانوں اور بنی قریظہ کے درمیان ایک معاہدہ تھا، حیی بن اخطب نے جو بنی النضیر کا سردار تھا، ان کو بد عہدی کر عہد شکنی پر آمادہ کر لیا، بنی قریظہ نے یہ اقدام تھوڑے انکار اور تردد کے بعد کیا، اس کے نتیجے میں خوف و دہشت کی فضا سارے شہر میں چھا گئی، منافقین نے بھی پاؤں نکالے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خیال ہوا کہ اس وقت قبیلہ غطفان سے اس بات پر صلح کر لینا مناسب ہے کہ مدینہ کے پھلوں کا ایک تہائی حصہ ان کو دیا جائے گا، یہ خیال انصار کی وجہ سے آپ کے دل میں آیا جن پر جنگ کا سب سے زیادہ بوجھ پڑا تھا، اور اب آپ ان کو مزید آزمائش میں ڈالنا نہ چاہتے تھے، لیکن اوس و خزرج کے دونوں سردار سعد بن معاذ و سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما کے عزم و ہمت، ثابت قدمی اور استقامت کو دیکھ کر آپ نے

---

[1] حدیث میں اس موقع پر کھانے کے لئے لفظ "سُور" آیا ہے، اس موقع پر علامہ محمد طاہر پٹنی نے مجمع بحار الانوار میں لکھا ہے کہ یہ اصلاً فارسی لفظ ہے، دعوت اور شادی کی بڑی دعوت کے لئے بولا جاتا ہے۔

اپنی رائے تبدیل فرمادی انھوں نے عرض کیا کہ حضرت ہم لوگ شرک و بت پرستی کی آلودگیوں میں پڑے ہوئے تھے نہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے اور نہ اس کو پہچانتے تھے اس وقت کھجور کا ایک دانہ بھی (ضیافت اور خرید و فروخت کے علاوہ) ہم ان کو دینے کے روادار نہ تھے اور اب جب ہم کو اللہ تعالیٰ نے اسلام سے سرفراز کیا اور ہدایت نصیب کی آپ کی ذات اور اسلام سے ہمیں عزت بخشی کیا ہم ان کو اپنا مال دے دیں گے خدا کی قسم ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہمارے پاس ان کے لئے تلوار کے سوا کچھ نہیں ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کے اور ہمارے درمیان فیصلہ فرما دے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر ارشاد فرمایا جیسی تمھاری رائے ہو!

جاہلیت کے شہسوار اور اسلام کے شہسوار کا مقابلہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ تمام مسلمانوں نے وہاں قیام کیا دشمن نے ان کا محاصرہ کر لیا تھا لیکن جنگ کی نوبت نہ آئی تھی البتہ یہ ہوا کہ دشمن کے کچھ گھوڑ سوار تیزی کے ساتھ آگے بڑھے اور خندق کے کنارے تک پہنچ گئے اور اسے دیکھ کر کہنے لگے یہ ایک نئی تدبیر اور نیا جال ہے جس سے عرب واقف نہیں ہیں پھر تلاش کر کے وہ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں خندق کی چوڑائی بہت کم تھی یہاں پہنچ کر انھوں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی تو وہ گھوڑے اس کو پار کر گئے اور مدینہ کی سرزمین پر دوڑنے لگے ان میں سے عرب کا نامی گرامی شہسوار عمرو بن عبدِ وُد بھی تھا جس کا مقابلہ ایک ہزار گھوڑ سوار کے برابر کیا جاتا تھا ایک جگہ ٹھہر کر اس نے آواز لگائی کہ ہے کوئی مقابلہ کرنے والا؟ یہ سن کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ سامنے آئے اور کہا عمرو! تم نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ قریش کا کوئی شخص

اگر تمہیں دو باتوں کی دعوت دے گا تو ایک تم ضرور قبول کر لو گے اس نے جواب دیا کہ ہاں، حضرت علیؓ نے کہا ٹھیک ہے میں تمہیں اللہ کی اس کے رسول کی اور اسلام کی دعوت دیتا ہوں اس نے کہا کہ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں حضرت علیؓ نے کہا تو پھر میں تمہیں مقابلہ کی دعوت دیتا ہوں کہنے لگا کیوں آخر میرے بھتیجے! بخدا میں تمہیں قتل کرنا نہیں چاہتا ہے حضرت علی نے کہا لیکن خدا کی قسم میں تمہیں ضرور قتل کرنا چاہتا ہوں۔

یہ سن کر عمرو کا خون گرم ہو گیا وہ اپنے گھوڑے سے اتر پڑا اس کی کوچیں کاٹ دیا اس کے چہرے پر غصہ میں ایک طمانچہ مارا، پھر اس حالت میں حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہوا، مقابلہ شروع ہوا تھوڑی دیر دونوں نے اپنے جوہر دکھائے پھر حضرت علیؓ نے اس کو ٹھکانے لگا دیا۔[1] ان کے دوسرے شہسواروں میں نوفل بن خبیر بھی تھا، یہ دیکھ کر یہ سب شہسوار بھاگ نکلے اور خندق پھاند کر راہ فرار اختیار کی۔

ماں اپنے جگر کے ٹکڑے کو جہاد اور شہادت پر آمادہ کرتی ہے

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو بنی حارثہ کے قلعہ میں مسلمان عورتوں کے ہمراہ تھیں، اور اس وقت تک پردہ کا حکم نازل نہ ہوا تھا، بیان فرماتی ہیں کہ سعدؓ بن معاذ اُدھر سے گذرے وہ ایک اتنی چھوٹی زرہ پہنے ہوئے تھے کہ ان کا پورا ہاتھ اس سے باہر تھا، وہ رجز پڑھتے جاتے تھے، ان کی والدہ نے دیکھ کر کہا کہ بیٹے تم نے بہت دیر کر دی جلدی جاؤ، حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ میں نے ان سے کہا کہ ام سعد بخدا میری خواہش ہے کہ سعد کی زرہ اس سے بڑی ہوتی چنانچہ وہی ہوا جس کا خطرہ

---

[1] ابن کثیر ج ۴ ص ۱۰۵-۱۰۶

حضرت عائشہؓ نے ظاہر کیا تھا، اسی کھلے ہوئے ہاتھ پر ایک تیر لمبا آ کر لگا اس نے وہاں کی خاص رگ (اکحل) کاٹ دی، اور بنی قریظہ کے غزوہ کے موقع پر وہ شہید ہوگئے۔

غیبی نصرت

مشرکوں نے مسلمانوں کو اس طرح گھیر لیا کہ جیسے وہ کسی قلعے میں محصور ہو گئے ہوں، یہ محاصرہ تقریباً ایک ماہ تک جاری رہا اس درمیان ان کو قسم قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، اور منافقوں کا نفاق بھی ظاہر ہوگیا، چنانچہ بعض لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے مدینہ واپس جانے کی اجازت چاہی اور یہ بہانہ کیا کہ ان کے گھر کھلے رہ گئے ہیں حالانکہ ایسی کوئی بات نہ تھی اور سب گھر محفوظ تھے، یہ صرف راہ فرار اختیار کرنے کی ترکیب تھی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرام خوف و پریشانی کی اس کیفیت میں تھے کہ اچانک نعیم بن مسعود غطفانی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا یا رسول اللہ! میں اسلام لا چکا ہوں لیکن میری قوم کو میرے اسلام لانے کا علم نہیں ہے اب جیسا منشا ہو حکم فرمائیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اکیلے آدمی ہو تم رہ کر ہماری مدد کرو، اس لئے کہ جنگ حیلہ و تدبیر کا نام ہے، نعیم بن مسعودؓ وہاں سے رخصت ہوئے بنی قریظہ کے پاس آئے اور ان سے کچھ ایسی باتیں کیں کہ ان کو خود اپنے موقف اور رویہ پر شبہ پیدا ہوگیا کہ قریش اور قبائل غطفان سے (جو باہر کے لوگ ہیں) ان کا یہ ربط و ضبط اور مہاجرین اور انصار سے (جو مقامی باشندے اور ان کے پرانے پڑوسی ہیں) ان کی

لہ ابن کثیر جلد ۳ ص ۲۰۲

یہ دشمنی کہاں تک صحیح ہے انھوں نے ان کو یہی مشورہ دیا کہ وہ قریش اور غطفان کی حمایت
میں لڑنے سے پہلے ان کے کچھ خواص اور سرداروں کو اپنے پاس بطور یرغمال رکھ لیں تاکہ
ان کا بھروسہ رہے انھوں نے یہ سن کر کہا واقعی تم نے بہت اچھی بات سجھائی پھر وہ یہاں سے
چل کر وہ سرداران قریش کے پاس گئے اور اپنی خیر خواہی اور اخلاص کا مظاہرہ کرنے
کے بعد ان سے کہا کہ یہود اپنے اس فعل پر پچھتا رہے ہیں اور یہ سوچ رہے ہیں کہ قریش کے کچھ
شرفاء اور سربرآوردہ لوگ بطور ضمانت ان کے ہاتھ میں رہیں تاکہ کوئی عہد شکنی کا خطرہ
نہ رہے ان کا ارادہ یہ ہے کہ ان سرداروں کو وہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے حوالہ کر دیں گے
اور وہ ان کے سر تلوار سے اڑا دیں گے پھر غطفان کے پاس گئے اور ان سے بھی وہی
کہا جو قریش سے کہہ چکے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں فریق ایک دوسرے سے چوکنے
اور محتاط ہو گئے اور ان کے دلوں میں یہود کی طرف سے سخت کینہ پیدا ہو گیا تمام متفقہ
پارٹیوں میں تفرقہ پڑ گیا اور ہر شخص ایک دوسرے سے خائف رہنے لگا چنانچہ جب ابوسفیان
اور قبیلہ غطفان کے سرداروں نے ایک فیصلہ کن جنگ کا آغاز کرنا چاہا تو یہود نے ٹال مٹول
سے کام لینا شروع کیا اور ان کے کچھ آدمی بطور یرغمال کے طلب کئے جب یہ بات
انھوں نے سنی تو ان کو پورا یقین ہو گیا کہ نعیم بن مسعود نے جو کچھ کہا تھا حرف بحرف صحیح
تھا، انھوں نے ان کی یہ درخواست قبول کرنے سے انکار کر دیا، دوسری طرف یہود کو بھی
اندازہ ہو گیا کہ ان کی بات سچی تھی، اس طرح ان سب کے قویٰ اور ارادوں میں اضمحلال
پیدا ہو گیا اور ان کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ کا کرنا یہ ہوا کہ کفر و شرک کے ان لشکروں اور دشمنان دین کی ان
فوجوں پر ان سرد بستہ راتوں میں ایسی تیز ہوا چلی کہ ان کی قیام گاہیں اکھڑ گئیں اور

دیگچیاں الٹ گئیں یہ منظر دیکھ کر ابوسفیان نے کہا کہ قریش کے لوگو! اب ٹھہرنے کی جگہ نہیں رہی، ہمارے خچر اور گھوڑے ہلاک ہو گئے، بنو قریظہ نے ہم سے بدعہدی کی ہے اور بہت وحشت ناک اور تکلیف دہ اطلاعیں ان کی طرف سے ہم کو ملی ہیں، اس آندھی نے جو قیامت ڈھائی ہے وہ بھی تم لوگ دیکھ رہے ہو، دیگچیاں تک ٹھہر نہیں رہی ہیں، آگ جلانا مشکل ہو رہا ہے ہماری کوئی قیام گاہ اور جائے پناہ محفوظ نہیں رہ گئی، اب یہاں سے چل نکلو، میں بھی واپس جانے کا ارادہ کر چکا ہوں، یہ کہہ کر ابوسفیان اپنے اونٹ کے قریب گئے جو بندھا ہوا تھا، اس پر بیٹھ گئے اور اس کو ایڑ لگائی، جب اونٹ کھڑا ہو گیا تب اس کی رسی کھولی۔

جب غطفان کو یہ خبر پہونچی کہ قریش کوچ کر گئے تو انھوں نے بھی اپنی جگہ کا رُخ کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت نماز پڑھ رہے تھے، حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ جن کو آپ نے ان متحدہ پارٹیوں میں اپنا مخبر بنا کر بھیجا تھا کہ وہ آپ کو ان کی نقل و حرکت سے آگاہ کر سکیں، واپس آئے تو جو کچھ دیکھا تھا اس سے آپ کو آگاہ کر دیا۔[1]
صبح نمودار ہوئی تو آپ خندق چھوڑ کر مدینہ تشریف لے چلے، مسلمان بھی واپس آ گئے اور اپنے ہتھیار رکھ دیئے،[2] قرآن کریم اس واقعہ کے بارے میں کہتا ہے:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا	مومنو! خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو
نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ	جو (اس نے) تم پر (اس وقت) کی
جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ	جب فوجیں تم پر (حملہ کرنے کو) آئیں

[1] پورا واقعہ صحیح مسلم باب غزوۃ الاحزاب بروایت ابن اسحٰق ملاحظہ کریں۔

[2] تفصیل سیرت ابن کثیر ج ۳ ص ۲۳۲ میں ملاحظہ فرمائیں۔

رِيحًا وَّجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَكَانَ	تو ہم نے ان پر ہوا بھیجی اور ایسے
اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ۝	لشکر نازل کئے جن کو تم دیکھ
(سورۂ احزاب۔ ۹)	نہیں سکتے تھے اور جو کام تم کرتے
	ہو خدا ان کو دیکھ رہا ہے۔
وَرَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا	اور جو کافر تھے ان کو خدا نے پھیر دیا
بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوا خَيْرًا	وہ اپنے غصے میں بھرے ہوئے
وَكَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ	تھے کچھ بھلائی حاصل نہ کر سکے
وَكَانَ اللَّهُ قَوِيًّا عَزِيزًا ۝	اور خدا مومنوں کو لڑائی کے بارے
(سورۂ احزاب۔ ۲۵)	میں کافی ہوا اور خدا طاقتور
	(اور) زبردست ہے۔

اس طرح جو بادل بڑے زور و شور سے اٹھا تھا وہ گرج چمک کر بغیر برسے نکل گیا اور مدینہ کا مطلع صاف تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس سال کے بعد اب قریش تم پر چڑھ کر نہ آئیں گے بلکہ تم ہی ان پر حملہ آور ہو گے۔[1]

غزوۂ خندق میں مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ ساٹھ آدمی شہید ہوئے اور مشرکین کے چار آدمی قتل کئے گئے۔

---

[1] سیرت ابن کثیر جلد ۳ صفحہ ۲۲۱

غزوۂ بنی قُریظہ

(۵ھ)

بنی قریظہ کی عہد شکنی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک ایسا عہد نامہ تحریر کرایا جس میں یہود کو امان دی گئی تھی اور ان سے معاہدہ کیا گیا تھا جس میں ان کے مذہب اور مال واملاک کی حفاظت کی ذمہ داری لی گئی تھی، کچھ شرطیں ان کے حق میں لگائی گئی تھیں، اور کچھ شرطیں ان پر عائد کی گئی تھیں، اس عہد نامہ کی خاص خاص باتیں یہ تھیں۔

یہود میں سے جو ہمارا ساتھ دے گا اس کے ساتھ تعاون اور مساوات کا معاملہ کیا جائے گا، نہ ان پر ظلم کیا جائے گا، اور نہ ان کے خلاف مدد کی جائے گی، مدینہ کا کوئی مشرک قریش کے جان و مال کو امان اور پناہ دے گا اور نہ کسی مومن کے مقابلہ میں اس کے لئے سینہ سپر ہوگا، یہود لڑائی میں جب تک شریک رہیں گے مسلمانوں کی طرح اس کے اخراجات بھی برداشت کریں گے، یہود کے قبائل[1] مسلمانوں کے ساتھ ایک قوم کی طرح رہیں گے، یہودیوں کو اپنے مذہب کی آزادی ہوگی، مسلمانوں کو اپنے مذہب کی،

---

[1] اس معاہدہ میں قبائل یہود کے نام یہ دیئے گئے ہیں، بنی عوف، بنی ساعدہ، بنی جشم، بنی الاوس اور بنی ثعلبہ۔

وہ اپنے ہاتھوں غلاموں اور اپنے معاملہ میں پوری طرح با اختیار ہوں گے۔

اس بنا پر یہ بھی تھا کہ اس عہدنامہ اور تحریری معاہدہ کی رو سے جنگ میں ایک دوسرے کی مدد کرنا ان پر لازم ہوگا جائز امور اور اطاعت الٰہی کے حدود کے اندر خیرخواہی خلوص اور صلاح کا رویہ رکھنا ہوگا، یثرب پر حملہ ہوا تو وہ مشترکہ طور پر اس کا مقابلہ کریں گے[1] لیکن بنی النضیر کے سردار حیی بن اخطب یہودی نے بنی قریظہ کو مسلمانوں سے عہد شکنی اور قریش سے اتحاد و دوستی پر آمادہ کر لیا حالانکہ ان کے سردار کعب بن اسد القرظی نے کہا تھا کہ میں نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم میں سچائی اور وفاداری کے سوا کوئی اور چیز نہیں دیکھی[2] بہرحال کعب بن اسد نے اپنا عہد توڑ دیا اور اس کے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے درمیان جو کچھ طے پایا تھا اس سے اپنے کو بری کر لیا۔

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ان کی اس عہد شکنی کی اطلاع ملی تو آپ نے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو جو اوس کے سردار تھے اور اوس بنو قریظہ کے حلیف تھے اور خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو انصار کے کچھ لوگوں کے ساتھ اس خبر کی تحقیق کے لئے روانہ کیا، وہاں پہنچ کر پتہ لگا کہ جتنا سنا تھا اس سے بدتر حالت پائی، ان لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے نازیبا الفاظ استعمال کئے اور صاف یہ کہنے لگے کیسا اللہ کا رسول؟ ہمارے اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے درمیان کوئی عہد و معاہدہ نہیں[3] انھوں نے جنگ کی باقاعدہ تیاری بھی شروع کر دی اور مسلمانوں کو پیچھے سے چھرا گھونپنا چاہا

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۵۰۳-۵۰۱ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۲۱-۲۲۰ [3] مونٹگمری واٹ کی کتاب CAMBRIDGE HISTORY OF ISLAM میں ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک جدا قبیلہ باقی رہ گیا تھا یہ بنی قریظہ کا قبیلہ تھا جب مشرکین نے مدینہ کا محاصرہ کیا تھا تو اس وقت مسلمانوں (ج ۱ ص ۴۳) میں

بے نوعیت کھلے ہوئے حملے اور دو بدو میدان جنگ سے کہیں زیادہ سخت اور خطرناک تھا اس صورت حال کی تصویر قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات میں اس طرح پیش کی گئی ہے :

إِذْ جَاءُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ (سورۃ احزاب ۔ ۱۰)	جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی طرف تم پر چڑھ آئے ۔

مسلمانوں کے لئے یہ بہت سخت حادثہ تھا اور اس کو قدرتی طور پر بہت محسوس کیا گیا اس کا اندازہ یہیں اس سے ہو سکتا ہے کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ (جو ان سے زیادہ سے زیادہ قریب اور مصیبت میں مددگار و غمگسار رہ چکے تھے) غزوہ خندق کے موقع پر جب ایک تیر ان کے شانہ پر لگا اور اس سے وہاں کی ایک نازک اور اہم رگ کٹ گئی اور ان کو اپنی موت کا یقین ہو گیا تو یہ جملہ کہا کہ "اے اللہ مجھے اس وقت تک موت نہ دے جب تک میری آنکھیں بنی قریظہ کی تباہی دیکھ کر ٹھنڈی نہ ہو جائیں"[1]

بنی قریظہ کی طرف پیش قدمی

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان غزوہ خندق سے واپس ہوئے اور مدینہ پہنچ کر سب مسلمانوں نے اپنے ہتھیار رکھ دیئے تو حضرت جبرئیل تشریف

(باقی صفحہ ۳۳۸) کے ساتھ خلوص و دوستی کا اظہار ہوتا تھا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ دوبارہ مشرکین سے مل چکا تھا اور پشت سے وار کرنے کے لئے کسی موقع کے انتظار میں تھا (امتاع [illegible]) ۔

[1] حضرت سعد کو ایک قریشی کا تیر لگا تھا بنی قریظہ کے کسی آدمی کے ہاتھ سے انھوں نے زخم نہیں کھایا تھا صحیح بخاری میں اس کا نام ابن العرقہ قریشی بتایا گیا ہے اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس تیر کی وجہ سے حضرت سعد کو بنی قریظہ پر غصہ تھا اور اسی بنا پر انھوں نے یہ سخت فیصلہ کیا ۔

لائے اور کہا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ نے ہتھیار رکھ دیئے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں، اس پر حضرت جبرئیل نے کہا کہ فرشتوں نے ابھی اپنے ہتھیار نہیں رکھے، اللہ عزوجل نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ بنی قریظہ کی طرف روانہ ہو جائیں، میں بھی وہیں کا ارادہ کر رہا ہوں کہ ان میں تزلزل پیدا کر دوں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک منادی کرنے والے کو طلب فرمایا اور حکم دیا کہ وہ لوگوں میں جا کر اعلان عام کرے کہ ہر اس شخص کو جو سننے اور ماننے والا ہے یہ چاہیے کہ نماز عصر بنی قریظہ میں پڑھے۔[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ میں پہونچ کر ان کا محاصرہ کر لیا جس کا سلسلہ پچیس شب و روز جاری رہا، یہاں تک کہ وہ اس محاصرہ سے تنگ آ گئے، اللہ تعالےٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔[2]

ابولبابہ کی ندامت اور توبہ کی قبولیت

اس درمیان میں بنی قریظہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے پاس بنی عمرو بن عوف کو بھیج دیجئے (یہ لوگ اوس کے حلیف بھی تھے) تاکہ ہم ان سے اپنے معاملہ میں مشورہ کر سکیں، ان کی درخواست پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ابولبابہ کو وہاں بھیج دیا، ان کو دیکھتے ہی سب لوگ سروقد کھڑے ہو گئے، عورتیں اور

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۳۳-۲۳۴، صحیح بخاری میں یہ قصہ کسی قدر تفصیل و اضافہ کے ساتھ باب "مرجع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الاحزاب، و مخرجه الی بنی قریظه و محاصرته ایاهم" میں بیان کیا ہے، صحیح مسلم میں کتاب الجہاد والسیر میں باب جواز قتال من نقض العهد و جواز انزال اهل الحصن علی حکم حاکم عدل اهل للحکم "میں یہ واقعہ دیا ہے۔ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۳۵

بچے دھاڑیں مار کر رونے لگے، یہ دیکھ کر ان کا دل کچھ پسیج گیا، اس کے بعد یہ سب لوگ کہنے لگے ابولبابہ! کیا محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے فیصلہ پر سر تسلیم خم کر لیا جائے؟ تو انھوں نے کہا ہاں، اسی کے ساتھ اپنے گلے پر ہاتھ پھیر کر اس کی طرف اشارہ کیا، ابولبابہؓ کہتے ہیں کہ ابھی میرے قدم بھی وہاں سے نہ ہٹنے پائے تھے کہ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اللہ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی خیانت کی ہے، چنانچہ وہ فوراً الٹے پاؤں واپس ہوئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کے بجائے مسجد نبوی کے ایک ستون سے اپنے کو باندھ دیا اور اعلان کر دیا کہ میں اس وقت تک اس جگہ سے نہ ہٹوں گا جب تک اللہ تعالیٰ میرے قصور کو معاف نہ فرما دے گا، انھوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کیا کہ آئندہ وہ بنی قریظہ کے علاقہ میں قدم بھی نہ رکھیں گے، اور اس مقام کی بھی شکل نہ دیکھیں گے جہاں انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی خیانت کی تھی۔

جب اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور یہ آیت نازل ہوئی۔

وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللَّهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ

(سورۃ توبہ - ۱۰۲)

اور کچھ لوگ ہیں کہ اپنے گناہوں کا (صاف) اقرار کرتے ہیں انھوں نے اچھے اور برے عملوں کو ملا جلا دیا تھا قریب ہے کہ خدا ان پر مہربانی سے توجہ فرمائے بے شک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

تو فوراً لوگ ان کو کھولنے کے لئے تیزی سے آگے بڑھے، انھوں نے کہا نہیں خدا کی قسم جب تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خود اپنے دست مبارک سے مجھے آزاد نہ کریں گے

میں اسی حالت میں رہوں گا جب نماز فجر کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور ان کے قریب سے گذرے تو آپ نے ان کو کھولا کیونکہ اس تنے سے تقریباً بیس رات بندھے رہے ہر نماز کے وقت ان کی اہلیہ آتیں اور نماز کے لئے ان کو کھول دیتیں پھر وہ دوبارہ اپنے کو اس سے باندھ لیتے۔[1]

سعد بن معاذؓ کی حق پرستی اور بے لاگ فیصلہ

بنو قریظہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو تسلیم کر لیا لیکن قبیلۂ اوس کے دل میں بنی قریظہ کی طرف سے نرم گوشہ تھا، وہ تیزی کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ خزرج کے مقابلہ میں ہمارا ان سے معاہدہ ہے اور انھوں نے ہمارے بھائیوں کے حلیفوں (یعنی بنی قینقاع) کے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ آپ کے علم میں ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ بات سن کر فرمایا اوس کے لوگو! کیا تم اس پر تیار ہو کہ تمہارا ہی کوئی آدمی اس کا فیصلہ کر دے انھوں نے کہا ہاں ہم تیار ہیں، آپ نے فرمایا میں یہ کام سعدؓ بن معاذ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں ان کو بلوایا گیا، جب وہ آئے تو ان کے قبیلہ والوں نے ان سے کہا کہ ابو عمرو! اپنے حلیفوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، اس لئے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تمہارے سپرد یہ معاملہ اسی لئے کیا ہے کہ تم ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ کرو جب انھوں نے زیادہ اصرار کیا تو انھوں نے کہا کہ سعد کو قسمت سے یہ موقع ملا ہے کہ آج اس کو حکم الٰہی کے سامنے اس وقت کسی کی ملامت کی

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۳۷-۲۳۸

بہرحال سعد نے کہا میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ ان کے مرد قتل کر دیئے جائیں ان کا مال تقسیم کر لیا جائے بچے اور عورتیں غلام بنا لئے جائیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔[1]

اسرائیلی شریعت کے مطابق سزا

یہ فیصلہ بنی اسرائیل کی شریعت کے جنگی قوانین کے بھی مطابق تھا اس لئے کہ تورات آیت ۱۱-۱۲-۱۳ میں ہے:-

"اور جب تو کسی شہر کے پاس اس سے لڑنے کے لئے آپہونچے تو پہلے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۲۴۰۔ مسلم شریف کے الفاظ یہ ہیں قضیت بحکم اللہ وربما قال بحکم الملک "تم نے اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا اور شاید آپ نے یہ فرمایا کہ الملک کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ کیا" مشہور روایت کسرہ کے ساتھ ہے اور اس کے معنی وہ ہیں جو مذکور ہوئے بعض روایتوں میں فتحہ کے ساتھ ہے اس سے حضرت جبرئیل علیہ السلام مراد ہیں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتہ جو فیصلہ لے کر آیا تھا اس کے مطابق تم نے فیصلہ کر دیا (صحیح مسلم باب جواز قتال من نقض العہد کتاب الجہاد والسیر)

ان مقتولین کی تعداد آٹھ سو یا نو سو لکھی ہے جیسا کہ کامل ابن اثیر ج ۲ صفحہ ۱۲۲ میں ہے۔

بعض معاصر اہل قلم نے مدینہ جیسے چھوٹے شہر اور نبوی رحمت کی کریمانہ سیرت کے پیش نظر تاریخی اسناد کے بجائے قیاس کا سہارا لے کر اس تعداد کو مستبعد قرار دیا ہے ملاحظہ ہو ڈاکٹر برکات احمد کی کتاب (MUHAMMAD & THE JEWS) اس واقعہ کے متعلق (جو عہد کے دینی شعور کو متاثر کرنے والا ہے) یہودی مآخذ بھی خاموش ہیں ایک یہودی مؤلف اسرائیل ولفنسن نے جو ابو ذؤیب مصری کی پی ایچ ڈی کی کتاب آثار شہداء یہود لکھی لیکن اس نے بھی بنو قینقاع اور بنو نضیر کی مدینہ سے جلاوطنی اور بنو قریظہ کے جنگ جوؤں کے قتل کا ذکر نہیں کیا۔

اس سے صلح کا پیغام کر تب یوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور
اور دروازے تیرے لئے کھول دے تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جائے
تیری خراج گزار ہوگی اور تیری خدمت کرے گی اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے
بلکہ تجھ سے جنگ کرے تو اس کا محاصرہ کر اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے
قبضہ میں کر دیوے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر مگر
عورتوں اور لڑکوں اور مواشی کو اور جو کچھ اس شہر میں ہو اس کا سارا لوٹ
اپنے لئے لے (کتاب استثناء۔ باب ۲۰ آیات ۱۰ تا ۱۴ کتاب مقدس
منجانب بائبل سوسائٹی ۱۹۸۲ء)۔

بنی اسرائیل میں قدیم زمانہ میں یہی رواج تھا توریت میں آتا ہے اور انھوں نے
مدیانیوں سے لڑائی کی جیسا خداوند نے موسیٰ کو فرمایا تھا۔ اور سارے مردوں کو قتل کیا
اور انھوں نے ان مقتولوں کے سوا اوی اور رقم اور صور اور حور اور ربع کو جو مدیان کے
پانچ بادشاہ تھے جان سے مارا اور بعور کے بیٹے بلعام کو بھی تلوار سے قتل کیا۔ اور
بنی اسرائیل نے مدیان کی عورتوں اور ان کے بچوں کو اسیر کیا اور ان کی مواشی
اور بھیڑ بکری اور مال و اسباب سب کچھ لوٹ لیا اور ان کے سارے شہروں کو جن میں
وے رہتے تھے اور ان کے سب قلعوں کو پھونک دیا۔[1]

موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اسی قانون پر عمل کیا جاتا تھا اور اس کو ان کی
اجازت اور تائید حاصل تھی توریت کہتی ہے۔

"تب موسیٰ اور العازر کاہن اور جماعت کے سارے سرداران کے استقبال

---

[1] کتاب مقدس گنتی باب ۳۱ آیت ۷ تا ۱۰ منجانب بائبل سوسائٹی مطبوعہ ۱۹۸۲ء۔

کے لیے خیمہ گاہ سے باہر گئے اور یہود کے لشکر کے رئیسوں پر جو ہزار بندوں کے سردار تھے اور ان پر جو سیکڑوں کے سردار تھے جو جنگ کر کے پھرے غصہ ہوا اور ان کو کہا کہ کیا تم نے سب عورتوں کو جیتا رکھا؟[1] سعد بن معاذ کے اس فیصلہ اور حکم کی تعمیل کی گئی، اور اس طرح مدینہ یہودی سازش، مکر و فریب اور فتنہ سامانیوں سے محفوظ ہو گیا اور مسلمانوں کو اطمینان ہو گیا کہ اب پیچھے سے ان پر کوئی حملہ نہ ہوگا اور کسی اندرونی سازش کو سر اٹھانے کا موقع نہ ملے گا۔

خزرج نے سلام بن ابی الحقیق کو بھی قتل کر دیا جس نے مسلمانوں کے خلاف یہ سب پارٹی بندی کی تھی، اور ان کا ناپاک اتحاد قائم کیا تھا، اس سے پہلے "اوس" کعب بن الاشرف کا خاتمہ کر چکے تھے، جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عداوت اور آپ کے خلاف لوگوں کو اکسانے اور شورشیں برپا کرنے میں سب سے آگے تھا، ان دونوں کے قتل سے مسلمانوں کو فتنہ و فساد کے ان سرچشموں سے نجات ملی جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مستقل اور ہمہ وقت سازش میں مشغول رہتے اور نئی نئی تحریکیں اور تجویزیں کرتے رہتے تھے، اور سب نے اطمینان کی سانس لی۔[2]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ سے جو معاملہ فرمایا وہ جنگی سیاست اور عرب کے یہودی قبائل کی سرشت اور افتاد طبع کے مطابق تھا، ان کے لئے اسی قسم کی سخت اور عبرت ناک سزا کی ضرورت تھی جس سے عہد شکنی کرنے والوں اور دھوکہ بازوں کو ہمیشہ کے لئے سبق مل جائے اور آئندہ نسلیں اس سے عبرت پکڑیں، R. V. C. BODLEY اپنی کتاب THE MESSENGER—THE LIFE OF MOHAMMAD میں اس واقعہ پر

---

[1] ایضاً آیت ۱۳-۱۴-۱۵۔ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۷۴-۲۷۵

قبیلے کے ایک سرسری فیصلے کی رو سے قتل کیے جانے پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔[1]

مدینے میں یہود کے اس آخری قلعے اور مورچے کے خاتمے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ نفاق کا کیمپ قدرتی طور پر کمزور پڑ گیا اور منافقین کی کمر گویا شکست ہو گئی۔ ان کے حوصلے پست ہو گئے اور ان کی بہت کچھ خود اعتمادی اور بڑی بڑی امیدیں جو انھوں نے باندھ رکھی تھیں ختم ہو گئیں اس لیے کہ ان کے مستحکم قلعوں میں سے آخری قلعہ تھا جو فتح ہو گیا۔ ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون نے غزوۂ بنی قریظہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔

"جہاں تک منافقین کا تعلق ہے بنی قریظہ کی لڑائی کے بعد ان کی آواز پست پڑ گئی اور اس کے بعد ان کے اعمال و اقوال سے کوئی ایسی بات ظاہر نہیں ہوئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے فیصلے کے خلاف ہوتی جیسا کہ اس سے پہلے توقع کی جا رہی تھی۔"[2]

عفو و درگذر اور سخاوت و دریا دلی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجد کی طرف کچھ سواروں کو ایک مہم پر روانہ فرمایا

---

[1] SELECTION FROM THE KORAN [illegible], P. [illegible]

[2] تاریخ الیہود فی بلاد العرب ص۱۵۱۔ استاذ محمد احمد باشمیل نے صحیح لکھا ہے کہ غزوۂ احزاب "صرف یہودی غزوہ تھا جسے یہود کے سازشی ذہن نے تخمیر میں برپا کیا اور اس میں یہودی سرمایہ صرف ہوا یہ جنگ چھیڑنے والا یہودی دماغ اور بھڑکانے کے لیے تمام قوتوں کے حصول کے لیے یہی صرف ہوتا ہے" غزوۂ بنی قریظہ غزوۂ احزاب کا قدرتی تکملہ تھی کیونکہ یہود بنی قریظہ ہی تیسرے محاذ کا تیسرا بازو تھا جو مسلمانوں کو بالکلیہ برباد کرنے پر تلا ہوا تھا (غزوۂ بنی قریظہ ص۱۲۳-۱۵۵)

یہ لوگ واپس لوٹے تو اپنے ساتھ بنی حنیفہ کے سردار ثمامہ بن اثال کو قیدی بنا کر لائے اور ان کو مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا گیا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُدھر سے گزرے تو آپ نے ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا ثمامہ! کچھ کہنا تو نہیں ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اگر آپ قتل کریں گے تو ایسے شخص کو قتل کریں گے جس کی گردن پر خون ہے اگر احسان کریں گے تو ایک شکر گزار اور احسان شناس پر احسان کریں گے اور اگر آپ کو مال و دولت مطلوب ہے تو آپ بتائیں آپ جو مطالبہ بھی کریں گے وہ پورا کیا جائے گا۔ آپ یہ سن کر آگے بڑھ گئے دوسری بار جب آپ کا اُدھر سے گزر ہوا تو آپ نے اس سے یہی سوال کیا اور اس نے یہی جواب دیا اور آپ نے وہی رویہ اختیار کیا جو پہلے کیا تھا تیسری بار جب آپ اُدھر تشریف لے گئے تو آپ نے حکم دیا کہ ثمامہ کو رہا کر دو، چنانچہ اس کو رہا کر دیا گیا اس کے بعد ثمامہ نے مسجد کے قریب ایک کھجور کے باغ میں جا کر غسل کیا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا اور عرض کیا کہ خدا کی قسم ایک وقت تھا کہ مجھے آپ کے چہرے سے زیادہ کوئی چہرہ برا نہ لگتا تھا لیکن آج آپ کا رخِ انور مجھے ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے اور خدا کی قسم آپ کے دین سے زیادہ روئے زمین پر مجھے کسی اور دین سے بغض نہ تھا لیکن آج آپ کا دین سارے ادیان و مذاہب سے زیادہ مجھے عزیز و محبوب ہے میرا قصد یہ تھا کہ میں عمرہ کی نیت سے جا رہا تھا کہ آپ کے سواروں نے مجھے گرفتار کر لیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بشارت دی اور عمرہ ادا کرنے کی ہدایت فرمائی، جب ثمامہ قریش سے ملے تو ان لوگوں نے کہا کہ ثمامہ تم بے دین ہو گئے، انھوں نے جواب دیا نہیں خدا کی قسم میں تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایمان لایا ہوں، بخدا تمہارے پاس یمامہ سے گیہوں کا ایک دانہ بھی اس وقت تک نہ پہنچے گا جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منظوری

نہ ہوگی، یمامہ مکہ کے غلہ کی منڈی تھی اور وہیں سے غلہ کی رسد آتی تھی، اس کے بعد وہ اپنے علاقہ میں واپس گئے اور انھوں نے کارواں کو جو گیہوں لے کر جاتے تھے، مکہ جانے سے روک دیا، اس کا اثر یہ پڑا کہ قریش کو فاقہ کی نوبت آ گئی اور انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں عرض داشت بھیجی کہ ثمامہ کو غذائی اشیاء اور اجناس کے برآمد کی اجازت دے دیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی۔[1]

غزوۂ بنی المصطلق اور واقعۂ افک

شعبان ۵ھ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ملی کہ بنی المصطلق (جو خزاعہ کی ایک شاخ تھے) جنگ کے لئے جمع ہو رہے ہیں، یہ اطلاع سن کر آپ بھی مقابلہ کے لئے تشریف لے چلے اور منافقین کی اتنی بڑی تعداد آپ کے ساتھ ہو گئی کہ اس سے پہلے کسی غزوہ میں نہ تھی،[2] ان کا سربراہ اور قائد عبد اللہ بن اُبی ابن سلول بھی ساتھ تھا، غزوۂ احزاب میں جس میں قریش نے پورے اتحاد کا مظاہرہ کیا تھا اور دوسرے تمام قبائل اپنے ساتھ ملا لئے تھے، مسلمانوں کی فتح و کامرانی نے اس گروہ کو نعل در آتش کر دیا، مسلمانوں کا ستارۂ اقبال برابر عروج پر تھا، پیہم کامیابیاں کفار مکہ، مدینہ اور اس کے اطراف میں بسنے والے یہود اور منافقین کے لئے حلق کا ایک ایسا کانٹا بن گئی تھیں جس سے ان کو کسی وقت قرار و سکون نہ ملتا تھا، وہ یہ سمجھ چکے تھے کہ مسلمانوں کو اب میدان جنگ میں اور کثرت تعداد

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۷۷، صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر باب الامداد بالملائکۃ یوم بدر۔ [2] ابن سعد اپنی طبقات میں لکھتے ہیں آپ کے ساتھ اس غزوہ میں منافقین کی اتنی بڑی تعداد شریک ہوئی جو اس سے پہلے کبھی کسی غزوہ میں شریک نہیں ہوئی تھی (کتاب الطبقات الکبیر ج ۲ ق ۱ لائیڈن ۱۳۲۵ھ ص ۴۵)

اور ساز و سامان سے شکست نہیں دی جا سکتی، اس لئے انھوں نے داخلی محاذ میں رخنہ اندازی
اور فتنہ پردازی کا راستہ اختیار کیا، مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کے لئے قومی اور قبائلی نخوت
کو ہوا دی، مقام رسالت کی بے حرمتی اور مسلمانوں کے اعتماد و یقین کو کمزور کرنے کا منصوبہ
بنایا اور کاشانۂ نبوت کے خلاف زبان درازی اور الزام تراشی کی خطرناک مہم چلانے کا
فیصلہ کیا، ان کا خیال تھا کہ اس طرح اس نئے اور مثالی معاشرے کی جڑیں ہل جائیں گی
جس میں ہر فرد دوسرے کا آئینہ ہے، جب وہ اپنے بھائی کے بارے میں کوئی ناروا حرکت دیکھتا یا
بات سنتا ہے تو پہلے اپنا جائزہ لیتا ہے، اگر اپنے نفس کو پاک اور صاف پاتا ہے تو جس طرح
اپنے لئے ایسی بے بنیاد بات نہیں کرتا دوسرے کے لئے بھی نہیں کرتا، اسی طرح اگر اہل بیت
نبوت پر اعتماد نہ رہے تو اس معاشرے میں ایک دوسرے پر سے اعتماد اٹھ جائے گا،
کسی شخص پر بھی اعتماد باقی نہ رہے گا، یہ بلاشبہ منافقین کی ایک نہایت خطرناک اور
گہری سازش تھی، اور یہ چال اور مکر و فریب کی پالیسی بنی المصطلق کے غزوہ میں
جس طرح کھل کر سامنے آئی اتنی کسی اور غزوہ میں نہ آئی تھی۔

آخر کار لڑائی کا وقت آپہونچا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مقابلہ کے لئے روانہ
ہوئے اور بنی المصطلق کے چشمہ پر جس کو مریسیع[1] کہتے ہیں آپ نے قیام کیا، یہ جگہ ساحل
کے قریب بمقام قدید کے قریب واقع تھی، یہاں دونوں لشکر باہم دست و گریبان
ہوئے اور انجام کار بنی المصطلق کو شکست ہوئی۔[2]

---

[1] اسی نسبت سے اس غزوہ کو غزوۃ المریسیع بھی کہا جاتا ہے (دیکھئے طبقات ابن سعد وغیرہ) [2] غزوہ
بنی المصطلق سیاسی، قومی اور اقتصادی اہمیت کا بھی حامل تھا اس لئے کہ اس کا حصہ ہی مقام مریسیع کر
کی تجارت کی شاہراہ پر واقع تھا، جو مکہ سے مدینہ کا ایک ذیلی راستہ بھی تھا، جس سے مسافر اور تجارتی قافلے گزرتے

اسی موقع پر حضرت عمرؓ کا ایک اجیر جو بنی غفار کے قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا اور
جہینہ کا ایک شخص جو خزرج کا حلیف تھا آپس میں لڑنے لگے تو جہنی نے آواز لگائی
اے انصاریو! اجیر نے صدا لگائی اے مہاجرین! عبداللہ بن ابی بن سلول یہ سن کر
بہت غصہ ہوا وہ اس وقت اپنے آدمیوں میں بیٹھا ہوا تھا اس نے کہا کیا ان مہاجرین
کے حوصلے یہاں تک پہنچے؟ انھوں نے ہمارے علاقے میں آکر ہم سے رسہ کشی کی اور اپنی تعداد
بڑھانے کی کوشش کی، واللہ یہ معاملہ ویسا ہی ہے جیسا اس مثال میں بیان کیا گیا ہے:
"سَمِّنْ كَلْبَكَ يَأْكُلْكَ" اپنے کتے کو خوب کھلا پلا کے موٹا کرو تم ہی کو کھائے گا، خدا کی قسم جب
ہم مدینہ واپس جائیں گے تو وہاں کے باعزت و سربرآوردہ وہاں کے ذلیل لوگوں کو
نکال باہر کریں گے، پھر اپنے آدمیوں کی طرف متوجہ ہو کر اس نے کہا یہ سب کچھ تم نے اپنے ہاتھوں
کیا ہے تم نے اپنے وطن میں ان کو جگہ دی، اپنا مال اپنے اور ان کے درمیان تقسیم کیا، خدا کی قسم
اگر تم اپنے ہاتھ کو ذرا روک لیتے اور اس قدر فراخ دلی سے کام نہ لیتے تو وہ یقیناً دوسرا گھر دیکھتے۔

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سنی تو آپ نے لشکر کی واپسی کا حکم دیا
تاکہ لوگ فتنہ میں نہ پڑیں اور شیطان کو وسوسہ اندازی کا موقع نہ مل سکے، یہ واپسی آپ کے
معمول کے خلاف تھی، آپ کے حکم پر سب لوگ چل کھڑے ہوئے آپ اس روز مسلسل چلتے رہے
یہاں تک کہ شام ہو گئی، رات بھر سفر رہا یہاں تک کہ صبح ہو گئی سفر جاری رہا یہاں تک کہ
دن چڑھ گیا اور دھوپ کی تمازت سے لوگوں کو تکلیف ہونے لگی، اس وقت آپ نے قیام
فرمایا، لوگ اس قدر تھک چکے تھے کہ زمین سے ان کی پیٹھ بھی نہ لگی تھی کہ وہ نیند کی آغوش
میں پہنچ گئے، عبداللہ بن ابی کے فرزند عبداللہ لشکر سے پہلے مدینہ پہنچ گئے اور راستہ میں
اپنے باپ کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے، انھوں نے عبداللہ بن ابی کو دیکھا تو اپنا اونٹ

بٹھا لیا اور کہا کہ میں تمہیں اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک کہ اپنی زبان سے تم نہ کہہ دو کہ میں ذلیل ہوں اور صاحب عزت محمد ہیں (صلے اللہ علیہ وسلم) اس دوران میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ادھر گذر ہوا آپ نے یہ سن کر فرمایا عبداللہ جانے دو جب تک وہ ہمارے درمیان ہیں ہم ان کے ساتھ اچھا ہی سلوک کریں گے۔[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ جب آپ سفر کا ارادہ فرماتے تو ازواج مطہرات کے لئے قرعہ ڈالتے جس کا نام نکلتا ان کو اپنے ہمراہ لے لیتے غزوہ بنی المصطلق میں حضرت عائشہ رضہ کے نام قرعہ نکلا چنانچہ آپ ان کو اپنے ہمراہ لے گئے واپسی پر جب مدینہ قریب ہوا تو آپ نے قیام فرمایا اور رات کا کچھ حصہ وہیں گذارا اس کے بعد آپ نے کوچ کا اعلان کیا حضرت عائشہ صدیقہ رضہ قضاء حاجت کے لئے گئیں تو ایک ہار جو ان کے گلے میں پڑا ہوا تھا کسی جگہ ٹوٹ کر گر گیا اور ان کو پتہ بھی نہ چل سکا جب وہ اپنے محمل میں واپس آگئیں تو ان کو معلوم ہوا کہ ان کا ہار غائب ہے وہ اس کی تلاش کے لئے پھر واپس گئیں اسی درمیان میں کوچ کا اعلان ہو گیا جن حضرات کے ذمہ ان کی سواری تھی وہ معمول کے مطابق آئے اور یہ سمجھ کر کہ حضرت عائشہ رضہ اندر ہیں محمل کو اٹھا لیا اور روانہ ہو گئے وہ بہت کم سن اور ہلکی پھلکی تھیں اس لئے ان کے بغیر ان کا بلند نہ ہو سکا اور اس کا شبہ بھی نہ ہو سکا کہ وہ اس کے اندر تشریف نہیں رکھتی ہیں حضرت عائشہ صدیقہ رضہ واپس آئیں تو یہاں کوئی نہ تھا سب روانہ ہو چکے تھے انہوں نے اپنی چادر اوڑھی اور وہیں لیٹ گئیں اسی درمیان میں صفوان بن معطل اسلمی جو اپنی ایک ضرورت سے قافلہ سے پیچھے رہ گئے تھے ادھر آ نکلے ان کو دیکھا تو انا للہ پڑھا اور کہنے لگے کہ یہ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حرم محترم ہیں اس کے بعد انہوں نے اپنا اونٹ ان کے قریب کر دیا اور خود

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۴۶ طبع لیڈن۔

پیچھے رہ گئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس پر سوار ہو گئیں تو انھوں نے اونٹ کی نکیل تھامی اور تیز رفتاری کے ساتھ قافلے کے تعاقب میں روانہ ہوئے جب وہ قافلے کے قریب پہونچے تو قافلہ منزل پر پڑاؤ کر چکا تھا لیکن اس واقعہ سے لوگوں میں کسی قسم کی سنسنی پیدا نہیں ہوئی اس لئے کہ صحرا کی زندگی اور قافلوں کی آمد و رفت میں وہ ان باتوں کے عادی تھے عزت و ناموس کی حفاظت ان کے خمیر میں تھی اور اس قسم کی پست خیالی سے ان کے عربی ذہن کا کوئی واسطہ نہ تھا جاہلیت اور اسلام دونوں میں یہی اصول کارفرما رہا ایک جاہلی شاعر کہتا ہے:-

وأغض طرفي ان بدت لي جارتي   حتى يواري جارتي مأواها

(دیوان الحماسہ)

"اگر میرے پڑوس کی کسی خاتون پر میری نظر بھی پڑ جاتی ہے تو میں اپنی نظریں نیچی کر لیتا ہوں یہاں تک کہ اس کا نشیمن اس کو اپنے اندر چھپا لے"

۱؎ اسی طرز عمل کی ایک جھلک ام سلمہ کے واقعہ میں بھی نظر آتی ہے جب ان کو اپنے شوہر کے ساتھ ہجرت کرنے سے روک دیا گیا، بچہ چھین لیا گیا اور وہ اس جگہ بیٹھ جاتیں اور شام تک روتی رہتیں، تقریباً ایک سال تک ان کا یہ حال رہا، یہاں تک کہ ان کو ترس آیا اور انھوں نے ان کو مدینہ جانے کی اجازت دے دی انھوں نے اپنا اونٹ تیار کیا اور اللہ کا نام لے کر اس پر بیٹھ گئیں اور روانہ ہو گئیں، راستہ میں انھیں عثمان بن طلحہ ملے اور ان کی یہ حالت دیکھ کر از راہ ہمدردی اونٹ کی نکیل تھام لی اور مدینہ تک ان کے ساتھ رہے۔ ام سلمہ کہتی ہیں کہ ان سے زیادہ کسی شریف عرب سے میرا سابقہ نہیں پڑا، ان کا حال یہ تھا کہ جب کوئی منزل آتی تو وہ اونٹ کو بٹھا کر پیچھے چلے جاتے میں اتر جاتی تو آتے اور سامان اتار کر اس کو ایک درخت سے باندھ دیتے آگے کہتی ہیں کہ جب تک مجھے مدینہ نہیں پہونچا دیا وہ برابر یہی کرتے رہے (سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۱۶-۲۱۷) یہ اس وقت کی بات ہے جب عثمان بن طلحہ اسلام نہیں لائے تھے اس بنا پر صفوان بن معطل السلمی اس پاک نفسی اور اخلاق عالیہ کے زیادہ مستحق تھے اس لئے کہ وہ بہت پہلے اسلام قبول کر چکے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و رفاقت کا شرف ان کو حاصل تھا۔

دوسری طرف صحابۂ کرام کا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے تعلق وہ تھا جو باپ بیٹے کے درمیان ہوتا ہے آپ کی ازواج مطہرات امہات المومنین کا درجہ رکھتی تھیں، وہ آپ ان کی نظر میں حقیقی باپ اور ساری دنیا سے زیادہ محبوب تھے صفوان بن المعطل بھی زہد و صلاح و تقویٰ اور حیا و عفت میں نیک نام تھے یہی ذکر آتا ہے کہ ان کو عورتوں سے کوئی دلچسپی اور سروکار نہ تھا۔

غرض کہ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جس کی طرف لوگوں کو التفات بھی ہوتا لیکن عبداللہ بن اُبی نے اس کو بالکل اپنا لیا اور مدینہ واپس آکر اس کا خوب چرچا کیا، منافقین نے جو اس کے منتظر تھے اس موقع کو غنیمت جانا اور اس کی اچھی طرح تشہیر کی، ان کے نزدیک یہ ایک ایسا حربہ تھا جس سے مسلمان آسانی کے ساتھ فتنہ میں پڑ سکتے تھے اور مقام رسالت اور اہل بیت کے ساتھ ان کی تعظیم اور محبت کا رشتہ کمزور کیا جا سکتا تھا، اس سے مسلمانوں کا باہمی اعتماد اور ایک دوسرے پر بھروسہ بھی مجروح ہوتا تھا، اس سازش کے کچھ ایسے سادہ دل مسلمان بھی شکار ہو گئے جن کو زیادہ باتیں کرنے کا شوق تھا اور جو بغیر تحقیق کے بات نقل کرنے کے عادی تھے۔[1]

جب حضرت عائشہؓ کو مدینہ میں اچانک اس کی خبر ہوئی تو وہ سناٹے میں آگئیں اور رنج و غم سے ان کا یہ حال ہو گیا کہ آنسو تھمتے نہ تھے راتوں کی نیند اڑ گئی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ معاملہ بہت سخت اور سنگین تھا، آپ کو جب علم ہوا کہ بات

---

[1] اسی بات کی طرف قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ (جب تم اپنی زبانوں سے اس کا ایک دوسرے سے ذکر کرتے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات کہتے تھے جس کا تم کو کچھ علم نہ تھا اور تم اسے ایک ہلکی بات سمجھتے تھے اور خدا کے نزدیک وہ بڑی بھاری بات تھی۔) (سورۃ النور۔ ۱۵)

کہاں سے چلی تھی تو اس وقت آپ تشریف لائے اور عبداللہ بن ابی کے سلسلے میں کچھ کہنے کی اجازت لی آپ منبر پر تشریف رکھتے تھے چنانچہ آپ نے فرمایا اے مسلمانو! ہے کون اس شخص کے معاملہ میں کچھ کہنے کی اجازت دیتا ہے جس کی وجہ سے گھر والوں کے بارے میں ایذا رسانی کا مجھے پتہ چلا ہے خدا کی قسم مجھے اپنے اہل خانہ کے بارے میں جو کچھ علم ہے وہ اطمینان بخش ہی ہے لوگوں نے اس معاملہ میں جن صاحب کا ذکر کیا ہے ان کے بارے میں بھی مجھے اچھی ہی بات معلوم ہے وہ جب کبھی میرے گھر آتے تو میرے ہمراہ آتے تھے، اوس کے کچھ لوگ یہ سن کر غیظ و غضب سے بھر گئے اور کہنے لگے کہ جس نے اتنی بڑی بات زبان سے نکالی ہے ہم اس کی گردن اڑا دینے کے لیے تیار ہیں خواہ وہ اوس کا آدمی ہو یا خزرج کا، عبداللہ بن ابی کا خزرج سے تعلق تھا اس کی یہ گفتگو سن کر قبائلی حمیت پیدا ہونے لگی اور دونوں قبیلے جوش میں آگئے قریب تھا کہ شیطان کا جادو ان پہ چل جائے اور وہ باہم دست و گریبان ہو جائیں لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے فہم و تدبر اور حلم و بردباری کی برکت سے یہ بات وہیں ختم ہو گئی، ادھر حضرت عائشہ کو اپنی بے گناہی کا پورا یقین تھا اس لئے ان کے رویہ میں اعتماد و خودداری اور عزت نفس کی پوری جھلک نظر آ رہی تھی ان کا حال اس بے گناہ اور معصوم صفت ہستی کا تھا جو ہر قسم کے شک و شبہ اور الزام سے بالاتر ہوتی ہے ان کو پورا یقین تھا کہ اللہ تعالے ان کو بالآخر صاف بری کر دے گا اور دامن رسالت پر بدگمانی و تہمت کا یہ داغ ہرگز باقی نہ رہے گا لیکن ان کو یہ خیال نہ تھا کہ اللہ تعالے اس کے لئے خاص طور پر وحی نازل فرمائے گا اور یہ آیتیں قرآن مجید کا جزو بن کر قیامت تک پڑھی جاتی رہیں گی ان کو زیادہ سے زیادہ انتظار بھی نہیں کرنا پڑا کہ ان کے بارے میں قرآن کی حسب ذیل

آیتیں نازل ہوئیں اور سات آسمانوں کے اوپر سے ان کی برأت کا اعلان کیا گیا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْکِ
عُصْبَۃٌ مِّنْکُمْ لَا تَحْسَبُوْہُ شَرًّا
لَّکُمْ بَلْ ھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ لِکُلِّ امْرِیٍٔ
مِّنْھُمْ مَّا اکْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ
وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَہٗ مِنْھُمْ لَہٗ
عَذَابٌ عَظِیْمٌ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْہُ
ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ
بِاَنْفُسِھِمْ خَیْرًا وَّقَالُوْا ھٰذَآ
اِفْکٌ مُّبِیْنٌ ۝

(سورۂ نور ۱۱-۱۲)

جن لوگوں نے بہتان باندھا ہے تم ہی
میں سے ایک جماعت ہے اس کو اپنے
حق میں برا نہ سمجھنا بلکہ وہ تمہارے
لئے اچھا ہے ان میں سے جس شخص نے
گناہ کا جتنا حصہ لیا اس کے لئے
اتنا وبال ہے اور جس نے ان میں سے
اس بہتان کا بڑا بوجھ اٹھایا ہے
اس کو بڑا عذاب ہوگا جب تم نے
وہ بات سنی تو مومن مردوں اور
عورتوں نے کیوں اپنے دلوں میں
نیک گمان نہ کیا اور کیوں نہ کہا
کہ یہ صریح بہتان ہے۔

اس طرح اس زبردست فتنہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا اور یہ بات اس طرح ختم ہوئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ مسلمان معمول کے مطابق اسی جوش اور ولولہ کار کے ساتھ اپنے ان عظیم کاموں کی تکمیل میں مشغول ہو گئے جن پہ نہ صرف ان کی بلکہ پوری انسانیت کی فلاح و کامرانی کا انحصار تھا۔[1]

---

[1] یہ واقعہ سیرت ابن ہشام سے ماخوذ ہے ج ۲ ص ۲۹۵-۳۰۲ نیز حدیث عائشہ بروایت بخاری۔

صُلح حُدَیبیَہ

(ذی القعدہ سنہ ۶ھ)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خواب اور مکّہ میں داخلے کے لئے مسلمانوں کی تیاری

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپؐ مکّہ میں داخل ہوئے اور بیت اللہ کا طواف کیا۔

یہ رویائے صادقہ تھا،[1] لیکن اس میں زمانہ، مہینہ اور سال کا کوئی تعین نہ تھا، آپؐ نے صحابۂ کرام کو مدینہ میں یہ خواب سنایا، یہ خوش خبری سن کر سب لوگ بہت مسرور ہوئے، مکّہ اور کعبہ (جس کی محبت و عظمت ان کے خمیر میں شامل اور ان کے رگ و ریشہ میں پیوست تھی) مدت ہوئی ان سے چھوٹ چکا تھا، ان کے دل میں طواف کا بڑا اشتیاق تھا اور وہ بہت بے چینی سے اس دن کے منتظر تھے، جب یہ سعادت ان کو دوبارہ حاصل ہو، مہاجرین میں مکّہ کا اشتیاق قدرتی طور پر بہت زیادہ تھا، اس لئے کہ وہ وہیں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے اور اس کی محبت گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی، بایں ہمہ عرصۂ دراز سے وہ اس کے دیدار اور زیارت سے محروم تھے، جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ خبر دی تو ان کو اس میں ذرا بھی شبہ نہ ہوا کہ اس خواب کی تعبیر اسی سال

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر سورۃ الفتح ج ۴ از ابن کثیر لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا بالحق (الآیہ)

نکل آئے گی اس بات نے ان کی آتشِ شوق کو اور بھڑکا دیا اور وہ سب کے سب آپ کے ساتھ روانہ ہونے کے لئے آمادہ ہو گئے شاذ و نادر ہی کوئی اس سے مستثنیٰ تھا عمرہ کا احرام بھی آپ نے باندھ لیا تھا تاکہ لوگوں کو اس کا علم ہو جائے کہ آپ صرف زیارت بیت اللہ کی غرض سے تشریف لے جا رہے ہیں[1]۔

وہاں پہنچ کر آپ نے قبیلہ خزاعہ کے ایک مخبر کو قریش کا پتہ لگانے کے لئے متعین کیا جب آپ مقام عسفان[2] کے قریب پہنچے تو اس مخبر نے آپ کو اطلاع دی کہ قبیلہ کعب بن لؤی نے آپ کے مقابلہ اور پیش قدمی روکنے کے لئے احابیش[3] کو اکٹھا کر رکھا ہے اور خاصی بڑی فوج منظم کر لی ہے ان کا ارادہ ہے کہ جنگ کر کے آپ کو بیت اللہ تک پہنچنے سے باز رکھیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پیش قدمی جاری رکھی جب آپ اس گھاٹی پر پہنچے جہاں سے ان کی طرف اتار شروع ہوتا ہے تو آپ کی اونٹنی قصواء بیٹھ گئی لوگوں نے یہ دیکھ کر کہنا شروع کیا قصواء اڑ گئی قصواء اڑ گئی آپ نے فرمایا قصواء اڑی نہیں اور یہ اس کا شیوہ نہیں اس کو ہاتھیوں کے روکنے والے نے روکا ہے[4] اور قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے وہ لوگ کوئی بھی ایسا منصوبہ پیش کرتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا پہلو مد نظر رکھا جاتا ہے اور مجھ سے صلہ رحمی کا سوال کرتے ہیں تو میں ان کا سوال ضرور پورا کروں گا پھر آپ نے اونٹنی کو ڈانٹا وہ اسی وقت اچھل کر کھڑی ہو گئی لیکن اپنا رخ بدل کر

---

[1] زاد المعاد ج ۱ صفحہ ۳۸۰ نیز ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۳۰۸ [2] مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک موضع ہے۔
[3] جنگجو افراد جو مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ [4] آپ کا اشارہ ابرہہ کے ہاتھی کی طرف تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔

چشمہ علیہ کی طرف روانہ ہو گئی اور اس کے آخری کنارہ پر ایک پانی کے گڑھے کے پاس جس میں ذرا سا پانی تھا رک گئی لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پیاس کی شکایت کی آپ نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکالا اور حکم دیا کہ اس کو اس گڑھے میں ڈال دیا جائے اس کو ڈالتے ہی پانی اس میں جوش مارنے لگا اور سب لوگ اچھی طرح سیراب ہو گئے۔[1]

مسلمانوں کے مکہ میں داخلہ سے قریش کی پریشانی

قریش کو جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری اور اس جگہ قیام کی خبر ملی تو ان کو سخت گھبراہٹ ہوئی آپ نے اس موقع پر مناسب سمجھا کر اپنے اصحاب کرام میں سے کسی ایک کو بھیج کر ان کو اطمینان دلا دیا جائے چنانچہ وہاں بھیجنے کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا وہ حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) مکہ میں بنی عدی بن کعب کا ایک آدمی بھی موجود نہیں ہے جو ان کے درپے آزار ہونے پر میری حمایت کر سکے آپ عثمانؓ کو وہاں جانے کا حکم فرمائیں کہ ان کا پورا خاندان وہاں موجود ہے اور وہ پیغام رسانی کا فریضہ بھی اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں آپ نے حضرت عثمانؓ کو بلوا کر قریش کے پاس بھیجا اور فرمایا کہ ان سے جا کر کہو کہ ہم جنگ کرنے کے لئے نہیں بلکہ عمرہ کا ارادہ کر کے یہاں آئے ہیں ان کو اسلام کی بھی دعوت دینا آپ نے ان کو یہ بھی ہدایت کی کہ مکہ میں جو اہل ایمان مرد و عورتیں ہیں ان کے پاس جا کر ان کو فتح کی بشارت دیں اور ان کو یہ خوش خبری سنائیں کہ اللہ تعالے مکہ میں اپنے دین کو غالب کرنے والا ہے یہاں تک کہ ایمان کو پوشیدہ رکھنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔[2]

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۸۰ [2] ایضاً

عشق و وفا کا امتحان

حضرت عثمانؓ روانہ ہوئے مکہ پہونچ کر وہ ابو سفیان اور قریش کے سربرآوردہ اشخاص کے پاس گئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ پیغام ان کو پہونچایا جب وہ اپنی بات کہہ چکے تو انھوں نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ اگر تم طواف کرنا چاہتے ہو تو طواف کر لو انھوں نے جواب دیا جب تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم طواف نہ کرلیں گے میں اس وقت تک طواف نہیں کر سکتا۔[1]

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ واپس آئے تو مسلمانوں نے کہا ابو عبداللہ تم تو بڑے مزے میں رہے تم نے تو طواف کر کے اپنے دل کا ارمان نکال لیا ہوگا کہنے لگے تم لوگوں نے بڑی بدگمانی سے کام لیا قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر مجھے ایک سال بھی وہاں ٹھہرنا پڑتا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف فرما ہوتے تب بھی میں اس وقت تک طواف نہ کرتا جب تک کہ حضور طواف نہ کر لیتے مجھے تو قریش نے طواف کی دعوت بھی دی تھی لیکن میں نے انکار کر دیا۔[2]

بیعت رضوان

اُدھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے آپ نے لوگوں کو بیعت کی دعوت دی تمام لوگ جوش و وارفتگی کے ساتھ آپ کے چاروں طرف جمع ہو گئے آپ اس وقت ایک درخت کے نیچے تشریف رکھتے تھے آپ نے اس پر بیعت کی کہ کوئی راہ فرار نہ اختیار کرے گا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود اپنا دست مبارک تھاما اور فرمایا یہ عثمانؓ کی طرف سے ہے[3] یہی بیعت رضوان تھی جو شجرہ کے نیچے ہوئی

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۱۵ [2] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۸۰ [3] ایضاً۔

ببول کے ایک درخت کے نیچے انجام پائی اور اس کا ذکر قرآن مجید کی حسب ذیل آیات میں کیا گیا:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ	(اے پیغمبر) جب مومن تم سے درخت
اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ	کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا ان
فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ	سے خوش ہوا اور جو (صدق و خلوص)
السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ	ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے
فَتْحًا قَرِيْبًا ه	معلوم کر لیا تو ان پر تسلی نازل فرمائی
(سورۂ فتح ـ ۱۸)	اور انہیں جلد فتح عنایت کی۔

مذاکرات ، ثالثی اور صلح کی کوشش

چونکہ صورت حال کچھ نازک ہو چلی تھی اس لئے بدیل بن ورقاء الخزاعی خزاعہ کے کچھ آدمیوں کے ساتھ وہاں پہنچا اس نے ان معاملات پر گفتگو کرنا چاہی اور دریافت کیا کہ آپ کی آمد کا مقصد کیا ہے؟

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم لوگ کسی سے جنگ کرنے کے لئے نہیں آئے ہیں ہم صرف عمرہ کی نیت سے یہاں آئے ہیں قریش کو جنگ نے پہلے ہی چور چور کر رکھا ہے اگر وہ چاہیں تو میں کچھ مدت ان سے طے کر لوں اور وہ میرے اور لوگوں کے درمیان کا راستہ چھوڑ دیں، اور اگر وہ چاہیں تو اسی گروہ میں شامل ہو جائیں جس میں دوسرے لوگ شامل ہوئے ورنہ انہیں کچھ مدت آرام کا موقع تو مل ہی جائے گا لیکن اگر جنگ کے علاوہ کوئی صورت ان کو قبول نہیں تو اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے میں اپنے اس معاملہ (دین) کے سلسلے میں جنگ کروں گا یہاں تک کہ میرا سر تن سے جدا ہو جائے، یا اللہ اپنے دین کو غالب فرمائے۔

جب بدیل نے ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہونچایا تو عروہ بن
مسعود ثقفی نے کہا کہ انھوں نے بہت سمجھداری کی تجویز رکھی ہے میری رائے ہے کہ تم
اس کو مان لو اور مجھے ان سے مل لینے دو سب نے کہا اچھا جاؤ بات کرو عروہ بن مسعود
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے آکر ملے اور آپ نے ان سے گفتگو شروع فرمائی عروہ کنکھیوں سے
صحابہ کرام کو دیکھتے جاتے تھے جن کا حال یہ تھا کہ اگر آپ تھوکتے تو کوئی نہ کوئی اس کو ہاتھ
پہ لے لیتا اور اپنے چہرے اور جسم پر مل لیتا آپ کوئی حکم فرماتے تو ہر شخص تعمیل کے لئے لپکتا
وضو فرماتے تو وضو کے پانی پر جان نثار اس طرح ٹوٹتے کہ لڑائی کا خطرہ ہونے لگتا آپ
کلام فرماتے تو سب پر سناٹا طاری ہو جاتا تعظیم اور ادب کی وجہ سے کوئی آپ سے نظر ملانے
کی ہمت نہ کرتا عروہ نے واپس جاکر اپنے ساتھیوں کو کہا کہ اے قوم میں بادشاہوں کے دربار
میں گیا ہوں میں نے قیصر و کسریٰ اور نجاشی کی شان و شوکت بھی دیکھی ہے لیکن خدا کی قسم میں نے
نہیں دیکھا کہ کسی بادشاہ کے درباری مصاحبین ایسا ادب اور اس درجہ تعظیم کرتے ہوں جیسے
کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھی محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی کرتے ہیں انھوں نے جو کچھ دیکھا
دیکھا اس کی تفصیل ان کو بتائی اور کہا کہ انھوں نے بہت اچھی تجویز رکھی ہے تم لوگ اس کو مان لو۔[1]

معاہدہ و صلح نامہ

اس درمیان میں بنی کنانہ کا ایک شخص جس کا نام مکرز بن حفص تھا ابھی ہوا
پہونچا اور بدزبانی اپنے چشم دید واقعات قریش کے سامنے بیان کئے قریش نے سہیل بن عمرو
کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا آپ نے ان کو دیکھتے ہی فرمایا ان کو

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۸۲

بھیجنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صلح کے خواہشمند ہیں آپ نے یہی فرمایا کہ معاہدہ کی تحریری دستاویز تیار کر لو[1]

حلم و حکمت کی جامعیت کی ایک مثال

آپ نے معاہدہ کی تحریر کے لئے کاتب (جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے) طلب فرمایا اور ارشاد ہوا لکھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سہیل نے کہا رحمٰن کا تعلق ہے بخدا ہم اس سے واقف نہیں ہیں اسی پرانے دستور کے مطابق باسمک اللّٰھم لکھو آپ نے فرمایا کہ لکھ دو باسمک اللّٰھم مسلمان یہ دیکھ کر بول اٹھے کہ نہیں ہم تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھیں گے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہوا باسمک اللّٰھم ہی لکھو۔

پھر آپ نے فرمایا کہ لکھو یہ وہ ہے جس کا اللہ کے رسول نے معاہدہ کیا یہ سن کر سہیل نے کہا کہ خدا کی قسم اگر ہمارا اس پر ایمان ہوتا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو ہم آپ کو بیت اللہ سے روکتے ہی کیوں؟ اور آپ سے جنگ ہی کیوں کرتے آپ اس کی جگہ محمد بن عبداللہ لکھیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اللہ کا رسول ہوں خواہ تم جھٹلاؤ لکھو محمد بن عبداللہ آپ نے حضرت علی کو اس کے مٹانے کا حکم دیا حضرت علی نے کہا کہ خدا کی قسم مجھ سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اس کی جگہ دکھاؤ انھوں نے آپ کو یہ جگہ دکھائی تو آپ نے اس کو خود مٹا دیا۔[2]

صلح اور آزمائش

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے رسول نے یہ معاملہ اس پر کیا ہے کہ

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۳۱۶ نیز صحیح بخاری باختلاف بعض الفاظ ملاحظہ ہو کتاب المغازی باب عمرۃ القضاء۔ [2] صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر باب صلح الحدیبیہ۔

تم لوگ ہمارے اور بیت اللہ کے درمیان حائل نہ ہو اور ہم اس کا طواف کریں۔ سہیل نے
کہا کہ ہمیں ڈر ہے کہ عربوں میں ایسا چرچا ہونے لگے کہ یہ معاہدہ ہم نے دب کر کیا ہے،
آئندہ سال آپ طواف کر سکتے ہیں۔ آپ نے یہ دفعہ بھی معاہدہ میں شامل کر لی۔

سہیل نے کہا کہ یہ بھی لازم ہوگا کہ اگر ہمارے یہاں سے کوئی شخص آپ کے یہاں
چلا جائے خواہ وہ آپ ہی کے مذہب پر ہو تو آپ اس کو ہمیں پلٹا دیں گے۔ مسلمانوں نے کہا سبحان اللہ
اگر کوئی مسلمان ہو کر ہمارے پاس آتا ہے تو ہم اس کو مشرکوں کے حوالے کیسے کر سکتے ہیں؟۔

یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ اچانک ابوجندل بن سہیل بیڑیوں میں گرتے پڑتے پہونچے
وہ مکہ کے نشیب سے آئے تھے اور کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو مسلمانوں تک پہونچا دیا تھا۔ سہیل
نے کہا اے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) یہ پہلا شخص ہے جس کی واپسی کا مطالبہ (عہد نامہ کی
رو سے) میں آپ سے کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابھی تو ہم نے تحریر بھی
مکمل نہیں کی۔ اس نے جواب دیا اگر ایسا ہے تو پھر کسی بات پر آپ سے معاملہ کرنے پر تیار
نہیں ہوں۔ آپ نے فرمایا میرے کہنے سے انھیں اجازت دیدو۔ اس نے کہا میں آپ کے
کہنے سے اجازت نہیں دے سکتا۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا تو تمہاری جو چاہے کرو۔ اس نے کہا
مجھے کچھ نہیں کرنا ہے۔ یہ سب سن کر ابوجندل بولے مسلمانو! میں مسلمان ہو کر آیا ہوں اور پھر
مشرکوں کو واپس کیا جا رہا ہوں کیا تم لوگ دیکھتے نہیں میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟
انھوں نے اللہ کے راستے میں سخت تکلیفیں اٹھائی تھیں[1]۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس
مطالبہ پر ان کو واپس فرما دیا۔ فریقین میں یہ بھی معاہدہ ہوا کہ دس سال تک دونوں
کشت و خون سے پرہیز کریں گے تاکہ لوگ امن و اطمینان کے ساتھ رہ سکیں اور کوئی کسی پر

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص [illegible] صحیح بخاری میں یہ واقعہ باب الشروط فی الجہاد کے تحت آیا ہے۔

دست درازی نہ کریں گے دوسری بات یہ طے ہوئی کہ اگر قریش سے کوئی شخص اپنے ولی وسرپرست کی اجازت کے بغیر محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے پاس آ نکلا تو وہ اس کو واپس کر دیں گے اور اگر محمد کے ساتھیوں میں سے کوئی شخص قریش کے پاس آ نکلا تو وہ اس کو واپس نہ کریں گے نیز یہ کہ جو شخص محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے معاہدہ اور جوار (حفاظت) میں داخل ہونا چاہے ہو سکتا ہے اسی طرح جو قریش کے معاہدہ و جوار میں آنا چاہے اس کو اس کی اجازت ہوگی۔[1]

مسلمانوں کا امتحان

جب مسلمانوں نے یہ صلح اور واپسی کی بات سنی اور انھوں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کس طرح اس کو برداشت کیا تو یہ بات ان کے لئے اتنی رنج فرسا ثابت ہوئی کہ ان کی جان پر بن گئی یہاں تک کہ حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم لوگ بیت اللہ جائیں گے اور طواف کریں گے؟ انھوں نے کہا ہاں فرمایا تھا لیکن کیا انھوں نے تم سے یہ کہا تھا کہ تم اسی سال بیت اللہ بھی جاؤ گے اور طواف بھی کرو گے۔[2]

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس صلح نامہ سے فارغ ہوئے تو آپ قربانی کے جانوروں کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کو جاکر ذبح کیا اس کے بعد حلق کرایا مسلمانوں کے لئے یہ بات کسی سانحہ سے کم نہ تھی اس لئے کہ مدینہ سے نکلتے وقت ان کے دل میں اس کا وسوسہ بھی نہیں تھا کہ انھیں مکہ جانے اور عمرہ کرنے کا موقع نہ مل سکے گا لیکن جب انھوں نے آپ کو قربانی کرتے اور حلق کراتے دیکھا تو سب اسی وقت تیزی سے

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۱۷-۳۱۸ [2] صحیح بخاری باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اہل الحرب

کھڑے ہو گئے اور آپ کی اتباع کرتے ہوئے قربانی اور حلق میں مشغول ہو گئے۔[1]

ذلت آمیز صلح یا کھلی ہوئی فتح؟

اس کے بعد آپ مدینہ تشریف لائے اور راستہ ہی میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝	اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے تم کو
لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن	فتح دی صریح و صاف تاکہ خدا تمہارے
ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ	اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے اور تم پر اپنی
عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا	نعمت پوری کرے اور تمہیں سیدھے
مُّسْتَقِيمًا ۝ وَيَنصُرَكَ اللَّهُ	راستے پر چلائے اور خدا تمہاری
نَصْرًا عَزِيزًا ۝ (سورۂ فتح ۱-۳)	زبردست مدد کرے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا یہی فتح ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں![2]

بصورت ناکامی، بحقیقت کامیابی

جب آپ مدینہ تشریف لے آئے آپ کے پاس قریش کا ایک آدمی پہونچا جس کا نام ابو بصیر عتبہ بن اُسید تھا، اس کی تلاش و تعاقب میں انھوں نے دو شخص بھیجے اور وہ معاہدہ آپ کو یاد دلایا، چنانچہ آپ نے اس شخص کو ان دونوں کے حوالے کیا، اور یہ دونوں اسے ساتھ لے کر واپس آ گئے، لیکن راستہ میں یہ شخص کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا، اور سمندر کے ساحل پر آ گیا، دوسری طرف ابو جندل بن سہیل بھی

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھیں زاد المعاد ج ۱ ص ۳۸۲
[2] دیکھئے صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر باب صلح الحدیبیہ

کسی طرح ان کی زد سے نکل آئے اور ابو بصیر سے آملے اور اب یہ ہونے لگا کہ قریش کا جو بھی مسلمان مکہ سے جان اور ایمان بچا کر نکلتا تو وہ سیدھا ابو بصیر سے جا ملتا، رفتہ رفتہ ان کی پوری جمعیت تیار ہو گئی، یہ لوگ یہ کرتے کہ قریش کا جو بھی قافلہ شام جانے والا انھیں ملتا یہ اس کا راستہ روک کر اس کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیتے اور سب قافلے والوں کو قتل کر ڈالتے، عاجز آ کر قریش نے اللہ کا واسطہ اور رشتہ داری اور قرابت کی دہائی دے کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ ان لوگوں کو ضرور بلوا بھیجیں اب جو بھی آپ کے پاس پہونچے گا، وہ مامون و محفوظ رہے گا۔[1]

یہ صلح فتح وظفر میں کیسے تبدیل ہوئی؟

آخر میں پیش آنے والے واقعات نے یہ ثابت کر دکھایا کہ صلح حدیبیہ سے (جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے موقف سے بہت پیچھے اتر کر معاہدہ فرمایا تھا اور قریش کا مطالبہ مان لیا تھا، اور انھوں نے بھی اس کو اپنی بڑی جیت اور نفع کا سودا سمجھا تھا اور مسلمانوں نے اس کو اپنی ایمانی قوت اور نبی کی کامل اطاعت کے جذبے برداشت کر لیا تھا) دراصل اسلام کے اقبال وظفر مندی کا ایک نیا دروازہ کھل گیا اور اس کی وجہ سے اسلام کو جزیرۃ العرب میں اس قدر تیزی کے ساتھ فروغ ہوا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا، اس نے فتح مکہ کا بھی دروازہ کھولا اور اسی کے نتیجے میں قیصر و کسریٰ مقوقس نجاشی اور امراء عرب کو دعوت اسلام دی گئی، اللہ تعالیٰ نے بالکل صحیح ارشاد فرمایا ہے:

وَعَسَىٰٓ أَن تَكْرَهُوا۟ شَيْـًٔا وَهُوَ ..... اور عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے

---

[1] زاد المعاد ج ا صفحہ ۳۸۳

خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ○ (سورۃ البقرۃ-۲۱۶)

اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو اور عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بھلی لگے اور وہ تمہارے لئے مضر ہو اور ان باتوں کو خدا ہی بہتر جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

اس صلح کے بہترین فوائد و نتائج میں ایک یہ بات بھی تھی کہ قریش نے مسلمانوں کی حیثیت اور مرتبہ کو تسلیم کیا اور ایک باعزت اور طاقت ور فریق کی حیثیت سے جس کے ساتھ معاہدے کیے جاتے ہیں اور مذاکرات ہوتے ہیں، ان کو ان کی جائز جگہ دی اور شاید اس صلح کا سب سے بہتر ثمرہ وہ جنگ بندی اور امن کی فضا تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں کو (جو عرصے سے جنگوں کے ایک طویل سلسلے میں الجھے ہوئے تھے اور جس نے ان کی ساری توانائی اور قوت کھینچ لی تھی) اطمینان کی سانس لینے اور کسی قدر آرام کرنے نیز اس پرسکون اور پُرامن فضا میں یکسوئی اور جمعیت خاطر کے ساتھ اس کی دعوت پہنچانے اور فریضۂ تبلیغ ادا کرنے کا بہترین موقع مل گیا۔

اس صلح نے مسلمانوں اور مشرکوں کو جو اب تک باہم دست و گریبان تھے ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع بھی فراہم کیا اور اس کی وجہ سے اسلام کے وہ محاسن مشرکین کے سامنے آئے جو اب تک اس قدر حسن و زیبائی کے ساتھ سامنے نہ آئے تھے، مثلاً شرک و بت پرستی کی نجاست سے کلیتہً پرہیز، دشمنی و عداوت، انسانی خون کی پیاس اور قتل و غارت گری سے مکمل نفرت جو ان کا شیوہ بن گیا تھا، اخلاقی طور پر ایک انقلاب جو چند سال کی قلیل مدت میں ان لوگوں کی زندگی میں رونما ہوا تھا جو کسی دوسری قوم کے افراد یا کسی غیر ملک کے باشندے نہ تھے، انھیں کے ہم قوم، ہم رنگ و ہم زبان تھے، انھیں کی طرح گھروں میں پیدا ہوئے تھے اور ان کی ایک عمر انھیں کے ساتھ بسر ہوئی تھی،

پھر یہ کیسا چیز کا کرشمہ تھا کہ وہ ان چند برسوں ہی میں مٹی سے اکسیر اور پتھر سے پارس بن گئے تھے؟ اسلام کی تعلیمات اور صحبتِ نبوی کے سوا کوئی چیز اہلِ مکہ اور ان مہاجرین کے درمیان فرق کرنے والی نہ تھی چنانچہ ایک سال بھی اس صلح پر نہ گذرا تھا اور مکہ بھی ابھی فتح ہونا باقی تھا کہ دلوں کی اتنی بڑی تعداد حلقہ بگوش اسلام ہو گئی کہ گذشتہ چند برسوں میں اس قدر نہ ہوئی تھی۔

امام ابن شہاب زہری (م ۱۲۴ھ) کہتے ہیں "اسلام کو اس سے پہلے اتنی بڑی کوئی فتح حاصل نہیں ہوئی جب فریقین (قریش اور مسلمان) میں صلح ہوئی جنگ بندی کا اعلان ہوا اور لوگ بلا خوف و خطر ایک دوسرے سے ملنے لگے اور ان کو ساتھ بیٹھنے اور بات چیت کرنے کا موقع ملا جس کسی سمجھدار آدمی سے اسلام کے بارے میں گفتگو کی گئی وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ تنہا ان دو برسوں میں اتنے آدمی داخل اسلام ہوئے جتنے اب تک ہوئے تھے بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ"[1]

ابن ہشام کہتے ہیں "زہری کے قول کی مزید دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حدیبیہ میں (بروایت جابر بن عبداللہ) چودہ سو آدمی تھے اس کے دو سال بعد فتح مکہ کے موقع پر آپ کے ساتھ دس ہزار صحابہ کی جمعیت تھی"[2]

اس جنگ بندی اور صلح نامہ کی بدولت ان مسلمانوں کو فائدہ پہونچا جو کہ اپنی مجبوری و بے بسی کی وجہ سے باقی رہ گئے تھے اور قریش کے اشتعال و اہانت کا ہدف بنے ہوئے تھے اور ابو جندل کے ہاتھ پر قریش کے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا، اسلام کی اس دعوتی اور تبلیغی کوشش اور اسلام کا کلمہ بتدریج مشرکین کے لئے ایک درد سر بن گیا۔

یہ سب لوگ ابو بصیر کے کاروانِ حق سے آملے اور دیکھتے ہی دیکھتے اسلام کی دعوت

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۲۲ [2] ایضاً۔

وقوت و شوکت کا ایک بڑا مرکز تعمیر ہو گیا قریش کو اس کی بڑی فکر دامن گیر ہوئی انھوں نے
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ان لوگوں کو مدینہ بلا لیں چنانچہ آپ نے
ایسا ہی کیا اور اس طرح جس تنگی و مصیبت میں یہ لوگ گرفتار تھے اس سے ان کو نجات ملی یہ سب
دراصل اسی صلح کی برکت اور جنگ بندی کے اسی معاہدہ کا نتیجہ تھا[1] اس مصالحانہ اور امن
پسندانہ رویہ کا جو آپ نے اس موقع پر اپنایا نیز جنگ سے عدم دلچسپی صلح جوئی کے جذبہ اور بردباری
واستقلال کے جس طرز عمل کا آپ سے اظہار ہوا اس کا ایک فائدہ یہ بھی نکلا کہ وہ عرب قبائل جو ابھی
اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے اسلام اور مسلمانوں کو نئی نظر سے دیکھنے لگے ان کے دلوں میں اسلام کی
عظمت اور اس کا وہ احترام اور محبت پیدا ہوگئی جو اس سے پہلے نہ تھی یہ ایک ایسا اخلاقی و عملی فائدہ تھا
جس کو معمولی نہیں کہا جا سکتا اگرچہ اس کا کوئی کو شش رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بطور خود نہیں کی تھی

خالد بن ولید اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم

صلح حدیبیہ دلوں کی فاتح ثابت ہوئی چنانچہ خالد بن الولید نے (جو قریش
کے سوار افواج کے سپہ سالار تھے اور جنھوں نے بڑے بڑے معرکے سر کئے تھے) صلح حدیبیہ
کے بعد ہی اسلام قبول کیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انھیں سیف اللہ (خدا کی
تلوار) کا لقب مرحمت فرمایا وہ راہ خدا میں ہر جگہ کامیاب و بامراد اور مظفر و منصور و سرفراز
ہو کر نکلے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں سے شام کا علاقہ فتح کروایا۔
عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے بھی جو ایک بڑے سپہ سالار اور جرنیل تھے اور بعد میں فاتح مصر
کی حیثیت سے سامنے آئے اسی زمانہ میں اسلام قبول کیا، دونوں صلح حدیبیہ کے بعد
مدینہ طیبہ حاضر ہو کر دولت اسلام سے سرفراز ہوئے اور مراتب علیا حاصل کئے۔[2]

---

[1] زاد المعاد ج ۱ صفحہ ۳۸۸-۳۸۹ [2] دیکھئے سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۲۷۷-۲۷۸

سلاطین و امراء کو دعوتِ اسلام

(اواخر ۶ھ یا اوائل ۷ھ)

حکیمانہ طرزِ دعوت

صلح ہونے کے بعد حالات قدرتی طور پر پُرسکون ہو گئے اور دعوتِ اسلامی کو سانس لینے کا موقع ملا اور ترقی و پیش قدمی کی نئی راہیں کشادہ ہو گئیں۔ اس موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سلاطینِ عالم اور امرائے عرب کو متعدد خطوط لکھے اور ان کو بڑے حکیمانہ انداز میں اسلام کی دعوت دی۔[1] اس کے لئے آپ نے بڑا اہتمام فرمایا اور ہر بادشاہ کے لئے ایسے ایلچی کا انتخاب کیا جو اس کے مرتبہ و حیثیت کے مطابق گفتگو کر سکے اور وہاں کی زبان نیز ملک کے حالات سے واقف ہو۔[2]

---

[1] قابلِ ترجیح قول یہ ہے کہ یہ خطوط صلح حدیبیہ کے بعد ماہ ذی الحجہ سنہ ۶ھ میں بھیجے گئے جیسا کہ واقدی کا بیان ہے بیہقی کے مطابق ہے اس [illegible] سلاطین میں [illegible] ایران کا شہنشاہ خسرو پرویز [illegible] ھ میں [illegible] گیا۔
ہرقل کو جو خط لکھا گیا اگر اس کا سنہ بھی ۶ھ تسلیم کیا جائے تو ہرقل کے ہاتھ میں پہنچنا [illegible]
اس لئے کہ وہ اسی سال [illegible] کے دورہ پر جا چکا تھا [illegible]
اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ یہ خطوط عیسوی تقویم کے مطابق ۶۲۸ء میں روانہ کئے جا چکے تھے [illegible]

[2] ابن سعد طبقات [illegible] علامہ سہیلی نے لکھا ہے [illegible] اپنی کتاب [illegible]
میں اس موضوع پر جو کلام کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات خارقِ عادت طریقہ پر ظہور میں آئی [illegible]
(زاد المعاد [illegible])

مکاتیب نبوی۔

ان سلاطین میں جن کے نام خطوط روانہ کئے گئے، رومی شہنشاہ ہرقل، ایرانی شہنشاہ کسریٰ پرویز، حبشہ کے بادشاہ نجاشی اور مصر کے بادشاہ مقوقس کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہرقل کو آپ نے اپنا مکتوب دحیۃ الکلبی کے ہاتھ ارسال فرمایا اور انہوں نے بُصریٰ کے رئیس اور سردار کے ذریعہ اس مکتوب گرامی کو ہرقل تک بھجوایا۔ اس مکتوب کا متن یہ ہے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم من	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد کی طرف
محمد عبد اللہ و رسولہ إلى	جو خدا کا بندہ اور رسول ہے یہ خط
ہرقل عظیم الروم سلام علی	ہرقل کے نام ہے جو روم کے رئیس اعظم
من اتبع الهدى، أما بعد فإنی	ہیں۔ ان کو سلامتی ہو جو ہدایت کا
أدعوك بدعایة الإسلام أسلم	پیرو ہو۔ اس کے بعد میں تم کو
تسلم یؤتك اللہ أجرك مرتین	اسلام کی دعوت کی طرف بلاتا
فإن تولیت فإن علیك إثم	ہوں۔ اسلام لاؤ تم سلامت رہو گے
الیریسیین یا أهل الكتاب	خدا تم کو دو گنا اجر دے گا اور اگر
تعالوا إلى كلمة سواء بیننا	تم نے نہ مانا تو اہل ملک کا گناہ تمہارے
وبینكم أن لا نعبد إلا اللہ	اوپر ہوگا۔ اے اہل کتاب ایک ایسی
ولا نشرك به شیئا ولا یتخذ	بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں
بعضنا بعضا أربابا من دون اللہ	یکساں ہے وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ[1]	کسی کو نہ پوجیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کو چھوڑ کر خدا نہ بنائے اور تم نہیں مانتے تو گواہ رہو کہ ہم مانتے ہیں۔

کسریٰ پرویز کے نام آپ نے حسب ذیل خط بھیجا:۔

بسم الله الرحمٰن الرحیم	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم محمد پیغمبر خدا کی
من محمد رسول الله الی کسریٰ	طرف سے کسریٰ رئیس فارس کے نام
عظیم فارس، سلام علیٰ من	سلام ہے اس شخص پر جو ہدایت کا
اتبع الهدیٰ وآمن بالله	پیرو ہوا اور اللہ اور اس کے رسول
ورسوله وشهد ان لا اله	پر ایمان لائے اور یہ گواہی دے کر
الا الله وانی رسول الله الی	خدا صرف ایک خدا ہے اور یہ کہ
الناس كافة لينذر من كان	خدا نے مجھ کو تمام دنیا کا پیغمبر مقرر
حيا اسلم تسلم فان ابيت	کر کے بھیجا ہے تاکہ وہ ہر زندہ شخص کو
فعليك اثم المجوس[2]	خدا کا خوف دلائے تم اسلام قبول
	کرو تو سلامت رہو گے ورنہ مجوسیوں
	کا وبال تمہاری گردن پر ہوگا۔

نجاشی کے نام یہ مکتوب تھا:۔

بسم الله الرحمٰن الرحیم	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم محمد کی طرف سے

[1] صحیح بخاری باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [2] الطبری ج ۳ ص ۹۰

من محمد رسول الله الى النجاشي	جو اللہ کا رسول ہے یہ خط نجاشی
عظيم الحبشة، سلام على من	کے نام ہے جو حبشہ کا امیر اعظم ہے
اتبع الهدى، اما بعد، فانى	سلام ہے اس شخص پر جو ہدایت کا
احمد اليك الله الذى لا اله	پیرو ہو، اما بعد، میں حمد بیان کرتا
الا هو الملك القدوس السلام	ہوں تم سے اس اللہ کی جس کے سوا
المؤمن المهيمن، واشهد ان	کوئی معبود نہیں، جو بادشاہ ہے
عيسى بن مريم روح الله	قدوس ہے سلام ہے مومن اور
وكلمته القاها الى مريم	مہیمن ہے اور گواہی دیتا ہوں
البتول الطيبة الحصينة	اس بات کی کہ عیسیٰ بن مریم اللہ کی
فحملت بعيسى من روحه	روح اور اس کا کلمہ ہیں جس کو اس نے
ونفخه كما خلق آدم بيده،	پاک نفس پاکباز مریم البتول میں
وانى ادعوك الى الله وحده	پھونکا تھا، پس اس کی روح اور اس کے
لا شريك له والموالاة على	نفخ سے عیسیٰ ان کے بطن میں قرار پائے
طاعته وان تتبعني وتؤمن	جیسے اس نے آدم کو اپنے ہاتھ سے
بالذى جاءنى، فانى رسول الله	بنایا تھا، میں تم کو دعوت دیتا ہوں
وانى ادعوك وجنودك	ایک اللہ پر ایمان لانے کی جس کا کوئی
الى الله عزوجل وقد	شریک نہیں، اور اس کی طاعت،
بلغت ونصحت فاقبل	موالات کی اور یہ کہ تم میری اتباع
نصيحتى والسلام على	کرو اور جو کچھ میرے اوپر وحی آئی ہے

اس پر ایمان لائے میں بے شک میں	من اتبع الہدیٰ۔[1]
اللہ کا رسول ہوں اور دنیا جہان کو	
اور تمہارے لشکروں کو اللہ عزوجل	
کی طرف بلاتا ہوں میں نے اپنا	
پیغام کہہ دیا اور نصیحت پہنچا دی	
پس یہ نصیحت قبول کرو اور	
سلام ہو اس پر جو ہدایت کا پیرو ہو	

قبطیوں کے سردار اور بادشاہ مقوقس کے نام یہ مضمون تھا۔

خدائے رحمٰن و رحیم کے نام سے محمد	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم من
رسول خدا کی طرف سے مقوقس	محمد عبد اللہ ورسولہ الی
رئیس قبط کے نام اس کو سلامتی ہو	المقوقس عظیم القبط سلام
جو ہدایت کا پیرو ہے اس کے بعد	علی من اتبع الہدیٰ اما بعد
میں تم کو اسلام کی دعوت دیتا	فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام
ہوں اسلام لے آؤ تو سلامت رہو گے	اسلم تسلم واسلم یؤتک اللہ
خدا تم کو دگنا اجر دے گا اگر تم نے	اجرک مرتین فان تولیت
نہ مانا تو اہل ملک کا گناہ تمہارے	فان علیک اثم اہل القبط
اوپر ہوگا اے اہل کتاب ایک	یا اہل الکتاب تعالوا الی کلمۃ
ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور	سواء بیننا وبینکم الا نعبد

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ صفحہ

إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا	تم میں یکساں ہے وہ یہ ہے کہ ہم خدا
وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا	کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا	ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کو چھوڑ
فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔	کر خدا نہ بنائے اور تم نہیں مانتے
	تو گواہ رہو کہ ہم مانتے ہیں۔

لہ صاحب لدنیہ ج ۳ صفحہ ۲۳۶ سے ۲۴۳۔ اس وقت تک پانچ نامہائے مبارک کے اصل نسخے دریافت ہو چکے ہیں ان کی تصویریں بھی بہت سے اسلامی رسائل و اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔

جہاں تک مقوقس کے نام سے فرمان مبارک کا تعلق ہے فرانسیسی مستشرق BARTHELEMY کو مصر کے مقام اخمیم کے ایک قدیم دیر سے ۱۸۵۰ء میں ہرن کی جھلی (ورق) پر لکھی ہوئی ایک تحریر ملی مطالعہ و تحقیق کے بعد ثابت ہوا کہ یہ وہ فرمان مبارک ہے جو مقوقس کے نام بھیجا گیا تھا اس کا عکس جرنل ۱۸۵۴ء اور رسالہ الہلال مصر نومبر ۱۹۰۴ء

اسی طرح نجاشی اور کسریٰ کے نام کے فرمان کی اصل بھی مل چکی ہے۔

رومی بادشاہ ہرقل کو بھیجا جانے والا مکتوب گرامی اسپین میں ساتویں صدی ہجری تک محفوظ تھا، جس کا پتہ چھٹی صدی کے مشہور محدث و مورخ علامہ سہیلی نے دیا ہے۔

ابوالعباس شہاب الدین احمد بن محمد قسطلانی (م ۹۲۳ھ) نے ارشاد الساری شرح صحیح البخاری کی جز اول میں لکھا ہے کہ:-

"کہا جاتا ہے کہ الملک المنصور قلاوون الصالحی کے زمانہ میں شاہ افرنگ نے سیف الدین قلیج کے سامنے ایک مطلا صندوق کھولا اور اس میں سے ایک سونے کا قلمدان نکالا پھر اس میں سے ایک خط نکالا جس کے اکثر حروف مٹ گئے تھے اور کہا کہ یہ تمہارے نبی کا مکتوب میرے (باقی صفحہ [illegible] پر)

فرامین نبوی میں مکتوب الیہم کے مابہ الامتیاز حالات کی رعایت

ذہین قاری وہ باریک فرق محسوس کرلیں گے جو حکمت دعوت و رسالت کے پیش نظر نمایاں ہیں، اور جن میں ان بادشاہوں کے امتیازی عقائد اور ذہنی کیفیات کا لحاظ کیا گیا ہے۔ چنانچہ ہرقل و مقوقس کلی یا جزئی طور پر الوہیت مسیح کے قائل تھے، اور انہیں "ابن اللہ" مانتے تھے، توان کے نام خطوط میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسم گرامی کے ساتھ "عبد اللہ" کا لفظ ہے، اور بسم اللہ کے بعد دونوں خط اس طرح شروع ہوتے ہیں۔

"من محمد عبد اللہ ورسولہ الی ھرقل عظیم الروم" اور "من محمد عبد اللہ ورسولہ الی المقوقس عظیم القبط" جبکہ کسریٰ پرویز کے نام مکتوب گرامی کا سرنامہ اس طرح تھا "من محمد رسول اللہ الی کسریٰ عظیم فارس" ہرقل و مقوقس کے نام کے خطوط میں یہ آیت کریمہ لکھی گئی ہے۔

قُلْ یٰۤاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی	آپ فرما دیجئے کہ اے اہل کتاب آؤ
کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ	ایک ایسی بات کی طرف جو کہ ہمارے
اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ	اور تمہارے درمیان برابر ہے کہ بجز
بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا	اللہ تعالےٰ کے ہم کسی اور کی عبادت

(باقی صفحہ کا) دارا قیصر کے نام تھا جسے ہم حفاظت رکھتے چلے آرہے ہیں، اور ہمارے اجداد نے ہمیں یہ وصیت کی ہے کہ جب تک یہ مکتوب ہمارے پاس رہے گا تب تک ہماری بادشاہت بھی رہے گی اس لئے ہم لوگ اس کی حفاظت کرتے ہیں (تازہ اطلاع کے مطابق یہ مکتوب شریف شائع ہو چکا ہے مع ترجمہ اردو ہوئے یہیں موجود ہے)

بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝

(سورۂ آل عمران ـ ٦٤)

ذکر ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو رب نہ قرار دے خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر پھر اگر یہ لوگ اعراض کریں تو تم لوگ کہہ دو کہ تم اس کے گواہ رہو کہ ہم تو ماننے والے ہیں۔

لیکن کسریٰ پرویز کے خط میں یہ آیت درج نہیں ہے کیونکہ اس کے مخاطب وہ اہل کتاب ہیں جو الوہیت مسیح کے قائل ہیں اور جنھوں نے اللہ کے علاوہ اپنے احبار و رہبان اور مسیح کو بھی اپنا رب بنا لیا تھا، ہرقل بیزنطی سلطنت کا سربراہ تھا اور مقوقس مصر کا بادشاہ تھا، دونوں اس عہد کی مسیحی دنیا کے قائد اور (حضرت مسیح کے بارے میں ایک طبیعت یا دو طبیعتوں کے معمولی اختلاف کے سوا) مسلم مذہبی رہنما بھی تھے۔[1]

کسریٰ پرویز اور اس کی قوم چونکہ آفتاب پرست اور آتش پرست تھی، اور دو خداؤں، خدائے خیر "یزداں" اور خدائے شر "اہرمن" کو مانتی تھی اور نبوت اور آسمانی رسالت کے صحیح مفہوم سے نا آشنا تھی، اس لئے ایرانی بادشاہ کے نام کے نامۂ مبارک میں یہ عبارت لکھی گئی ہے۔

فانی رسول اللہ الی الناس — اور میں تمام لوگوں کے لئے اللہ کا

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں مصنف کی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" صفحہ ٣٥-٣٩ (دارالقلم تیرہواں ایڈیشن) یا اردو ترجمہ "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر"

كَافَّةً لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا۔ ایسا رسول ہوں جو شعوری طور پر زندہ لوگوں کو آگاہ کرے۔

سلاطین کون تھے؟

ہمیں اس پیغمبرانہ اقدام کی اہمیت و عظمت کا (جو ان خطوط کے ذریعہ کیا گیا) اس وقت تک اندازہ نہیں ہو سکتا جب تک ان چاروں اشخاص ہرقل، کسریٰ، نجاشی اور مقوقس کے معاصر تاریخ میں مرتبے اور حیثیت، ان کی سلطنتوں کے رقبہ و وسعت اور ان کے شوکت اور دبدبے کا ہمیں علم نہ ہو۔ اگر کوئی شخص ساتویں صدی عیسوی کی تاریخ سے واقف نہیں ہے اور اس کو ان ملکوں کے متعلق ضروری معلومات حاصل نہیں ہیں تو وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ خطوط چند مقامی حکام اور والیانِ ریاست[1] کے نام لکھے گئے ہیں، جو ہر زمانہ میں اور ہر جگہ پائے جاتے رہے۔

اس کے برخلاف جو شخص اس عہد کے سیاسی نقشہ میں ان بادشاہوں کی اہمیت جانتا ہے، ان کی تاریخ اور سیرت و کردار سے واقف ہے اور ان کی قوت، اقتدار اور رعب و دبدبہ کو اچھی طرح سمجھتا ہے، وہ محسوس کرے گا کہ یہ عظیم اقدام اور جرأت وہی نبی کر سکتا تھا جو خدا کی طرف سے اس کام پر مامور کیا گیا ہو، اس پر اس دعوت و تبلیغ کی پوری ذمہ داری ہو، اس پر عظمت اور جبروت کا سایہ بھی نہ پڑا ہو اور آسمانوں اور زمینوں کے حقیقی بادشاہ اور مالک الملک کی اس پر ایسی تجلی ہو کہ تاج و سریر کے مالک اس کو گڑیا گڈے یا بے جان پتلے معلوم ہوتے ہوں جن کو بادشاہوں کی پوشاک میں آراستہ

[1] مثلاً ہمارے انگریزی عہد کے نظام حیدرآباد یا نواب بھوپال یا مہاراجہ گوالیار یا مہاراجہ بیکانیر (مؤلف) کے نام یہ خطوط لکھے جائیں۔

کر کے تخت حکومت پر بٹھا دیا گیا ہو۔ اس لئے یہاں معاصر تاریخ اور معتبر مورخوں کی شہادتوں کی مدد سے ان کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

قیصر روم ہرقل اوّل (۶۱۰-۶۴۱ء)

بازنطینی شہنشاہ قیصر روم ہرقل اوّل ایک وسیع و عریض شہنشاہی کا مالک تھا جس نے ایرانی شہنشاہی کے ساتھ مل کر اس عہد کی ساری متمدن دنیا کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا اور جس کا سکہ آدھی دنیا میں چل رہا تھا۔ تین بر اعظموں یورپ ایشیا اور افریقہ میں اس کے خوش حال، دولت مند اور ترقی یافتہ و متمدن مقبوضات اور نو آبادیاں (DOMINIONS) تھیں یہ سلطنت رومۃ الکبریٰ کی جانشین تھی جس کے زیر نگیں تقریباً پوری متمدن قدیم دنیا رہ چکی تھی۔[1]

یہ بادشاہ ایک یونانی خاندان کا فرد تھا کپوڈیشیا میں پیدا ہوا اور قرطاجنہ کارتھیج (CARTHAGE) میں پرورش پائی، وہ افریقہ کے ایک حاکم (EXARCH OF AFRICA) کا لڑکا تھا اس میں کوئی بات ایسی نہ تھی جس سے اس کی غیر معمولی ذہانت، حوصلہ مندی اور قائدانہ صلاحیت کا اظہار ہوتا جب فوقس (PHOCUS) نے غاصبانہ طور پر بازنطینی سلطنت کے شہنشاہ موریقس نامی (MAURICE) کو (جس کے کسریٰ پرویز پر احسانات تھے) ۶۰۲ء میں قتل کیا تو ایرانیوں کو بازنطینی سلطنت پر فوج کشی کا بہانہ مل گیا اور انہوں نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، اس عظیم الشان بازنطینی سلطنت کی

---

[1] اس شہنشاہیت کے حدود اربعہ اس کی ریاستوں اور صوبوں کی تفصیل جو یورپ ایشیا اور افریقہ میں پھیلے ہوئے تھے کتاب کے باب اوّل میں "مشرقی رومی سلطنت" کے عنوان سے ہم بیان کر چکے ہیں۔

بازنطینی اور ساسانی شہنشاہیتیں
(چھٹی صدی عیسوی میں)
(دمشق)
بیت المقدس
خیبر
یثرب (مدینہ)
طائف
یمن
(قاہرہ)
بازنطینی حکومت (مغربی) کے براہ راست ماتحت علاقے
بازنطینی حکومت (مشرقی) کے براہ راست ماتحت علاقے
عرب غسانی سلطنت جو بازنطینی حکومت (مشرقی) کی باجگزار تھی
ایرانی حکومت کے براہ راست زیر اقتدار علاقے
عرب سلطنتیں جو کہ ایرانی حکومت کے ماتحت تھیں

آخری ساسانیین قیصر[1] ہرقل کو قرطاجنہ سے طلب کیا گیا اس نے فوقس کو قتل کیا اور
سنہ ۶۱۰ء[2] میں زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اس وقت پورا ملک موت و زیست کی
کشمکش میں گرفتار تھا اور خشک سالی، وبائی امراض، غربت اور مالی نقصانات سے
دیوالیہ ہو چکا تھا ہرقل نے اپنی حکومت کے ابتدائی سال ایک پرسکون اور عافیت پسند
انسان کی طرح گذارے اور کوئی بڑا کام انجام نہیں دیا لیکن ۶۲۲ء میں اس کے اندر
اچانک ایک انقلاب برپا ہو گیا (یہ وہ سال ہے جس بابت قرآن مجید نے چند برسوں کے
اندر غلبۂ روم کی پیشین گوئی کی تھی[3]) اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے عیش پرست اور آرام طلب
بادشاہ سے ایک پرجوش اور غیرت مند قائد اور جرنیل میں تبدیل ہو گیا۔ یہ خیال اس کے
اعصاب پر پوری طرح سوار ہو گیا اس کے اندر غیرت قومی نے جوش مارا چنانچہ
اس نے ایران کے قلب کا رخ کیا اپنی چھینی ہوئی زمین اور کھوئی ہوئی عزت واپس
لی ایران کے مشہور شہروں پر قبضہ کر لیا ایران کے قلب و جگر میں اتر کر مرکز سلطنت
میں اپنے جھنڈے گاڑ دیئے اور عظیم اور قدیم ایرانی شہنشاہی کی عزت و عظمت کو
خاک میں ملا دیا اور اس کو ٹھوکروں سے اس قدر چور چور کر دیا کہ معلوم ہونے لگا اب
سلطنت کا دم واپسیں ہے اور آل ساسان کے تخت کی چولیں بالکل ہل چکی ہیں
یہ فاتح واپس آ کر ۶۲۵ء میں قسطنطنیہ میں فتح مندانہ داخل ہوا اور ۶۲۹ء میں

---

[1] اس کی تفصیل گبن (GIBBON) کی کتاب (DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE)
اور آرتھر کرسٹن سین کی کتاب "ایران بعہد ساسانیان" میں ملاحظہ فرمائیں۔ [2] اس واقعہ کے
ایک سال بعد جزیرۃ العرب میں حضور کی بعثت ہوئی۔ [3] دیکھئے سورۂ روم کی ابتدائی آیات
نیز راقم سطور کا مقالہ "قرآن مجید میں غلبۂ روم کی پیشین گوئی" مشمولہ کتاب "مطالعۂ قرآن کے اصول و مبادی"

اس کو کسریٰ پرویز کے نام سے یاد کرتے ہیں اپنے باپ کے قتل کے بعد ۵۹۰ء میں اس کی تاج پوشی ہوئی بہرام چوبین نے اس کے خلاف بغاوت کی خسرو نے شکست کھائی اور ساسانی مملکت کو چھوڑ کر بازنطینی فرماں روا موریقس (MAURICE) سے پناہ طلب کی اور اپنے ملک کی بازیافت میں اس کی مدد چاہی موریقس نے زبردست فوجوں کے ساتھ اس کی مدد کی ان خون آشام جنگوں کے بعد بہرام کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور خسرو اپنے آباؤ اجداد کے تخت حکومت پر دوبارہ قابض ہو گیا ۶۰۲ء میں خسرو نے بازنطینی سلطنت پر اپنے معنوی باپ اور ولی نعمت موریقس کا بدلہ اس کے قاتل اور تخت قیصری کے غاصب فوقس (PHOCUS) سے لینے کا تہیہ کر لیا فوقس کے قتل نے بھی اس کو مزید پیش قدمی سے باز نہ رکھا اور وہ قسطنطنیہ تک بڑھتا چلا گیا اور اپنی قدیم حریف سلطنت کی اس طرح اینٹ سے اینٹ بجا دی کہ اس کی کوئی مثال پہلے نہیں ملتی ۶۱۶ء تک اس کی فتوحات اور اقبال مندی کا ستارہ پورے عروج پر پہونچ گیا یہاں تک کہ ہرقل نے ایرانیوں کو ان کے ملک سے بے دخل کر دیا اور ساسانی مملکت کے قلب و جگر پر حملے کئے خسرو کو اپنا ملک خیرباد کہہ کر ایک محفوظ اور دور دراز علاقہ میں پناہ لینی پڑی لیکن جلد ہی ۶۲۸ء کی بغاوت میں اس کا کام تمام ہو گیا۔

مورخین ایران کا اتفاق ہے کہ خسرو دوم ایران کا سب سے عظیم اور شان و شوکت رکھنے والا شہنشاہ تھا اس کے عہد میں مملکت ساسانیہ اپنی ترقی و خوش حالی پر تکلف زندگی کی انتہائی تعیش اور آرائش و زیبائش کے نقطۂ عروج پر پہنچی ہندوستان کی شمالی مغربی ریاستوں تک اس کا سکہ رواں تھا[1] اس کے نام کے ساتھ بڑے شاندار تہنیت ہوتی تھی۔

[1] ایران بعہد ساسانیان ص ۴۰۲

خداؤں میں انسان عظیم و فانی اور انسانوں میں خدائے لافانی اس کے نام کا بول بالا آفتاب کے ساتھ طلوع کرنے والا شب کی آنکھوں کا اجالا[1] اس کے عہد میں ملک نے جتنی ترقی کی تھی اور اس کو جو شان و شوکت حاصل ہوئی تھی اس کے متعلق مشہور مؤرخ طبری کے الفاظ یہ ہیں:-

"یہ بادشاہ سب سے زیادہ سخت گیر، سب سے زیادہ قوت فیصلہ اور دور بینی رکھنے والا تھا۔ شجاعت و بہادری اور فتح و ظفر کے کارناموں، دولت کی فراوانی اور تقدیر کی ہمنوائی اور زمانہ کی مساعدت کے اسباب جتنے اس کے لیے مہیا تھے کسی اور بادشاہ کے لیے نہ تھے اس کا لقب پرویز پڑ گیا جس کے معنی عربی میں مظفر یعنی فاتح و اقبال مند ہوتے ہیں[2] تہذیب تمدن کی جدت طرازیوں اور نکتہ آفرینیوں میں بھی کوئی جواب نہ تھا۔ ماکولات مشروبات کے شعبے میں اس نے نئی نئی چیزیں ایجاد کی تھیں۔[3]

عطریات و خوشبو وغیرہ میں بھی وہ آخری منزل پر تھا۔ اس کے عہد میں پُر تکلف و متنوع کھانوں اعلیٰ قسم کی شرابوں اور بہترین عطریات کا لوگوں میں ایک خاص ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ نغمہ و سرود اور فن موسیقی نے اس کے عہد میں بڑا عروج حاصل کیا تھا۔ لوگوں کو ان چیزوں سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کو دولت جمع کرنے اور نوادرات اور نفیس اشیاء اکٹھا کرنے کا بڑا شوق تھا۔ جب اس کا خزانہ (سنہ ۶۰۷ء تا سنہ ۶۰۸ء) میں قدیم عمارت سے طیسفون (مدائن) کی نئی عمارت میں منتقل کیا گیا تو اس کی مقدار ۴۶۸ ملین (یعنی چھیالیس کروڑ اسی لاکھ) مثقال ہوتی تھی جو سینتیس کروڑ پچاس لاکھ

---

[1] ایران بعہد ساسانیان ص۳۱۰ ماخوذ از تھیوفی لیکٹس [2] تاریخ طبری ج ۲ ص۱۷۲ المطبعة الحسینیة الطبعة الاولیٰ (مصر) [3] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ طبری ص۱۷۵

طلائی فرنک کے برابر ہوتا ہے۔ اس کی تخت نشینی کے تیرہویں سال اس کے خزانہ شاہی میں ۸۰۰ ملین (یعنی اٹھاسی کروڑ) مثقال سونا موجود تھا۔[1] اس نے ۳۸ سال حکومت کی اور اس کے بعد اس کا بیٹا شیرویہ تخت حکومت پر بیٹھا۔

مقوقس

یہ اسکندریہ کا گورنر اور مصر میں بازنطینی شہنشاہی کا نائب سلطنت VICEROY تھا عرب مؤرخ زیادہ تر اس کو مقوقس کے نام سے یاد کرتے ہیں اس کے اصلی نام اور کنیت میں بڑا اختلاف ہے مؤرخ ابو صالح جنھوں نے چھٹی صدی ہجری (سنہ ۱۲ء) میں اپنی تاریخ قلم بند کی تھی اس کا ذکر جریج بن مینا المقوقس کے نام سے کیا ہے ابن خلدون نے لکھا ہے کہ وہ قبطی تھا مقریزی نے اس کو المقوقس الرومی لکھا ہے جب ایرانیوں نے مصر پر حملہ کیا تو بازنطینیوں کے مقرر کردہ گورنر نے راہِ فرار اختیار کی اس کا نام (JOHN THE ALMONER) تھا یہ اسکندریہ سے بھاگ کر قبرص پہنچا اور وہیں اس کی موت ہوئی اس کے بعد ہرقل نے اس کی جگہ دوسرے نائب سلطنت کو جس کا نام جارج تھا مقرر کیا اور شاید یہ وہی شخص ہے جس کو عرب جریج کہتے ہیں اس نے اس کو ملکانی کلیسا کا سربراہ بھی مقرر کیا بعض مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس کی تقرری ۶۳۱ء میں ہوئی۔ الفریڈ بٹلر (ALFRED J. BUTLER) لکھتا ہے:۔

"عربوں کا خیال تھا کہ جو حاکم بازنطینی حکومت کی طرف سے ایران پر فتح پانے کے بعد مصر کا گورنر مقرر ہوا اس کا لقب مقوقس تھا اور وہ ایک وقت میں

---

[1] ایران بعہد ساسانیان ص ۶۱۱

ملک کا حاکم اور کلیسا کا سربراہ اور مذہبی پیشوا بھی ہوتا تھا چنانچہ الفرڈ
جارج کے بیٹے (جو وہاں نائب سلطنت تھا) یہ لقب تجویز کیا اور وہ اس کو
ترجیح دیتا ہے کہ مقوقس اس کا اصل نام نہیں بلکہ لقب ہے جو قدیم قبطی
زبان کا لفظ ہے یہ بھی ممکن ہے کہ ایرانیوں کے مصر پر غلبہ اور اقتدار کے وقت
کسی قبطی لاٹ پادری نے کلیسا کی سربراہی اور نظام مملکت دونوں اپنے
ہاتھ میں لے لی ہوگی تاہم صلح ۶۲۸ء میں لکھا گیا اس لئے ممکن ہے کہ
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مکتوب گرامی مقوقس کے نام اسی وقت میں
پہونچا ہو جب مصر کا حاکم تقریباً خود مختار تھا۔[1]

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے نام کے ساتھ عظیم القبط (قبطیوں
کے رہنما اور سردار) کے الفاظ بھی لکھے۔

مصر بازنطینی شہنشاہی کی سب سے زرخیز ریاست تھی اور پیداوار اور آبادی
دونوں کے لحاظ سے سب سے آگے تھی غذائی اجناس دار السلطنت میں یہیں سے سپلائی
ہوتی تھیں فاتح مصر عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے
نامۂ مبارک ارسال کرنے کے چودہ[2] برس بعد وہاں فاتحانہ داخل ہوئے تھے امیر المؤمنین
عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے نام اپنے خط میں مصر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:۔

"مصر کی سرزمین بہت سرسبز و شاداب ہے اس کا طول ایک مہینہ کی مسافت
اور عرض دس دن کی مسافت کے بقدر ہے[3] اس کی آبادی اور کثرت تعداد کا اندازہ

---

[1] دیکھئے APPENDIX C. PP. [illegible] و ملاحظہ ہو عربوں کی فتح مصر (الفرڈ بٹلر) مصر کے اس گورنر
کا نام بعض کتابوں میں الجریج بن مینا بتایا گیا ہے۔ [2] النجوم الزاہرہ ابن تغری بردی ج ۱ ص ۲۲

اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے سنہ ۲۰ھ مطابق ۶۴۰ء میں فتح مصر کے بعد یہ شمار کرایا کہ جزیہ کے مستحق کون کون لوگ ہیں تو ان کی تعداد ساٹھ لاکھ سے زیادہ نکلی۔[1] رومیوں کی تعداد اس میں ایک لاکھ تھی۔ حضرت عمرو بن العاص نے خلیفہ کو لکھا

میں نے ایک ایسا شہر فتح کیا ہے جس کی تعریف میں صرف اتنا لکھتا ہوں کہ مجھے وہاں چار ہزار بلند و مستحکم مقامات نظر آئے جہاں چار ہزار حمام تھے یہودیوں کی تعداد چالیس ہزار تھی بادشاہوں کے لئے چار سو تفریح گاہیں تھیں۔[2]

نجاشی

یہ ملک قدیم زمانہ سے حبشہ (ABYSSINIA) ایتھوپیا ETHIOPIA کہلاتا ہے یہ مشرقی افریقہ کا حصہ ہے اور بحر احمر کے جنوب مغرب میں واقع ہے جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت اس کے حدود کیا تھے اس کا تعین اس وقت آسان نہیں یہاں کی حکومت بھی دنیا کی قدیم ترین حکومتوں میں تھی یہودی ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ سبا حبشہ ہی میں رہتی تھیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد آج تک حبشہ کی حکمران ہے یہود نے ہیکل سلیمانی کی تباہی کے بعد یہاں آباد ہونا شروع کیا جیسا ئیت کو چوتھی صدی عیسوی سے وہاں فروغ ہوا اور جب یمن کے بادشاہ نے اپنے ملک میں عیسائیوں پر مظالم شروع کئے تو قسطنطین اول نے حبشہ کے بادشاہ

---

[1] دائرۃ معارف القرن العشرین از محمد فرید وجدی، دیکھئے مادہ مصر۔ مصنف کا خیال ہے کہ مصر کی آبادی کے تناسب کو دیکھتے ہوئے اس تعداد میں شبہ ہے اس لئے کہ مصر کی بالغ مردوں کی تعداد اس وقت بھی چالیس لاکھ سے زائد نہیں۔ [2] حسن المحاضرۃ للسیوطی۔

سے عیسائیوں کی مدد کرنے اور ان مظالم کا سدباب کرنے کا مطالبہ کیا چنانچہ ۵۲۵ء میں اس نے یمن پر قبضہ کر لیا اور یمن پر حبشی اقتدار تقریباً ۵۰ سال تک قائم رہا۔ اسی زمانہ میں حبشہ کی طرف سے یمن کے بادشاہ ابرہہ نے بیت اللہ پر لشکر کشی کی اور واقعۂ فیل کا ظہور ہوا۔

حبشہ کا دارالسلطنت "AKSUM" تھا۔ یہ ایک آزاد اور خود مختار حکومت تھی جو کسی غیر ملکی حکومت کے تابع نہ تھی اور نہ کسی کو خراج اور ٹیکس وغیرہ دیتی تھی، بازنطینی شہنشاہی سے اس کا تعلق صرف مذہبی رشتۂ عیسائیت کی بنیاد پر تھا اس کا ثبوت خاص طور پر اس سے ملتا ہے کہ بازنطینی فرمانروا جسٹینین نے چھٹی صدی کے وسط میں "JULIAN" نامی ایک شخص کو حبشہ کے دربار شاہی میں اپنا سفیر مقرر کیا۔ "DE LACY O'LEARY" اپنی کتاب ARABIA BEFORE MOHAMMAD میں لکھتا ہے:

"حبشہ ۵۲۲ء سے لے کر ظہور اسلام تک بحر احمر اور افریقہ کی ساری تجارت پر مسلسل قابض رہا، بلکہ شاید ہندوستان کی تجارت پر بھی قابض تھا۔"[۲]

حبشہ کے بادشاہ کو ہمیشہ نجاشی (NAGUSA NAGASHI) کہا جاتا تھا۔ البتہ اس نجاشی کے تعین اور نشاندہی میں مختلف اقوال اور روایتیں آئی ہیں جس کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا نامۂ مبارک بھیجا تھا اور اس کو اسلام کی دعوت دی تھی، اس سلسلے میں ہمارے سامنے دو مستقل بالذات اور ایک دوسرے سے ممتاز شخصیتیں ہیں، پہلی وہ شخصیت ہے جس کے عہد میں مکہ کے مسلمانوں نے ہجرت کی تھی، اور جن میں جعفر بن ابی طالب بھی تھے، یہ نبوت کے پانچویں سال کا

۱؎ A. H. M. JONES & ELIZABETH MONROE; A HISTORY OF ABYSSINIA (OXFORD [illegible]) PP. [illegible]

۲؎ ARABIA BEFORE MOHAMMAD (LONDON, [illegible]) P. [illegible]

واقعہ ہے یہ بات بہت خلافِ قیاس ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس وقت یہ مکتوب روانہ فرما دیا ہو اس لئے کہ اس وقت کے حالات اس کی بالکل اجازت نہیں دیتے تھے اور اس کام کا وقت ابھی نہ آیا تھا آپ نے ہجرت سے قبل کسی بادشاہ کو کوئی مکتوب روانہ فرمایا ہو اور اسلام قبول کرنے کی دعوت دی ہو اس کا کوئی سراغ ہمیں نہیں ملتا زیادہ سے زیادہ جو بات ملتی ہے وہ یہ کہ اس موقع پر آپ نے اس سے ان مسلمانوں کو پناہ دینے کی فرمائش کی، جو قریش کے مظالم سے تنگ آ چکے تھے ابن ہشام اور دوسرے مصنفین نے اس باب میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اتنا ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ ایمان اس کے دل میں اتر چکا تھا اور وہ اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ عیسیٰ ابن مریم علیہ الصلاۃ والسلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اور اس کا حکم ہیں، جو اس نے مریمؑ پر القاء کیا تھا۔

جہاں تک اس نجاشی کا تعلق ہے جس کو آپ نے دعوتِ اسلام پر مشتمل اپنا مکتوب روانہ فرمایا، وہ حافظ ابن کثیر کے رجحان کے مطابق وہ نجاشی ہے جو ان مسلم نجاشی کے بعد والی ہوا جن سے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو سابقہ پڑا تھا، ابن کثیر کہتے ہیں یہ بات اس وقت پیش آئی جب آپ نے فتح مکہ سے قبل روئے زمین کے سلاطین کو خطوط لکھے، اور ان کو دینِ حق کی دعوت دی، ہمارے نزدیک قابلِ ترجیح قول یہی ہے کہ یہی وہ نجاشی تھا جس نے اسلام قبول کیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اس کی وفات کی خود اطلاع فرمائی اور اس کے لئے دعائے مغفرت کی، انہی نے واقدی اور دوسرے سیرت نگاروں سے روایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ وہی نجاشی ہے جس کے لئے آپ نے دعائے مغفرت فرمائی یہ واقعہ

تبوک سے واپسی پر رجب سنہ ۹ھ میں پیش آیا تھا۔

اس طرح ان مختلف روایات کی تصدیق ہو جاتی ہے اور قرائن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، واللہ اعلم۔

ان سلاطین نے نامہائے مبارک کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟

"ہرقل" "نجاشی" اور "مقوقس" ان تینوں نے مکاتیب نبوی کے ساتھ ادب کا معاملہ کیا اور ان کی طرف سے ان کے جواب میں تواضع اور احترام تھا نجاشی اور مقوقس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قاصدوں کا بہت اکرام کیا، مقوقس نے آپ کو ہدایا بھی بھیجے ان میں دو باندیاں بھی تھیں جن میں ایک کا نام ماریہ تھا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم ان ہی کے بطن سے تھے۔[1]

جہاں تک کسریٰ پرویز کا تعلق ہے اس نے نامہ مبارک سنتے ہی چاک کر ڈالا اور بولا "میرا غلام ہو کر مجھ کو یوں لکھتا ہے"[2] رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا "اللہ اس کے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا"۔[3]

---

[1] حاشیہ صحیح مسلم طبع مصر ج ۵ ص ۱۶۶ [2] نظامی گنجوی نے جو ایران کے پایۂ ناز مسلمان شاعر تھے شاہ ایران کی اس گستاخی کو اپنے اس شعر میں بڑی لطافت کے ساتھ ادا کیا ہے، وہ کہتے ہیں:۔

در یدان نامۂ گردن شکن را   نہ نامہ بلکہ نام خویشتن را

[3] صحیح بخاری باب کتاب النبی صلے اللہ علیہ وسلم الی کسریٰ و قیصر، کسریٰ کے نام کا فرمان مبارک جو مستقیاب ہوا ہے اس میں چاک کا نشان اب بھی موجود ہے جو درمیان میں سے اوپر سے نیچے کی طرف دائیں طرف جھکتا ہوا ہے اور اس کو سی دیا گیا ہے یہ فرمان مبارک جسے بیرم نے حاصل کیا تھا حکومت لبنان کے ایک سابق وزیر ہنری فرعون کے پاس محفوظ ہے (مقالہ ڈاکٹر عبد العزیز ابراہیم پیش کردہ سیرت کانفرنس ۱۶ ربیع الاول ۱۳۸۳ھ اور مقالہ ڈاکٹر صلاح الدین المنجد شائع جریدہ "الحیات")

کسریٰ نے یمن کے حاکم باذان کو اس کا حکم دیا کہ آپ کو حاضر کیا جائے، اس نے بابویہ کو آپ کے پاس بھیجا اور یہ کہلوایا کہ شہنشاہ کسریٰ نے باذان کو ہدایت کی ہے کہ کسی کو بھیج کر آپ کو وہاں حاضر کیا جائے، اس غرض سے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ آپ میرے ساتھ چلیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو یہ اطلاع دی کہ اللہ تعالےٰ نے کسریٰ پر اس کے بیٹے شیرویہ کو مسلط کر دیا ہے جس نے اس کو قتل کر دیا ہے[1] رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو خبر دی تھی وہ حرف بحرف صحیح نکلی، کسریٰ کے تخت پر اس کا لڑکا قباذ جس کا لقب شیرویہ تھا، فائز ہوا، کسریٰ اسی کے اشارے پر ۶۲۸ء میں قتل کیا گیا، اس کی موت کے بعد ملک کا شیرازہ منتشر ہو گیا اور حکمراں خاندان کے ہاتھ سلطنت ایک کھلونا بن گئی، شیرویہ بھی چھ ماہ سے زیادہ حکومت نہ کر سکا اور اس کے تخت پر چار سال کے اندر یکے بعد دیگرے دس بادشاہ متمکن ہوئے، سلطنت کی چولیں ہل گئیں، آخر میں یزدگرد پر سب کا اتفاق ہوا، اور اس سلطنت کا تاج اس کے سر پر رکھا گیا، یہ ساسانی خاندان کا آخری فرمانروا تھا، اور اسی کو اسلامی افواج کا سامنا کرنا پڑا تھا، جنھوں نے بالآخر سلطنت آل ساسان کی قسمت پر مہر لگا دی، اور اس سلطنت کا جس کا چار سو سال تک دنیا میں ڈنکا بجتا رہا چراغ گل ہو گیا[2] یہ واقعہ ۶۳۲ء میں پیش آیا، اور اس طرح پیشین گوئی آٹھ سال کے اندر اندر پوری ہو گئی، اور آپ کی پیشین گوئی کا دوسرا جزو بھی پورا ہوا کہ "اذا هلك كسرى فلا كسرى بعده"[3]
اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو ایران کا وارث و حاکم بنا دیا، اہل ایران کو اسلام کی ہدایت دی۔

---

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۵۷۲ [2] ایران بعہد ساسانیان ... ساسانی سلطنت کا دور آخر۔ [3] یہ اس روایت کے الفاظ ہیں جو مسلم نے ابو ہریرہ سے، امام شافعی نے اپنی مسند میں بیان کی ہے۔

ان میں علم و دین کے بڑے بڑے امام اور اسلام کی تبلیغ کرنے والے پیدا ہوئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا بالکل صحیح ثابت ہوا کہ :-

لوکان العلم بالثریا لتناوله	اگر علم ثریا پر بھی ہوگا تو کچھ ایرانی
اناس من ابناء فارس۔[1]	لوگ حاصل کر کے رہیں گے۔

ہرقل اور ابوسفیان کا مکالمہ

ہرقل نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے اور صحیح حقائق سے آگاہ ہونے کی کوشش کی اور کسی ایسے شخص کی جستجو کی جو آپ کے بارے میں صحیح رپورٹ دے سکے حسن اتفاق سے ابوسفیان اس وقت غزہ میں موجود تھے اور تجارت کی غرض سے آئے ہوئے تھے ان کو شاہی دربار میں لایا گیا۔ بادشاہ کے سوالات ایک ایسے دانشمند، واقف اور تجربہ کار شخص کے سوالات تھے جو تاریخ مذاہب انبیاء کے خصائص اور سیرت اور ان کی قوموں کا ان سے معاملہ اللہ تعالیٰ کی سنت سے بخوبی واقف ہو۔ ابوسفیان نے بھی قدیم عربوں کی طرح اس شرم سے کہ لوگ ان کو غلط بیانی کرنے والا نہ کہیں ان سوالات کا بالکل صحیح صحیح جواب دیا۔

یہ مکالمہ درج ذیل ہے :-

ہرقل : ان کا نسب کیسا ہے ؟

ابوسفیان : وہ ہم میں عالی نسب سمجھے جاتے ہیں۔

ہرقل : کیا یہ بات وہ کہتے ہیں ان سے پہلے بھی کسی نے کہی تھی۔

---

[1] مسند امام احمد ج ۲ ص ۲۹۶

ابوسفیان: نہیں۔

ہرقل: اس خاندان میں کوئی بادشاہ گذرا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

ہرقل: کیا صاحب اثر لوگوں نے ان کا اتباع کیا ہے یا کمزوروں نے؟

ابوسفیان: کمزور لوگوں نے۔

ہرقل: ان کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟

ابوسفیان: بڑھتے جاتے ہیں۔

ہرقل: کیا کوئی ان کے دین میں داخل ہونے کے بعد دین کو ناپسند کرکے پھر بھی جاتا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

ہرقل: کیا ان کے اس دعوے سے پہلے بھی تم نے کبھی ان پر جھوٹ کا تجربہ کیا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

ہرقل: کیا وہ عہد و قرار کی خلاف ورزی بھی کرتے ہیں؟

ابوسفیان: ابھی تک تو نہیں کی لیکن اب جو نیا معاہدۂ صلح ہے اس میں دیکھیں وہ عہد پر قائم رہتے ہیں یا نہیں؟

ہرقل: تم لوگوں نے ان سے کبھی جنگ بھی کی؟

ابوسفیان: ہاں!

ہرقل: نتیجۂ جنگ کیا رہا؟

ابوسفیان: جنگ کا پانسہ ہمارے اور ان کے درمیان پلٹتا رہتا ہے کبھی ہم غالب

آتے ہیں یا گھٹتی وہ۔

ہرقل: وہ کیا تعلیم دیتے ہیں؟

ابوسفیان: وہ کہتے ہیں کہ ایک خدا کی عبادت کرو کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ نماز پڑھو، پاکدامنی اختیار کرو سچ بولو، صلہ رحمی کرو۔

ہرقل نے مترجم سے کہا کہ ان سے کہو کہ میں نے تم سے ان کے نسب کی بابت دریافت کیا تو تم نے بتایا کہ وہ تم میں شریف النسب ہیں پیغمبر ہمیشہ اچھے ہی خاندانوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ میں نے تم سے دریافت کیا کہ کیا اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا، تو تم نے کہا کہ نہیں اگر ان سے پہلے کسی نے یہ دعویٰ کیا ہوتا تو میں کہتا کہ وہ اسی کی نقل کر رہے ہیں۔ میں نے تم سے پوچھا کہ کیا ان کے خاندان میں کوئی بادشاہ گذرا ہے، تم نے کہا نہیں اگر کوئی بادشاہ گذرا ہوتا تو میں کہتا کہ اپنے خاندان کی بادشاہت کے طالب ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا تم ان کو اس دعوے سے پہلے بھی کبھی جھوٹا کہتے تھے، تم نے کہا نہیں، میں جانتا ہوں کہ یہ ناممکن تھا کہ وہ لوگوں سے تو جھوٹ نہ بولیں اور اللہ پر جھوٹ باندھیں۔ میں نے تم سے دریافت کیا کہ شرفاء و دولتمند لوگ ان کے متبع ہیں یا غریب اور کمزور، تم نے کہا کمزوروں نے ہی ان کی پیروی کی ہے پیغمبروں کے (ابتدائی) پیرو ہمیشہ غریب ہی لوگ ہوتے ہیں۔ میں نے تم سے دریافت کیا کہ ان کے پیرو بڑھتے جاتے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں تم نے کہا کہ بڑھتے جاتے ہیں ایمان کا یہی معاملہ ہے (کہ بڑھتا جاتا ہے) یہاں تک کہ کمال کو پہونچ جائے۔ میں نے تم سے پوچھا کہ کوئی ان کے دین سے ناراض ہو کر مرتد بھی ہو جاتا ہے تم نے کہا نہیں، ایمان کا حال یہی ہوتا ہے جب دلوں کو اس کی چاشنی حاصل

ہو جاتی ہے تو وہ نکلتا نہیں ہے — میں نے تم سے پوچھا کہ کیا وہ عہد و پیمان کی خلاف ورزی بھی کرتے ہیں، تم نے کہا نہیں، پیغمبر اسی طرح خلاف ورزی نہیں کرتے، اور میں نے تم سے دریافت کیا کہ وہ کیا سکھاتے ہیں، تم نے بتایا کہ وہ تم کو یہ سکھاتے ہیں کہ تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، اور تم کو بتوں کی پوجا سے روکتے ہیں، نماز، سچائی، پاکدامنی کی تعلیم دیتے ہیں، اگر تمہارا کہنا سچ ہے تو عنقریب اس وقت جہاں میرے قدم ہیں وہاں تک ان کا قبضہ ہو جائے گا، مجھ کو ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا، اگر میں وہاں جا سکتا تو ضرور ان کی ملاقات کے لئے جاتا، اور اگر میں ان کے پاس ہوتا تو ان کے پاؤں دھوتا۔[1]

ہرقل نے ارکان سلطنت اور اعیان قوم کو محل میں طلب کیا، اور دروازے بند کروا دیئے، پھر حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر اس نے کہا: اے اہل روم! کیا تم خیر و فلاح چاہتے ہو؟ اور چاہتے ہو کہ تمہارا ملک باقی رہے، اگر ایسا ہے تو تم اس نبی کے ہاتھ پر ایمان لے آؤ، حاضرین تیزی سے دروازوں کی طرف بھاگے تو ان کو بند پایا، جب ہرقل نے ان کی یہ حالت دیکھی اور ان کے ایمان لانے سے مایوس ہو گیا تو اس نے حکم دیا کہ ان کو واپس لاؤ، اور کہا کہ ابھی میں نے جو بات کہی تھی وہ اس لئے کہی کہ اپنے دین پر تمہاری مضبوطی کا امتحان لوں، میں نے یہ دیکھ لیا، تو سب نے اس کے سامنے پیشانی ٹیک دی اور اس سے خوش ہو گئے۔

غرض ہرقل نے سعادت و نجات کا یہ زریں موقع کھو دیا اور اس ابدی دولت پر فانی سلطنت کو ترجیح دی، جس کا انجام یہ ہوا کہ عہد فاروقی میں اس کو اس سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔

---

[1] الجامع الصحیح للبخاری ج ۱۔ باب کیف کان بدأ الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اریسی کون تھے؟

"اریسین" یا "یریسین" کا لفظ روایات کے اختلاف کے باوجود صرف اس خط میں آیا ہے جو ہرقل کے نام لکھا گیا۔ اس کے علاوہ جتنے مکاتیب سلاطین کو آپ نے روانہ فرمائے کسی میں یہ لفظ ہمیں نہیں ملتا۔ علماء حدیث اور علماء لغت کا اس لفظ کے اصلی مفہوم کے بارے میں خاصا اختلاف ہے۔ مشہور قول یہ ہے کہ "اریسین" "اریسی" کی جمع ہے اور وہ خدمتگاروں، شاگرد پیشہ اور کاشتکاروں کے لئے آتا ہے۔[1]

ابن منظور نے بھی "لسان العرب" میں اس کو کاشتکاروں کے ہم معنی قرار دیا ہے اور اس کو امام لغت ثعلب سے نقل کیا ہے۔ ابن الاعرابی کے قول کا حوالہ دیتے ہوئے بھی اس مادہ کے یہی معنی لکھے ہیں اور ابوعبیدہ کا قول نقل کیا ہے کہ "میرے نزدیک اریس سردار اور بڑے کو کہتے ہیں جس کے حکم کی تعمیل کی جائے اور جب وہ اطاعت چاہے تو اس کی اطاعت کی جائے"۔[2]

اس موقع پر ایک پڑھا لکھا آدمی جس کی ان ملکوں کے خصائص و حالات پر نظر بھی ہو یہ سوال کر سکتا ہے کہ اگر اریسین سے مراد کاشتکار تھے تو شہنشاہ ایران کسریٰ پرویز اس کا زیادہ مستحق تھا کہ اس کو ان کے بارے میں اس کی ذمہ داری سے آگاہ کیا جاتا اور یہ لفظ اس خط میں آتا جو کسریٰ کے نام بھیجا گیا، اس لئے کہ

---

[1] دیکھئے شرح مسلم للنووی اور "مجمع بحار الانوار" از علامہ محمد طاہر پٹنی۔

[2] دیکھئے "لسان العرب" مادہ ارس۔

کاشتکاروں کا طبقہ سلطنت ساسانی میں بازنطینی سلطنت کے مقابلہ میں زیادہ وسیع اور نمایاں تھا، اور ایران کی قومی آمدنی اور ذرائع معیشت کا زیادہ تر انحصار زراعت پر تھا جیسا کہ ازہری نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور ابن منظور نے ان کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ:۔

"سواد عراق کے لوگ جو کسریٰ کے دین پر تھے زراعت پیشہ اور کاشتکار تھے اہل روم ساز و سامان کی تیاری اور صناعی کا پیشہ کرتے تھے اور اس لئے وہ مجوس کو اریسین کہتے تھے اریس کی طرف نسبت کرتے ہوئے جس کے معنی کاشتکار کے ہیں عرب بھی ایرانیوں کو "فلاحین" کاشتکار کے لقب سے یاد کرتے تھے[1]

ان سب وجوہ سے ہمارے نزدیک ترجیح اس قول کو ہے کہ اریسیین سے مراد اریس مصری (A.R.U.S, 280-336) کے پیرو ہیں جو ایک مستقل مسیحی فرقہ کا بانی تھا جس نے مسیحی عقائد اور اصلاح کے شعبہ میں ایک خاص کردار ادا کیا، اس فرقے نے بازنطینی سلطنت اور مسیحی کلیسا کو عرصہ دراز تک پریشان رکھا تھا "اریوس" وہ شخص ہے جس نے توحید کا نعرہ بلند کیا اور خالق و مخلوق (عیسائیوں کے الفاظ میں) "باپ بیٹے" کے درمیان فرق کرنے کی دعوت دی، اس نے اس موضوع پر بحث و مباحثہ کا دروازہ کھولدیا اور عیسائی معاشرہ میں صدیوں تک یہی موضوع رہا، اس کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے کہ خدائے واحد کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ زمین پر ظاہر ہوا اس لئے اس نے حضرت مسیح کو قوت اور

---

[1] ایضاً

کلام الٰہی سے ظہور پایا خدا کے بنیادی صفات میں وحدانیت اور ابدیت ہے اور اس نے اپنی ذات سے براہ راست کسی کو پیدا نہیں کیا اس لئے بیٹا خود "خدا" نہیں ہے بلکہ امر رب کی حکمت کا ایک مظہر ہے اور اس کی الوہیت اضافی ہے نہ کہ مطلق۔[1]

جیمس میکنن (JAMES MACKINNON) اپنی کتاب "مسیح سے قسطنطین تک" میں لکھتا ہے:۔

"اریوس کا اصرار تھا کہ تنہا اللہ کی ذات قدیم ہے ازلی ابدی ہے اس کا کوئی شریک نہیں، رہا بیٹا تو جسے عدم سے وجود میں لایا ہے بیٹا ازلی نہیں ہے اللہ ہمیشہ سے باپ نہیں ہے چنانچہ ایک زمانہ ایسا گذرا ہے کہ بیٹے کا وجود ہی نہ تھا بیٹا اپنی ایک مستقل حقیقت رکھتا ہے جبکہ اللہ اس کا شریک نہیں، وہ تبدیلیوں اور انقلابات سے متاثر بھی ہوتا ہے اور وہ صحیح معنی میں خدا کہلانے کا مستحق نہیں، البتہ کامل قرار دیا جا سکتا ہے لیکن وہ بہرحال ایک کامل مخلوق ہے۔"[2]

دوسری طرف اسکندریہ کا کلیسا چوتھی صدی عیسوی میں حضرت مسیح کی الوہیت کا مطلق طریقے سے قائل تھا اور اس کے نزدیک خالق و مخلوق اور باپ بیٹے میں کوئی فرق نہ تھا اس کو مصری کلیسا کے لاٹ پادری الیگزینڈر (ALEXANDER) نے ۳۲۱ء میں اسکندریہ کے کلیسا سے بے دخل کر دیا، اریوس شہر چھوڑ کر چلا گیا لیکن اس کی مقبولیت

۱؎ تفصیل کے لئے دیکھئے انسائیکلوپیڈیا مذاہب و اخلاق جلد اول مقالہ ([illegible]) ص [illegible]

۲؎ FROM CHRIST TO CONSTANTINE — (LONDON, [illegible])

سے یہ جھگڑا ختم نہیں ہوا شہنشاہ قسطنطین نے اس نزاع کو ختم کرانے کی کوشش کی، لیکن اس کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی ۳۲۵ء میں اس نے نیقیہ NICAEA میں ایک کانفرنس بلائی جس میں دو ہزار تین سو پادری شریک ہوئے شہنشاہ کا رجحان الوہیت مسیح کی طرف تھا اس لئے اس نے اریوس کے خلاف فیصلہ دیا اس کے باوجود کہ مذکورہ کی اکثریت اریوس کی موید تھی اور صرف تین سو اٹھارہ پادری بادشاہ کے ساتھ تھے تاہم اس نے اریوس کو الیریا ILLYRIA میں جلاوطن کر دیا اور اس کی سب تحریریں جلا دی گئیں جس کے پاس اس کی کوئی تحریر ملتی اس کو سخت سزا دی جاتی لیکن ان کوششوں کے اریوس کی اہمیت اور لوگوں میں اس کی ہر دلعزیزی و مقبولیت ختم نہ کی جا سکی۔

آخر کار قسطنطین ہی کو اپنا رویہ نرم کرنا پڑا اور اس نے اس کے عقیدہ سے پابندی اٹھالی اپنے سب سے بڑے حریف و رقیب الیگزنڈر کی موت اور اس کے جانشین ATHANASIUS کی جلاوطنی کے بعد اریوس اسکندریہ پھر واپس آگیا قریب تھا کہ قسطنطین اس کو مصری کلیسا کا سربراہ مقرر کر دے اور اس کا مذہب قبول کرلے لیکن موت نے اس کا موقع نہیں دیا۔[1]

"ڈریپر نے اپنی کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس" میں لکھا ہے کہ تیرہ مسیحی مجالس نے چوتھی صدی عیسوی میں اریوس کے خلاف فیصلہ دیا تھا پندرہ مسیحی مجالس نے اس کی تائید کی تھی سترہ مسیحی مجالس نے جو رائے ظاہر کی وہ اس کی رائے کے بہت قریب تھی اس طرح ۴۵ مسیحی مجالس اس مسئلہ پر غور و فیصلہ کرنے کے لئے منعقد کی گئیں۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا مذہب و اخلاق مقالہ "ARIANISM"

واقعہ یہ ہے کہ مسیحی دنیا میں چوتھی صدی سے قبل عقیدۂ تثلیث کا عام رواج نہیں تھا، "نیو کیتھولک انسائیکلوپیڈیا" میں آتا ہے کہ:-

"عقیدۂ تثلیث کی تشکیل جدید اور اس کے راز سے پردہ صرف انیسویں صدی کے نصف ثانی میں ہی اٹھ سکا، جب عقیدۂ توحید پر اگر کوئی گفتگو کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مسیحی تاریخ کے آغاز سے چوتھی صدی کی آخری چوتھائی تک منتقل ہو جاتا ہے یہ کہ ایک عہد کے لئے منظاہر ہیں، مسیحی دنیا میں یہ نظریہ اسی مخصوص تاریخی وقفہ میں پھیلا تھا"[1]

یہ عقیدہ و دعوت الوہیت مسیح کی کھلی ہوئی دعوت کے ساتھ ہمیشہ برسرِ پیکار رہی، کبھی اس کا پلڑا بھاری ہوتا کبھی اس کا، بازنطینی مملکت کی مشرقی ریاستوں میں عیسائیوں کی بہت بڑی تعداد اریوس کے عقیدہ کی حامل تھی، یہاں تک کہ تھیوڈوسیس THEODOSIUS THE GREAT نے قسطنطنیہ میں عیسائی کانفرنس طلب کی جس نے الوہیت مسیح اور ان کے خدا کا بیٹا ہونے کے عقیدہ کو باقاعدہ منظور کرلیا، اور اس کے اعلان کے بعد اریوسی عقیدہ کی دعوت ختم ہوگئی اور یہ تحریک نظروں سے اوجھل ہوگئی، تاہم عیسائیوں کی ایک جماعت اس کے بعد بھی اس سے وابستہ رہی اور یہ لوگ "فرقۂ اریسیہ" یا "اریسیین" کے نام سے مشہور ہوئے۔

اس لئے قابلِ ترجیح اور قرینِ قیاس یہی قول ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس جملہ سے "فان تولیت فان علیک اثم الأریسیین" سے مراد یہی جماعت ہے[2] کہ اس وقت کی مسیحی دنیا میں جس کی امامت اور قیادت عظیم بازنطینی مملکت کے ہاتھ میں تھی،

---

[1] "THE NEW CATHOLIC ENCYCLOPAEDIA" مقالہ "تثلیث مقدس" ج ۱۴ ص ۲۹۵

اور جس کا سربراہ ہرقل تھا یہی فرقہ نسبتاً توحید کا حامل اور اس پر اب تک قائم تھا۔

عجیب بات یہ ہے کہ عصر اول کے بعض جلیل القدر علماء اسلام نے بھی اسی بات کا اظہار کیا ہے امام طحاوی (م ۳۲۱ھ) اپنی کتاب "مشکل الآثار" میں لکھتے ہیں:-

"بعض حقائق آگاہ علماء نے بیان کیا ہے کہ ہرقل کی جماعت میں ایک فرقہ تھا جس کو اریسیہ کہتے تھے یہ توحید اللہ اور حضرت مسیحؑ کی عبدیت کا قائل تھا نصاریٰ مسیح کی ربوبیت کے بارے میں جو کچھ کہتے تھے یہ فرقہ اس کو تسلیم نہیں کرتا تھا یہ دین مسیح پر قائم تھا اور انجیل میں جو کچھ تھا اس پر عمل پیرا تھا نصاریٰ اس سے آگے بڑھ کر جو کچھ کہتے تھے وہ اس پر ایمان نہ رکھتا تھا اگر یہ بات صحیح ہے تو اس فرقہ کو اریسیونؔ رفع کے ساتھ اور اریسیینؔ نصب اور جر کے ساتھ کہنا دونوں جائز ہے جیسا کہ علماء حدیث کا خیال ہے۔"[1]

اسی کے قریب رائے امام نوویؒ شارح مسلم (م ۶۷۶ھ) نے بھی ظاہر کی ہے وہ کہتے ہیں:-

"دوسرا قول یہ ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ میں جو عبداللہ بن اریس[3] کے ماننے والوں میں تھے جس کی طرف اروسیت کو منسوب کیا جاتا ہے۔"[2]

مکاتیب بنام امرائے عرب

امرائے عرب میں آپ نے منذر بن ساوی (حاکم بحرین[4]) جیفر بن الجلندی،

---

[1] مشکل الآثار ج ۲ ص ۳۹۹ [3] یہ امام نووی کی فروگذاشت معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ ظہور اسلام سے تقریباً سو برس قبل اریس کا وجود تھا اور اس کا نام بھی کوئی اسلامی عربی نام نہ تھا۔

[2] شرح صحیح مسلم للنووی ج ۲ ص ۱۰۸ [4] بحرین عرب کے اس خطہ کو کہتے ہیں جس کا نام اب "الاحساء" ہے حضرت ابوعبیدہ کی قیادت میں جو لشکر بھیجا گیا تھا اور جس میں [illegible] (باقی ص ... پر)

عبد بن الجلندیؓ الازدی (امرائے عمان) اور ہوذہ بن علی (حاکم یمامہ) اور حارث بن
شمر الغسانی کے نام مکاتیب ارسال کئے گئے منذر بن ساوی تمیمی جلندیؓ کے دونوں
بیٹوں جیفر اور عبد نے اسلام قبول کرلیا ہوذہ بن علی حاکم یمامہ نے رسول اللہ صلی اللہ

(باقی صفحہ کا) خلیج کے کنارے کے اندر آنے کا واقعہ پیش آیا، وہاں کی سمت روانہ کیا گیا تھا اور احادیث
میں بھی اس وقت پر البحرین ہی کا لفظ آتا ہے یہیں سے بڑی مقدار میں مال غنیمت بھی آیا تھا۔
جس کا ذکر احادیث میں آتا ہے اب یہ نام یہاں سے منتقل ہو کر جزیرۃ العرب کے اس حصہ کی طرف منتقل
ہو گیا جو خلیج کی ریاستوں میں ایک ریاست ہے جو بحرین کے نام سے مشہور ہے اس کے زیادہ تر باشندے
بنی عبدالقیس، بنی بکر بن وائل اور تمیم کے قبائل سے تھے ان مکتوبات کی تحریر کے وقت وہاں کا
والی اور حاکم منذر بن ساوی تھا جو بنو تمیم کے قبیلہ کا فرد تھا ان مکتوبات کے متن کے لئے جو
ملوک و امرائے عرب اور رؤسائے قبائل کو تحریر کئے گئے اور ان کے نام بدلے اور کتب سیر
کے بارے میں معلومات کے لئے ملاحظہ ہو کتاب "اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین"
(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تالیف امام محمد بن طولون دمشقی (م ۹۵۳ھ)
طبع مؤسسۃ الرسالۃ ؎ مؤرخین کہتے ہیں کہ جلندی کسی خاص شخص
کا نام نہیں تھا وہ ایک لقب تھا جس کے معنی بادشاہ کے ہیں جیسے مصر کے فرعون اور حبشہ کے نجاشی کہتے ہیں
اول الذکر بادشاہ عمر میں اپنے بھائی سے بڑا تھا (ملاحظہ ہو تاریخ الادب و تاریخ العرب قبل الاسلام)
؎ ہوذہ بن علی الحنفی یمامہ کا بادشاہ تھا اور عیسائی مذہب رکھتا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلیط بن
عمرو کو اسی کے پاس بھیجا تھا یمامہ کے حدود اس وقت مشرق میں بحرین سے ملتے تھے اور مغرب میں حجاز سے
جا ملتے تھے یمامہ کے متعلقات میں منفوحہ بھی ہے جو مشہور جاہلی شاعر اعشیٰ کا وطن ہے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے زمانہ میں بنو حنیفہ وہاں کے نمایاں قبائل میں تھے انہیں میں مسیلمہ بن حبیب (باقی صفحہ آئندہ)

علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اس کو اقتدار میں شریک کیا جائے آپ نے انکار فرمایا۔ اور اس کے بعد جلد اس کی موت ہو گئی۔[1]

غزوہ بنی لحیان اور غزوہ ذی قرد

صلح حدیبیہ (سنہ ۶ھ) اور غزوہ خیبر کے درمیان غزوہ بنی لحیان اور غزوہ ذی قرد واقع ہوئے[2] جن میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تشریف لے گئے۔ اور ابن مکتوم کو مدینہ کا والی مقرر کیا۔ پہلے غزوہ کا سبب واقعہ رجیع کے افراد خبیب بن عدی اور ان کے ساتھیوں کے خون کا مطالبہ و جواب تھا۔ اور دوسرے کا سبب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جنگل میں چرنے والی اونٹنیوں پر شترکشت کی غارتگری بنی غفار کے ایک آدمی کا قتل اور ان کی بیوی کا اغوا تھا۔[3]

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) کا [illegible] پیدا ہوا تھا جس کا لقب عورت سے نسبت کی وجہ سے کذاب پڑ گیا۔ [3] تاریخ طبری ج ۳ ص [illegible]

[1] زاد المعاد ج ۲ ص [illegible] [2] صحیح مسلم میں سلمہ بن اکوع کی روایت جسے ابن حجر نے فتح الباری میں ترجیح دی ہے، اصحاب سیر متفق ہیں کہ غزوہ ذی قرد صلح حدیبیہ سے پہلے ہوا ہے۔

[3] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۷۹-۲۸۵

غزوۂ خیبر

(سنہ ۷ھ)

اللہ کا انعام

اللہ تعالیٰ نے حدیبیہ میں بیعت رضوان کے شرکاء کو جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی تھی اور اللہ تعالیٰ کے حکم اور ارشاد کو اپنی خواہش نفس اپنی رائے اور فہم پر مقدم رکھا تھا، فتح قریب اور مال کثیر کی بشارت دی اور ارشاد ہوا۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّأْخُذُوْنَهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ (سورۃ الفتح ۱۸)

(اے پیغمبر) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا اور جو (صدق و خلوص) ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا، ان پر تسلی نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح عنایت کی اور بہت سی غنیمتیں جو انہوں نے حاصل کیں اور خدا غالب حکمت والا ہے۔

ان فتوحات کا مقدمہ اور پیش خیمہ غزوۂ خیبر تھا۔ خیبر[1] ایک یہودی آبادی تھی جس میں بڑے مستحکم قلعے تھے[2] یہ یہود کا جنگی مستقر اور جزیرۃ العرب میں ان کا آخری قلعہ تھا۔ یہ یہودی مسلمانوں کے خلاف برابر شرارت و ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے اور اس بات کو کسی وقت نہ بھولتے کہ ان کے دوسرے بھائیوں کے ساتھ کیا ہوا ہے وہی سب کچھ ان کے ساتھ بھی پیش آسکتا ہے، وہ قبیلہ غطفان کے ساتھ مل کر مدینہ طیبہ پر حملہ کی سازش کر رہے تھے[3] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارادہ فرمالیا کہ اب ان سے اور ان کی سازشوں سے نجات حاصل کر لی جائے اور اس محاذ کی طرف

---

[1] ان قلعوں میں ناعم، قموص، اور حصن الشق، حصن نطاۃ، حصن سلالم، حصن الوطیح، حصن الکتیبہ زیادہ مشہور تھے یعقوبی نے لکھا ہے کہ خیبر میں بیس ہزار جنگجو موجود تھے (ج ۲ ص ۵۶) منقول از کتاب صحابہ و تابعین از مولوی حبیب اللہ ندوی ناشر دار المصنفین (اعظم گڑھ)

[2] مشہور انگریز مستشرق W. MONTGOMERY WATT اپنی کتاب "MUHAMMAD PROPHET AND STATESMAN" (محمد صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت پیغمبر اور سیاستدان) میں لکھتا ہے کہ خیبر کے یہودی خاص طور سے قبیلہ بنی نضیر کے وہ سردار جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے سے جلاوطن کیا تھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف شرانگیزی میں بہت پیش پیش تھے، یہی لوگ تھے جنہوں نے عرب کے دوسرے قبائل کو اپنی دولت کے ذریعہ اکسا کر مسلمانوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا اور یہی وہ بنیادی سبب تھا جس کی وجہ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر لشکر کشی کی۔ ص ۱۸۹ (انتہی ملخصاً) اس غزوہ کا مقصد صرف یہودیوں کی اس قوت کا زائل کرنا ہی نہیں تھا جو خیبر میں مجتمع ہو گئی تھی بلکہ حجاز و نجد کے درمیان شمال اور جزیرۃ العرب کے وسط کے ایک بڑے علاقہ قبیلہ غطفان کی طرف سے بھی اطمینان حاصل کرنا تھا جو عربی قبائل کا ایک نہایت جنگجو اور طاقتور مجموعہ تھا، اسی کی طرف سے اطمینان کے بغیر کسی طرف بھی اطمینان سے توجہ نہیں ہو سکتی

اطمینان اور یکسوئی حاصل ہو۔ یہ علاقہ مدینہ کے شمال مشرق میں ۸ میل کی مسافت پر واقع تھا۔

لشکرِ اسلام نبی کی قیادت میں

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ سے نکل کر مدینہ میں ذی الحجہ کا پورا مہینہ اور محرم کا کچھ حصہ قیام فرمایا اور اس کے بعد خیبر کی طرف رخ کیا۔

عامر بن الاکوع رضی اللہ عنہ لشکر کے ساتھ تھے اور یہ رجزیہ اشعار پڑھتے جاتے تھے۔

واللہ لولا اللہ ما اهتدينا ولا تصدقنا ولا صلينا

خدایا اگر تو ہدایت نہ کرتا تو نہ ہم ہدایت پاتے نہ خیرات دیتے نہ روزہ رکھتے۔

إنا إذا قوم بغوا علينا وإن أرادوا فتنة أبينا

ہم وہ لوگ ہیں کہ جب کوئی قوم ہم پر یورش کرتی ہے اور آمادۂ فساد ہوتی ہے تو ہم اس سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔

فأنزلن سكينة علينا وثبت الأقدام إن لاقينا[1]

تو ہمارے اوپر سکینت کا نزول فرما اور مقابلہ کے وقت ہمارے قدموں کو جمائے رکھ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے اس ربانی لشکر کو لے کر یہاں تشریف لائے۔ ان کی تعداد ایک ہزار چار سو تھی، اور ان کے ساتھ دو سو گھوڑے تھے۔ آپ نے اس کو اس میں شرکت کی اجازت نہ دی جو حدیبیہ کے موقع پر پیچھے رہ گیا تھا۔ ان صحابیات کی تعداد جو مریضوں کے علاج و معالجہ، زخمیوں کی مرہم پٹی اور پانی و غذا کے انتظام

---

[1] سیرت ابن کثیر ج ۳ ص ۳۴۲-۳۴۵ و صحیح مسلم باب غزوۂ خیبر بعض الفاظ اور اشعار کے اختلاف کے ساتھ۔

کی ذمہ داری انھیں پر عائد تھی۔

آپ نے رجیع کے مقام پر جو یہود اور قبیلۂ غطفان کے درمیان واقع تھا لشکر کو پڑاؤ کا حکم دیا، مقصد یہ تھا کہ ان کے اور اہلِ خیبر کے درمیان سلسلۂ رسل و رسائل منقطع ہو جائے اس لئے کہ وہ ان سے ملے ہوئے اور ان کے حامی تھے، نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور یہ لوگ ان کی حمایت اور امداد نہ کر سکے، اپنے گھر بار اور کاروبار میں لگے رہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اہلِ خیبر کے بیچ انھوں نے راستہ صاف کر دیا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لشکر کے لئے غذا فراہم کرنے کا حکم دیا تو صرف ستو حاصل کئے جا سکے چنانچہ اسی پر اکتفا کیا گیا، جب آپ خیبر کے سامنے تشریف لائے تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی فتح خیبر کا سوال کیا، اور اس جگہ کے شر سے اور یہاں کے لوگوں کے شر سے پناہ مانگی، آپ کی عادت مبارکہ تھی کہ جب آپ کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تو رات کو حملہ نہ کرتے بلکہ صبح تک انتظار کرتے اگر اذان کی آواز آپ کے کانوں میں آتی تو آپ توقف فرماتے اور حملہ نہ کرتے اسی طرح آپ نے یہاں بھی رات گذاری، صبح ہوئی تو اذان کی آواز نہ سنائی دی، یہ دیکھ کر آپ نے حملہ کی نیت سے پیش قدمی کی، راستہ میں خیبر کے کسان مزدور اپنے پھاوڑے اور جھابے لئے نظر آئے، جب انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور لشکر کو دیکھا تو انھوں نے نعرہ لگایا کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اور لشکر آ گیا، اور بدحواس فرار اختیار کی، آپ نے یہ دیکھ کر فرمایا "اللہ اکبر خربت خیبر" اللہ کی شان خیبر برباد ہوا، "انا اذا نزلنا بساحة قوم فساء صباح المنذرین" ہم جب کسی قوم پر حملہ آور ہوتے ہیں تو ان کی صبح بُری ہوتی ہے[1]

---

[1] ابن کثیر ج ۳ صفحہ ۳۴۴-۳۴۲ نیز صحیح بخاری باب غزوۂ خیبر باختصار۔

(ان کی شامت آجاتی ہے) جنھیں پہلے ہی ڈرایا اور آگاہ کیا جاچکا ہے۔[1]

مظفر و منصور قائد

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے خیبر کے قلعوں کی طرف توجہ کی اور ایک ایک کر کے ان قلعوں کو فتح کرنا شروع کیا، ان قلعوں میں ایک قلعہ ایسا تھا، جو نامور یہودی شہسوار مرحب کا تخت گاہ تھا،[2] اس کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے سر کیا، اس کا واقعہ یہ ہے کہ یہ قلعہ مسلمانوں کے لئے بہت سخت و دشوار گذار ثابت ہو رہا تھا اور ان کا قابو اس پر نہیں چل پا رہا تھا، حضرت علیؓ کی آنکھیں اس وقت آشوب کر آئی تھیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "کل یہ پرچم وہ شخص لے گا جس سے اللہ اور اس کے رسولؐ کو محبت ہے، اس کے ذریعہ یہ قلعہ فتح ہوگا" اس منصب عظیم کے بڑے بڑے صحابہ امیدوار تھے اور ہر شخص یہ خیال کرتا کہ شاید اس کو یہ سعادت حاصل ہو، آپ نے حضرت علیؓ کو طلب فرمایا، ان کی آنکھوں میں تکلیف تھی، وہ آگئے تو آپ نے اپنا مبارک لعاب دہن ان کی آنکھوں میں لگایا اور ان کے حق میں دعا کی وہ اسی وقت ایسے اچھے ہوگئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کو درد ہی نہ تھا، آپ نے پرچم ان کے حوالے کیا، انھوں نے کہا کہ کیا یہود سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں؟ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "یہاں سے روانہ ہو یہاں تک کہ ان کے سامنے پڑاؤ ڈالو پھر ان کو اسلام کی دعوت دو، اور اللہ تعالیٰ نے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۲۹-۳۳۰ [2] روایات کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام قلعۂ قموص تھا۔ [3] صحیح بخاری، صحیح مسلم باب "غزوۂ خیبر"

کا اس سلسلہ میں ان پر جو حق ہے اس سے ان کو آگاہ کرو، خدا کی قسم اگر تمہارے ذریعہ اللہ تعالیٰ ایک آدمی کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ بہتر ہے۔[1]

شیرِ خدا اور ایک نامور یہودی شہسوار کا مقابلہ

حضرت علی کرم اللہ وجہہ پرچمِ اسلام اور لشکرِ اسلام کے ساتھ جب خیبر پہنچے تو نامور یہودی شہسوار "مرحب" رجز پڑھتا ہوا مقابلہ پر آیا، اس سے آپ کے دو دو ہاتھ ہوئے۔

حضرت علیؓ نے پہلے اس پر ایک ہی سخت ضرب لگائی جو اس کے خود اور سر کو پھاڑتی چلی گئی، اور دار ھ تک اتر گئی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی۔[2]

محمد بن مسلمہؓ نے بھی اس معرکہ میں اپنی ہمت اور بہادری کے جوہر دکھائے اور متعدد شہسواروں اور پہلوانوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔

محنت کم، اُجرت زیادہ

خیبر کے ایک حبشی غلام نے جو اپنے مالک کی بکریاں چراتے پھا رہا تھا دیکھا کہ اہلِ خیبر نے ہتھیار اٹھا لئے ہیں اور جنگ کے لئے تیار ہیں تو اس نے پوچھا کہ آپ لوگوں کا کیا ارادہ ہے؟

---

[1] صحیح بخاری باب غزوۂ خیبر نیز صحیح مسلم و نسائی، سرخ اونٹ عرب میں بڑی دولت اور ایک نایاب چیز سمجھی جاتی تھی۔ [2] بعض اہلِ سیر نے یہ اقتباس قلعۂ ناعم کی فتح کے سلسلے میں نقل کیا ہے اور بعض نے قلعۂ قموص کے سلسلہ میں بیان کیا ہے، اس کے مختلف ٹکڑے آئے ہیں، مگر قلعہ کے نام کا تعین نہیں ہے ابن ہشام وغیرہ میں محمد بن مسلمہؓ کو مرحب کا قاتل بتایا گیا ہے، لیکن صحیح مسلم کی روایت میں حضرت علیؓ کے نام کی تصریح ہے اور ان کے رجزیہ اشعار بھی منقول ہیں (مسلم حدیث نمبر ۱۸۰۷ کتاب الجہاد والسیر)

انھوں نے کہا کہ ہم اس شخص سے جنگ کرنے جارہے ہیں جو نبوت کا مدعی ہے، نبوت کے
ذکر نے اس کے دل پر خاص اثر کیا، وہ اپنی بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ
علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا کہ آپ کیا کہتے ہیں؟ اور کس چیز
کی دعوت دے رہے ہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ میں اسلام کی طرف بلاتا ہوں، اور یہ کہ
تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں خدا کا رسول ہوں، اور اللہ کے سوا
کسی کی عبادت نہ کرو، غلام نے کہا کہ اگر میں یہ گواہی دوں اور اللہ عزوجل پر ایمان
لے آؤں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا کہ اگر تمہاری اس عقیدہ پر موت آئی تو تمہارے لئے
جنت ہے، وہ یہ سن کر اسلام لے آیا اور پھر کہنے لگا اے اللہ کے نبی میرے پاس یہ بکریاں
امانت میں ان کا کیا ہوگا؟ آپ نے فرمایا تم ان کو حصباء کے میدان میں لے جاکر چھوڑ دو
اللہ تمہاری یہ امانت ادا کر دے گا، اس نے یہی کیا، خدا کا کرنا کہ بکریاں اپنے مالک کے
پاس خود واپس چلی گئیں اور یہودی کو علم ہوگیا کہ اس کا غلام مسلمان ہو چکا ہے، اس موقع
پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور لوگوں کو خطاب فرمایا، ان کو نصیحت
فرمائی اور جہاد کا شوق دلایا، جب دونوں فریق برسرپیکار ہوئے تو شہداء اسلام
میں سیاہ فام غلام بھی تھا، مسلمان اسے اٹھا کر اپنے خیمہ میں لائے، بعض روایتوں میں
آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے شامیانہ پر نظر ڈالی پھر اپنے اصحاب کرام کی
طرف رخ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس غلام کے ساتھ بہت اکرام
کا معاملہ فرمایا، اور اس کو خیر پہونچایا، میں نے دیکھا کہ اس کے سرہانے جنت کی
دو حوریں موجود ہیں حالانکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے لئے ایک سجدہ بھی نہیں کیا تھا۔[1]

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۰۹

آپ کی رفاقت میں نے اس لئے نہیں کی تھی

ایک اعرابی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، ایمان لایا اور آپ کی اتباع و پیروی قبول کی، اور کہا کہ میں بھی آپ کے ساتھ ہجرت کروں گا، آپ نے اس کو بعض صحابۂ کرام کے حوالے کیا اور فرمایا کہ اس کا خیال رکھیں، غزوۂ خیبر کے موقع پر کچھ مالِ غنیمت آپ نے تقسیم فرمایا، یہ اعرابی اس وقت چراگاہ میں گیا ہوا تھا، جب وہ واپس آیا تو اس کو حصۂ رسدی دیا گیا، اس نے کہا کہ یہ کیا ہے؟ لوگوں نے اس کو بتایا کہ یہ تمھارا حصہ ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تمھیں دیا ہے، وہ لے کر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! یہ کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا: "یہ تمھارا حصہ ہے" اس نے کہا کہ میں اس کی خاطر آپ کے ساتھ نہیں ہوا تھا، میں نے تو اس لئے آپ کی اتباع کی تھی کہ مجھے اس جگہ ـــــ اپنے حلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا ـــــ دشمن کا کوئی تیر لگے، میری موت ہو جائے اور میں جنت میں پہونچ جاؤں، آپ نے فرمایا: "اگر تمھاری نیت صحیح ہے تو اللہ ایسا ہی کرے گا۔"

خیبر کے موقع پر جب دشمن سے جنگ ہوئی اور شہدا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے گئے تو اس میں یہ خوش نصیب بھی تھا، آپ نے دریافت فرمایا کیا یہ وہی شخص ہے؟ صحابہ کرام نے جواب دیا کہ جی ہاں، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ کے ساتھ اس نے سچائی کا معاملہ کیا تو اللہ تعالےٰ نے بھی اس کی خواہش کو سچ کر دکھایا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے جبہ مبارک میں اس کو کفن دیا، پھر اس کی نماز جنازہ

پڑھی اور اس کے لئے یہ دعا فرمائی کہ "اے اللہ تیرا یہ بندہ تیرے راستے میں ہجرت کے لئے نکلا تھا، یہ تیری راہ میں شہید ہوا ہے اور میں اس کا گواہ ہوں"۔[1]

خیبر میں قیام کی شرط

غرض اس طرح یکے بعد دیگرے قلعے پر قلعہ فتح ہوتا گیا اور کئی کئی دن کی جنگ اور محاصرہ میں گذرنے لگے یہاں تک کہ اس صورت حال سے عاجز ہو کر یہودیوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے صلح کی پیش کش کی لیکن آپ کا ارادہ ان کو وہاں سے بے دخل اور جلا وطن کرنے کا تھا، انھوں نے کہا کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہم کو آپ اسی جگہ قیام کی اجازت دے دیجئے، زمین کی دیکھ بھال اور کھیتی باڑی میں ہم مشغول رہیں گے اس لئے کہ آپ لوگوں سے زیادہ ہم اس فن سے واقف ہیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرامؓ کو کاشتکاری کا تجربہ نہ تھا، اگر یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیتے تو سارا وقت اسی کی نذر کرنا پڑتا، چنانچہ آپ نے خیبر میں قیام کی اجازت ان کو اس شرط پر دے دی کہ تمام پیداوار غلہ اور پھلوں کا آدھا مسلمانوں کو ملے گا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب تک چاہیں گے معاہدہ کو برقرار رکھیں گے۔[2]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پیداوار کی تقسیم کے لئے اُن کے پاس عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا کرتے تھے وہ اندازہ کر کے اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے پھر اُن سے کہتے کہ ان میں جو حصہ چاہیں لے لیں، وہ لوگ یہ دیکھ کر کہتے کہ اسی عدل و انصاف پر آسمان اور زمین قائم ہیں۔[3]

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۹۴ [2] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۹۴-۳۹۵ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے سنن ابی داؤد باب المساقاۃ [3] فتوح البلدان از بلاذری ص ۳۳

مذہبی رواداری اور کشادہ قلبی

غزوۂ خیبر میں جو مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا اس میں توریت کے متعدد نسخے تھے یہودیوں نے درخواست کی کہ وہ ان کو عطا کر دیئے جائیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ یہ سب صحیفے ان کے حوالے کر دیئے جائیں۔[1]

یہودی فاضل ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"اس واقعہ سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ان مذہبی صحیفوں کا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دل میں کس درجہ احترام تھا، آپ کی اس رواداری اور فراخدلی کا یہودیوں پر بڑا اثر پڑا، وہ آپ کے اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکے کہ آپ نے ان کے مقدس صحیفوں کے ساتھ کوئی ایسا سلوک نہیں کیا جس سے ان کی بے حرمتی لازم آتی ہو، اس کے مقابلہ میں ان کو یہ واقعہ بھی خوب یاد ہے کہ جب رومیوں نے یروشلم کو سنہ ۷۰ قبل مسیح میں فتح کیا تو انھوں نے ان مقدس صحیفوں کو آگ لگا دی، اور ان کو اپنے پاؤں سے روندا، اسی طرح متعصب نصرانیوں نے اندلس میں یہود پر مظالم کے دوران توریت کے صحیفے نذر آتش کئے، یہ وہ عظیم فرق ہے جو ان فاتحین (جن کا ابھی اوپر ذکر گذرا ہے) اور اسلام کے نبی کے درمیان ہمیں نظر آتا ہے۔"[2]

جعفر بن ابی طالبؓ کی آمد

اسی غزوہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی جعفر بن ابی طالبؓ

---

[1] تاریخ الخمیس ج ۲ ص ۶۰ [2] تاریخ الیہود فی بلاد العرب ص ۱۷۰

اور ان کے رفقاء آپ سے آکر ملے آپ کو اس سے بے حد مسرت ہوئی بہت محبت اور شوق کے ساتھ آپ نے ان کا استقبال کیا ان کی پیشانی کو بوسہ دیا اور فرمایا "بخدا میں نہیں جانتا کہ کس چیز سے میں زیادہ خوش ہوں خیبر کی فتح سے یا جعفرؓ کی آمد سے[1]"

یہود کی ایک مجرمانہ سازش

اسی غزوہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو زہر دیا گیا سلام بن مشکم کی یہودی بیوی زینب بنت حارث نے آپ کو زہر ملا کر ایک بھنی ہوئی بکری کا تحفہ دیا پہلے اس نے دریافت کیا کہ اس کا کون سا حصہ آپ کو زیادہ مرغوب ہے آپ نے فرمایا دست یہ سن کر اس نے دست میں خاص طور سے زہر ملایا آپ نے جب دست سے کچھ حصہ توڑ کر نوش فرمایا تو خود اس گوشت نے آپ کو اطلاع دی کہ اس میں زہر ملا ہے چنانچہ آپ نے اسی وقت اس لقمہ کو اگل دیا۔

اس کے بعد آپ نے یہودیوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ اگر میں تم سے کچھ پوچھوں تو کیا تم صحیح صحیح جواب دو گے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں! آپ نے فرمایا کیا تم نے اس بکری میں زہر ملایا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ملایا ہے آپ نے فرمایا کہ تم کو اس پر کس چیز نے آمادہ کیا؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم نے سوچا کہ اگر آپ (نعوذ باللہ) جھوٹے ہیں تو آپ سے چھٹی مل جائے گی اور اگر واقعی نبی ہیں تو زہر آپ پر اثر نہ کرے گا اس کے بعد اس عورت کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر کیا گیا اس نے بھی

---

[1] زاد المعاد ج ا صفحہ ۳۹۶

اعتراف جرم کر لیا اور کہا کہ میں نے آپ کی جان لینے کا ارادہ کیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر تجھے قابو نہیں دے سکتا۔ صحابہ کرامؓ نے اجازت چاہی کہ اس عورت کو قتل کر دیں۔ آپ نے فرمایا: نہیں اس وقت آپ نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا اور اس کو کوئی سزا نہ دی اور نہ قتل کرنے کی اجازت دی۔ البعد میں جب اس زہر خورانی کے نتیجہ میں بشر بن البراء بن معرور کا انتقال ہو گیا جو اس کھانے میں شریک تھے تو اس کو قتل کر دیا گیا۔[1]

غزوۂ خیبر کے اثرات

غزوۂ خیبر اور اس میں مسلمانوں کی شاندار فتح کا عرب کے ان قبائل پر جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے بہت خوشگوار اثر پڑا۔ ان کو خیبر میں یہودیوں کی جنگی طاقت ان کی دولت مندی، وقایع الباری، غذائی اشیاء کی فراوانی، سامان جنگ کی کثرت قلعوں کے استحکام اور حملہ آور فوجوں اور تجربہ کار جنیلوں کے لئے اس کے سخت اور دشوار گذار اور ناقابل تسخیر ہونے کا بخوبی اندازہ تھا اور یہ معلوم تھا کہ ان میں مرحب اور حارث ابی زینب جیسے تجربہ کار شہسوار اور تربیت یافتہ ماہرین جنگ موجود ہیں۔ چنانچہ اس فتح نے ان کے تمام اندازے غلط ثابت کئے، اور ان کے عزائم اور بعد کے واقعات پر اس کا گہرا اثر پڑا۔

ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون غزوۂ خیبر اور تاریخ اسلام پر اس کے اثرات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

---

[1] بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ سے مختصراً اس روایت کو نقل کیا ہے (باب الشاۃ التی سمت للنبی صلے اللہ علیہ وسلم بخیبر)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلامی فتوحات کی تاریخ میں غزوۂ خیبر کی بہت بڑی اہمیت ہے یہی وجہ ہے کہ عرب کے تمام قبیلے بہت فکرمندی کے ساتھ اس کے نتیجہ کا انتظار کر رہے تھے اور اس کا فیصلہ تھا، یہود کی تلوار کی جھنکار رہ جاتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے دشمن جو عرب کے مختلف شہروں اور دیہاتوں میں تھے اس غزوہ سے بڑی امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔[1]

مالِ غنیمت

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح خیبر سے فارغ ہوئے تو آپ نے فدک (جو ایک آباد قصبہ اور حجاز کے بالائی حصہ میں دوسرے قصبات اور قریوں کی طرح ایک مستقل ریاست تھی)[2] کی طرف توجہ فرمائی، یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نصف نصف پر مصالحت کرنی چاہی، آپ نے ان کی پیشکش کو قبول فرمایا، اس سے جو حاصل ہوتا آپ اس کو اپنے اور مسلمانوں کے مفاد میں جہاں مناسب سمجھتے تقسیم فرما دیتے۔[3]

اس کے بعد آپ وادی القریٰ[4] تشریف لے گئے، یہ خیبر اور تیماء کے درمیان ایک نو آبادی تھی جس کو یہود نے اسلام سے قبل آباد کیا تھا، اور اس نے ان کے مرکز کی حیثیت اختیار کر لی تھی، عرب کے کچھ لوگ بھی یہاں ان کے ساتھ آ کر شامل ہو گئے تھے، ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام دی اور ان سے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ اسلام قبول کر لیں گے تو ان کا مال و جان سب محفوظ رہے گا، اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہوگا۔

---

[1] تاریخ الیہود فی بلاد العرب ص ۱۶۲ [2] یہ بڑا قصبہ کی آبادی یہودی بنی مرہ اور بنی سعد بن بکر کے قبائل کے افراد پر مشتمل تھی۔ (نہایۃ الارب ج ۱۷ ص ۲۶۹) [3] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۵۳ [4] وادی القریٰ اس وادی کو کہتے ہیں جو حجاز میں ہے جہاں بہت سے گاؤں ہیں، یہاں عرب اور یہودی آباد تھے، اس کا شمار جزیرۃ العرب کے سرسبز و شاداب علاقوں میں ہے، اس میں چشمے اور کنوئیں بھی پائے جاتے ہیں۔

اس غزوہ میں کئی مقابلے ہوئے جن میں زبیر بن العوامؓ کی بہادری کے جوہر ظاہر ہوئے اور فتح و کامیابی کا سہرا ان کے سر رہا چنانچہ دوسرے ہی روز سے یہود نے جو کچھ ان کے ہاتھ میں تھا، وہ مسلمانوں کے ہاتھ میں دے دیا، مسلمانوں کو ان غزوات میں بڑا مال غنیمت ہاتھ لگا اور بہت وافر سامان ملا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ساری دولت کو صحابۂ کرام میں تقسیم فرما دیا، آراضی اور کھجور کے باغات یہود کے ہاتھ میں چھوڑ دیے گئے اور ان پر معاملہ ہو گیا۔

جب تیماء کے یہودیوں کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل خیبر، اہل فدک اور وادی القریٰ سے یہ معاملہ فرمایا ہے تو انھوں نے آپ سے مصالحت کر لی اور ان کا مال و جائیداد انہی کے قبضے میں رہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لے آئے۔[1]

مہاجرین کی پاک نفسی و احتیاط

جب مسلمان مدینہ واپس آ گئے تو مہاجرین نے انصار کو ان کے وہ عطیات واپس کرنا چاہے جو انھوں نے ان کی پریشان حالی اور عسرت کے زمانہ میں کھجور کے درختوں اور باغوں کی شکل میں دیئے تھے اس لیے کہ خیبر میں وہ خود صاحب جائداد ہو گئے تھے اور ان کے پاس بھی باغات تھے، ام سلیمؓ جو انس بن مالکؓ کی والدہ تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس زمانے میں کچھ کھجور کے درخت پیش کیے تھے آپ نے اپنی آزاد کردہ باندی ام ایمن کو عنایت فرما دیئے تھے، فدک کے حاصل ہونے کے بعد آپ نے ام سلیمؓ کو یہ درخت واپس فرما دیئے

---

[1] تیماء وادی القریٰ اور شام کے درمیان شام سے قریب تر ایک قصبہ ہے تقریباً زمانہ جاہلیت میں شام سے آنے والے قافلوں کے راستے میں پڑتا تھا، مشہور یہودی شاعر سموأل کا قلعہ الابلق الفرد کہتے ہیں، اسی میں واقع تھا۔ معجم البلدان ج ۲ صفحہ ۶۷ تیماء کے ساتھ۔

تھے اور ام ایمن کو کھجور کے ہر درخت کے بدلے میں باغ فدک سے دس درخت عنایت فرمائے[1] خیبر کے بعد بھی بہت سے سریے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مختلف مقامات پر بھیجے اور جلیل القدر صحابہ کو ان کا امیر مقرر فرمایا۔ ان میں سے کچھ سریوں میں جنگ ہوئی اور کچھ میں جنگ کی نوبت نہیں آئی[2]

عمرۃ القضاء

دوسرے سال سنہ ۷ھ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمان عمرۃ القضاء کی نیت سے تشریف لے چلے تو قریش نے کوئی مزاحمت نہیں کی، آپ کو مکہ جانے دیا اور اپنے گھروں میں تالے ڈال کر جبل قعیقعان[3] پر چلے گئے۔ آپ نے تین روز وہاں قیام فرمایا اور عمرہ سے فراغت کی۔ اللہ تعالیٰ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:-

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا
بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ
إِنْ شَاءَ اللّٰهُ آمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ
رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ
فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ
مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝
(سورۃ الفتح ـ ۲۷)

بیشک خدا نے اپنے پیغمبر کو سچا (اور)
صحیح خواب دکھایا کہ تم خدا نے چاہا تو
مسجد حرام میں اپنے سر منڈا کر اور
اپنے بال کتروا کر امن و امان سے داخل ہوگے
اور کسی طرح کا خوف نہ کروگے جو بات
تم نہیں جانتے تھے اس کو معلوم تھی
سو اس نے اس سے پہلے ہی جلد فتح کرادی۔

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۴۵۔ مسلم نے اس قصہ کو مفصل طور پر کتاب الجہاد والسیر میں باب رد المہاجرین الی الانصار منائحہم من الشجر والثمر حین استغنوا عنہا بالفتوح میں بیان کیا ہے اور بخاری نے بھی اس قصہ کا مختصر ذکر کیا ہے [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو زاد المعاد ج ۱ ص ۳۴۳ [3] صحیح بخاری (باب عمرۃ القضاء)

لڑکیوں کی پرورش و تربیت میں مقابلہ اور حقوق میں مساوات

اسلام کے اثر سے ان لوگوں کے دل و دماغ میں انقلاب عظیم واقع ہو چکا تھا وہ لڑکی جو پہلے خاندان کے لئے اور اشراف و رؤساء قوم کی نگاہ میں باعث ننگ و عار تھی (اور بعض قبیلوں میں اس کو زندہ درگور کر دینے تک کا رواج تھا) آج ایسی عزیز و محبوب بن چکی تھی جس کی پرورش اور تربیت کے لئے آپس میں مقابلہ کی نوبت آ جاتی تھی مسلمان سب برابر تھے اور مساویانہ حقوق رکھتے تھے کسی کو کسی پر اگر فوقیت تھی تو کسی فضیلت علمی و عملی اور کسی معقول بنیاد پر جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے واپسی کا قصد کیا تو سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی چھوٹی بچی "اُمامہ" چچا چچا پکارتی ہوئی آپ کے پیچھے ہولی حضرت علیؓ نے اسے لے لیا اور حضرت فاطمہؓ کے حوالے کیا اور کہا کہ — دیکھو — یہ چچا کی لڑکی ہے اب حضرت علی، زید، جعفر رضی اللہ عنہم کے درمیان اس مسئلہ پر کشمکش ہونے لگی حضرت علیؓ نے کہا کہ اسے میں لیتا ہوں یہ میری چچا زاد بہن ہے حضرت جعفرؓ نے کہا کہ میری بھی چچا زاد بہن ہے اور اس کی خالہ میرے نکاح میں ہے حضرت زیدؓ نے کہا (اسلام کے رشتہ سے) یہ میری بھتیجی ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ کے حق میں فیصلہ دیا کہ چونکہ بچی کی خالہ ان کے گھر میں ہے اور خالہ ماں کی جگہ پر ہوتی ہے اس لئے اس کو وہاں زیادہ آرام ملے گا) حضرت علیؓ سے آپ نے تطییب دلداری فرمائی کہ تم میرے ہو اور میں تمہارا ہوں حضرت جعفرؓ سے فرمایا تم میرے صورت و سیرت دونوں میں مجھ سے مشابہ ہو حضرت زیدؓ سے ارشاد ہوا کہ "تم میرے بھائی ہو اور میرے مولیٰ ہو"[1]

---

[1] صحیح بخاری کتاب المغازی باب "عمرۃ القضاء"

غزوۂ مُوتہ[1]

(جُمادی الاولیٰ ۸ھ)

مسلمانوں کے سفیر کا قتل اور اس کا شاخسانہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حارث بن عُمیر الازدیؓ کو اپنے مکتوب عالی کے ساتھ بُصریٰ کے حاکم شرحبیل بن عمرو الغسانی کے پاس بھیجا جو رومی سلطنت کے تابع تھا۔ شرحبیل نے حکم دیا کہ ان کو باندھ دیا جائے اس کے بعد ان کو سامنے بلوا کر شہید کر دیا۔[2] سفراء اور قاصدوں کے قتل کرنے کا کبھی بھی دستور نہ تھا، خواہ کتنا ہی شدید اختلاف ہو یا خط کا مضمون کتنا ہی ناگوار ہو۔ یہ ایسا واقعہ تھا کہ جس سے چشم پوشی کسی طرح جائز نہ تھی، یہ عام قاصدوں اور سفیروں کے لئے خطرہ کی بات اور مکتوب اور صاحب مکتوب دونوں کی اہانت تھی، اس لئے اس طرح کی گستاخی کرنے والے کی سرکوبی اور مظلوم کا بدلہ ضروری تھا، تاکہ کسی کو آئندہ اس کی

---

[1] موتہ مشرقی اردن کے شہر کرک کے جنوب میں بارہ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے، مدینہ اور موتہ کا فاصلہ تقریباً گیارہ سو کلومیٹر کا ہے، اس فاصلہ کو مسلمانوں نے اونٹوں اور گھوڑوں پر اس طرح طے کیا کہ اس کا سلسلہ بالکل منقطع ہو چکا تھا، مرکز سے خبر رسانی کا بھی کوئی انتظام نہ تھا اور پورا سفر گویا دشمنوں کے جبڑوں کے درمیان تھا۔

[2] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۱۱

جرأت نہ ہو سکے سفراء کا خون اس طرح ارزاں نہ ہوا اور قسم کا الناک واقعہ دوبارہ پیش نہ آئے۔

رومی قلمرو میں پہلی اسلامی فوج

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہونچی تو آپ نے ایک لشکر بصری بھیجنے کا ارادہ فرمایا یہ واقعہ جمادی الاولیٰ ۸ھ کا ہے۔

تین ہزار مجاہدین پر مشتمل ایک فوج اس کے لئے تیار ہوئی آپ نے باوجود اس کے کہ اس لشکر میں بڑے بڑے جلیل القدر اور عالی مرتبہ انصار و مہاجرین موجود تھے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کیا جو آزاد کردہ غلام تھے اسی کے ساتھ آپ نے ہدایت فرمائی کہ اگر وہ شہید یا زخمی ہو جائیں تو جعفر ابن ابی طالب کو امیر مقرر کیا جائے اور ان کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آئے تو عبداللہ بن رواحہ کو امیر مقرر کیا جائے جب روانگی کا وقت قریب ہوا تو لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعین کردہ امراء کو رخصت کیا اور ان کو اپنا سلام پیش کیا ان کے سامنے ایک طویل اور پر مشقت سفر تھا اور ایسے دشمن سے واسطہ تھا جس کو اس زمانہ کی سب سے بڑی سلطنت کی پشت پناہی حاصل تھی۔

یہ اسلامی فوج روانہ ہوئی اور آگے بڑھ کر اس نے مقام معان پر پڑاؤ ڈالا یہاں مسلمانوں کو اطلاع ملی کہ ہرقل بلقاء میں ایک لاکھ رومی فوج کے ہمراہ مقیم ہے اور اس کے ساتھ بہت بڑی تعداد میں عرب قبائل لخم، جذام، بلقین، بہراء وغیرہ بھی آملے ہیں مسلمانوں نے دو راتیں اس مقام معان پر گذاریں اور صورت حال

ـــــــــــــــ

لـه سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۷۳

پرغور کرتے رہے رائے ٹھہری کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خط روانہ کیا جائے اور دشمن کی تعداد سے آپ کو مطلع کر دیا جائے پھر یا تو آپ ہمارے لئے کمک روانہ فرما دیں یا مقابلہ کا حکم فرمائیں تو اس کی تعمیل کی جائے۔[1]

ہم دشمن سے تعداد اور قوت کی بنیاد پر نہیں لڑتے

اسی موقع پر عبداللہ بن رواحہؓ نے مجاہدین اسلام کو ہمت دلائی اور کہا کہ خدا کی قسم آج تم اس چیز کو ناگوار اور تلخ محسوس کر رہے ہو جس کے لئے تم نکلے تھے اور جو تمہاری دلی مراد تھی یعنی شہادت انھوں نے کہا کہ ہم دشمن کا مقابلہ تعداد اور قوت کی بنیاد پر نہیں کرتے ہم تو اس کا مقابلہ اس دین کی طاقت سے کرتے ہیں جس سے اللہ تعالےٰ نے ہم کو سرفراز کیا ہے اس لئے چل کھڑے ہو اور یاد رکھو دونوں صورتوں میں ہمارا فائدہ ہے جیت ہو تب بھی اور شہادت ہو تب بھی یہ سن کر سب لوگ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور روانہ ہو گئے۔

مجاہدین سر بکف

جب اسلامی لشکر بلقاء کے قریب پہونچا تو رومیوں اور عربوں کا ایک لشکر جرار ان کے سامنے تھا یہ لشکر "مشارف" کے مقام پر تعینات تھا مسلمانوں کو دیکھ کر یہ قریب ہوا مسلمانوں نے ایک گاؤں میں جس کا نام موتہ تھا مورچہ سنبھال لیا اور جنگ کا آغاز ہو گیا۔[2]

زید بن حارثہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۱۴ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۷۷-۳۸۰

پرچم ہاتھ میں لئے تھے) جنگ کا آغاز کیا اور آخر کار شہید ہوئے نیزوں نے ان کے سارے جسم کو چھلنی کر دیا، ان سے پرچم جعفرؓ نے لے لیا، اور لڑتے رہے جب لڑائی کا دباؤ بڑھا تو گھوڑے سے اتر گئے اور اس کی اگلی ٹانگیں کاٹ دیں، اور پیادہ پا لڑنا شروع کیا، اتنے میں ان کا داہنا بازو کٹ گیا، انھوں نے پرچم اپنے بائیں ہاتھ میں لے لیا، بایاں ہاتھ بھی کٹ گیا تو پرچم کو انھوں نے اپنے دونوں زخمی اور کٹے ہوئے بازوؤں سے جکڑ لیا، یہاں تک کہ شہادت سے سرخرو ہوئے اس وقت ان کی عمر ۳۳ سال تھی۔[۱] ان کے سینے اور بازوؤں کے درمیان اور سامنے کے حصہ میں نوّے زخم تھے، جو تلوار اور نیزوں کے تھے کوئی زخم پشت کی طرف نہ تھا۔[۲] غرض اس طرح یہ باہمت نوجوان جنت کی نعمتوں کے ترانے گاتا ہوا اور دشمن کی کثرتِ تعداد اور قوت و شوکت اور ساز و سامان اور دنیا کی ظاہری زیب و زینت کو پیروں سے روندتا ہوا اس دنیا سے رخصت ہوا۔

جعفرؓ کی شہادت کے بعد عبد اللہ ابن رواحہؓ نے پرچم اپنے ہاتھ میں لیا اور آگے بڑھے انھوں نے بھی اپنا گھوڑا چھوڑ دیا، اسی درمیان میں ان کے ایک چچازاد بھائی ایک ہڈی جس میں ذرا سا گوشت لگا ہوا تھا لے کر آئے اور کہا کہ اس کو پیٹ میں ڈال لو تاکہ کچھ توانائی آجائے تم نے کئی روز سے کچھ کھایا نہیں ہے عبد اللہ بن رواحہؓ نے ان ہی کے ہاتھ سے ذرا گوشت اپنے منہ میں لیا، پھر اس کو پھینک دیا، تلوار اپنے ہاتھ میں لی، آگے بڑھ کر دشمن سے دو دو ہاتھ کئے، اور

۱؎ زاد المعاد ج ۱ ص ۴۱۳ باختصار ۲؎ ابن کثیر ج ۳ ص ۲۴۲ و زاد المعاد ج ۱ ص ۴۱۴

صحیح بخاری میں ہے کہ ہم نے ان کو مقتولین میں دیکھا تو ان کے جسم پر نوّے سے اوپر زخم کے نشان نظر آئے جو نیزہ اور تیر کے تھے (باب غزوۂ موتہ)

جام شہادت نوش کیا۔[1]

حضرت خالدؓ کی ماہرانہ قیادت

ان کے بعد لوگوں نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت پر اتفاق کر لیا اور انھوں نے پرچم اسلام اپنے ہاتھ میں لیا، وہ بہت بہادر، فن جنگ سے واقف اور تجربہ کار شخص تھے انھوں نے اسلامی لشکر کو جنوب کی طرف موڑ لیا، دشمن شمال کی طرف چلا گیا،[2] دوسری طرف رات نے اپنے سیاہ پردے ڈال دیئے، اور دونوں فریقوں نے اس فرصت کو غنیمت جانا اور ان کو سلسلۂ جنگ جاری نہ رکھنے میں عافیت نظر آئی۔

یہ حقیقت ہے کہ پسپائی کا عمل (جیسا کہ عراقی جنرل شیث خطاب کہتے ہیں) پسپائی کے شکست میں بدل جانے کے احتمال کے سبب مشکل ترین فوجی عمل ہوتا ہے اور شکست ایسی مصیبت ہوتی ہے جو شکست خوردہ کے لئے عموماً بڑے نقصانات کا سبب بن جاتی ہے، اس لئے موتہ میں مسلمانوں کے معمولی نقصانات اس فوجی فائدہ کے مقابلہ میں ناقابل لحاظ ہیں کہ اس سے رومی فوجی طاقت، ان کی تنظیم اور اسالیب جنگ کی معلومات حاصل ہوئیں، جو بعد کی جنگوں میں مسلمانوں کے کام آئیں۔[3]

حضرت خالدؓ نے اپنے آدمیوں کی اچھی خاصی تعداد اپنے لشکر کے عقب

---

[1] زاد المعاد ج ۱ صفحہ ۴۱۴ وسیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۳۸۰ [2] ایضاً [3] شیث خطاب (الرسول القائد) صفحہ ۱۸۳ موتہ کے بارے میں ملاحظہ ہو ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM: ART. MUTA.

تعینات کردی ان لوگوں نے صبح کے وقت اتنی بلند آواز سے نعرے لگائے اور شور برپا کیا کہ دشمن کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ شاید مدینہ سے نئی کمک آگئی ہے، اس کی وجہ سے رومیوں پر مسلمانوں کا بڑا رعب پڑا اور وہ آپس میں کہنے لگے کہ جب تین ہزار کے لشکر نے یہ آفت ڈھائی ہے تو جب ان کے پاس نئی کمک پہنچ گئی ہے جس کی تعداد اور قوت کا اندازہ ہی نہیں تو اس وقت یہ لوگ ہمارے ساتھ کیا کریں گے؟ یہ سوچ کر رومیوں کی ہمت پست ہو گئی اور انھوں نے مقابلہ کا ارادہ ترک کر دیا اور اس طرح اللہ تعالٰے نے مسلمانوں کو لڑائی کی زحمت و تکلیف سے محفوظ رکھا۔[1]

آنکھوں دیکھا حال

ادھر مسلمان میدان جنگ میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھا رہے تھے اور ادھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ میں صحابۂ کرامؓ سے اس معرکہ کا آنکھوں دیکھا حال بیان فرما رہے تھے، انس بن مالکؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے زید، جعفر اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم کی شہادت کی اطلاع مدینہ خبر پہونچنے سے قبل ہی دے دی تھی آپؐ نے فرمایا کہ اب زیدؓ نے پرچم لیا وہ شہید ہوئے جعفرؓ نے لیا، وہ بھی شہید ہوئے ابن رواحہ نے لیا وہ بھی شہید ہوئے (اس وقت آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے) یہاں تک کہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار (سیف اللہ خالد بن الولیدؓ) نے پرچم اپنے ہاتھ میں لیا، اور اللہ تعالٰے نے مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی۔[2]

---

[1] المغازی للواقدی [2] صحیح بخاری باب غزوۂ موتہ۔

جعفر طیارؓ

جعفر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دونوں بازوؤں کے بدلے ان کو دو شہپر عطا کئے ہیں جن سے وہ جنت میں جہاں چاہیں پرواز کرتے پھرتے ہیں اسی لئے ان کا لقب جعفر طیارؓ (اُڑنے والے) اور ذی الجناحین (دو بازوؤں اور پروں والے) پڑ گیا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت و دلداری

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ کی اہلیہ سے فرمایا کہ جعفر کے بچوں کو ہمارے پاس لاؤ، جب وہ آئے تو آپ نے ان کو اپنے سینے سے لگایا اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے پھر آپ نے اُن کی شہادت کی خبر سنائی جب محاذ جنگ سے شہادت کی اطلاع آگئی تو آپ نے اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ جعفر کے گھر والوں کے لئے کھانا تیار کرو اس حادثہ نے ان کو اس قابل نہیں رکھا کہ وہ کھانا پکانے کی طرف توجہ کریں آپ کے چہرۂ مبارک سے بھی رنج و غم کا اظہار ہو رہا تھا[1]

حملہ کرنے والے، نہ کہ بھاگنے والے

جب لشکر واپس ہوتے ہوئے مدینے کے قریب پہونچا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا، بچے بھی ان کے پیچھے پیچھے دوڑتے تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سواری پر تھے آپ نے فرمایا کہ بچوں کو اٹھا لو اور جعفرؓ کا بچہ مجھے دیدو[2]

۱؎ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمرؓ جب حضرت جعفرؓ کے صاحبزادے سے ملتے تو کہتے السلام علیک یا ابن ذی الجناحین (دو پروں والے کے لڑکے تم پر سلام ہو) (باب غزوہ موتہ) زاد المعاد ج ۱

۲؎ سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۸۰-۳۸۱

آپ کے پاس ان کے بچے عبداللہ کو لایا گیا، آپ نے اس کو اپنی گود میں بٹھا لیا، (مسلمان چونکہ میدان جنگ سے ہٹ آنے کے عادی نہ تھے، یہ ان کے لئے پہلا واقعہ تھا) اس لئے وہ ان غازیوں پر مٹی پھینکتے تھے اور کہتے تھے بھاگنے والو کیا اللہ کے راستہ سے بھاگ گئے ہو؟ آپ نے فرمایا، بھاگنے والے نہیں ہیں، انشاء اللہ حملہ کرنے والے ہیں۔[1]

غزوۂ مُوتہ اور فتح مکہ کے درمیان

غزوۂ موتہ اور فتح مکہ کے درمیان ایک سریہ ذات السلاسل کے نام سے جمادی الاخریٰ سنہ ۸ھ میں بھیجا گیا، یہ مقام وادی القریٰ کی پشت پر تھا، اور قبیلۂ قضاعہ کے علاقہ میں واقع تھا، اسلامی لشکر نے اس موقع پر دشمن کا پوری طرح صفایا کر دیا۔ دوسرا سریہ سریۃ الخبط تھا، اس کے امیر ابو عبیدہ ابن الجراح رضی اللہ عنہ تھے، یہ رجب سنہ ۸ھ میں بھیجا گیا، اس میں مہاجرین و انصار کے تین سو آدمی شریک تھے، آپ نے ان کو جُہینہ کے ایک قبیلہ کی سرکوبی کے لئے سمندر کے قریب روانہ فرمایا، راستہ میں ان مجاہدین کو سخت بھوک اور فاقہ کا سامنا کرنا پڑا، حتیٰ کہ درختوں کے پتوں پر گذر اوقات ہونے لگی، اس وقت سمندر نے ان کے لئے عنبر نام کی ایک بہت بڑی مچھلی فراہم کر دی جس سے نصف ماہ تک ان کا کام چلا، اس کا تیل بھی انھوں نے نکالا اور خوب فائدہ اٹھایا، اس کی وجہ سے ان کی صحت و قوت بحال ہو گئی، اور جسم تر و تازہ ہو گئے، حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جب یہ واقعہ سنا تو فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری مہمانی تھی، آپ نے اس کا کچھ گوشت بھی نوش فرمایا۔[2]

---

[1] یہ روایت امام احمد بن حنبل کی، زاد المعاد ج ۱ ص ۴۱۲ [2] صحیح بخاری میں یہ روایت "باب غزوۃ سیف البحر" میں بیان کی گئی ہے۔

فتح مکہ

(رمضان ۸ھ[1])

فتح مکہ کا پس منظر

جب دینِ حق اور مسلمانوں کی دینی تربیت کی بنیادیں خدا کے حکم سے اچھی طرح مستحکم ہو گئیں، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو آزما لیا اور ان کے دلوں اور نیتوں کا پورا امتحان کر لیا، قریش کے ظلم و سرکشی، قبولِ حق سے انکار، راہِ حق میں رکاوٹیں کھڑی کرنے اور مسلمانوں کو مسلسل ایذا پہونچانے اور طرح طرح کے الزامات لگانے اور ستانے کا جام لبریز ہو گیا، بلکہ چھلکنے لگا تو مشیتِ الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ اب اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان مکہ میں فاتح بن کر داخل ہوں، کعبہ کو بتوں کی آلائش، اچھوت اور فحش کلامی کی گندگی و ناپاکی سے پاک صاف کریں، مکہ کو اس کی پرانی حیثیت اور مرتبہ پر واپس لائیں، بیت اللہ کو پوری انسانیت عامہ کے لئے سرچشمۂ ہدایت و برکت بنائیں اور اس کے فیضانِ رحمت کو دنیا کے تمام انسانوں کے لئے عام کر دیں۔

لہ مطابق جنوری ۶۳۰ء

بنی بکر اور قریش کی عہد شکنی

اللہ تعالیٰ نے اس فتح مبین کے لئے خاص اسباب پیدا فرمائے اور خود قریش کو نادانستہ طور پر اس کا باعث اور محرک بنا دیا، اور ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا جس نے فتح مکہ کو نہ صرف جائز بلکہ ناگزیر اور ضروری کر دیا۔ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (اور اللہ تعالیٰ کے قبضے میں آسمانوں اور زمین کے لشکر ہیں۔)

صلح حدیبیہ کے معاہدہ کی ایک دفعہ یہ تھی کہ جو شخص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد و پناہ میں آنا چاہے وہ ایسا کر سکتا ہے اور جو شخص قریش کی پناہ اور عہد قبول کرنا چاہے وہ اس میں آزاد ہوگا، چنانچہ بنو بکر نے قریش کو ترجیح دی اور ان کی حمایت اور پشت پناہی قبول کی اور خزاعہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حمایت اور پشت پناہی پسند کی۔[1]

بنو بکر اور خزاعہ میں بہت پرانی دشمنی تھی، اور انتقامی کارروائیوں کا ایک سلسلہ جاری تھا اور بعثت کے پہلے سے تھا، اسلام نے آکر ان دونوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی، اور اس معاملہ کے سوا کسی اور چیز پر سوچنے کی فرصت لوگوں کے پاس نہ رہی، اب جب یہ صلح ہوئی اور یہ دونوں قبیلے دو مخالف کیمپوں میں تقسیم ہو گئے، تو بنو بکر نے اس موقع کو غنیمت جان کر خزاعہ سے اپنا حساب بے باق کرنا چاہا، بنو بکر کے کچھ لوگوں سے ساز باز کر کے خزاعہ پر اس وقت شبخون مارا جب وہ پانی کے ایک چشمہ کے پاس مقیم تھے، لڑائی ہوئی اور خزاعہ کے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۹۰

متعدد آدمی مارے گئے۔

قریش نے بنی بکر کی ہتھیاروں سے مدد کی اور رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قریش کے بڑے سردار اس جنگ میں شریک ہوئے یہ لوگ خزاعہ کو دھکیلتے ہوئے حرم تک پہونچ گئے حرم پہونچ کر قریش کے بعض لوگوں نے کہا اب ہم حرم میں داخل ہو گئے ہیں اپنے معبود کا خیال کرو اپنے معبود کا خیال کرو جواب ملا کہ آج کے دن کوئی معبود نہیں بنی بکر آج بدلہ چکالو اس کے بعد تمھیں موقع نہیں ملے گا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے فریاد

اس موقع پر عمرو بن سالم الخزاعی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے آکر ملے اور آپ کے سامنے کھڑے ہو کر کچھ اشعار پڑھے اور اس میں آپ کے اور خزاعہ کے درمیان جو عہد و پیمان تھا اس کا واسطہ دے کر آپ کی حمایت و اعانت کے طالب ہوئے نیز آپ کو اس کی اطلاع دی کہ قریش نے عہد شکنی کی ہے اور آپ کے عہد نامہ اور میثاق کو ختم کر دیا ہے اور اس حالت میں جب وہ پانی پر تھے انھوں نے ان پر شب خون مارا اور رکوع و سجود کی حالت میں ہم لوگ قتل کیے گئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا: عمرو بن سالم! تمھاری ضرور مدد ہوگی۔

آخری طور پر اتمام حجت

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مناسب سمجھا کہ اس خبر کی مزید تصدیق کر لی جائے

لے زاد المعاد ج ۱ صفحہ ۴۲۰ وسیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۳۹۴

تاکہ قریش کے پاس کہنے کے لئے کوئی بات باقی نہ رہے آپ نے ان کے پاس ایک آدمی کو بھیجا اور اس کو یہ ہدایت کی کہ ان کے سامنے تین صورتیں رکھے ایک یہ کہ وہ خزاعہ کے مقتولین کا خون بہا دیں یا جس نے اس معاہدہ کو توڑا ہے اور خزاعہ پر حملہ کیا ہے اس سے بے تعلقی کا اعلان کریں یہ لوگ بنی بکر کی شاخ بنو نفاثہ سے تعلق رکھتے تھے یا پھر جیسا انھوں نے کیا ہے وہی ان کے ساتھ کیا جائے گا، ان کے بعض سرداروں نے کہا کہ ہاں ہم برابر کا جواب پسند کریں گے اس طرح قریش کی ذمہ داری سے مسلمان بری الذمہ ہو گئے اور ان پر حجت قائم ہو گئی۔[1]

معاہدہ کی تجدید کے لئے قریش کی کوشش

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ ابوسفیان معاہدہ کی توثیق اور اس کی مدت میں توسیع کے لئے تمہارے پاس آئے ہیں اور ایسا ہی ہوا قریش نے جو کچھ کیا تھا اس سے ان کو ایک قسم کا اندیشہ لاحق ہوا اور اس سخت جواب کو ناپسند کیا جو بعض کم عقل لوگوں نے دیا تھا اور ان کو اس پر پچھتاوا ہوا اور انھوں نے ابوسفیان ہی کو اس معاہدہ کی توثیق اور اس کی مدت میں توسیع کے لئے روانہ کیا۔[2]

ماں باپ اور اولاد پر حضورؐ کو ترجیح

ابوسفیان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لئے مدینہ آئے تو اپنی لڑکی

---

[1] زرقانی نے مواہب میں ابن عائذ سے ابن عمر کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ جس شخص کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کام کے لئے بھیجا تھا ان کا نام ضمرہ تھا اور قریش کے جس شخص نے اس کا جواب دیا تھا اس کا نام قرطہ بن عمرو تھا، دیکھئے شرح المواہب اللدنیہ للزرقانی ج ۲ ص ۲۹۴)

[2] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۲ و سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۹۵-۳۹۶

ام حبیبہؓ (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہؓ) کے گھر گئے، اور آپ کے بستر
مبارک پر بیٹھنا چاہا، لیکن ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے ان کو روک دیا، انھوں نے کہا بیٹی!
میں نہیں سمجھ پایا کہ تم نے اس بستر کو میرے لائق نہیں سمجھا یا مجھ کو اس بستر کے لائق نہیں سمجھا؟
انھوں نے جواب دیا کہ اصلی بات یہ ہے کہ یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بستر
ہے اور آپ مشرک ناپاک ہیں، میں پسند نہیں کرتی کہ آپ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے
بستر پر بیٹھیں، انھوں نے جواب دیا، خدا کی قسم ہم سے جدا ہونے کے بعد تم تو بہت بدل گئیں۔[1]

ابوسفیان کی پریشانی اور ناکامی

اس کے بعد ابوسفیان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے، اور آپ سے
گفتگو کی، لیکن آپ نے ان کو کوئی جواب نہ دیا، پھر وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے، اور
ان سے خواہش کی کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ان کی طرف سے بات کرلیں،
انھوں نے جواب دیا کہ یہ کام میں نہیں کرسکتا، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہم
ان سب کو بہلانے پھسلانے کی انھوں نے کوشش کی، لیکن ان حضرات میں سے
کسی نے بھی اس کی ہامی نہ بھری، اور کہا کہ مسئلہ اتنا اہم اور سنگین ہے کہ ہم لوگ بول
نہیں سکتے، ان کی حیرانی اور پریشانی اس قدر بڑھی کہ انھوں نے حضرت فاطمہؓ
سے کہا کہ اے بنت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کیا تم اپنے اس بچے کو (یہ کہتے ہوئے

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۳۲ و سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۹۶ اصل عربی کے الفاظ ہیں "واللہ لقد اصابک یا بنیۃ بعدی شر" یعنی نیا دین قبول کرنے کے بعد تو بیچاری ہو نہیں رہ گئی، اور اپنے دین و ایمان کے سامنے اپنے باپ کا بھی کچھ خیال نہیں۔

انھوں نے حضرت حسن بن علیؓ کی طرف اشارہ کیا جو پانچ سال کے خورد سال بچے تھے اور کھیل رہے تھے "اشارہ کر سکتی ہو کہ یہ اتنا زبان سے کہہ دے کہ اس نے فریقین میں بیچ بچاؤ کرا دیا ہے پھر یہ قیامت تک کے لیے عربوں کا سردار بن جائے گا۔ انھوں نے جواب دیا کہ میرا بچہ ابھی اس قابل نہیں ہوا کہ ایسے اہم معاملات میں دخل دے اور فریقین میں بیچ بچاؤ کرے، پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو آپ کی مرضی کے خلاف کوئی بھی صلح صفائی پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی پریشانی دیکھی اور ان کو اندازہ ہوا کہ وہ کس کرب اور مصیبت میں ہیں تو انھوں نے کہا کہ میں نہیں سمجھتا کہ اس وقت کوئی چیز بھی تمھارے کام آسکتی ہے تم بنی کنانہ کے سردار ہو کھڑے ہو اور خود لوگوں میں صلح صفائی کراؤ، پھر اپنے گھر کی راہ لو انھوں نے جواب دیا کہ کیا تمھارے خیال میں اس سے کچھ فائدہ ہو سکتا ہے؟ انھوں نے کہا بخدا میں تو ایسا نہیں سمجھتا لیکن میں تمھارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں دیکھتا۔ یہ سن کر ابو سفیان مسجد میں کھڑے ہوئے اور اعلان کیا لوگو! میں نے صلح کرادی اس کے بعد اونٹ پر سوار ہوئے اور اپنا راستہ لیا۔[1]

جب قریش نے یہ قصہ سنا تو کہنے لگے تم تو کوئی بات لے کر نہیں آئے، یہ کارروائی نہ ہمارے لئے مفید ہے نہ تمھارے لئے۔

مکہ کی تیاری اور حاطب ابن ابی بلتعہ کا خط

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جہاد کی تیاری کا حکم فرمایا اور اس کا

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۹۵-۹۶

اہتمام کیا کہ ساری باتوں کو خفیہ رکھا جائے۔ اس کے بعد آپ نے اپنی مکہ روانگی کا اعلان کیا، اور لوگوں کو تیار رہنے اور سامان تیار رکھنے کی ہدایت کی۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اے اللہ! اس کا انتظام فرما دے کہ قریش کا کوئی جاسوس اور مخبر اپنا کام نہ کر سکے اور ہم اچانک قریش کے سر پہ پہنچ جائیں۔[1]

مدینہ کا اسلامی معاشرہ بہر حال ایک انسانی اور بشری معاشرہ تھا، اور اس میں انسانی جذبات و احساسات اور خواہشات کی زندہ حقیقت اور واقعات کی وہ جھلکیاں موجود تھیں جو کسی زندہ، فطری اور غیر مصنوعی معاشرہ میں ہوتی ہیں، اس لئے وہ صحیح کام بھی کرتے تھے اور ان سے غلطیاں بھی ہوتی تھیں، ہو سکتا ہے وہ اپنے فیصلوں اور اقدامات میں بعض اوقات کسی تاویل سے بھی کام لیتے ہوں اور اس تاویل میں وہ حق پر بھی نہ ہوں، دراصل یہ ان تمام انسانی معاشروں کا خاصہ ہے جن میں آزادی اور باہمی اعتماد کی فضا پائی جاتی ہو۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اگر ان کے کسی اقدام کو غلط سمجھتے تو ان کے لئے عذر تلاش کرتے اور ان کے ساتھ رعایت و تسامح کا معاملہ فرماتے، ان غلطی کرنے والوں کے لئے آپ کا سینۂ مبارک بہت کشادہ تھا، اور ان کی فضیلت اور تگ و دو جہاد میں ان کے کارناموں اور اسلام کے لئے ان کی سابقہ خدمات کا آپ کو ہمہ وقت احساس رہتا تھا، حدیث، سیرت اور تاریخ اسلام نے ایسے کتنے نازک اور واقعات بھی محفوظ کر دیئے ہیں جو بجائے خود ان کتابوں کی امانت و دیانت اور حق گوئی اور انصاف پسندی کی شہادت اور سند ہیں۔

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۱ و سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۹۷

ان واقعات میں حاطب ابن ابی بلتعہ کا واقعہ بھی ہے یہ ان لوگوں میں ہیں، جنھوں نے مکہ سے ہجرت کی اور جنگ بدر میں شریک ہوئے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ روانگی کے ارادے سے صحابہ کرام کو باخبر کیا، اور خاموشی کے ساتھ اس کی تیاریاں شروع ہو گئیں تو حاطب بن ابی بلتعہ نے ایک خط لکھا جس میں ان لوگوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی روانگی کی اطلاع تھی، انھوں نے یہ خط ایک عورت کے حوالہ کیا اور اگر وہ اس کو بحفاظت قریش تک پہونچا دے تو اس کے لئے کچھ معاوضہ کا بھی وعدہ کیا، اس نے اس خط کو اپنے بالوں کے جوڑے میں چھپا لیا اور روانہ ہو گئی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جب غیبی طریقے سے اطلاع ملی تو آپ نے حضرت علی و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کو اس کے تعاقب میں روانہ فرمایا اور ارشاد ہوا کہ تم لوگ جاؤ جب تم روضۃ الخاخ (مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام ہے) کے قریب پہونچوگے تو تم کو وہاں ایک مسافر عورت ملے گی جس کے پاس قریش کے نام یہ خط ہوگا، یہ دونوں گھوڑے دوڑاتے ہوئے وہاں پہونچے اسی جگہ یہ عورت ان کو ملی، انھوں نے اس کو سواری پر سے اترنے پر مجبور کیا اور کہا کہ تمھارے پاس کوئی خط ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میرے پاس کوئی خط نہیں ہے، انھوں نے اس کے سامان و اسباب کی تلاشی لی، لیکن کچھ نہ ملا، حضرت علیؓ نے اس سے کہا کہ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بات غلط نہیں ہو سکتی، نہ ہم غلط کہتے ہیں، بخدا تجھے یہ خط نکالنا پڑے گا، ورنہ ہم تیری جامہ تلاشی لیں گے، جب اس نے دیکھا کہ یہ لوگ اس پر آڑے ہوئے ہیں تو اس نے کہا کہ منہ ادھر کرلو، انھوں نے منہ ادھر کرلیا، اس نے اپنے جوڑے کو کھول کر یہ خط نکالا، اور ان کے حوالے کیا

یہ دونوں حضرات خط لے کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے۔
یہ حاطبؓ بن ابی بلتعہ کا خط تھا جس میں قریش کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی
روانگی کی اطلاع تھی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حاطبؓ کو طلب فرمایا انھوں نے
حاضر ہو کر کہا کہ یا رسول اللہ آپ عجلت نہ فرمائیں خدا کی قسم میں اللہ اور رسولؐ
پر ایمان رکھتا ہوں۔ نہ میں نے اپنا دین تبدیل کیا ہے نہ اپنی وفاداری لیکن میرا
قریش سے ویسا تعلق نہیں جیسا ان مہاجرین کا ہے جن کی ان میں قرابتیں اور
خاندانی تعلقات ہیں جو ان کے عزیزوں کے پشت پناہ بن سکتے ہیں میرا معاملہ
یہ ہے کہ میں صرف ان کا حلیف ہوں میرے گھر کے لوگ اور بچے تو وہاں ہیں لیکن
ان کو خاندانی طور پر کوئی حمایت و پشت پناہی حاصل نہیں[1] میں نے سوچا کہ
جب مجھے یہ چیز حاصل نہیں ہے تو میں ان پر کوئی ایسا احسان کر دوں جس سے
میرے خاندان کے لوگ محفوظ رہیں۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر کہا یا رسول اللہ مجھے
اجازت دے دیجئے میں اسی وقت اس کی گردن اڑا دوں۔ اس لئے کہ اس نے

---

[1] حاطب ابن ابی بلتعہ کا تعلق قبیلہ لخم سے تھا جو قحطانی یمانی نام شام کے عربی قبائل میں سے ہے
وہ قریش میں کسی کے حلیف تھے اس کے بارے میں کئی اقوال ہیں ایک یہ کہ وہ بنو اسد ابن عبد العزیٰ
کے حلیف تھے اور کوئی ان کو حضرت زبیرؓ کا حلیف بتاتا ہے کسی کا بیان ہے کہ عبد اللہ بن حمید اسدی
کے آزاد کردہ غلام تھے (ملاحظہ ہو الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ للعلامہ احمد ابن حجر العسقلانی ج [illegible])
مشہور روایت کے مطابق مقوقس شاہ مصر کے نام حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا خط یہی
لے کر گئے تھے مرزبانی نے معجم الشعراء میں ان کو جاہلیت میں قریش کے شہسواروں اور شعراء میں شمار
کیا ہے مدائنی کے بیان کے مطابق ۳۰ھ میں زمانہ خلافت حضرت عثمانؓ میں ان کا انتقال ہوا

اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت کی ہے اور منافق ہوگیا ہے ، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ بدر میں شریک تھے اور تم تعین کیا معلوم کہ بہیں اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو مخاطب کر کے فرما دیا ہو کہ تم جو چاہو کرو میں نے تمہارے سب قصور معاف کر دیئے ہیں یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے انھوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں[1]۔

غرض رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم رمضان میں مدینہ سے روانہ ہوئے لشکر اسلام دس ہزار صحابیوں پر مشتمل تھا[2] "مر الظہران" میں آکر اس نے منزل کی، اس نقل و حرکت سے اللہ تعالیٰ نے قریش کو بالکل بے خبر رکھا، اور وہ خوف و بے تقینی اور انتظار کی ملی جلی کیفیت کا شکار ہو گئے۔

پروانۂ معافی

راستہ میں آپ کو آپ کے چچا زاد بھائی ابوسفیان (ابن الحارث بن عبدالمطلب) ملے آپ نے ان سے منہ پھیر لیا اس لئے کہ انھوں نے آپ کو بڑی ایذا پہونچائی تھی اور آپ کی ہجو کہی تھی، انھوں نے حضرت علیؓ سے اس بات کا شکوہ کیا، انھوں نے کہا کہ تم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے روئے مبارک کے سامنے کی طرف آؤ اور وہ کہو جو برادران یوسف نے یوسف علیہ السلام سے کہا تھا "تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ"[3] (خدا کی قسم خدا نے تم کو ہم پر فضیلت بخشی ہے اور بے شک ہم خطاکار تھے) اس لئے کہ آپ یہ پسند نہیں فرماتے کہ اچھی اور نرم بات کہنے میں آپ سے

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۲ صحاح میں بھی یہ قصہ مروی ہے ترجمہ کے وقت صحیح بخاری کے الفاظ پیش نظر رکھے گئے ہیں۔ [2] باب غزوۃ الفتح فی رمضان صحیح بخاری۔ [3] سورۂ یوسف - ۹۱

کوئی پڑھ جائے انھوں نے یہی کیا اور سامنے آکر یہ آیت پڑھی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرّٰحِمِينَ[1] ۔ (آج تم پر کوئی الزام نہیں اللہ تعالےٰ انھیں معاف فرمائے اور وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحیم ہے) اس کے بعد بہت اچھے اور راسخ مسلمانوں میں ان کا شمار ہوا لیکن اسلام لانے کے بعد پھر کبھی انھوں نے شرم کے مارے آپ سے آنکھیں چار نہیں کیں[2]۔

ابوسفیان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ آگ کے الاؤ روشن کیے جائیں، چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی اسی وقت ابوسفیان بن حرب جاسوسی کی غرض سے اور حالات کا اندازہ کرنے کے لیے اُدھر سے گذرے اور ان کے منہ سے نکلا کہ اس شان کا لشکر اور اس طرح کی روشنی تو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی، حضرت عباس (بن عبدالمطلب) اس سے پہلے ہجرت کر چکے تھے اور اس لشکر میں موجود تھے انھوں نے ابوسفیان کی آواز پہچان لی اور کہا دیکھو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں میں تشریف فرما ہیں کل قریش کا انجام کتنا ہولناک ہوگا پھر یہ سوچ کر کہ کوئی مسلمان ان کو دیکھ لے گا تو فوراً ان کا کام تمام کر دے گا اپنے خچر کے پیچھے انھیں بٹھایا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نظر مبارک ان پر پڑی تو آپ نے فرمایا ابوسفیان تمھارا بھلا ہو کیا ابھی تک اس کا

---

[1] سورۂ یوسف۔ ۹۲ [2] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۳

وقت نہیں آیا کہ تم اس پر ایمان لاؤ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؟

انھوں نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ کتنے حلیم اور کتنے کریم اور کس قدر صلہ رحمی کرنے والے ہیں، خدا کی قسم میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی اور معبود کا وجود ہوتا تو آج میرے کچھ کام آتا۔ آپ نے فرمایا ابو سفیان! خدا تمہیں سمجھ دے کیا اب بھی اس کا وقت نہیں آیا کہ تم اس بات کا اقرار کرو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟!

ابو سفیان نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ کتنے حلیم کتنے کریم اور کتنے صلہ رحمی کرنے والے ہیں لیکن جہاں تک اس معاملہ کا تعلق ہے اس بارے میں مجھے ابھی کچھ شبہ ہے۔

حضرت عباسؓ نے فرمایا "بندۂ خدا قبل اس کے کہ تمھاری گردن تلوار سے اڑا دی جائے اسلام قبول کرلو اور گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں" یہ سن کر ابو سفیان اسلام لائے اور شہادت دے کر اس فریضہ سے عہدہ برآ ہوئے۔[1]

معافی کی صدائے عام

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے معافی اور امن وحفاظت کا دائرہ اس روز وسیع فرما دیا کہ اہل مکہ میں سے صرف وہی شخص ہلاک ہو سکتا تھا جو خود معافی وسلامتی کا خواہشمند نہ ہو اور اپنی زندگی سے بیزار ہو، آپ نے فرمایا کہ جو ابو سفیان

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۰۳، وزاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۰

کے گھر میں داخل ہو جائے گا اس کو پناہ ملے گی، جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے گا، وہ محفوظ ہے جو مسجد (حرام) میں داخل ہوگا اس کو امان ہے۔[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اہل لشکر کو ہدایت فرمائی کہ مکہ داخل ہونے وقت صرف اس شخص پر ہاتھ اٹھائیں جو ان کی راہ میں حائل ہو اور ان کی مزاحمت کرے آپ نے اس کا بھی حکم فرمایا کہ اہل مکہ کی منقولہ وغیر منقولہ جائداد کے سلسلہ میں مکمل احتیاط برتی جائے اور اس پر مطلق دست درازی نہ کی جائے۔[2]

ابوسفیان فتح کے جلوس کا نظارہ کرتے ہوئے

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو ہدایت کی کہ ابوسفیان کو ایسی جگہ لے جائیں جہاں سے اسلامی دستوں کی پیشقدمی کا نظارہ ہو سکے۔ یہ فاتح دستے سمندر کی موجوں کی طرح متلاطم نظر آتے تھے مختلف قبائل اپنے اپنے جھنڈوں کے ساتھ گذر رہے تھے جب کوئی قبیلہ گذرتا تو ابوسفیان عباس رضی اللہ عنہ سے اس کا نام دریافت کرتے اور کہتے کہ مجھے اس قبیلہ سے کیا سروکار، یہاں تک کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس ایک مسلح دستے میں تشریف لائے جو سبز معلوم ہو رہا تھا، یہ مہاجرین وانصار کا ایسا آہن پوش دستہ تھا کہ ان کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔

ابوسفیان نے یہ منظر دیکھ کر کہا کہ خدا کی شان عباسؓ یہ کون لوگ ہیں؟ انھوں نے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۰۴ یہ روایت صحیح بخاری میں مختصر طور پر آئی ہے باب این رکز النبی الرایۃ یوم الفتح [2] ایضاً۔

جواب دیا یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں جو مہاجرین و انصار کے جلو میں تشریف لے جا رہے ہیں انھوں نے کہا ان میں سے کسی کو اس سے پہلے یہ طاقت اور شان و شوکت حاصل نہ تھی، خدا کی قسم اے ابوالفضل! تمہارے بھتیجے کا اقتدار آج کی صبح کتنا عظیم ہے! انھوں نے کہا کہ ابوسفیان یہ نبوت کا معجزہ ہے۔

اس کے بعد ابوسفیان نے بلند آواز سے اعلان کیا کہ اے قریش کے لوگو! یہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اتنی طاقت کے ساتھ تمہارے پاس آئے ہیں جس کا تم کو کبھی تجربہ نہ ہوا ہوگا، اب جو ابوسفیان کے گھر میں آ جائے گا اس کو امان دی جائے گی لوگ چیخ کر کہنے لگے اللہ تم سے سمجھے تمہارے گھر کی حقیقت ہی کیا ہے کہ ہم سب کو اس میں پناہ مل سکے؟ پھر انھوں نے کہا جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے گا اس کو امان ملے گی، جو مسجد (مسجد حرام) میں چلا جائے گا اس کو امان ملے گی، چنانچہ لوگ منتشر ہو گئے، اپنے اپنے گھروں اور مسجد حرام میں پناہ گیر ہو گئے۔[1]

نیازمندانہ شرکہ فاتحانہ داخلہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکہ میں اس شان سے داخل ہوئے کہ سر مبارک عبدیت و تواضع کے غلبہ سے بالکل جھک گیا تھا قریب تھا کہ آپ کی ٹھوڑی اونٹنی کے کجاوہ سے لگ جائے آپ داخل ہوتے وقت سورۂ فتح پڑھ رہے تھے۔[2]

---

[1] البدایہ ص۲۹۱ و زاد المعاد ج ا ص۴۲۵ [2] ابن کثیر ج ۳ ص۵۵۳ صحیح بخاری میں معاویہ بن قرہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فتح مکہ کے دن اس حالت میں دیکھا کہ آپ اپنی اونٹنی پر تشریف رکھتے تھے اور سورۂ فتح ترجیع کے ساتھ تلاوت فرما رہے تھے۔

مکہ کے اس فاتحانہ داخلہ میں (جو جزیرۃ العرب کا قلب و جگر اور روحانی
و سیاسی مرکز تھا) عدل و مساوات تواضع اور اظہار عبدیت کا کوئی انداز نہ تھا
جس کو آپ نے اختیار نہ فرمایا ہو، اسامہؓ کو جو آپ کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام)
حضرت زید کے صاحبزادہ تھے آپ نے اپنی سواری کے پیچھے جگہ دی تھی، ہاشم
اور اشراف قریش میں سے جن کی بڑی تعداد وہاں موجود تھی، یہ شرف کسی کو حاصل
نہ ہوا، یہ واقعہ جمعہ کی صبح ۲۰ر رمضان کا ہے۔[1]

فتح کے روز ایک شخص نے آپ سے گفتگو کی تو اس پر کپکپی طاری ہو گئی،
آپ نے فرمایا ڈرو نہیں اطمینان رکھو میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، میں تو قریش کی
ایک ایسی عورت کا لڑکا ہوں جو گوشت کے سوکھے ٹکڑے کھایا کرتی تھی۔[2]

معافی و رحم کا دن ہے خونریزی کا نہیں

جب سعد بن عبادہؓ جو انصار کے دستہ کے امیر تھے ابو سفیان کے پاس سے
گزرے انھوں نے کہا "الیوم یوم الملحمة، الیوم تستحل الکعبة، الیوم أذل الله
قریشا" "آج گھمسان کا رن ہے اور خونریزی کا دن ہے، آج کعبہ میں سب جائز
ہوگا، آج اللہ تعالیٰ نے قریش کو ذلیل کیا ہے"، جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
اپنے دستہ میں ابو سفیان کے پاس سے گزرے تو انھوں نے آپ سے اس کی شکایت کی
اور کہا کہ یا رسول اللہ آپ نے سنا سعد نے ابھی کیا کہا؟ آپ نے فرمایا کیا کہا ہے؟
انھوں نے وہ سب دہرا دیا، سعد کے جملہ کو آپ نے ناپسند فرمایا اور فرمایا "الیوم یوم

۱۔ ابن کثیر ج ۳ ص ۵۵۶   ۲۔ صحیح بخاری کتاب المغازی، باب حجۃ الوداع

المرحمة اليوم يعز الله فيه قريشا ويعظم الله الكعبة" (یعنی آج تو رحم و مہربانی کا دن ہے آج اللہ تعالیٰ قریش کو عزت عطا فرمائے گا، اور کعبہ کی عظمت بڑھائے گا) آپ نے حضرت سعدؓ کو بلوا بھیجا اور اسلامی پرچم ان سے لے کر ان کے صاحبزادے قیس کے حوالہ کیا، آپ نے یہ خیال فرمایا کہ ان کے صاحبزادے کو پرچم دینے کے معنی یہ ہوں گے کہ گویا پرچم ان سے واپس نہیں لیا گیا ہے۔[1]

اس طرح ایک حرف کی تبدیلی (الملحمہ کے بجائے المرحمہ فرما دینے) اور ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے تبدیل کر دینے سے (جن میں سے ایک باپ کا ہاتھ تھا، دوسرا بیٹے کا) آپ نے سعد بن عبادہ (جن کے ایمانی اور مجاہدانہ کارنامے اظہر من الشمس تھے) کی ادنیٰ دلشکنی کے بغیر ابوسفیان کی (جن کو تالیف قلب کی ضرورت تھی) دلجوئی کا سامان ایسے حکیمانہ بلکہ معجزانہ طریقہ پر انجام دے دیا، جس سے بہتر طریقہ پر تصور میں آنا مشکل ہے، باپ کے بجائے ان کے بیٹے کو یہ منصب عطا کر دیا جس سے ابوسفیان کے زخم خوردہ دل کی تسکین منظور تھی، دوسری طرف آپ سعد بن عبادہ کو بھی آزردہ خاطر نہیں دیکھنا چاہتے تھے جنہوں نے اسلام کے لئے بڑی خدمات انجام دی تھیں۔

۱ے ابن اموی نے مغازی میں اس روایت کا ذکر کیا ہے (دیکھئے فتح الباری ج ۸ ص ۵) صحیح بخاری میں یہ واقعہ الفاظ کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ بیان کیا گیا ہے لیکن اس میں سعد بن عبادہ کے سوال اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جواب کا ذکر ہے۔ اموی کا پورا نام یحییٰ بن سعید بن ابان ہے اور ان کا شمار معتبر ثقات میں ہے جن کے لئے حدیث کی اصطلاح میں صدوق کا لفظ آتا ہے، صحاحِ ستہ نے ان سے روایت کی ہے، ان کی وفات ۱۹۴ھ میں ہوئی۔ ۲ے زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۲

معمولی جھڑپیں

اس موقع پر صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابی جہل، سہیل بن عمرو اور خالد بن ولید کے ساتھیوں کے درمیان کچھ جھڑپیں ہوئیں جن میں تقریباً ایک درجن کفار مارے گئے، اس کے بعد انھوں نے شکست قبول کر لی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی لشکر کے سالاروں کو یہ ہدایت فرمادی تھی کہ جب وہ مکہ میں داخل ہوں تو صرف اس پر ہاتھ اٹھائیں جو ان پر ہاتھ اٹھائے۔[1]

حرم سے بتوں کی صفائی

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں اپنے مقام پر پہنچ گئے اور لوگ مطمئن ہو گئے تو اس وقت آپ باہر تشریف لائے بیت اللہ کی طرف روانہ ہوئے وہاں جا کر بیت اللہ کے گرد طواف کیا، اس وقت آپ کے دست مبارک میں ایک کمان تھی، کعبہ میں تین سو ساٹھ بت تھے آپ اس کمان سے ان بتوں کو کچوکے لگاتے اور فرماتے تھے:۔

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ،	حق آگیا اور باطل مٹ گیا،
إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (سورۃ اسراء)	اور باطل مٹنے ہی کی چیز تھی۔

اس کے ساتھ یہ تمام ایک ایک کر کے منہ کے بل گرتے جاتے۔[2]

آپ کو کعبہ میں کچھ تصویریں اور مجسمے بھی نظر آئیں اور آپ کے حکم سے

---

[1] [illegible] ۔ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص [illegible]، زاد المعاد [illegible]

ان کو بھی توڑ پھوڑ دیا گیا۔[1]

آج حسنِ سلوک اور پاسِ وفا کا دن ہے

جب آپ نے طواف پورا فرما لیا تو عثمان بن طلحہ کو جو کعبہ کے کلید بردار تھے بلوایا، کعبہ کی کلید اُن سے لی دروازہ کھولا گیا، اور آپ کعبہ میں داخل ہوئے، اس سے پہلے جب آپ نے مدینہ ہجرت سے قبل ایک دن یہ کلید طلب فرمائی تھی تو انھوں نے سخت جواب دیا تھا، اور آپ سے اہانت آمیز گفتگو کی تھی، اور آپ نے حلم اور بردباری سے کام لیتے ہوئے یہ فرمایا تھا، عثمان! تم یہ کلید کسی وقت میرے ہاتھ میں دیکھو گے اس وقت میں جسے چاہوں گا اسے دوں گا" اس کے جواب میں انھوں نے کہا تھا، اگر ایسا ہوا تو وہ دن تو قریش کی بڑی ذلت و تباہی کا ہوگا" آپ نے فرمایا "نہیں اس دن وہ آباد اور باعزت ہوں گے" یہ الفاظ عثمان بن طلحہ کے دل نشین ہوگئے، اور انھوں نے محسوس کیا کہ جیسا آپ نے فرمایا ہے ویسا ہی ہوگا۔[2]

جب آپ کعبہ سے باہر تشریف لائے تو کنجی آپ کے دستِ مبارک میں تھی، آپ کو دیکھتے ہی حضرت علیؓ کھڑے ہوگئے، اور عرض کیا، اللہ آپ پر درود و سلام بھیجے آپ سقایہ (پانی پلانے کا انتظام) کے ساتھ حجابہ (بیت اللہ کی دربانی) بھی ہمیں عطا فرمائیں، آپ نے فرمایا عثمان بن طلحہ کہاں ہیں؟ ان کو بلایا گیا،

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۴ نیز ملاحظہ ہو صحیح بخاری کا باب (این رکز النبی صلے اللہ علیہ وسلم الرایۃ یوم الفتح) [2] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۵ صحیح بخاری میں بھی یہ واقعہ آیا ہے۔

آپ نے فرمایا عثمان! لو یہ تمہاری کنجی ہے، آج حسن سلوک اور پاسِ وفا کا دن ہے۔ یہ کنجی لو جو تمہارے پاس ہمیشہ ہمیشہ رہے گی اور ظالم کے سوا کوئی تم سے اس کو چھین نہ سکے گا۔[۱]

توحیدِ حق اور وحدتِ انسانی کا دین

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب کعبہ سے نکلنے کے لئے اس کا دروازہ کھولا تو قریش پورے حرم میں صف بستہ کھڑے تھے اور منتظر تھے کہ اب آپ کیا کرنے والے ہیں۔ آپ نے دروازے کے دونوں بازو تھام لئے، تمام لوگ آپ کے نیچے تھے پھر آپ نے فرمایا:-

لا إله إلا الله وحده	ایک خدا کے سوا اور کوئی خدا نہیں
لا شريك له صدق وعده	ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے اس نے
ونصر عبده وهزم الأحزاب	اپنا وعدہ سچا کیا، اپنے بندہ کی مدد
وحده، ألا كل مأثرة أو مال	کی اور تمام جتھوں کو تنہا شکست
أو دم فهو تحت قدمي هاتين	دی۔ یاد رکھو کہ تمام مفاخر تمام
إلا سدانة البيت وسقاية	انتقامات، خون بہا سب میرے
الحاج، يا معشر قريش!	قدموں کے نیچے ہیں، صرف کعبہ کی
إن الله قد أذهب عنكم	تولیت اور حجاج کی آب رسانی
نخوة الجاهلية وتعظمها	اس سے مستثنیٰ ہے، اے قوم قریش!

[۱] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۵ طبقات ابن سعد کے حوالہ سے۔

یا لآباء الناس من آدم و آدم من تراب۔	اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار خدا نے مٹا دیا، تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:-

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (سورہ حجرات ۱۳)	لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر لو، خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے، بیشک خدا سب کچھ جاننے والا اور سب سے باخبر ہے۔

نبی رحمت

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اے قریشیو! تمہیں کیا توقع ہے کہ اس وقت میں تمہارے ساتھ کیا کروں گا؟ انھوں نے جواب دیا ہم اچھی ہی امید رکھتے ہیں، آپ کریم النفس و شریف بھائی ہیں اور کریم و شریف بھائی کے بیٹے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا میں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا۔

زادالمعاد ج ۱ ص ۴۲۴

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا — آج تم پر کوئی الزام نہیں جاؤ تم

فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ۔ — سب آزاد ہو۔

اس کے بعد آپ نے بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ کعبہ پر چڑھ کر اذان دیں، قریش کے سب سرداران اور اشراف نے یہ اعلان سنا اور وادی مکہ اذان حق سے گونج اٹھی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُم ہانی (بنت ابی طالب) کے گھر تشریف لے گئے غسل فرمایا اور اللہ تعالے کے شکرانہ میں آٹھ رکعتیں صلاۃ الفتح (فتح کی نماز) کی ادا فرمائیں۔

حدود شرعیہ کے اجراء میں کوئی امتیاز روا نہیں

بنی مخزوم کی ایک عورت نے جس کا نام فاطمہ تھا، اس غزوہ میں چوری کی اس کی برادری کے لوگ اسامہ بن زیدؓ کے پاس اس خیال سے کہ وہ رسول اللہ کو بہت عزیز ہیں حاضر ہوئے اور سفارش کرانا چاہی، انھوں نے جب اس معاملہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی تو آپ کے روئے مبارک کا رنگ بدل گیا، آپ نے فرمایا کہ تم مجھ سے اللہ تعالے کی مقرر کردہ حدود میں کسی حد کے متعلق بات کرتے ہو؟ اسامہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ میرے لئے اللہ تعالے سے مغفرت چاہیں، شام کے وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سب لوگوں سے خطاب فرمایا پہلے اللہ تعالے کی حمد وثنا بیان کی جو اس کی شان کے لائق ہے پھر فرمایا:۔

اما بعد۔ تمھارے پہلے لوگ اس لئے ہلاک ہوئے تھے کہ ان میں سے جب کوئی شریف اور ذی حیثیت آدمی چوری کرتا تھا تو وہ اس کو چھوڑ دیتے تھے جب ضعیف کمزور

۱؎ زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۴۔ ۲؎ صحیح بخاری باب منزل النبی صلے اللہ علیہ وسلم یوم الفتح، زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۵

شخص چوری کرتا تھا تو اس پر حد جاری کرتے تھے اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے اگر فاطمہ بنت محمد نے بھی چوری کی ہوتی تو میں اس کے ہاتھ کاٹ دیتا۔ پھر اس کے بعد آپ نے حکم دیا کہ اس عورت کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں چنانچہ اس کے ہاتھ کاٹے گئے اور خلوص دل سے اس نے اس عمل بد سے توبہ کی اس کے حالات سدھر گئے اور اس نے شادی کر لی۔[1]

اپنے دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک

جب فتح مکمل ہوگئی اور سب لوگوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے امان عطا فرمائی سوائے نو آدمیوں کے جن کے قتل کا حکم ہوا خواہ وہ کعبہ کے پردوں کے اندر ملیں ان میں کوئی وہ تھا جو اسلام لانے کے بعد مرتد ہوگیا کسی نے فریب دے کر کسی مسلمان کو قتل کیا تھا کسی نے آپ کی ہجو کو تفریح طبع کا سامان بنایا تھا اور اس کو لوگوں میں پھیلاتا تھا ان میں عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح بھی تھا جو مرتد ہوگیا تھا عکرمہ بن ابی جہل تھا جو اسلام کے غلبہ اور اس کے زور دورہ سے نفرت کی بنا پر اور جان کے خوف سے اپنا وطن چھوڑ کر یمن چلا گیا تھا اس کی بیوی نے اس کے فرار کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کے لئے امان طلب کی تو آپ یہ جانتے ہوئے کہ وہ روئے زمین پر آپ کے بدترین دشمنوں کا بیٹا ہے اس کی امان دی بلکہ خوشی اور استقبال میں اس طرح اس کی طرف لپکے کہ چادر بھی جسم اطہر سے سرک گئی تھی۔

عکرمہ اسلام لائے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بہت مسرت ہوئی اسلام میں ان کو بڑا مقام حاصل ہوا، ارتداد کی جنگوں اور شام کے معرکوں میں انہوں نے بڑی خدمات انجام دیں۔

ان میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے محبوب چچا سیدنا حمزہ کے قاتل

---

[1] بخاری و مسلم، دیکھئے بخاری میں (باب مقام النبی صلے اللہ علیہ وسلم بمکۃ زمن الفتح)

(جبیر ابن مطعم کے غلام) وحشی بھی تھے جن کا خون رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مباح کر دیا تھا۔ لیکن وہ اسلام لائے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کا اسلام قبول فرمایا۔

ان میں ہبار بن الاسود بھی تھا جس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پہلو پر نیزہ سے حملہ کیا، یہاں تک کہ وہ اونٹ سے ایک چٹان پر گر پڑیں اور اسقاط حمل کا واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد وہ بھاگ گیا بعد میں اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اور سارہ اور دو ایک دوسری گانے والیوں کو جو آپ کی ہجو میں گیت گائے اشعار کو گاتی تھیں) کے سلسلے میں بھی آپ سے امان چاہی گئی۔ آپ نے ان دونوں کو امان دی اور وہ دونوں مسلمان ہو گئیں۔[1]

ہند بنت عتبہ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مکالمہ

مکہ میں ایک مجمع آپ سے اسلام پر بیعت کرنے کے لئے اکٹھا ہو گیا۔ آپ ان کو بیعت کرنے کے لئے کوہ صفا پر تشریف لائے اور وہاں بیٹھ کر ان سے اللہ و رسول کی سمع و طاعت پر جہاں تک ان کے اندر اس کی قوت ہو بیعت لی۔

جب مردوں کو بیعت کر کے آپ فارغ ہو گئے تو آپ نے عورتوں سے بیعت لی۔ ان میں ابو سفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ بھی تھیں وہ نقاب میں تھیں، اور سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ انھوں نے جو کچھ کیا تھا اس کی وجہ سے اپنے کو ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مجھ سے بیعت کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ گی، ہند نے کہا خدا کی قسم آپ ہم سے وہ اقرار لے رہے ہیں جو آپ نے مردوں سے نہیں لیا۔

---

[1] زاد المعاد ج ۱ صفحہ ۴۲۵

"اور چوری نہ کروگی" ہند نے پھر کہا کہ میں نے ابوسفیان کے مال میں سے کچھ تھوڑا تھوڑا لیا ہے میں نہیں جانتی کہ یہ بھی کرلیا کرنا حلال ہے یا حرام ابوسفیان نے یہ سن کر جو اس وقت موجود تھے کہا کہ جہاں تک گذشتہ کا تعلق ہے تم اس سے آزاد ہو وہ تمہارے لیے حلال ہے اس موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا تم عتبہ کی بیٹی ہند ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں آپ جو کچھ گذشتہ قصور سرزد ہوتے ہیں ان کو معاف کریں، اللہ تعالےٰ آپ کو معاف کرے پھر آپ نے فرمایا "اور زنا نہ کروگی" اس نے کہا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیا کوئی شریف عورت بھی زنا کرسکتی ہے؟[1]

اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا "اپنی اولاد کو قتل نہ کروگی" یہ سن کر انھوں نے کہا جب تک وہ بچے رہے ہم نے انھیں پالا جب بڑے ہوئے تو آپ نے انھیں قتل کیا اب آپ جانیں اور وہ جانیں!

اس کے بعد ارشاد ہوا "کوئی کھلا ہوا بہتان نہ باندھوگی" ہند نے کہا بخدا بہتان تراشی بہت معیوب اور قبیح بات ہے اور بعض موقع پر چشم پوشی اور درگذر بہتر ہے۔ آپ نے فرمایا "اور میری نافرمانی نہ کروگی" اس نے کہا ہاں بھلی باتوں میں![2]

تمھارے ہی ساتھ جینا ہے اور تمھارے ہی ساتھ مرنا ہے

جب اللہ تعالےٰ نے مکہ کے دروازے اللہ کے رسول کے لئے کھول دیئے جو آپ کی جائے پیدائش اور اصلی وطن تھا تو انصار نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ تعالےٰ نے آپ کا اصلی وطن فتح فرما دیا ہے اب آپ یہیں قیام

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص [illegible]، [2] ابن کثیر ج ۴ ص [illegible] ابن کثیر کے سوا دیگر مصادر سے معمولی اضافہ کے ساتھ

فرمائیں گے مدینہ واپس نہ ہوں گے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انصار سے دریافت فرمایا کہ تم لوگ کیا بات کرتے تھے اس بات کو ان کے سوا کوئی اور نہ جانتا تھا یہ لوگ اس پر بہت شرمندہ ہوئے اور آخر میں اعتراف کر لیا، آپ نے فرمایا معاذ اللہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے جینا بھی تمھارے ساتھ ہے اور مرنا بھی تمھارے ساتھ ہے۔[1]

دشمنوں نے آنکھیں بچھائیں اور فاسق و فاجر متقی و پرہیزگار بن گئے!

فضالہ بن عمیر کی نیت خراب ہوئی اور اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم طواف میں مشغول ہوں تو اس وقت وہ کام کر لیا جائے جو کسی شقی سے غیر ممکن ہو سکتا تھا جب وہ اس ارادے سے آپ کے قریب آیا تو آپ نے اسے متوجہ کرتے ہوئے کہا فضالہ! اس نے کہا جی یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپ نے فرمایا کہ تمھارے دل میں اس وقت کیا آرہا تھا اس نے کہا کچھ نہیں اللہ کو یاد کر رہا تھا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ سن کر ہنسے پھر فرمایا اللہ سے معافی چاہو، پھر اپنا دست مبارک اس کے سینہ پہ رکھا اس کا دل اسی وقت پُرسکون ہو گیا، فضالہ بیان کرتے تھے کہ آپ نے اپنا ہاتھ میرے سینہ سے ہٹایا بھی نہیں تھا کہ اللہ تعالےٰ کی ساری مخلوق میں میرے لئے آپ سے زیادہ محبوب کوئی اور نہ تھا۔

انھوں نے کہا کہ اس کے بعد میں اپنے گھر کی طرف چلا راستہ میں مجھے وہ عورت ملی جس سے میں کچھ باتیں کیا کرتا تھا اس نے کہا کہ آؤ فضالہ تم سے کچھ بات کریں، فضالہ کا جواب تھا اللہ اور اسلام اب اس کی اجازت نہیں دیتا۔[2]

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۱۶ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۱۷ و زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۲

جاہلیت کے آثار اور بت پرستی کے نشانات کا خاتمہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کے چاروں طرف جتنے بُت تھے ان کو ختم کرنے کے لئے سرایا بھیجے اور یہ سارے کے سارے بُت پاش پاش کر دیئے گئے، ان میں "لات و عزیٰ" اور "منات" کے بُت بھی شامل تھے۔ اس کے بعد آپ کے منادی نے مکہ میں اعلان کر دیا کہ ہر وہ شخص جو اللہ اور آخرت کے دن پر یقین رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے گھر کے ہر بُت کو توڑ دے۔ آپ نے اصحاب کرام میں سے کچھ آدمیوں کو مختلف قبائل میں بھیجا اور انھوں نے وہاں جا کر بُت شکنی کا یہ مقدس فریضہ انجام دیا۔

جریر روایت کرتے ہیں کہ "جاہلیت میں ایک بت خانہ تھا جس کا نام "ذوالخلصہ" تھا، اسی طرح "الکعبۃ الیمانیہ" اور "الکعبۃ الشامیہ" کے نام سے بُت خانے تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ کیا تم اس "ذوالخلصہ" کو پاش پاش کر کے مجھے راحت نہ پہونچاؤ گے؟ جریر کہتے ہیں کہ میں ڈیڑھ سو شہسواروں کو لے کر (جو احمس کے تھے اور یہ لوگ شہسوار مانے جاتے تھے) وہاں گیا، اس بُت کو بھی توڑ ڈالا اور جتنے لوگ اس وقت اس بُت کے پاس حاضر تھے ان کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا، اس کے بعد میں نے واپس آکر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر سنائی، آپ نے ہمارے لئے اور احمس کے لئے دعا فرمائی۔"[1]

پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں کھڑے ہو کر اس کی حرمت و عظمت کا اعلان کیا اور ارشاد فرمایا کہ کسی شخص کے لئے جو اللہ اور آخرت کے دن پر

---

[1] صحیح بخاری باب غزوۃ ذی الخلصہ۔

ایمان لا چکا ہے یہ جائز نہیں کہ اس میں خون بہائے یا یہاں کے کسی درخت کو کاٹے آپ نے یہ بھی فرمایا کہ نہ مجھ سے پہلے کسی شخص کے لئے یہاں ایسا کرنا جائز تھا اور نہ میرے بعد کبھی کسی کے لئے جائز ہوگا" اس کے بعد آپ مدینہ تشریف لے آئے۔[1]

فتح مکہ کے اثرات

فتح مکہ کا عربوں کے دلوں پر بہت گہرا اثر پڑا اللہ تعالیٰ نے ان کے دل قبول اسلام کے لئے کھول دیئے اور انھوں نے وفدوں اور جماعتوں کی شکل میں آ کر کثرت اسلام قبول کرنا شروع کیا، کچھ ایسے قبیلے تھے جو قریش کے ساتھ کسی نہ کسی معاہدہ سے وابستہ تھے اور اس معاہدہ کی پابندی ان کے قبول اسلام میں رکاوٹ بن رہی تھی کچھ قبیلے قریش سے ڈرتے تھے اور قریش کی بڑائی و عظمت ان کے دل میں گھر کر چکی تھی، جب انھوں نے دیکھا کہ خود قریش نے اسلام کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور سر تسلیم خم کر دیا ہے تو ان کو بھی اس کا شوق پیدا ہوا اور سب جھجک دور ہو گئی۔

بعض قبیلے یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ کوئی ظالم و جابر داخل نہیں ہو سکتا ہے نہ اس کو بری نیت سے فتح کر سکتا ہے ان میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جن کے سامنے واقعہ فیل پیش آیا تھا، اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ابرہہ کا کیا انجام ہوا، وہ کہتے تھے جانے دو ان کے اور ان کی قوم کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں، اگر وہ ان پر غالب آ گئے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ وہ نبی برحق ہیں جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے ہاتھ پر مکہ کو فتح فرمایا اور قریش خواستہ یا

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۴-۴۲۵۔ [2] صحیح بخاری بروایت عمرو بن سلمہ، باب مقام النبی بمکہ زمن الفتح)

نخواستہ اسلام کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے پر مجبور ہوئے تو عربوں کا اسلام کی طرف ایسا رجوعِ عام ہوا کہ اس سے پہلے اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی ان کی بڑی بڑی جماعتیں اور قبیلے آپؐ کے پاس حاضر ہوتے اور اپنے نصیب خفتہ کو بیدار کرتے اسی موقع کے لئے اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے:۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ	جب اللہ کی مدد آپہونچی اور فتح
وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ	(حاصل ہو گئی) اور تم نے دیکھا کہ
فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا	لوگ غول کے غول خدا کے دین میں
(سورۃ النصر ۱-۲)	داخل ہو رہے ہیں۔

گورنر امیر

مکہ کو الوداع کہنے سے پہلے آپؐ نے عتاب بن اُسَید کو مکہ کے معاملات اور حج کے انتظامات کی دیکھ بھال کے لئے امیر مقرر کیا۔ ان کی عمر اس وقت بیس سال کے لگ بھگ تھی حالانکہ ان سے زیادہ سن رسیدہ بزرگ اور اربابِ فضل و کمال اس وقت موجود تھے، یہ اس بات کی علامت تھی کہ عہدے اور منصب اہلیت اور قوت و صلاحیت کی بنیاد پر ملتے ہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے دورِ خلافت میں ان کو اس عہدے پر بدستور باقی رکھا۔[۳]

---

[۱] استفادہ از "رحمۃ للعالمین" مؤلفہ مولانا قاضی محمد سلیمان منصورپوری۔

[۲] ابن ہشام ج ۲ ص ۴۱۳   [۳] الاصابۃ و اسد الغابۃ۔

غزوۂ حُنَین

(شوال ۸ھ)

شمع اسلام کو پھونکوں سے بجھانے کی ایک ورناکام کوشش

جب فتح مکہ کی تکمیل ہوگئی اور لوگوں نے بہت بڑی تعداد میں اسلام قبول کرنا شروع کیا تو اس وقت گرد و پیش کی آبادی نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے ترکش کا آخری تیر بھی چلا دیا۔ یہ دراصل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ اور جزیرۃ العرب میں اسلام کے فروغ اور اشاعت کو روکنے کی ایک مایوسانہ کوشش تھی۔

ہوازن کا اجتماع

قبیلۂ ہوازن قریش کے بعد مضر کی طاقت سمجھی جاتی تھی ان کے اور قریش کے درمیان رقابت اور مقابلہ کا جذبہ پہلے سے موجود تھا چنانچہ قریش نے اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت کے سامنے ہتھیار رکھ دیئے اور اپنی شکست تسلیم کرلی لیکن ہوازن نے اپنا سر تسلیم خم کرنے سے انکار کردیا بلکہ اس کے اندر یہ جذبہ اور شوق پیدا ہوگیا کہ اسلام کی بیخ کنی کا سہرا اُس کے سر بندھے اور عرب میں

اس کے اس کارنامہ کی شہرت ہوا اور لوگ کہیں کہ جو کام قریش نہ کر سکے اس کو ہوازن نے کر دکھایا۔

قبیلے کے سردار مالک بن عوف النصری نے اعلانِ جنگ کیا۔ خود ان کے قبیلے ہوازن کے ساتھ پورے قبیلہ ثقیف اور قبائل "نصر و جشم" اور سعد بن بکر نے ان کی آواز پر لبیک کہا۔ کعب اور کلاب نے ان کی حمایت نہیں کی۔ سب نے مل کر صف آرائی کر کے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف پیش قدمی کا پروگرام بنایا اور مال و متاع، عورتیں اور بچے لشکر کے ساتھ رکھے تاکہ گھر والوں کی عزت و ناموس کے خیال سے وہ پامردی سے مقابلہ کریں اور راہ فرار اختیار نہ کر سکیں۔

اس معرکہ میں دُرید بن الصمۃ بھی شریک تھا جو ایک سن رسیدہ اور تجربہ کار شخص تھا اور بہت عقلمند اور صائب الرائے سمجھا جاتا تھا۔ ان کا لشکر اوطاس[1] میں آتا۔ حالت یہ تھی کہ اونٹوں کی بلبلاہٹ گدھوں بچھڑوں کی چیخ پکار، بکریوں کے ممیانے اور بچوں کے رونے چلانے سے لشکر کے اندر ایک شور برپا تھا۔ مالک بن عوف (سردارِ قبیلہ) نے اپنے سپاہیوں کو ہدایت کی کہ تم مسلمانوں کو دیکھنا تو اپنی تلواروں کے نیام توڑ دینا اور ایک ساتھ پوری طاقت سے حملہ کرنا۔[2]

دوسری طرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ کے دو ہزار مسلمان تھے جن میں سے کچھ لوگ نئے نئے اسلام لائے تھے کچھ لوگوں کے ابھی اسلام قبول کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس کے علاوہ آپ کے اصحاب کرامؓ اور فدائیانِ اسلام کی

---

[1] قبیلہ ہوازن کے علاقہ میں طائف کے نزدیک ایک مقام ہے جہاں غزوہ حنین پیش آیا۔

[2] سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۴۳۷۔۴۴۰

دس ہزار فوج آپ کے ساتھ تھی جو مدینہ سے آپ کے ساتھ نکلے تھے۔ اس طرح ان کی تعداد اب تک کے تمام غزوات سے زیادہ تھی یہ دیکھ کر کچھ مسلمان کہنے لگے کہ آج ہم قلتِ تعداد کی وجہ سے شکست نہیں کھا سکتے کثرتِ تعداد پر ان کو ایک طرح کا نازسا ہوگیا۔[1]

اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان بن اُمیہ سے (با وجود اس کے کہ وہ مشرکین ہی سے تھے) کچھ زرہیں اور ہتھیار وغیرہ مستعار لئے اور ہوازن کے معرکہ کی نیت سے تشریف لے چلے۔[2]

اب بت پرستی واپس نہیں آسکتی خواہ کسی شکل میں ہو!

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس لشکر میں کچھ ایسے افراد بھی تھے جو ابھی ابھی تازہ تازہ جاہلی زندگی کو ترک کرکے اسلام میں داخل ہوئے تھے قصہ یہ تھا کہ عرب میں بعض قبائل کو ایک بڑے اور سرسبز درخت سے جس کا نام "ذات انواط" تھا خاص عقیدت تھی، وہ اس میں اپنے ہتھیار لٹکاتے تھے قربانیاں کرتے تھے اور ایک دن اس کے نیچے قیام کرتے تھے، چنانچہ جب دورانِ سفر یہ درخت انھیں نظر آیا تو جاہلیت کی اُن قدیم رسموں اور باتوں کو یاد کرکے اور ان زیارت گاہوں کو دیکھ کر ان کے منھ میں پانی بھر آیا اور بے ساختہ کہنے لگے یا رسول اللہ! جیسا ان لوگوں کا "ذات انواط" تھا ویسا ہی ایک ہمارے لئے بھی مرکزِ عقیدت تجویز فرما دیجئے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] تفسیر طبری ج ۱۰ ص ۱۲-۱۳ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۴۰

یہ سن کر فرمایا اللہ اکبر! اس کی قسم جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے تم نے مجھ سے ایسی فرمائش کی ہے جیسے موسیٰ کی قوم (یہود) نے موسیٰ سے کی تھی اور کہا تھا: اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۚ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ[1] (آپ ہمارے لیے بھی ایک معبود بنا دیجیے جیسے ان کے بہت سے معبود ہیں، انھوں نے جواب دیا کہ تم بڑی جہالت کی باتیں کرنے والی قوم ہو) پھر آپ نے فرمایا: بے شک تم اپنی پیشرو قوموں کی ایک ایک بات اور طریقہ کی پیروی کرو گے۔[2]

وادی حُنین میں

جب مسلمان وادی حُنین میں پہونچے تو شوال کی دسویں تاریخ (۸ھ) تھی، انھوں نے صبح کے دھندلکے میں نشیب کی طرف اترنا شروع کیا، ہوازن ان سے پہلے اس وادی میں پہونچ چکے تھے اور اس کی گھاٹیوں، تنگ راستوں اور آڑوں میں کمین گاہیں اور مورچے بنا لیے تھے، مسلمانوں کو صرف اتنا نظر آیا کہ انھوں نے ان کو اپنے تیروں پر رکھ لیا ہے اور تلواریں بے نیام ہیں، انھوں نے ایک ساتھ اور ایک وقت میں بھرپور حملہ کیا، وہ مانے ہوئے تیرانداز تھے۔[3]

اکثر مسلمان اس اچانک حملے سے گھبرا کر پیچھے کی طرف پلٹے کوئی کسی کو دیکھتا نہ تھا کہ وہ کہاں ہے، یہ ایک خطرناک اور فیصلہ کن لمحہ تھا اور قریب تھا کہ جنگ کا پانسہ مسلمانوں کے خلاف پلٹ جائے، پھر اس کے بعد ان کو سنبھلنے اور اپنا مرکز قائم رکھنے کی بھی گنجائش

---

[1] سورۃ الاعراف - ۱۳۸ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۴۲-۴۴۳، اصل روایت صحاح میں بھی ہے۔

[3] ابن ہشام ص ۴۴۲-۴۴۳ [4] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۴۴

ذریعے یہاں جو کچھ ہوا وہ غزوۂ احد سے بہت مشابہ تھا جب یہ مشہور ہو گیا تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں اور وہاں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے تھے۔

دشمنوں کی شماتت اور ضعیف الایمان لوگوں کی لغزشیں

مکہ کے اکثر لوگ جو آپ کے ہمراہ اس لشکر میں تھے اور جن کے دلوں میں ابھی ایمان تازہ تھا ہزیمت کی یہ شکل دیکھ کر مختلف باتیں کرنے لگے، دلوں کا چھپا ہوا کینہ اس وقت ان کی زبانوں پر آگیا، انھوں نے کہا اب سمندر سے ادھر ان کی ہزیمت کا سلسلہ ختم نہ ہوگا بعض لوگ کہنے لگے آج ان کا جادو ٹوٹ گیا۔[1]

فتح اور سکینت

مسلمانوں کو جس قدر تادیب اور تنبیہ اللہ تعالےٰ کو منظور تھی وہ ہو گئی اور کثرت تعداد پر خوش ہونے کی وجہ سے اللہ تعالےٰ نے ان کو فتح کی حلاوت کے بعد پھر شکست کی تلخی کا مزہ بھی چکھا یا تاکہ ان کا ایمان مضبوط ہو اور فتح سے ان کے اندر کوئی اترا ہٹ اور ہزیمت سے کسی قسم کی مایوسی پیدا نہ ہو تو فاتح پھر ان کو حملہ کی پوزیشن میں پہونچا دیا، اور اپنے رسول اور تمام مسلمانوں پر ایک قسم کی سکینت نازل فرمائی جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس وقت اپنے سفید رنگ خچر (شہباء) پر اپنی جگہ اسی طرح بے خوف و بے تردد تشریف فرما تھے آپ کے ساتھ مہاجرین و انصار اور اہل بیت کے بہت کم افراد باقی رہ گئے تھے، عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص۴۴۳ـ۴۴۴ اختصار کے ساتھ۔

آپ کے خچر کی لگام تھامے تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے جاتے تھے۔

انا النبی لا کذب ـــــــــ انا ابن عبد المطلب

میں پیغمبر صادق ہوں ـــــــــ میں فرزند عبد المطلب ہوں

اس حالت میں جب مشرکین کے دستے آپ کے سامنے آئے تو آپ نے ایک مٹھی مٹی لے کر دشمنوں کی آنکھوں ایسی دور تک اس طرح پھینک دی کہ وہ ان کی آنکھوں میں بھر گئی۔

جب آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ہر شخص اپنی فکر میں ہے تو ارشاد ہوا کہ عباس بہ آواز بلند پکارو یا معشر الانصار یا اصحاب السمرۃ "(اے انصار اے ببول[2] کے درخت والو) انھوں نے سنتے ہی کہا لبیک لبیک! ان کی آواز بہت بلند تھی جب ان کی آواز کسی آدمی تک پہنچتی تو وہ اسی وقت اپنے اونٹ سے کود پڑتا اور اپنی تلوار اور ڈھال لے کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو جاتا جب ایک جماعت اس طرح تیار ہو گئی تو انھوں نے کفار سے مقابلہ شروع کر دیا اور دونوں فریق گتھ گئے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے دستے کے ساتھ بلندی پر تشریف لائے آپ نے دیکھا کہ دونوں فریق برسر پیکار ہیں یہ منظر دیکھ کر آپ نے فرمایا اب تنور گرم ہو گیا ہے (زور کا رن پڑا ہے[3]) اس کے بعد آپ نے کچھ کنکریاں لے کر کفار کی طرف پھینک دیں عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں برابر دیکھتا رہا کہ دشمن کی تیزی ماند پڑ رہی ہے اور وہ پسپا ہوتے نظر آ رہے ہیں۔[4]

---

[1] صحیح بخاری (باب قولہ تعالیٰ اذ اعجبتکم کثرتکم) اس روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ ابو سفیان بن الحارث آپ کے سفید خچر کی باگ تھامے ہوئے تھے یہ روایت صحیح مسلم باب غزوہ حنین میں بھی ہے [2] اس سے مراد وہ درخت ہے جس کے نیچے حدیبیہ میں بیعت رضوان کی تھی عربی میں ببول کے درخت کو سمرہ کہتے ہیں اس لئے صحابہ کیلئے سمرہ کا لقب بن گیا۔ [3] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۴۳ حمی الوطیس تنور گرم ہو گیا ہے اس معنی پر اس عربی محاورہ کا استعمال سب سے پہلے آپ کی زبان مبارک سے ہوا ہے [4] صحیح مسلم

دونوں فریق اچھی طرح لڑے اور ابھی شکست کھا کر لوگ پوری طرح واپس بھی نہیں ہوئے تھے کہ ان کے قیدی جن کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں حاضر نظر آئے اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت کے فرشتے نازل فرمائے اور پوری وادی ان سے بھر گئی[2] اس طرح ہوازن کی شکست اتمام تک پہونچی۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ	خدا نے بہت سے موقعوں پر تم کو مدد دی ہے
كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ	اور جنگ حنین کے دن جب کہ تم کو اپنی
كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا	جماعت کی کثرت پر غرہ تھا تو وہ
وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا	تمہارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین
رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ	باوجود (اتنی بڑی) فراخی کے تم پر تنگ
ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى	ہو گئی پھر تم پیٹھ پھیر کر پھر گئے پھر خدا نے
رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ	اپنے پیغمبر پر اور مومنوں پر اپنی طرف سے
وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا	تسکین نازل فرمائی اور (تمہاری مدد
وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ وَذٰلِكَ	کو فرشتے) لشکر جو تمہیں نظر نہیں
جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝	آتے تھے (آسمان سے) اتارے اور کافروں
(سورۃ التوبہ ۔ ۲۵ ۔ ۲۶)	کو عذاب دیا اور کفر کرنے والوں کی یہی سزا ہے

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف آخری جنگ

عربوں کے سینہ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو آگ سلگ رہی تھی وہ

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۴۵   [2] ایضاً ص ۴۴۹ صحیح مسلم میں کتاب الجہاد والسیر کے تحت غزوۂ حنین کے باب میں یہ واقعہ بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔

غزوۂ حنین کے بعد ٹھنڈی پڑ گئی اس لئے کہ اس لڑائی نے ان کی باقی ماندہ طاقت بھی ختم کر دی اور ان کے ترکش کے سارے تیر بیکار کر دیئے ان کی جمعیت ذلیل اور پراگندہ ہو گئی اور ان کے دل قبولِ اسلام کے لئے کھل گئے۔

اوطاس میں

ہوازن کی شکست کے بعد ان کے ایک گروہ نے جس میں سردارِ قبیلہ مالک بن عوف بھی تھا طائف میں جا کر پناہ لی اور وہاں اپنے کو قلعہ بند کر لیا ایک دوسرے دستہ نے چل کر "اوطاس" میں پڑاؤ ڈال دیا، ان کے تعاقب کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ ابو عامر الاشعری کی سرکردگی میں روانہ فرمایا جس نے ان سے جہاد کیا اور ان کو شکست دی[1] حنین کا مالِ غنیمت اور باندیاں وغیرہ آپ کے پاس پہونچیں تو آپ نے ان سب کو جعرانہ[2] بھجوا دیا اور ان کو وہاں حفاظت و حراست میں کر دیا گیا[3]

غلاموں اور باندیوں کی تعداد چھ ہزار تھی اونٹ چوبیس ہزار بکریاں چالیس ہزار سے زیادہ اس کے علاوہ چار ہزار اوقیہ چاندی اس میں شامل تھی یہ سب سے بڑا مالِ غنیمت تھا جو اب تک مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ حنین میں اپنے اصحابِ کرام اور رفقاء نے جہاد کو یہ حکم صادر فرمادیا کہ کسی بچہ عورت، مرد یا غلام پر جو کام کاج کے لئے ہو ہاتھ نہ اٹھایا جائے آپ نے ایک عورت کے قتل پر جو حنین میں ماری گئی تاسف کا اظہار فرمایا[4]

---

[1] ابن کثیر ج ۳ ص ۳۵۳   [2] جعرانہ مکہ معظمہ سے شمال مشرق طائف کے راستہ پر ایک اہم منزل ہے۔

[3] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۵۹   [4] سیرت ابن کثیر ج ۳ ص ۳۲۸

غزوۂ طائف

(شوال ۸ھ)

ثقیف کے باقی ماندہ دستے

ثقیف کے باقی ماندہ دستے طائف چلے آئے اور یہاں آکر شہر کے دروازے بند کر لئے قلعہ کے اندر انھوں نے ایک سال کے غلہ کا انتظام کر لیا اور جنگ کے لئے تیار ہو گئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کی سرکوبی کے ارادہ سے طائف کی طرف تشریف لے چلے اور اس کے قریب پہونچ کر پڑاؤ ڈالا لیکن مسلمان اس میں داخل نہ ہو سکے اس لئے کہ تمام دروازے پہلے ہی سے بند کر لئے گئے تھے، ثقیف نے مسلمانوں پر سخت تیر اندازی شروع کی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تیر نہیں ٹڈیوں کا لشکر ان پر ٹوٹ پڑا ہے ثقیف کے لوگ اچھے تیر انداز سمجھے جاتے تھے۔

طائف کا محاصرہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر لشکر کو دوسری طرف منتقل کر دیا اور کوئی پچیس چھبیس دن تک ان کا محاصرہ رکھا، اس درمیان میں ان سے سخت لڑائی ہوتی رہی اور دونوں طرف سے خوب تیر اندازی ہوئی، اس محاصرہ میں

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پہلی بار منجنیق (ایک قسم کی توپ) استعمال کی۔ محاصرہ بہت سخت تھا مسلمانوں کے کئی آدمی کفار کے تیروں سے شہید ہوگئے۔

میدانِ جنگ میں رحم دلی

جب محاصرہ اور جنگ نے طول کھینچا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ثقیف کے انگور کے باغات کاٹ ڈالنے کا حکم دیا، انہی باغات پر ان کی معیشت کا سارا دارومدار تھا، لوگوں نے ان کو کاٹنا شروع کیا تو انھوں نے آپ سے درخواست کی اللہ کے لئے اور رشتہ کا خیال کر کے ان باغات کو چھوڑ دیں، آپ نے فرمایا بے شک میں اس کو اللہ کے لئے اور رشتہ کی بنیاد پر چھوڑتا ہوں۔

پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ منادی کروادی کہ جو غلام قلعے سے اتر کر ہمارے پاس آجائے گا وہ آزاد ہے چنانچہ بیس کے قریب سے کچھ اوپر آدمی نکل آئے ان میں ابوبکرہ بھی تھے جو حدیث کے ایک بڑے راوی اور عالم صحابی ہیں آپ نے ان سب کو آزاد فرمایا اور ہر آدمی کو ایک مسلمان کے حوالے کیا اور اس کے کھانے پینے کی ذمہ داری اس پر ڈال دی یہ بات طائف والوں کو بہت گراں گذری[۳]۔

محاصرہ کا خاتمہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو طائف فتح کرنے کا حکم اللہ تعالےٰ کی طرف سے

---

[۱] سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۴۸۳-۴۸۳ باختصار [۲] شاید قبیلہ بنی سعد کی طرف اشارہ ہو جس میں آپ نے اپنی رضاعت کے دن گذارے تھے [۳] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۹۷ بہ روایت ابن اسحاق۔

نصیب ہوا اس لئے آپ نے حضرت عمر کو حکم دیا کہ واپسی کا اعلان کر دیں انھوں نے واپسی کا اعلان کیا تو لوگوں میں بہت شور ہوا اور وہ کہنے لگے کہ ہم بغیر طائف فتح کئے کیسے چلے جائیں؟ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا قتال کے لئے چلو انھوں نے قتال کا آغاز کیا اور اس کے نتیجے میں ان کو سخت چوٹیں پہونچیں پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ ہم کل صبح انشاء اللہ واپس چلیں گے مسلمان یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور سفر کی تیاری کر کے روانہ ہونے لگے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ منظر دیکھ کر ہنسنے لگے[1]

حُنین کے باندی غلام اور مالِ غنیمت

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جعرانہ میں قیام کیا اور ہوازن کو اس کا موقع دیا کہ دس دن کے اندر اسلام قبول کر لیں اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوں پھر آپ نے مالِ غنیمت کو تقسیم فرمانا شروع کیا اور مؤلفۃ القلوب (یعنی وہ لوگ جن کی دلداری اور تالیف قلب کے لئے حصہ دیا جاتا تھا) کا حق سب سے پہلے آپ نے عنایت فرمایا ابو سفیان اور ان کے دونوں بیٹوں یزید و معاویہ کو آپ نے دل کھول کر عنایت فرمایا، حکیم بن الحزام، نضر بن الحارث، علاء بن الحارثہ اور ان کے علاوہ سرداران قریش کو بھی بہت فیاضی کے ساتھ اور کثیر مقدار میں عطا فرمایا پھر آپ نے

---

[1] حوالہ سابق ـــ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بھی یہ واقعہ تھوڑے سے فرق و اضافہ کے ساتھ آیا ہے ہنسنے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ کل جب واپسی کے لئے کہا گیا تھا تو لوگوں کو تردد ہوا اب جب زخم ہو چکے تو خوشی خوشی تیار ہو گئے، آپ کو فطرت انسانی کی اس نیرنگی پر ہنسی آئی۔

عام مالِ غنیمت منگوایا اور تمام لوگوں کو طلب فرما کر ان میں اس کو تقسیم کر دیا۔[1]

انصار کی محبت اور ان کا ایثار

اس تقسیم پر جس میں قریش کے سرداروں اور مؤلفۃ القلوب کا بہت بڑا حصہ تھا اور انصار کا بہت معمولی کچھ انصاری نوجوانوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر انصار کو ایک احاطہ میں جمع کیا اور ان کے سامنے ایک ایسا مؤثر اور رقت آمیز خطبہ دیا کہ ان کے دل کے تار جھنجھنا اٹھے آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور محبت و شوق کا ایک چشمہ ان کے دلوں میں اُبل پڑا۔

آپ نے فرمایا "کیا میں تمھارے پاس اس حالت میں نہیں آیا تھا کہ تم سب گمراہ تھے پھر میرے ذریعہ اللہ تعالےٰ نے تمھیں ہدایت نصیب فرمائی، تم غریب اور مفلس تھے، اللہ تعالےٰ نے میرے ذریعہ تمھیں دولتمند کیا، تم سب ایک دوسرے کے دشمن تھے اللہ تعالےٰ نے تمھارے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا؟"

ان سب نے جواب دیا" اللہ اور اس کے رسول کا فضل و احسان سب سے زیادہ ہے" جب وہ خاموش ہوئے آپ نے فرمایا۔

اے انصار! کیا تم مجھے اس سوال کا جواب دو گے؟

انھوں نے کہا "یا رسول اللہ ہم اس بات کا آپ کو کیا جواب دے سکتے ہیں! سارا فضل و احسان اللہ اور اس کے رسول کا ہے؟"

آپ نے فرمایا "نہیں، خدا کی قسم اگر تم چاہو تو کہہ سکتے ہو اور تم جو کہو گے سچ ہو گا

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۴۴ اختصار کے ساتھ۔

اور میں اس کی تائید کروں گا کہ آپ ہمارے پاس اس حالت میں آئے کہ آپ کو جھٹلایا جا چکا تھا، اس وقت ہم نے آپ کی تصدیق کی اور آپ کو سچا تسلیم کیا، سب نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا ہم نے آپ کی مدد کی آپ کو لوگوں نے بے خانماں کر دیا تھا ہم نے آپ کو پناہ دی آپ کا ہاتھ خالی تھا ہم نے آپ کے ساتھ ہمدردی اور آپ کی تسلی و غمخواری کی۔"

پھر آپ نے ان کی طرف رخ کر کے ایک ایسی بات فرمائی جس میں ناز و اعتماد بھی تھا، اور اس تقسیم و عطا کے فرق کی حکمت بھی بیان کر دی گئی تھی۔

آپ نے فرمایا "اے جماعت انصار! کیا دنیا کی چند روزہ سرسبزی و شادابی کے لئے جو میں نے ان کی تالیفِ قلب کے لئے انھیں دی ہے تاکہ وہ اس کی وجہ سے اسلام پر ثابت قدم رہیں اور تمھیں تمھارے اسلام کے اعتماد پر چھوڑ دیا تھا، تمھارے دل کے اندر میرے بارے میں کچھ خیال آتا ہے۔"

پھر اس کے بعد آپ نے ان سے ایک ایسی بات کہی جس کو سن کر وہ اپنے قابو میں نہیں رہے اور ایمانی محبت کے سوتے ان کے دلوں میں بے ساختہ پھوٹ پڑے۔
آپ نے فرمایا:۔

"اے جماعت انصار! کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ لوگ اپنے ساتھ بھیڑ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم اپنے خیموں میں اللہ کے رسول کو ساتھ لے کر جاؤ (صلے اللہ علیہ وسلم) قسم اس کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے تم جس چیز کو اپنے ساتھ لے جاؤ گے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو وہ لے کر جائیں گے اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار ہی کا ایک فرد ہوتا اگر لوگ کسی ایک راستہ اور وادی میں چلتے اور انصار کسی دوسری وادی میں تو میں انصار

اسی کی وادی میں چلوں گا۔ انصار تو شعار (استر) ہیں (وہ کپڑا جو جسم پر براہ راست ہوتا ہے) دوسرے لوگ دثار ہیں (یعنی وہ کپڑے جو اوپر ہوتے ہیں اور جسم سے مس نہیں کرتے) اے اللہ انصار پر رحم فرما۔ انصار کی اولاد پر رحم فرما اور انصار کی اولاد کی اولاد پر رحم فرما۔"

یہ سن کر تمام انصار بے ساختہ رو پڑے اور ان کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں وہ کہنے لگے ہم اس پر راضی اور خوش ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے حصہ اور نصیب میں آئیں۔[1]

قیدیوں کی واپسی

ہوازن کا ایک وفد جو چودہ آدمیوں پر مشتمل تھا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے آکر ملا اور آپ سے درخواست کی کہ ازراہ احسان آپ ان قیدیوں اور مال اسباب کو انھیں واپس فرما دیں آپ نے فرمایا کہ تم دیکھ رہے ہو کہ میرے ساتھ کون کون ہیں؟ مجھے سب سے زیادہ وہ بات پسند ہے جو سچی ہو اب یہ بتاؤ کہ تمھاری اولاد اور تمھاری عورتیں تمھیں زیادہ محبوب ہیں یا تمھارا مال و اسباب؟

انھوں نے جواب دیا کہ ہم اپنی اولاد اور اپنی عورتوں کے برابر کسی چیز کو نہیں سمجھتے آپ نے فرمایا "کل صبح کی نماز کے بعد تم لوگ کھڑے ہو کر یہ کہنا کہ ہم مسلمانوں کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سفارشی بناتے ہیں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے مسلمانوں کو سفارشی بنا کر پیش کرتے ہیں کہ آپ ہمارے غلام باندی

---

[1] اصل روایت صحیحین میں ہے صاحب زاد المعاد نے اس روایت کو زیادہ جامع اور مفصل سیاق میں بیان کیا ہے اور ہم نے اسی کو نقل کر دیا ہے، دیکھئے صحیح بخاری باب غزوۃ الطائف۔

واپس فرما دیں۔ جب آپ نے نماز صبح سے فراغت کی تو انھوں نے کھڑے ہو کر ایسا ہی کہا اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے حصہ اور بنی عبد المطلب کے حصہ میں جو کچھ ہے وہ تمہارے حوالے ہے دوسرے لوگوں سے میں تمہارے لئے سفارش کرتا ہوں اس پر مہاجرین و انصار نے کہا ہمارے حصہ کا جو کچھ ہے وہ سب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہے۔

بنی تمیم، بنی فزارہ اور بنی سُلیم کے تین آدمی اپنے حصہ سے دستبردار ہونے پر تیار نہیں ہوئے تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ یہ لوگ مسلمان ہو کر آئے ہیں میں نے ان کا انتظار بھی کیا اور ان کو اختیار دیا لیکن انھوں نے اپنی اولاد اور بیویوں کے برابر کسی اور چیز کو قرار نہیں دیا اس لئے اگر کسی کے پاس ایسے قیدی ہوں اور وہ ان کو خوشدلی سے دینا چاہے تو اس کا راستہ کھلا ہوا ہے اور اگر اپنے حق کو چھوڑنا نہ چاہے تو یہ ان کو دے دے اس شخص کو ہر حصہ کے بدلے میں چھ حصے اس پہلے مال غنیمت سے ملیں گے جو اللہ تعالےٰ ہمیں عنایت فرمائے گا۔

لوگوں نے کہا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خاطر ہم خوشدلی سے حاضر کرتے ہیں آپ نے فرمایا ہمیں معلوم نہیں کہ تم میں سے کون اس پر راضی ہے اور کون راضی نہیں ہے اس وقت تم لوگ واپس جاؤ تمہارے سردار اور چودھری تمہارے صحیح صحیح معاملے سے ہمیں آگاہ کریں غرض سب نے ان کی عورتوں اور بچوں کو واپس کر دیا اور ایک شخص بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں رہا ہر قیدی کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پوشاک بھی عطا فرمائی۔[۱]

---

[۱] زاد المعاد ج ا ص ۴۷۲ صحیح بخاری میں یہ واقعہ قول اللہ تعالیٰ "ویوم حنین اذ اعجبتکم" الآیہ میں الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ آیا ہے۔

نرم دلی اور کریم النفسی

مسلمانوں نے اس ہنگامے میں دوسرے غلاموں باندیوں کے ساتھ جو تعداد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجی ان میں حلیمہ سعدیہ کی لڑکی شیما بھی تھیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن تھیں مسلمان ان سے واقف نہ تھے اس لئے انھوں نے لے جانے میں سختی سے کام لیا۔ انھوں نے مسلمانوں سے کہا کہ خدا کی قسم تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں تمھارے سردار کی دودھ شریک بہن ہوں۔ انھوں نے ان کی بات پر یقین نہیں کیا اور ان کو آپ کی خدمت میں پہونچا دیا۔

جب وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ سے کہا کہ یا رسول اللہ! میں آپ کی رضاعی بہن ہوں۔ آپ نے فرمایا اس کی پہچان کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں! جس وقت میں آپ کو گود میں لئے تھی آپ نے میری پیٹھ میں دانت کاٹ لیا تھا، اس کا نشان موجود ہے۔ آپ نے نشان پہچانا، اپنی چادر مبارک ان کے لئے بچھادی اور ان کو اس پر بٹھایا، اور ان کو اختیار دیتے ہوئے کہا کہ اگر تم چاہو تو بہت محبت اور عزت کے ساتھ میرے ساتھ رہ سکتی ہو، اور اگر چاہو تو میں تحائف و سامان کے ساتھ تم کو رخصت کردوں اور تم اپنے قبیلہ میں پہونچ جاؤ۔ انھوں نے کہا کہ آپ مجھے جو کچھ دینا چاہیں عنایت فرمادیں اور مجھے میری قوم میں بھیج دیں، آپ نے انھیں عطا فرمایا اور انھوں نے اسلام بھی قبول کر لیا۔ آپ نے تین غلام ایک باندی اور کچھ بکریاں انھیں عطا فرمائیں۔[1]

عمرۂ جعرانہ

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم غزوۂ حنین سے فارغ ہوئے اور

---

[1] زاد المعاد ج ۱ : ص ۲۴۹

جعرانہ میں غلاموں اور مالِ غنیمت کی تقسیم کا کام مکمل ہو گیا تو آپؐ نے عمرہ کے لئے احرام باندھ لیا، یہ اہلِ طائف کا میقات تھا، اور مکہ سے ایک منزل پر تھا۔ عمرہ سے فراغت کے بعد آپؐ مدینہ تشریف لائے[1] یہ ماہ ذی قعدہ ۸ھ کا واقعہ ہے۔

اپنی رضا و رغبت سے

جب مسلمان طائف سے واپس آئے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہو "آئبون تائبون عابدون لربنا حامدون"۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ ثقیف کے لئے بددعا کریں۔ آپ نے دعا کی کہ "اے اللہ ثقیف کو ہدایت دے اور ان کو یہاں لا۔"[2]

عروہ بن مسعود ثقفی مدینہ پہونچنے سے قبل راہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملے اور اسلام لائے، اور وہیں سے اسلام کی دعوت دینے کے لئے اپنی قوم میں واپس گئے ان کو اپنی قوم میں بہت قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اور وہ بہت ہر دلعزیز اور محبوب تھے لیکن جب انھوں نے اپنے اسلام کا اعلان کیا اور اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دی تو ان کو تیروں کا نشانہ بنایا گیا، اور انھوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔

ان کے قتل کے بعد ثقیف نے کئی ماہ توقف کیا اور آپس میں مشورہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے کہ موجودہ صورتِ حال میں ان سب عربوں سے لڑنے کی ان میں طاقت نہیں جنھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی ہے اور اسلام کے حلقہ بگوش ہو چکے ہیں چنانچہ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک وفد بھیجنا طے کیا۔

---

[1] ابن ہشام ج ۲ ص [illegible]　[2] صحیح بخاری باب غزوۃ الطائف۔

بُت پرستی کے ساتھ کوئی سمجھوتہ اور رعایت نہیں

یہ لوگ جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے مسجدِ نبوی کے ایک گوشہ میں ان کے لیے خیمہ لگوایا، انھوں نے اسلام قبول کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی کہ ان کے خاص بُت "لات" کو تین سال تک آپ نہ توڑیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار کیا اور وہ برابر ایک ایک سال نیچے اترتے رہے اور آپ انکار فرماتے رہے، آخر بات یہاں تک پہونچی کہ ان کے آنے کے ایک ماہ بعد تک اس کو نقصان نہ پہونچایا جائے، آپ نے انکار فرمایا، اور ابوسفیانؓ اور مغیرہ بن شعبہؓ (جو اسی قبیلہ کے تھے) کو حکم دیا کہ وہ دونوں جاکر اس بُت کو پاش پاش کرڈالیں، پھر انھوں نے درخواست کی کہ نماز سے ان کو معاف کردیا جائے، آپ نے فرمایا "جس دین میں نماز نہ ہو اس میں کوئی خیر نہیں"۔

جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوئے اور اپنے وطن کا رخ کیا تو آپ نے ان کے ساتھ ابوسفیانؓ اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما کو بھی روانہ فرمایا، مغیرہؓ نے بُت شکنی کا فرض انجام دیا، اس کے بعد اسلام ثقیف میں عام ہوگیا، اور اہل طائف کا ایک ایک آدمی اسلام کی نعمت سے سرفراز ہوا۔[1]

کعب بن زُہیر کا قبولِ اسلام

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے واپس تشریف لائے تو آپ کی

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۵۰ تغیر کے ساتھ۔

خدمت میں کعب بن زہیر (جو شاعر بھی تھے اور شاعر زادہ بھی) آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، انھوں نے آپ کی بہت ہجو کی تھی لیکن پھر زمین ان پر تنگ ہوئی اور وہ خود اپنے سے بیزار ہونے لگے تو ان کے بھائی بجیر نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تائب اور نادم ہو کر حاضر ہوں اور اسلام لے آئیں، انھوں نے ان کو ڈرایا کہ اگر ایسا انھوں نے نہ کیا تو ان کا انجام بہت برا ہوگا، اس پر انھوں نے آپ کی مدح و منقبت میں وہ مشہور قصیدہ کہا جو قصیدۂ بانت سعاد کے نام سے مشہور ہے،

غرض وہ مدینہ آئے اور صبح کے وقت جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نماز فجر کے بعد تشریف فرما تھے، خدمت مبارک میں حاضر ہوئے آپ کے قریب بیٹھ گئے اور اپنا ہاتھ آپ کے دست مبارک میں دے دیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کی صورت آشنا نہ تھے، چنانچہ انھوں نے کہا کہ کعب بن زہیر تائب اور مسلمان ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہے اور آپ سے امان کا خواستگار ہے کیا آپ اس کی توبہ قبول کریں گے؟ یہ سن کر ایک انصاری اس کی طرف لپکے اور کہا یا رسول اللہ! مجھے اللہ کے دشمن سے نمٹ لینے دیں، میں اسی وقت اس کی گردن مار دیتا ہوں، آپ نے فرمایا "نہیں رہنے دو وہ توبہ کر کے اور اپنی حرکتوں سے باز ہو کر یہاں آئے ہیں" پھر کعب نے اپنا مشہور قصیدۂ لامیہ پڑھا جس کا مطلع یہ ہے:-

بانت سعاد فقلبی الیوم متبول

متیم اثرها لم یفد مکبول

سعاد جدا ہو گئی میرا دل آج مریض محبت ہے اور اس کے پیچھے پیچھے گرفتار ہے

جیسے کسی پیروں میں بیڑی ڈال دی گئی ہے اور اس کو بدلا کے لئے معاوضہ دیکر بھی نہیں چھڑایا گیا

پھر اس قصیدہ کا مدحیہ شعر پڑھا:۔

ان الرسول لنور یستضاء به

مهند من سیوف الله مسلول

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بلاشبہ ایک نور ہیں جن سے اجالا ہے اور وہ اللہ کی ایک تیز دھار بے نیام تلوار ہیں۔

یہ شعر سن کر آپ نے اپنی چادر مبارک اتار کر ان کو عطا فرمائی۔[1]

---

[1] تاریخ ادب عرب ص ۲۲-۲۸۰

قسطلانی نے مواہب میں ابوبکر بن الانباری کی روایت بیان کی ہے کہ جب وہ اس شعر پر پہونچے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر اتار کر ان پر ڈال دیا۔ یہی وہ چادر ہے جس کو حضرت معاویہ نے دس ہزار دینار میں خریدنا چاہا لیکن انھوں نے جواب دیا کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی چادر کے لئے کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ کعب کے انتقال کے بعد ان کے ورثا سے معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کو بیس ہزار دے کر حاصل کر لیا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہی وہ چادر ہے جو سلاطین اسلام کے پاس ہے۔ ملاحظہ ہو الزرقانی علی المواہب ج ۳ ص

غزوۂ تبوک

(رجب سنہ ۹ھ)

غزوۂ تبوک کا نفسیاتی اثر اور اس کے اسباب

دشمن کے دل میں رعب و ہیبت قائم کرنے اور ان لوگوں کی آنکھیں کھول دینے میں جو یہ سمجھنے لگے تھے کہ اسلام کا شعلہ بھڑک کر عنقریب بجھ جائے گا، یا وہ بادل کے ایک ٹکڑے کی طرح ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے چھٹ جائے گا، غزوۂ تبوک کا وہی اثر پڑا جو فتح مکہ کا پڑا تھا، یہ غزوہ دراصل اس زمانے کی سب سے بڑی طاقت اور سب سے بڑی سلطنت سے ٹکراؤ کے مترادف تھا، جو عربوں کی نگاہ میں بڑی پر ہیبت اور عظیم سلطنت تھی، چنانچہ جب ابوسفیان نے دیکھا کہ رومی شہنشاہ ہرقل نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مکتوب گرامی کو کیا اہمیت دی، اور اس سے وہ کتنا متاثر ہوا تو ان کی زبان

---

[1] تبوک مدینہ منورہ اور دمشق کے درمیان نصف فاصلہ پر ہے اور ایلہ کے جنوب مشرق میں واقع ہے، یاقوت نے معجم البلدان میں ابوزید کے حوالہ سے لکھا ہے کہ تبوک حجر اور شام کی سرحد کے درمیان حجر سے چار منزل پر واقع ہے کہا جاتا ہے کہ اصحاب الایکہ جن میں حضرت شعیب علیہ السلام کی بعثت ہوئی تھی یہیں آباد تھے آجکل تبوک بحر قلزم سے چھ منزل کے فاصلہ پر ہے جبل لوز اور شروری دو پہاڑوں کے درمیان واقع ہے (دائرۃ المعارف للبستانی باختصار) اس وقت یہ ایک اہم سعودی چھاؤنی ہے جو مدینہ کے انتظامیہ امارت کے ماتحت ہے جس کا فاصلہ مدینہ سے سات سو کلو میٹر ہے

یہ فقرہ نکلا (اور جس کو پڑھ کر ہرقل نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ جزیرۃ العرب ہی میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہونے والا ہے) "محمد بن عبداللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کا معاملہ تو زور پکڑ گیا ان سے بنو الاصفر (رومیوں) کا بادشاہ بھی ڈرنے لگا، وہ کہتے ہیں کہ جب سے مجھے برابر یقین رہا کہ وہ غالب آئیں گے یہاں تک کہ اللہ نے میرے دل میں اسلام ڈالا۔"

عرب اس زمانہ میں رومیوں سے جنگ اور ان پر حملہ آور ہونے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے بلکہ ان کو خود اندیشہ تھا کہ کہیں انھیں کی طرف سے ان پر حملہ نہ ہو جائے اور صحیح بات یہ ہے کہ وہ اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے تھے کہ کوئی ان کی طرف توجہ کرے اور ان کو اپنا نشانہ بنائے، مدینہ کے مسلمانوں پر جب کوئی ناگہانی آفت آتی اور کوئی بڑا خطرہ درپیش ہوتا تو ان کا ذہن زیادہ سے زیادہ غسان کی عیسائی عرب ریاست کی طرف منتقل ہوتا تھا جو رومی شہنشاہ قیصر کے ماتحت تھی۔

واقعہ ایلاء میں جو صورت حال پیش آیا تھا حضرت عمرؓ کے الفاظ سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میرے ایک انصاری دوست تھے جب میں غیر حاضر ہوتا تو وہ مجھے روداد سناتے جب وہ غیر حاضر ہوتے تو میں ان کو خبریں پہنچاتا، اس زمانے میں ہم لوگ غسان کے ایک بادشاہ سے بہت خوف زدہ تھے جس کے متعلق یہ چرچا تھا کہ اس کا ارادہ ہم پر حملہ کرنے کا ہے ہمارے دل میں ہر وقت اسی کا خیال رہتا تھا اسی اثناء میں میرے انصاری دوست آئے اور انھوں نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا اور

له ابوسفیان نے آپ کے لیے ابن ابی کبشہ کا لفظ طنزاً استعمال کیا تھا، ابوکبشہ کے متعلق دو قول ہیں، ایک یہ کہ خزاعہ کا کوئی شخص تھا جس نے [illegible] بت پرستی چھوڑ دی تھی، دوسرے یہ کہ آپ کے اجداد مادری میں کوئی اس نام کا گذرا ہے (مجمع بحار الانوار)

کہنے لگے "کھولو، کھولو۔" میں نے کہا کیا غسانی نے حملہ کر دیا؟ [1]

اس وقت رومی سلطنت کا اقبال بام عروج پر تھا۔ اس کی فوجوں نے ہرقل کی لیڈرشپ میں ایرانی فوجوں کو تہس نہس کر دیا تھا اور ایرانی مملکت میں اندر تک گھس گئیں تھیں۔ چنانچہ اس زبردست اور غیر معمولی فتح کی خوشی میں اور اس کے شکرانے کے طور پر ہرقل نے حمص سے ایلیا تک ایک زبردست فاتح کی حیثیت سے شاندار جلوس میں سفر کیا۔ یہ ہجرت کے ساتویں سال کا واقعہ ہے۔ ہرقل اس وقت اس صلیب کو اٹھائے ہوئے تھا جو اس نے ایرانیوں سے حاصل کی تھی۔ سارا راستہ قالین، غالیچوں اور فرش و فروش سے آراستہ تھا۔ ہر طرف گل پاشی ہو رہی تھی۔ اور وہ اس فرش پر چل رہا تھا۔ اس شاندار فتح پر دو سال بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے رومیوں کے مقابلے کے لئے روانہ ہوئے۔ اس غزوہ کے ذریعہ جس کا عربوں کے دل و دماغ پر گہرا نقش تھا، اللہ تعالےٰ نے شام پر حملہ کا راستہ ہموار کر دیا، جو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں فتح ہوا، لیکن اس کی بنیاد اسی غزوہ میں پڑ چکی تھی۔

یہ غزوہ کیسے پیش آیا؟ اس کے بارے میں یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ رومی عرب کی شمالی سرحدوں پر حملہ کی تیاری کر رہے ہیں۔ ابن سعد اور ان کے شیخ واقدی راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبطیوں سے یہ خبر ملی کہ ہرقل نے اپنے سپاہیوں کی ایک سال کی خوراک کا انتظام کر لیا ہے، اور ان کے ساتھ لخم، جذام، عاملہ اور غسان اور نیز عرب کے اور قبائل کو

---

[1] بخاری نے یہ واقعہ سورۂ تحریم کی تفسیر میں، اور مسلم نے کتاب الطلاق باب ایلاء اور اعتزال النساء وتخییرهن میں (الفاظ ان کے ہیں) نقل کیا ہے۔ صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر، باب کتب النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی ہرقل ملک الشام یدعوه الی الاسلام

شامل کر لیا ہے اور ان کے دستے بلقاء تک پہونچ بھی چکے تھے۔[1]

اس روایت سے قطع نظر کر کے بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس غزوہ کا اصل مقصد پڑوسی حکومت کو خوف زدہ کرنا تھا جس سے مرکز اسلام اور اسلام کی بڑھتی ہوئی اور ابھرتی ہوئی دعوت اور اس کی روز افزوں قوت و طاقت کو نقصان پہونچ جانے کا اندیشہ تھا، اس غزوہ کے ذریعہ اس حکومت کو یہ آگاہی دینی تھی کہ وہ مسلمانوں پر ان کی سرزمین کے اندر حملہ کرنے کی جرأت نہ کرے، اور ان کو تقریباً لقمۂ تر یا مال مفت نہ سمجھے، جس شخص کا یہ حال ہو وہ اتنی عظیم شہنشاہی پر حملہ نہیں کر سکتا، اور نہ اس کی سرحد میں داخل ہو کر اس کے لئے کوئی چیلنج یا خطرہ بن سکتا ہے، اس کی پشت پر وہی حکمت کارفرما تھی جس کا ذکر قرآن مجید نے غزوۂ تبوک کے سلسلہ میں کیا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا	مسلمانو! ان کافروں سے جنگ کرو
الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ	جو تمہارے آس پاس بسے ہوئے
وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً	ہیں اور چاہئے کہ وہ جنگ میں تمہاری
وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ	سختی محسوس کریں اور جان رکھو کر
(سورۂ توبہ - ۱۲۳)	خدا پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔

یہ مقصد اس غزوہ سے پیدا ہو گیا، رومیوں نے اس کا جواب کسی جوابی حملہ اور جیش قدمی یا فوجی نقل و حرکت اور سرگرمی سے نہیں دیا، بلکہ انھوں نے اس کھلے ہوئے چیلنج کے مقابلہ میں ایک طرح کی پسپائی اور خاموشی اختیار کر لی اور اس پوشیدہ طاقت کا جتنا اندازہ انھیں اس وقت ہوا اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

---

[1] الزرقانی علی المواہب ج ۳ ص ۶۳-۶۲

دوسرا فائدہ جو اس جرأت مندانہ غزوہ (جس میں پورا خطرہ مول لیا گیا تھا) سے حاصل ہوا وہ یہ تھا کہ وہ جزیرۃ العرب کے ان قبائل نیز ان فاتح اور با اقتدار قبائل (جو رومی شہنشاہ سے متعلق اور اس کے ماتحت تھے) کے دلوں پر پہلا فوری رعب و داب قائم ہو گیا، اور اس کے ذریعہ ان کو یہ موقع ملا کہ وہ دین اسلام کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کریں اور یہ محسوس کریں کہ وہ کوئی پانی کا بلبلہ نہیں ہے جو تھوڑی دیر کے لئے سطح آب پر ابھرتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو جاتا ہے اس کا مستقبل پورے طور پر روشن ہے اور شاید ان تو محسوں کو اس کے ذریعہ اسلام میں داخلہ کا کوئی موقع مل سکے جو خود ان کی سرزمین اور ان کے وطن میں نکلا ہوا ہے ان لوگوں کے ذکر میں جو اس غزوہ میں نکلے تھے قرآن مجید نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَلَا يَطَـُٔونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ	جو قدم بھی وہ دشمن کے خلاف راہ خدا
الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ	میں اٹھاتے ہیں وہ کافروں کے لئے
نَّيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُم بِهِ عَمَلٌ	غیظ و غضب کا باعث اور جو نقصان
صَالِحٌ۔ (سورۂ توبہ۔ ۱۲۰)	بھی وہ کفار کو پہنچاتے ہیں وہ ان کے
	لئے عمل نیک ثابت ہوتا ہے۔

رومیوں کو غزوۂ موتہ ابھی تک اچھی طرح یاد تھا جس میں ان کی پوری تسلی و تشفی نہیں ہو سکی تھی، اور جس میں ہر فریق نے بسلامت واپسی ہی کو غنیمت سمجھا تھا اور اس کی وجہ سے بازنطینی سلطنت اور اس کی زبردست افواج کا جو رعب عربوں کے دل پر تھا وہ بہت کمزور ہو گیا۔

مختصر یہ کہ اس غزوہ کی سیرت نبوی اور دعوت اسلامی کی تاریخ میں خصوصی

اہمیت ہے اور اس سے ان مقاصد کی تکمیل ہوئی جو مسلمانوں اور عربوں کے حق میں بہت دوررس تھے اور جن کا تاریخ اسلام کے تسلسل اور آئندہ پیش آنے والے واقعات پر گہرا اثر پڑا۔

غزوہ کا زمانہ اور وقت

یہ غزوہ رجب سنہ ۹ھ میں پیش آیا[1]، سخت گرمی کے موسم میں جب کھجوریں پک گئی تھیں اور سایہ خوشگوار معلوم ہونے لگا تھا آپ نے اس کے لئے بہت طویل سفر کا ارادہ فرمایا چونکہ بے آب و گیاہ میدانوں کو عبور کرنا تھا اور سخت دشمن کا مقابلہ درپیش تھا اس لئے

---

[1] غزوہ تبوک کی اس تاریخ کا تعین شمسی حساب سے بہت دشوار ہے جس میں آپ مدینہ سے تبوک کے لئے روانہ ہوئے، بعض سیرت نگاروں نے اکتوبر کو رجب سنہ ۹ھ کے مطابق قرار دیا ہے، مولوی حبیب الرحمٰن خان صاحب کی جدید "مفتاح التقویم" سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے اسی کو علامہ شبلی نے خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا لیکن اس کے داخلی شواہد اور حدیث صحیح کی تصریحات جو صحیحین اور دوسرے اصحاب صحاح و سنن سے ثابت ہیں ان سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ یہ غزوہ گرمیوں کے زمانے میں ہوا کعب بن مالک کی حدیث میں صاف آیا ہے "وغزاها رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزاها فی حر شدید حین طابت الثمار والظلال" اس سلسلہ میں معیار و میزان یہی ہونا چاہیے اور وقت کی جو تحدید اس سے مطابقت نہ رکھتی ہو اس کو ناقابل اعتبار سمجھنا چاہیے، موسیٰ بن عقبہ نے ابن شہاب زہری سے جو روایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں، "خریف کی راتوں اور سخت گرمی میں جبکہ لوگ نخلستانوں میں رہنا پسند کرتے تھے یہ غزوہ پیش آیا" اس سے زیادہ واضح منافقین کا وہ قول ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ براءۃ میں کیا ہے، اور پھر اس کا رد کیا ہے "وَقَالُوا لَا تَنفِرُوا فِي الْحَرِّ ۗ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا ۚ لَّوْ كَانُوا يَفْقَهُونَ" (اور کہنے لگے کہ گرمی میں مت نکلنا (ان سے) کہہ دو کہ دوزخ کی آگ اس سے کہیں زیادہ گرم ہوگی کاش یہ سمجھتے ہوں۔ التوبہ ۸۱)

آپ نے مسلمانوں کو پہلے ہی آگاہ فرما دیا تھا کہ آپ کو کس رخ پر جانا ہے[1] تاکہ وہ اس کے لئے اچھی طرح تیاری کر لیں یہ زمانہ سخت عسرت اور قحط سالی کا تھا۔

منافقین اس موقع پر مختلف بہانے اور عذر کرکے گھر بیٹھ رہے ان کو طاقتور اور خطرناک دشمن کے خوف، سخت موسم، جہاد سے عدم دلچسپی اور دین حق میں شک و شبہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت و ہمرکابی سے باز رکھا، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُونَ بِمَقْعَدِهِمْ	جو لوگ (غزوۂ تبوک میں) پیچھے رہ گئے
خِلَافَ رَسُولِ اللَّهِ وَكَرِهُوا	وہ پیغمبر خدا (کی مرضی) کے خلاف بیٹھے
أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ	رہنے سے خوش ہوئے اور اس بات کو
وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ	ناپسند کیا کہ (خدا کی راہ) میں اپنے مال
وَقَالُوا لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ ۗ قُلْ	اور جان سے جہاد کریں اور (اوروں سے)
نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا ۚ لَوْ كَانُوا	بھی کہنے لگے کہ گرمی میں مت نکلنا
يَفْقَهُونَ ۝	(ان سے) کہہ دو کہ دوزخ کی آگ اس سے
(سورۃ توبہ - ۸۱)	کہیں زیادہ گرم ہے کاش یہ (اس
	بات کو) سمجھتے۔

جہاد اور روانگی لشکر میں صحابہؓ کا ذوق و شوق اور جذبۂ مسابقت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سفر کی بہت اہتمام سے تیاری فرمائی اور لوگوں کو تیاری کا حکم فرمایا۔ آپ نے اہل ثروت کو راہ خدا میں خرچ کرنے کی ترغیب دی

[1] ماخوذ از حدیث کعب ابن مالک (صحیحین)

چنانچہ دولت مند طبقہ کے بہت سے افراد اس موقع پر سامنے آئے اور انھوں نے بڑے جوش واحتساب کے جذبہ سے اس میں حصہ لیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس پورے لشکر کو جس کو جیش العسرۃ کہا جاتا ہے سامان فراہم کرنے کی ذمہ داری لی اور ایک ہزار دینار اس پر خرچ کئے، ان کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی، بہت سے صحابہ نے جو استطاعت نہ رکھتے تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سواری کی درخواست کی، آپ نے اس کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے ان سے معذرت کر دی، اس محرومی کا ان کو اس درجہ قلق تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اس فریضہ کو ساقط فرما دیا، اور ارشاد ہوا:-

وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنْفِقُونَ. (سورۂ توبہ-۹۲)

اور نہ ان بے سروسامان لوگوں پر (الزام) ہے کہ تمہارے پاس آئے کہ ان کو سواری دو اور تم نے کہا کہ میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جس پر تم کو سوار کروں تو وہ لوٹ گئے اور اس غم سے کہ ان کے پاس خرچ موجود نہ تھا ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے

کچھ مسلمان وہ تھے جن کو بغیر کسی شبہ یا تردد کے صرف عزم وارادہ کرنے میں دیر لگی اور وہ اس غزوہ میں شریک نہ ہو سکے۔

لشکر اسلام کی تبوک کی طرف روانگی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تیس ہزار مجاہدین کے ساتھ مدینہ سے تبوک کے لئے

روانہ ہوئے اس سے پہلے کسی غزوہ میں اتنی بڑی تعداد شریک نہ تھی آپ نے
ثنیۃ الوداع میں لشکر کو پڑاؤ ڈالنے کی ہدایت کی اور محمد بن مسلمہ الانصاریؓ کو مدینہ کا
حاکم مقرر کیا اہل بیت کے لئے حضرت علیؓ کو مقرر فرمایا اور جب انھوں نے منافقین
کی افواہوں اور چہ میگوئیوں کا آپ سے ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی نہیں کہ تم
میرے لئے ایسے ہو جیسے موسیٰ کے ساتھ ہارون تھے ہاں یہ بات ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا[۱]
آپ اس لشکر کے ساتھ حِجر[۲] اور قوم ثمود کی سرزمین پر اترے اور صحابہ کرامؓ
سے فرمایا کہ یہ ان کی سرزمین ہے جن پر عذاب نازل ہوا ہے آپ نے فرمایا کہ "جب
ان لوگوں کے مکانات میں جنھوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا داخل ہو تو روتے ہوئے داخل ہو
اس ڈر سے کہ کہیں تم کو بھی وہ مصیبت نہ آئے جو ان پر آئی تھی آپ نے یہ بھی فرمایا کہ
یہاں کا پانی نہ پینا اور نہ نماز کے لئے اس پانی سے وضو کرنا اگر آٹا تم نے اس پانی سے
گوندھ لیا ہو تو اسے اونٹوں کو کھلا دو اور خود اس میں سے ذرا سا بھی نہ کھاؤ"[۳]
جب لوگوں کو پانی کی بہت تنگی ہوئی تو انھوں نے آپ سے اس کی شکایت کی
اور اپنی دشواری بیان کی آپ نے دعا فرمائی اور اس دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے بادل
بھیجا اور اس قدر بارش ہوئی کہ لوگ سیراب ہو گئے اور اپنی ضرورت کا پانی اکٹھا بھی کر لیا۔[۴]

رومیوں سے عربوں کا خوف

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تبوک تشریف لے جا رہے تھے تو کچھ منافقین

---

۱ صحیح بخاری باب (غزوۂ تبوک) ۲ زاد المعاد ج ۲ ص ۲ و سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۵۲۲
[illegible] اس کے ہم معنی [illegible] ہیں۔ ۳ سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۵۲۲

آپ کی طرف اشارہ کر کے ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ بنی الاصفر یعنی رومیوں کی جنگ اتنی ہی آسان ہے جتنی کہ اپنے ملک کے عرب قبائل سے خدا کی قسم ہم دیکھ رہے ہیں کہ کل یہ سب رسیوں سے جکڑے پڑے ہوں گے[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور ایلہ کے حاکم میں صلح

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تبوک پہونچ گئے تو ایلہ کا حاکم یوحنّہ بن روبہ جو سرحدی علاقوں کے حکام میں سے تھا، آپ کی خدمت میں آیا اور آپ سے صلح کر لی اور جزیہ آپ کو پیش کر دیا۔ جربا، اوراذرح کے لوگ بھی آئے اور آپ نے ان کو امان کی تحریر لکھدی جس میں حدود کی ذمہ داری پانی اور بری و بحری راستوں کی حفاظت اور فریقین کی سلامتی کی ضمانت دی گئی تھی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کا اکرام بھی فرمایا[2]۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مدینہ طیبہ واپسی

اس موقع پر رومیوں کی پسپائی اور سرحد پار کر کے فوج کشی کا خیال ترک کر دینے کی اطلاع رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پہونچی اور آپ نے بھی اس کو مناسب نہیں سمجھا کہ ان کے ملک میں گھس کر ان کا تعاقب کیا جائے اس غزوہ سے جس مقصد کا حصول پیش نظر تھا وہ حاصل ہو چکا تھا، البتہ آپ نے اکیدر بن عبدالملک الکندی نصرانی

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۵۲۴-۵۲۵

[2] ایضاً صفحہ ۵۲۵-۵۲۶

نے جو دومۃ الجندل کا حاکم[1] اور رومی فوجوں کا پشت پناہ تھا، اس کی طرف سے
حملہ کی ضرور اطلاع ملی۔ آپ نے اس کی سرکوبی کے لئے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو
پانچ سو سواروں کے ساتھ روانہ فرمایا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس کو گرفتار کر کے آپ کی
خدمت میں بھیجا۔ آپ نے اس کا خون معاف کیا اور جزیہ پر اس سے مصالحت کر لی
اور اس کو آزاد کر دیا۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک میں کچھ راتیں گزاریں، پھر مدینہ طیبہ
واپس تشریف لائے۔[3]

ایک غریب مسلمان کے جنازہ میں

عبد اللہ ذوالبجادین رضی اللہ عنہ کی وفات تبوک میں ہوئی۔ یہ اسلام قبول کرنے کے لئے
کوشاں تھے، لیکن ان کی قوم ان کو اس سے باز رکھتی تھی، اور ان کو طرح طرح سے ستایا جاتا
تھا۔ آخر کار انھوں نے ان کو ایک موٹی کھردری چادر میں چھوڑ دیا۔ اس کے سوا ان کے

---

[1] دومۃ الجندل ایک آباد گاؤں تھا، جہاں بدو عرب خرید و فروخت کے لئے جایا کرتے تھے۔ رومیوں
سے یہ مقام ویران اور بنجر یا ہو گیا تھا۔ اکیدر نے آ کر اس کو نئی رونق دی، اور زیتون کی کاشت
وہاں شروع کی۔ چنانچہ اس کے بعد وہ بستی وہاں آباد ہو گیا۔ پھر شروع کر دیا۔ گاؤں کو ایک مستحکم فصیل گھیرے
ہوئے تھی۔ فصیل کے اندر ایک مستحکم قلعہ تھا جس کو شمال کے اطراف میں خاص شہرت حاصل تھی۔ اس کی وجہ
سے اس مقام کو فوجی اہمیت بھی حاصل تھی۔ اس کے باشندے قبیلہ بنی کلب سے تعلق رکھتے تھے۔ اکیدر اپنے
آپ کو اس زمانہ کے دستور کے مطابق ایک بادشاہ کہلواتا تھا۔ اکیدر اس زمانہ میں نصرانی مذہب
پر تھا۔ (دیکھئے تاریخ العرب قبل الاسلام از ڈاکٹر جواد علی) [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۵۲۶
[3] ایضاً ص ۵۲۷

پاس کوئی ستر پوشی کا کپڑا نہ تھا، وہ بھاگ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے جب آپ کے قریب ہوئے تو یہ چادر بھی پھٹ گئی اور اس کے دو ٹکڑے ہو گئے انھوں نے ایک ٹکڑے سے لنگی کا کام لیا اور دوسرے ٹکڑے کو اوڑھ لیا، اسی حالت میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اسی دن سے ان کا لقب "ذوالبجادین" پڑ گیا۔

جب تبوک میں ان کا انتقال ہوا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے رات کی تاریکی میں ان کے جنازہ کی مشایعت کی ان میں کسی کے ہاتھ میں مشعل تھی جس کی روشنی میں یہ لوگ چل رہے تھے قبر تیار تھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خود بدولت قبر میں اترے حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ نے نعش کو قبر میں اتارا آپ فرماتے اپنے بھائی کو اور نیچے میرے قریب کرو، دونوں نے ان کو نیچے کی طرف جھکایا، جب آپ نے ان کو لحد میں لٹا دیا تو فرمایا "اللھم انی امسیت راضیا عنہ فارض عنہ" اے اللہ میں اس سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی ہو جا! عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے تمنا کی کہ کاش کہ اس قبر میں میں ہوتا۔[1]

کعب بن مالک کا ابتلاء اور ان کی کامیابی و سرخروئی

جن لوگوں کی اس غزوہ میں شرکت نہ کرنے کی وجہ کوئی شبہ یا وسوسہ نہیں تھا، شریک نہ ہو سکے ان میں کعب بن مالکؓ مرارۃ بن الربیعؓ اور ہلال ابن امیہؓ بھی تھے یہ لوگ سابقین اولین میں سے ہیں، اسلام کے لئے انھوں نے بیش قیمت خدمات

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۵۲۷ - ۵۲۸

انجام دی تھیں اور راہ حق میں سخت تکلیفیں اٹھائی تھیں مرارۃ بن الربیعؓ اور ہلال بن
امیہؓ جنگ بدر میں بھی شریک تھے غزوات سے فرار یا پیچھے رہنا ان کی فطرت اور
عادت سے دور تھا اس کو حکمت الٰہی کے سوا کسی چیز سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، یا اس سے
مقصود ان کا امتحان ان کے نفوس کا تزکیہ اور مسلمانوں کی تربیت تھا، یہ صرف
سہل انگاری ارادہ کی کمزوری" اور اسباب و وسائل پر ضرورت سے زیادہ اعتماد اور
پوری سنجیدگی اور نشاط و سرگرمی کے ساتھ اس معاملہ پر غور نہ کرنے کا نتیجہ تھا، اور
یہ وہ چیز ہے جس نے بہت سے مردان خدا کو جو ایمان اور خدا اور رسولؐ کی محبت میں
دوسرے مسلمانوں سے کسی طرح کم تر نہ تھے بار بار نقصان پہنچایا ہے، اور یہی وہ کمزوری
ہے جس کی طرف اس جماعت کے تیسرے شخص کعب بن مالکؓ نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

"میں روزانہ اس ارادہ سے نکلتا کہ میں سفر کا ضروری سامان لے لوں اور ان کے
ساتھ روانہ ہو جاؤں، لیکن بغیر کچھ کئے واپس آ جاتا، پھر میں اپنے دل میں کہتا کہ مجھے
دقت کیا ہے جب چاہوں گا لے لوں گا، (میرے پاس سامان بازار میں موجود تھا)
میں اسی لیت و لعل میں رہا کہ کوچ کی گھڑی آ گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور
مسلمان روانہ ہو گئے، اور میں نے ابھی تک کچھ سامان ہی نہیں کیا تھا، میں نے کہا چلو
میں آپ کی روانگی کے ایک دو دن بعد ہی روانہ ہو جاؤں گا اور راستہ میں قافلہ میں
شامل ہو جاؤں گا، ان سب کی روانگی کے بعد بھی میں سامان تیار کرنے کے لئے نکلا
لیکن پھر بھی کچھ کئے بغیر واپس آ گیا، دوسرے دن بھی یہی ہوا، مجھ پر یہی سستی طاری رہی
اور انھوں نے اپنے قدم تیز کر دیئے اور لڑائی کا معاملہ بہت آگے نکل گیا، میں نے اس
بعد بھی ارادہ کیا کہ اب بھی مدینہ سے روانہ ہو کر ان کو پا لوں، کاش کہ میں نے ایسا ہی

کیا ہوتا لیکن اس کی بھی توفیق نہ ہوئی۔ [1]

اللہ تعالیٰ نے ان تینوں کے ایمان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، اسلام سے وفاداری اور مصیبت و راحت ہر حالت میں ثابت قدمی کا ناز کا امتحان لیا، وہ لوگوں کی عزت و تعظیم اور جفا و بے نیازی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ والتفات اور اعراض و بے توجہی دونوں حالتوں میں ایسے مخلص و جاں نثار ثابت ہوئے جس کی نظیر مذہبی معاشروں اور جماعتوں کی تاریخ میں (جو ایمان و عقیدہ اور محبت و جذبات پر قائم ہوتی ہیں) ملنی مشکل ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت سچ بولے اور جو کچھ حقیقت تھی بے کم و کاست بیان کر دی جب لوگ باتیں بنا کر معافی حاصل کر رہے تھے انھوں نے اس وقت خود اپنے خلاف گواہی دی، جب منافقین اپنے آپ کو اس سے ہر طرح بری قرار دے رہے تھے۔

وہ اپنی طویل اور طبیغ و مؤثر روایت میں اپنا قصہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> یہ سب پیچھے رہنے والے آپ کے پاس حاضر ہوئے اور قسمیں کھا کھا کر آپ سے اپنے عذر بیان کرنے لگے، یہ کوئی اسّی سے اوپر افراد تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے ان کی ظاہری باتوں کو قبول فرما لیا، ان سے بیعت لی اور ان کے لئے مغفرت طلب فرمائی، ان کے بھیدوں اور دل کے رازوں کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا، میں بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، سلام عرض کیا، جب میں نے آپ کو سلام کیا تو آپ نے خفگی کی مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا، پھر فرمایا آؤ، میں آگے بڑھا

---

[1] صحیح بخاری کتاب المغازی۔

اور آپ کے بالکل سامنے بیٹھ گیا آپ نے مجھ سے پوچھا تم کس وجہ سے پیچھے رہ گئے؟ کیا تم نے اپنی سواری نہیں خریدی تھی میں نے کہا جی ہاں بخدا ایسا ہی ہے خدا کی قسم اگر میں آپ کے بجائے اس وقت اہل دنیا میں سے کسی شخص کے پاس ہوتا تو میں سمجھتا کہ میں کچھ عذر کر کے اس کی ناراضگی سے بچ جاؤں گا میرے اندر بات کرنے اور اپنی بات ثابت کرنے کا سلیقہ بھی ہے لیکن بخدا مجھے یقین ہے کہ اگر آج جھوٹ بول کر آپ کو راضی کر لوں گا تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مجھ سے ناراض کر دے اور اگر میں سچ بول کر آپ کو کسی قدر آزردہ کروں گا تو اس میں مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی کی امید ہے خدا کی قسم میرے پاس کوئی عذر نہیں ہے اور خدا کی قسم جس وقت میں پیچھے رہ گیا تھا اس سے زیادہ میں کبھی صحت مند اور فارغ البال نہ تھا۔"

بالآخر وہ ہوا کہ گھڑی آ گئی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ان سے بات کرنے کی ممانعت فرمادی مسلمان تو سمع و طاعت کے پتلے تھے چنانچہ سب نے ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور بالکل بدل گئے حتی کہ ان کی نگاہ میں زمین آسمان بھی بدل گئے معلوم ہوتا تھا کہ یہ وہ زمین ہی نہیں ہے جو پہلے تھی اس حال میں ان کی پچاس راتیں گذریں جہاں تک مرارہ بن ربیعؓ اور ہلال بن امیہؓ کا تعلق ہے وہ دونوں تھک ہار کے اپنے گھر بیٹھ رہے اور روتے رہے کعب بن مالکؓ ان سب سے زیادہ جوان اور طاقتور تھے وہ باہر نکلتے تھے مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھتے تھے بازاروں میں آتے جاتے تھے لیکن کوئی شخص ان سے گفتگو کرنے کا روادار نہ تھا۔

لیکن ان تمام باتوں نے محبت اور وفاداری کے اس رابطہ اور رشتہ پر کوئی اثر

نہیں ڈالا جوان کے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے درمیان قائم تھا اس سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وہ شفقت بھی کم نہ ہوسکی جو ان کے حال پر تھی بلکہ اس سرزنش اور تنبیہ نے ان کی اس محبت دل کی تپش اور درد و سوز کو اور بڑھا دیا وہ کہتے ہیں:

میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتا اور آپ کو سلام کرتا اس وقت آپ نماز سے فراغت کے بعد اپنی مجلس میں تشریف فرما ہوتے میں اپنے دل میں سوچتا کہ آپ نے سلام کے جواب میں اپنے لب مبارک کو جنبش دی ہے یا نہیں! پھر میں آپ کے قریب نماز کے لئے کھڑا ہو جاتا اور کنکھیوں سے آپ کو دیکھتا رہتا جب میں نماز کی طرف متوجہ ہوتا تو اس وقت آپ میری طرف التفات فرماتے جب میں آپ کی طرف متوجہ ہوتا تو آپ اعراض فرماتے۔

غرض دنیا ان کے لئے بدل گئی اور اب ایک ایسے شخص نے بھی ان سے منہ پھیر لیا جس پر ان کو بڑا ناز و اعتماد تھا، وہ بیان کرتے ہیں:-

"لوگوں کی جفا سے میرے لئے یہ عرصہ بہت طویل اور شاق ہو گیا آخر میں دیوار پھاند کر ابو قتادہ کے احاطہ میں پہونچا، وہ میرے چچا زاد بھائی بھی تھے اور مجھے سب سے زیادہ عزیز و محبوب تھے میں نے ان کو سلام کیا تو خدا کی قسم انھوں نے سلام کا جواب تک نہ دیا، میں نے کہا ابو قتادہ! میں تم کو اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ مجھے اللہ اور اس کے رسول سے محبت ہے؟ اس پر بھی وہ خاموش رہے، میں نے دوبارہ یہی بات کہی اور ان کو اللہ کا واسطہ دیا، وہ خاموش رہے، پھر تیسری بار کہا کہ اللہ و رسولہ أعلم، اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں، اس پر میری آنکھوں سے

بے ساختہ آنسو بہنے لگے ہیں اسی وقت مڑا اور دیوار پھاند کر واپس چلا گیا۔[1]

یہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوا بلکہ اس مکمل مقاطعہ کا اثر ان تینوں کی بیویوں تک پہنچا اور ان کو حکم ملا کہ وہ اپنی بیویوں کو علیحدہ کر دیں چنانچہ انھوں نے اس کی تعمیل کی۔

عشق و وفا اور استقامت و ثابت قدمی کے امتحان کا سب سے نازک مرحلہ اس وقت آیا جب غسان کے بادشاہ نے ان کے اس محبت و تعلق کو خریدنا چاہا، یہ خیال ہے کہ یہ وہ بادشاہ ہے جس کا مصاحب و ندیم بننا اور اس کی مجلس میں حاضر ہونا بڑا شرف سمجھا جاتا تھا، اور اس میں پوری رقابت چلتی تھی، اور جس کے عرب شعراء برسوں سے گیت گاتے تھے[2] بادشاہ کا قاصد ان کے پاس ایسے وقت پہونچا جب وہ سخت ذہنی و قلبی پریشانی، لوگوں کی بے تعلقی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے رخی کے شدید ابتلاء میں تھے، اس نے ان کو شاہ غسان کا خط دیا جس کا مضمون یہ تھا:۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمھارے ولی نعمت نے تمھارے ساتھ جفا کا معاملہ کیا ہے، اللہ نے تمھارے لئے ذلت اور ضائع ہونے کی جگہ مقدر نہیں کی ہے تم ہمارے پاس آجاؤ، ہم تمھارے ساتھ اچھا معاملہ کریں گے۔"

اس خط سے کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے دل میں غیرت و حمیت کی ایک بجلی کوند گئی اور ان کی محبت اور جوش ایمانی ابلنے لگی، وہ ایک تنور کے پاس گئے اور خط اس میں پھینک دیا۔

جب ان تینوں صاحب ایمان ہستیوں کا امتحان مکمل ہوگیا، تو قرآن مجید نے ان کا

---

[1] حدیث کعب بن مالکؓ صحیح بخاری [2] دیکھئے آل جفنہ کی منقبت میں حسان بن ثابتؓ کا مشہور قصیدہ جس کے دو شعر یہ ہیں:۔

لله در عصابة نادمتهم — يوماً بجلق في الزمان الأول

يسقون من ورد البريص عليهم — بردى يصفق بالرحيق السلسل

ذکر کر کے ان کو بقاء و دوام عطا کی اور ان کے واقعہ نے مسلمانوں کے لئے ابد الآباد تک ایک سبق اور سامان عبرت و نصیحت فراہم کر دیا اور ان کی ایمانی قوت اور دین اسلام کا پورا ثبوت مل گیا اور باوجود اس کے کہ زمین اُن پر اپنی کشادگی کے باوصف تنگ ہو چکی تھی بلکہ خود ان کے نفس ان کے لئے تنگ تھے ان کے پیر جادۂ حق سے ایک لمحہ کے لئے نہ ہٹے تو اس وقت اللہ تعالٰی نے آسمانوں کے اوپر سے ان کی قبولیت کا اعلان فرمایا اور صرف ان کی توبہ کا ذکر نہیں کیا کہ وہ کہیں اس سے تنہائی اور احساس کہتری محسوس نہ کریں اور یہ بات ان کے لئے انگشت نمائی کا باعث نہ بنے بلکہ ان کی توبہ کی تمہید میں سید الانبیاء و المرسلین اور مہاجرین و انصار کی توبہ کا بھی ذکر کیا جو اس غزوہ میں پیش پیش تھے اس کا مقصد ان کا اعزاز و اکرام ان کی تسکین خاطر لوگوں کی نگاہوں میں ان کی قدر بڑھانا اور ان کی شان دوبالا کرنا تھا۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ	بے شک خدا نے پیغمبر پر مہربانی کی اور
وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ	مہاجرین اور انصار پر جو باوجود اس کے
اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ	کہ ان میں سے بعضوں کے دل پھر جانے کو
بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ	تھے مشکل کی گھڑی میں پیغمبر کے ساتھ
مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ	رہے پھر خدا نے ان پر مہربانی فرمائی
رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ وَعَلَى الثَّلٰثَةِ	بے شک وہ ان پر نہایت شفقت
الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ	کرنے والا (اور) مہربان ہے اور
عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ	ان تینوں پر بھی جن کا معاملہ ملتوی
وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ	کیا گیا تھا یہاں تک کہ جب زمین

[1] جو ایک معروف و مسلّم حقیقت تھی اور جس کی بقا مرا (حیدرا ان) ضرورت نہ تھی۔

وَظَنُّوٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ	باوجود فراخی کے ان پر تنگ ہو گئی
اِلَّآ اِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ	اور ان کی جانیں بھی ان پر دوبھر
لِيَتُوْبُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ	ہو گئیں اور انھوں نے جان لیا کہ خدا
الرَّحِيْمُ	کے ہاتھ سے خود اس کے سوا کوئی پناہ
(سورۃ توبہ - ۱۱۷ - ۱۱۸)	نہیں پھر خدا نے ان پر مہربانی کی تاکہ
	توبہ کریں بے شک خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے

غزوات پر ایک نظر

غزوۂ تبوک کے ساتھ جو ہجرت کے نویں سال رجب میں پیش آیا غزواتِ نبوی (جن کی تعداد ستائیس[1] ہے) نیز دوسرے سرایا اور چھاپوں (جن کی تعداد ساٹھ تک گنی ہے[2] اور کچھ میں قتال کی نوبت بالکل نہیں آئی) کا سلسلہ ختم ہوا۔

ان تمام غزوات و سرایا میں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بھیجے گئے جتنا خون بہایا گیا، جنگوں کی پوری تاریخ میں اس سے کم کوئی مقدار نظر نہیں آتی ان تمام غزوات کے مقتولین کی تعداد ایک ہزار اٹھارہ سے زیادہ نہیں جب میں دونوں فریق شامل ہیں، لیکن اس قلیل تعداد نے انسانوں کو خون کی حیس ارزانی سے اور بے حرمتی و بے آبروئی سے بچایا اس کا مکمل جائزہ اور سرسری تخمینہ بھی ناممکن ہے اس کے نتیجے میں جزیرۃ العرب کے اطراف میں اس قدر امن و اطمینان کی فضا قائم ہو گئی کہ ایک مسافر تنہا عورت حیرہ سے چلتی اور کعبہ کا طواف کر کے واپس جاتی

---

[1] تحقیق ابن قیم (زاد المعاد) ، عراقی جبرائیل اور ظہیر مصنف محمد ذیشت خطاب کی تحقیق میں ان غزوات کی تعداد جن کی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قیادت فرمائی اٹھائیس ہے دیکھئے جعفر بن النبی صلے اللہ علیہ وسلم
[2] مولانا قاضی محمد سلیمان منصورپوری نے رحمۃ للعالمین میں ان کی تعداد لکھی ہے جو اوپر سطور میں مذکور ہے

اہم اسلامی غزوات کے مقامات
غزوات کے مقامات ۔ شہر
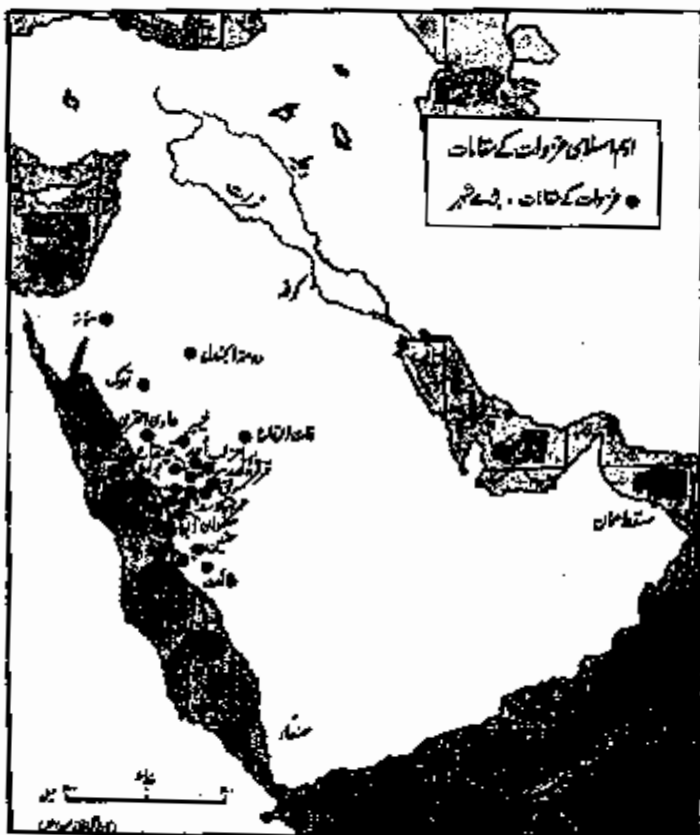
اور اللہ کے سوا اس کو کسی کا ڈر نہ ہوتا[1] ایک عورت قادسیہ سے اپنے اونٹ پر چلتی اور بیت اللہ کی زیارت کرتی اور اس کو کسی کا خوف نہ ہوتا[2] اس سے پہلے یہ حالت تھی کہ پورے جزیرۃ العرب میں قتل و غارتگری، انتقامی کاروائیوں، خانہ جنگیوں اور معرکہ آرائیوں کا سلسلہ قائم تھا اور بڑی بڑی حکومتوں کے کارواں بھی بڑے غیر معمولی پہرہ، حفاظتی بندوبست اور ماہر رہبروں کی مدد سے چلتے تھے۔

یہ غزوات قرآن مجید کے دو حکیمانہ اصولوں پر مبنی ہیں ایک اَلْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ[3] (فتنہ انگیزی قتل سے بڑھ کر ہے) دوسرے وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰاُولِی الْاَلْبَابِ[4] (اے عقل والو! تمہارے لئے بدلہ اور قصاص ہی میں سامانِ زندگی ہے) ان کی وجہ سے نوعِ انسانی کا بڑا وقت بچا اور اصلاحِ حال اور خطرات کے تدارک کی ان طویل کوششوں اور مسلسل جنگوں کی ضرورت نہ پڑی جو اکثر بے نتیجہ رہتی ہیں اس کے علاوہ ان غزوات پر جن اخلاقی تعلیمات اور مشفقانہ و ہمدردانہ ہدایات کا سایہ اور پرتو تھا اس نے ان کو انتقامی کاروائی اور غیظ و غضب کی آگ بجھانے کے بجائے تادیبی کاروائی اور ہدایت و فلاح کا سامان کرنے کا ذریعہ بنا دیا تھا چنانچہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کسی لشکر کو روانہ فرماتے تو اس کو یہ ہدایت دیتے :-

"میں تمہیں اللہ سے ڈرنے اور جو مسلمان تمہارے ساتھ ہیں ان کے ساتھ اچھے برتاؤ کی نصیحت کرتا ہوں، اللہ کے نام پر قتال کرنا اور اللہ ہی کے راستہ میں اس سے قتال کرنا جس نے اللہ کے ساتھ کفر اختیار کیا، غداری نہ کرنا، مالِ غنیمت کی چوری نہ کرنا، کسی بچے، عورت اور از کار رفتہ بوڑھے یا کسی معبد میں بیٹھے ہوئے گوشہ گیر

---

[1] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۵۸۱
[3] سورۃ البقرۃ ۱۹۱ [4] سورۃ البقرۃ ۱۷۹

قتل نہ کرنا، کسی کھجور کو ہاتھ نہ لگانا، کسی درخت کو نہ کاٹنا، کسی عمارت کو نہ گرانا۔[1]

جہاں تک اس جنگی کارروائی کی کامیابی اور وسعت کا تعلق ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دس سال کی مختصر مدت میں جزیرۃ العرب کا تقریباً ۲۷۴ میل مربع روزانہ اسلام کے زیر نگیں آتا گیا، مسلمانوں کے جانی نقصان کو دیکھا جائے تو مہینہ میں ایک آدمی کا اوسط پڑتا ہے، دس سال مکمل نہیں ہونے پائے تھے کہ دس لاکھ مربع میل اسلام کے زیر اقتدار آچکے تھے۔[2]

اس کا موازنہ دو عالمی جنگوں (جس میں پہلی جنگ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء میں ہوئی تھی، دوسری ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۵ء میں ہوئی تھی) سے کیجئے تو آپ کو اس فرق کا صحیح اندازہ ہوگا۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا کے فاضل اور محقق مقالہ نگار نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پہلی عالمگیر جنگ کے مقتولین کی تعداد چونسٹھ لاکھ تھی،[3] دوسری عالمگیر جنگ کے مقتولین کی تعداد ساڑھے تین کروڑ اور چھ کروڑ کے درمیان تھی۔[4]

ان دونوں جنگوں نے جیسا کہ سب جانتے ہیں، انسانیت کی کوئی خدمت انجام نہیں دی، اور انسانی سوسائٹی کو ان سے تھوڑا یا بہت کسی درجہ میں فائدہ نہیں پہونچا۔

قرون وسطیٰ کی تحقیقاتی عدالتوں (INQUISITION) اور کلیسا کے ظلم و ستم اور وحشیانہ استبداد کا جو لوگ نشانہ بنے ان کی تعداد بھی ایک کروڑ بیس لاکھ تک پہونچتی ہے۔[5]

---

[1] واقدی بروایت زید بن ارقم بسلسلۂ غزوۂ موتہ [2] ان معلومات میں جنرل اکبر خاں کی کتاب حدیث دفاع سے فائدہ اٹھایا گیا ہے ۹۹۱ [3] جلد ۲۳ [4] ایضاً ص ۱۰۰۸ (ایڈیشن ۱۹۵۸ء)

[5] JOHN DEVENPORT, APOLOGY FOR MUHAMMAD AND QURAN

اسلام میں پہلا حج

حج سنہ ۹ھ میں فرض کیا گیا[1] اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو امیر حج بنایا اور مسلمانوں کو حج کرانے کی ذمہ داری ان کے سپرد کی مشرکین بھی اپنے حج کے مقامات میں تھے[2] حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ سے تین سو آدمیوں کا قافلہ حج کے لئے روانہ ہوا۔[3]

اس وقت سورۂ براۃ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی آپ نے حضرت علیؓ کو بلا بھیجا اور ان سے فرمایا کہ سورۂ براۃ کی ابتدائی آیات اور ان کے احکام کو لے کر وہاں جائیں اور قربانی کے روز جب سب لوگ منٰی میں جمع ہوں یہ اعلان کر دیں کہ جنت میں کوئی کافر نہیں داخل ہوگا اور اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کر سکتا اور کوئی شخص برہنہ ہو کر طواف نہیں کر سکتا اور اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کسی کا کوئی معاہدہ ہو تو طے شدہ میعاد تک اس کی پابندی کی جائے گی۔ حضرت علیؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی پر روانہ ہوئے اور راستہ میں حضرت ابوبکرؓ سے جا ملے انھوں نے پوچھا کہ امیر بنا یا محکوم کہنے لگے مامور ہوں۔ پھر دونوں اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حج کے انتظامات میں مشغول ہو گئے جب قربانی کا دن آیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم اور ہدایت کے مطابق ان سب باتوں کا اعلان کیا۔[4]

---

[1] بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ حج سنہ ۶ھ میں فرض ہوا، شیخ محمد الخضری نے اپنی کتاب تاریخ التشریع الاسلامی میں اسی قول کو اختیار کیا ہے، دیکھئے ص ۵۹ [2] ابن ہشام ج ۲ ص ۵۴۳ [3] زاد المعاد ج ۲ ص ۲۲ [4] ابن ہشام ج ۲ ص ۵۴۵ تا ۵۴۶

وفود کا سال

(سنہ ۹-۱۰ھ)

مدینہ میں وفود کی مسلسل آمد اور عرب کی زندگی پر اس کا اثر

پہلے اللہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے مکہ فتح فرمایا،
پھر غزوۂ تبوک سے آپ مظفر و منصور واپس ہوئے اس سے قبل آپ دنیا کے سلاطین
و امراء کے نام اپنے مکاتیب ارسال فرما چکے تھے جن میں ان کو اسلام کی دعوت دی گئی
تھی ان مکاتیب کا بعض بادشاہوں نے خوشدلی اور احترام و تعظیم کے ساتھ استقبال
کیا بعض نے نرمی اور معقولیت کے ساتھ اس کا جواب دے دیا بعض لوگ تردد اور
خوف کی حالت میں رہے اور کچھ نے اس کو گستاخی کے ساتھ رد کردیا اور اس کے ساتھ اہانت
اور تکبر کا معاملہ کیا، اور اس کی پاداش میں بلا کسی تاخیر کے اس کو اپنے ملک اور جان سے
ہاتھ دھونا پڑا، یہ وہ واقعات تھے جن کا چرچا سارے عرب میں تھا، اور ہر جگہ اس کا
تذکرہ کیا جاتا تھا۔

مکہ کی فتح سے (جو جزیرۃ العرب کا روحانی و اجتماعی پایۂ تخت تھا) سرداران
قریش کے قبول اسلام اور دین حق کے سامنے مزاحمت و سرکشی کے سب سے بڑے قلعہ
کے انہدام کا ان لوگوں پر گہرا اثر پڑا جو گومگو کی کیفیت میں تھے یا اسلام کی ناکامی

خواب دیکھ رہے تھے، ان واقعات نے ان کے اور اسلام کے درمیان وہ قدیم رکاوٹ دور کردی اور ان کے اور قبول اسلام کے درمیان جو فاصلہ تھا وہ بہت کم رہ گیا۔

مشہور محدث علامہ محمد طاہر پٹنی (م ۹۸۶ھ) اپنی شہرۂ آفاق کتاب "مجمع بحار الانوار" میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"یہ سال آمدِ وفود کا سال تھا، عرب قبائل نے اسلام کے ساتھ قریش کے معاملہ کا انتظار کیا تھا، اس لئے کہ وہی لوگ سب کے پیشوا تھے، اور بیت اللہ کے ذمہ دار تھے، جب انھوں نے اسلام کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کردیا، مکہ فتح ہوگیا اور قبیلۂ ثقیف نے بھی اسلام قبول کرلیا تو انھوں نے محسوس کرلیا کہ اب ان کے اندر ان کے مقابلہ کی طاقت نہیں، اس وقت ہر طرف سے وفود کی کثرت ہوئی اور لوگ گروہ در گروہ اللہ کے دین میں داخل ہونے لگے۔"[1]

ان سب باتوں کا عربوں کے دل و دماغ پر (جو بہر حال انسان تھے) قدرتی طور پر اثر پڑا اور اس کی وجہ سے اسلام میں داخل ہونے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کی حاضری کا ایک دروازہ کھل گیا، اور تلاش حق میں مختلف وفود مرکز اسلام میں اس کثرت سے آنے لگے جس طرح کوئی موتی کی لڑی ٹوٹ جائے اور اس کے سارے دانے اسلام کی آغوش میں آجائیں۔

یہ وفد اپنے اپنے علاقوں اور مرکزوں میں نئی روح سے سرشار ہو کر ایمان کا نیا نشہ، دعوتِ اسلام کا نیا جذبہ، شرک و بت پرستی اور اس کے نشانات و علامات اور جاہلیت اور اس کے اثرات سے شدید نفرت لے کر واپس جاتے۔

---

[1] مجمع بحار الانوار ج ۵ ص ۲۴۲

ان وفود میں بنی تمیم کا بھی وفد تھا جس میں ان کی قوم کے مشہور شاعر و اشراف شامل تھے ان کے خطیب و شاعر اور مسلمانوں کے خطیب شاعر میں مقابلہ ہوا اور اس میں اسلام کی اور اسلام کے خطیب و شاعر کی برتری ظاہر ہوئی اس کو ان کے رؤسا و اشراف نے تسلیم بھی کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو انعامات بھی دیئے اور اچھی طرح دیئے۔[1]

بنی عامر کا وفد بھی آیا ضمام بن ثعلبہ بنی سعد بن بکر کی طرف سے نمائندہ بن کر آئے اور داعی و مبلغ بن کر اپنی قوم میں واپس ہوئے پہلا کلمہ جو وہاں پہونچ کر ان کی قوم سے ہوا وہ ان کا یہ جملہ تھا "برا ہو لات و عزیٰ کا" لوگوں نے کہا ارے کیا کہتے ہو ضمام ابرص سے ڈرو، جذام سے ڈرو، جنون سے ڈرو، وہ کہنے لگے تمہاری خرابی ہو خدا کی قسم یہ دونوں نہ نقصان پہونچا سکتے ہیں نہ فائدہ بے شک اللہ نے ایک رسول بھیجا ہے اور ان پر ایک کتاب نازل کی ہے جس کے ذریعہ انھوں نے تم کو اس سے نجات دی جس میں تم لوگ ہو اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم اس کے بندہ اور اس کے رسول ہیں میں ان کے پاس سے جو کچھ انھوں نے حکم دیا اور جس چیز سے منع کیا ہے وہی تمہارے لئے لے کر آیا ہوں اس دن شام بھی نہیں ہوئی کہ ان کے محلہ میں کوئی مرد و عورت ایسا نہ تھا جو اسلام نہ لایا ہو۔[2]

بنی حنیفہ کا وفد آیا جس میں مسیلمہ کذاب بھی تھا یہ اسلام لایا اور بعد میں

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۵۶۲-۵۶۸ [2] ایضاً ص ۵۷۴

مرتد ہوگیا اور خود نبوت کا دعویدار بن بیٹھا اس نے فتنہ ارتداد برپا کیا اور اسی میں مارا گیا۔

وفد بنی طے میں نامور شہسوار زید الخیل بھی تھے جن کا نام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بدل کر "زید الخیر" کر دیا اور مومنین راسخین میں ان کا شمار ہوا۔

مشہور زمانہ سخی حاتم کے بیٹے عدی بن حاتم بھی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے اخلاق کریمانہ اور تواضع دیکھ کر اسلام لے آئے اور یہ کہا کہ خدا کی قسم یہ کسی بادشاہ کا انداز نہیں۔

بنی زبید کا وفد بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وفد میں عرب کے نامور شہسوار عمرو بن معدیکرب بھی تھے کندہ کے وفد میں اشعث بن قیس شامل تھے آزد کا وفد بھی حاضر ہوا سلاطین حمیر کا قاصد بھی پہونچا اور ان بادشاہوں کا خط آپ کی خدمت میں پیش کیا جس میں ان کے قبول اسلام کی اطلاع تھی۔

معاذ بن جبل اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہما کو آپ نے اسلام کی دعوت دینے کے لئے یمن روانہ کیا اور ان کو ہدایت کی کہ "یسّرا ولا تعسّرا وبشّرا ولا تنفّرا"[1] (دیکھو آسانی پیدا کرنا سختی نہ کرنا خوشخبری دینا متنفر و بیزار نہ کرنا)

فروہ بن عمرو الجذامی نے ایک قاصد کے ذریعہ آپ کو اپنے قبول اسلام کی خبر بھیجی یہ رومی سلطنت کی طرف سے "معان" اور اس کے اطراف میں جتنا شامی علاقہ ہے اس کا عامل یا گورنر تھا۔

نجران میں بنو الحارث بن کعب خالد بن الولید کے ہاتھ پر اسلام لائے

---

[1] صحیح بخاری کتاب المغازی باب بعث معاذ وابی موسیٰ الی الیمن۔

حضرت خالدؓ نے وہاں قیام کر کے ان کو اسلام کی تعلیم دی، اس کے بعد خالد رضی اللہ عنہ اپنے ساتھ بنو الحارث کا ایک وفد لے کر واپس آئے اور جب وہ لوگ اپنے علاقہ واپس گئے تو ان کی تعلیم کے لیے آپ نے عمرو بن حزمؓ کو بھیجا کہ وہ سُنّت اور اسلام کے شعائر و آداب سے ان کو آگاہ کریں اور ان کے صدقات وغیرہ کا انتظام کریں۔ ہمدان کا وفد بھی خدمت میں حاضر ہوا۔[1]

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے لات بُت کو توڑنے کے لیے بھیجا، انھوں نے پہلے اس بُت کو پاش پاش کیا، اس کے بعد بُت خانہ کی چہار دیواری پر چڑھ گئے اور دوسرے لوگ جو ان کے ساتھ تھے وہ بھی چڑھ گئے اور سب نے مل کر اس کے ایک ایک پتھر کو گرانا شروع کر دیا، یہاں تک کہ وہ زمین کے بالکل برابر ہو گیا، اسی روز یہ وفد واپس بھی آ گیا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے اس کی تعریف کی۔[2]

عبد القیس کا وفد آیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو خوش آمدید کہا اور ان برتنوں اور ظروف کو استعمال کرنے کی ان کو ممانعت فرمائی جن میں نشہ جلدی پیدا ہوتا ہے، یہ احتیاطاً آپ نے مفاسد کے سدِّ باب کے لیے ارشاد فرمایا، اس لیے کہ وہ لوگ اس کے بہت عادی تھے۔[3]

اشعریّہ اور اہلِ یمن کا وفد بڑے سرور کے ساتھ یہ شعر پڑھتا ہوا آیا

غداً نلقی الأحبّة محمداً وحزبہ "کل ہم محبوبوں سے ملیں گے"

---

[1] ابن ہشام ج ۲ ص ۵۹۲-۵۹۷ [2] سیرت ابن کثیر ج ۴ ص ۱۲۲-۱۲۳

[3] زاد المعاد ج ۲ ص ۳۲ صحیحین میں یہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

محمد صلے اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے اصحاب ہیں! آپ نے اس وفد کو دیکھ کر فرمایا! اتاکم اھل الیمن ھم ارق افئدۃ و الین قلوبا الایمان یمان والحکمۃ یمانیۃ[1] تمھارے پاس اہل یمن آئے ہیں جو بہت نرم و گداز دل والے ہیں! ایمان تو یمن کا حصہ ہے، حکمت تو یمن کی حکمت ہے۔

خالد بن الولیدؓ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت کے ساتھ دعوت اسلام کے لئے اہل یمن کے پاس بھیجا! انھوں نے وہاں پہنچ کر چھ ماہ گزار دیئے حضرت خالدؓ برابر ان کو اسلام کی دعوت دیتے اور وہ قبول نہ کرتے پھر آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو وہاں بھیجا، انھوں نے ان کو آپ کا خط پڑھ کر سنایا اور پورا قبیلہ ہمدان مسلمان ہوگیا حضرت علیؓ نے آپ کو ان کے اسلام لانے کی اطلاع بھیجی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب ان کا خط پڑھا تو سجدہ میں گر پڑے پھر سر مبارک اٹھایا اور فرمایا! سلامتی ہو ہمدان پر سلامتی ہو ہمدان پر۔[2]

مزینہ کا وفد چار سو آدمیوں کے ساتھ آیا! نجران کے عیسائیوں کا بھی ایک وفد جس میں ساٹھ سوار تھے! اس میں ان کے اشراف و سربرآوردہ لوگوں کی تعداد چوبیس تھی، اس میں ان کے بڑے پادری اور عالم ابوحارثہ بھی تھے، رومی بادشاہ ان کا بڑا اعزاز کرتے تھے! ان کی ہر طرح مالی مدد کرتے تھے اور ان کے لئے گرجے تعمیر کرتے تھے! ان لوگوں کے بارے میں قرآن مجید میں بکثرت آیات نازل ہوئی ہیں۔[3]

اہل نجران کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک مکتوب بھیجا اور ان کو اسلام کی دعوت دی! انھوں نے یہ مکتوب پڑھا تو ایک وفد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس

۱؎ صحیح بخاری باب قدوم الاشعریین واہل الیمن۔ ایک روایت میں الفقہ یمان کا بھی اضافہ ہے یعنی دین کی سمجھ بوجھ یمن کا حصہ ہے ۲؎ زاد المعاد ج ۳ ص ۳۲ ۳؎ از صحیح بخاری ۴؎ تفصیل کے لئے دیکھئے زاد المعاد ج ۳

روانہ کیا، اور اس نے بہت سے سوالات آپ کے سامنے رکھے ان کے موافق جواب میں سورۂ آلِ عمران کی بہت سی آیتیں نازل ہوئیں[1] رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو مباہلہ کی دعوت بھی دی لیکن خوف کی وجہ سے شرحبیل اس پر تیار نہیں ہوا۔ دوسرے روز یہ لوگ پھر خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت آپ نے ان کو ایک تحریر دی اور ان پر خراج لگایا اور ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ یہ کہہ کر بھیجا کہ ھٰذا امین ھٰذہ الامۃ۔ یہ اس اُمت کے امین ہیں[2]۔

وفد تجیب کی آمد سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بہت خوشی ہوئی، آپ نے ان کی بڑی عزت اور خاطر داری کی، انھوں نے آپ سے مختلف چیزوں کے بارے میں سوالات کئے، آپ نے یہ سارے جوابات ان کو لکھوا کر دے دیئے، پھر وہ آپ سے قرآن و سنت کے بارے میں بہت سی باتیں پوچھنے لگے، اس کی وجہ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ان سے خاص مناسبت پیدا ہو گئی، آپ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ہدایت کی کہ ان کی اچھی طرح سے ضیافت و مہمانداری کریں، یہ لوگ چند روز آپ کی صحبت میں رہے اور زیادہ قیام نہ کر سکے، ان سے پوچھا گیا کہ وہ کس وجہ سے اتنی جلدی کر رہے ہیں، کہنے لگے ہم اپنے لوگوں میں جا کر بتانا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہم نے کیسے کی، آپ نے ہماری کیا کیا باتیں ہوئیں اور آپ نے کیا جواب دیا، اس کے بعد وہ لوگ واپس ہو گئے، پھر سنہ ۱۰ھ کے حج میں "منیٰ" میں وہ آپ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوئے[3]۔

ان وفود میں بنی فزارہ، بنی اسد، بہرا اور عذرہ کے وفد بھی تھے، یہ سب لوگ اسلام لائے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو فتح شام کی بشارت دی، ان کو

---

[1] مباہلہ کی حقیقت و تفصیل کے لیے آل عمران کی آیت ۶۱ کی تفسیر میں ملاحظہ ہو [2] ابن کثیر ج ۲ ص ۵۴ امام بخاری نے قصۂ اہل نجران کے باب میں اس واقعہ کو مختصر بیان کیا ہے [3] زاد المعاد ج ۲ ص ۴۸

کاہن عورتوں کے پاس جانے اور ان سے قسمت کا حال پوچھنے سے منع فرمایا، جو
قربانیاں وہ کرتے تھے ان سے بھی انھیں منع کیا، اور فرمایا کہ صرف عید الاضحیٰ کی
قربانی ان کے لئے جائز ہے۔[1] بنی ذی مرہ اور خولان کے وفد بھی حاضر خدمت ہوئے
ان سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خولان کے بت کے بارے میں جس کی وہ پرستش
کرتے تھے دریافت فرمایا، انھوں نے جواب دیا کہ آپ کو مبارک ہو آپ جو کچھ لے کر آئے ہیں اس سے
اللہ تعالیٰ نے اس کو بدل دیا ہے البتہ کچھ پرانے لوگ کچھ بڑی بوڑھی عورتیں
اب بھی اس کو اپنے سینے سے لگائے ہوئی ہیں، جب ہم واپس جائیں گے تو انشاءاللہ
اس بت کو توڑ ڈالیں گے۔[2] محارب، و غسان، اور غامد، اور نخع کے وفد بھی آپ کے
پاس حاضر ہوئے۔[3]

یہ وفود آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر دین سیکھتے، دینی معلومات اور دینی
سمجھ حاصل کرتے، مسائل معلوم کرتے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ
کا مشاہدہ کرتے اور آپ کے اصحاب کرامؓ کی صحبت و رفاقت ان کو نصیب ہوتی۔
اکثر مسجد نبوی کے صحن میں ان کے لئے خیمہ لگا دیا جاتا، وہ وہاں رہتے، قرآن مجید
سنتے، مسلمانوں کو نماز پڑھتا ہوا دیکھتے اور ان کے دل میں جو کچھ آتا وہ بڑی سادگی
اور صفائی سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیتے اور آپ بڑی
بلاغت اور حکمت کے ساتھ اس کا جواب عنایت فرماتے اور قرآن مجید سے
استشہاد کرتے اس سے ان کا ایمان پختہ ہوتا اور قلبی اطمینان نصیب ہوتا۔

---

[1] زاد المعاد ج ۳ ص ۴۷-۴۸ [2] ایضاً ص ۴۸ [3] ایضاً ص ۵۵-۵۶

ایک جاہل بُت پرست اور نبی ہادیؐ کا مکالمہ

کنانہ بن عبدیا لیل اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے درمیان جو مکالمہ ہوا وہ یہاں پیش کیا جاتا ہے :۔

کنانہ :۔ جہاں تک زنا کا مسئلہ ہے ہم لوگ اکثر مجرد اور غیر شادی شدہ رہتے ہیں۱ اس لئے یہ ہمارے لئے ضروری ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم :۔ وہ تم پر حرام ہے اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَسَآءَ سَبِيْلًا (ترجمہ :۔ اور زنا کے پاس بھی نہ جانا کہ وہ بے حیائی اور بُری راہ ہے۔ سورۂ اسراء ۔ ۳۲)

کنانہ :۔ سود کے بارے میں جو آپ کہتے ہیں تو ہمارا سارا مال ہی سود ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم :۔ اصل سرمایہ راس المال لینے کا تمہیں حق ہے اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے :۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۲ (ترجمہ : مومنو! خدا سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو جتنا سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو)

کنانہ :۔ جہاں تک شراب کا تعلق ہے تو وہ تو ہماری زمین کا نچوڑ ہے اور ہمارے لئے بہت ضروری ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم :۔ اللہ تعالےٰ نے اسے حرام کیا ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (ترجمہ :۔ اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پاسے (یہ سب) ناپاک کام اعمال شیطان سے ہیں سو ان سے بچتے رہنا تاکہ نجات پاؤ۔ المائدہ ۔ ۹۰)

---

۱ غالباً یہ لوگ تجارت کے سلسلے میں کثرت سے سفر کرتے تھے۔ ۲ سورۃ البقرہ ۔ ۲۷۸

کنانہ :- ربتہ ثیت کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم :- اس کو توڑ ڈالو۔

کنانہ اور اس کے ہمراہی :- اگر ربتہ کو معلوم ہو جائے کہ آپ اس کو توڑ دینا چاہتے ہیں تو وہ اپنے سب پجاریوں کو ختم کر دے اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ابن عبد یالیل! تمھاری خرابی ہو تم کس قدر جاہل ہو۔ ربتہ ایک پتھر کے سوا کیا ہے؟

کنانہ اور اس کے ہمراہی :- ابن خطاب! ہم تمھارے پاس نہیں آئے ہیں پھر اس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا آپ اس کو توڑ ڈالیں ہم اس کو کبھی نہیں توڑ سکتے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم :- میں کسی آدمی کو تمھارے ہاں بھیج دوں گا جو تمھارے لئے یہ کام کر دے گا۔

پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو رخصت کی اجازت دی اور ان کا پورا اکرام کیا۔ انھوں نے کہا یا رسول اللہ! آپ ہمارے لئے ہماری قوم کا کوئی امیر بنا دیجئے۔ آپ نے عثمانؓ بن ابی العاصؓ کو ان کا امیر مقرر فرما دیا۔ یہ ان سب میں سب سے زیادہ کم عمر تھے لیکن علم دین میں ان کی دلچسپی آپ کے علم میں تھی انھوں نے وہاں جانے سے قبل قرآن مجید کی کچھ سورتیں بھی یاد کر لی تھیں۔

وفود کی آمد کا یہ سال عرب میں بت پرستی اور بت پرستوں کے استیصال کا سال تھا۔

زکوٰۃ و صدقات کی فرضیت

ہجرت کے پانچویں سال زکوٰۃ فرض ہوئی[1] اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے امراء و عمال کو ان تمام علاقوں میں جہاں اسلام پہونچ چکا تھا روانہ فرمایا۔

---

[1] زاد المعاد ج ۲ ص ۴۵   [2] حافظ ابن حجر کی تحقیق کے مطابق (فتح الباری)

حَجَّۃُ الوِدَاعْ

(ذی الحجہ ۱۰ھ - فروری ۶۳۲ء)

حجۃ الوداع اور اس کے وقت کا انتخاب

جب مشیت الٰہی کی تکمیل ہوگئی امت کے نفوس بت پرستی کی آلودگیوں اور جاہلیت کی عادتوں سے پاک اور ایمان کی روشنی سے منور ہوگئے اور ان کے دل کی سر زمین اسلام کی پیہم تعلیمات سے شاداب ہوگئی اور اسلام کی سرسبز ہوگئیں بیت اللہ بھی بتوں اور بت پرستوں کی گندگی سے پاک و صاف ہوگیا، مسلمانوں کے اندر جن کو حج بیت اللہ کئے ہوئے بہت عرصہ ہوگیا تھا، حج کا نیا شوق پیدا ہوگیا، اور محبت اور عشق کا جام نہ صرف لبریز ہوا بلکہ چھلکنے لگا، جدائی کی گھڑی بھی بہت قریب آگئی اور حالات کا تقاضہ ہوا کہ امت کو وداع کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ۱۰ھ میں حج کی اجازت عطا فرمائی۔ اسلام میں یہ آپ کا پہلا حج تھا۔

حجۃ الوداع کی دعوتی، تبلیغی اور تربیتی اہمیت

آپ مدینہ سے اس غرض سے روانہ ہوئے کہ حج بیت اللہ کریں گے، مسلمانوں سے ملیں گے، ان کو دین کی تعلیم دیں گے اور مناسک حج سکھائیں گے، حق کی شہادت دیں گے

اپنا فرض ادا کریں گے، مسلمانوں کو آخری نصیحتیں اور وصیتیں کریں گے، ان سے عہد و پیمان لیں گے، جاہلیت کے آخری آثار و نشانات کو مٹائیں گے اور قدموں کے پامال کریں گے، یہ حج ہزار وعظ اور ہزار درس و تعلیم کا قائم مقام تھا، یہ دراصل ایک چلتا پھرتا مدرسہ، ایک متحرک مسجد اور ایک گشتی چھاؤنی تھی، جہاں ایک جاہل علم سے آراستہ ہوتا، غافل اپنی غفلت سے بیدار ہوتا، سست و کاہل چست و چالاک اور کمزور طاقتور بنتا، ایک ابرِ رحمت سفر و قیام ہر حالت میں اور ہر وقت ان پر سایہ فگن رہتا، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور آپ کی محبت و شفقت اور آپ کی تربیت اور نگرانی و رہنمائی کا ابرِ رحمت تھا۔

حجۃ الوداع کا تاریخی ریکارڈ

صحابہ کرام جیسے ثقہ اور عادل راویوں نے اس سفر کے نازک سے نازک گوشوں اور پہلوؤں، اور اس کے چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کا ایک ایسا ریکارڈ ہمارے لیے محفوظ کر دیا ہے جس کی مثال نہ سلاطین و امراء کے سفرناموں میں ملتی ہے نہ علماء و مشائخ کی سرگزشتوں میں۔[1]

---

[1] مثلاً ان روایات میں یہاں تک موجود ہے کہ آپ نے احرام کے وقت کس قسم کی خوشبو استعمال کی تھی، اشعار کیا اور زخم لگایا تو اس کا نشان کس جانب تھا، کس مقام پر پہنچ کر لگایا، کس مقام پر آپ کو ایک شکار کئے ہوئے گورخر کا ہدیہ پیش کیا گیا، یہاں تک کہ منیٰ کی شب میں ایک سانپ کے بلِ سے نکلنے اور اس کے بچ کر نکل جانے کا واقعہ بھی منقول ہے، آپ نے جن لوگوں کو اس سفر میں اپنے ساتھ سواری پر سوار کیا اور [illegible] کی تعداد [illegible] ہے، سب محفوظ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر ہجرت و سفر حجۃ الوداع کے راستے اور ان کے مقامات
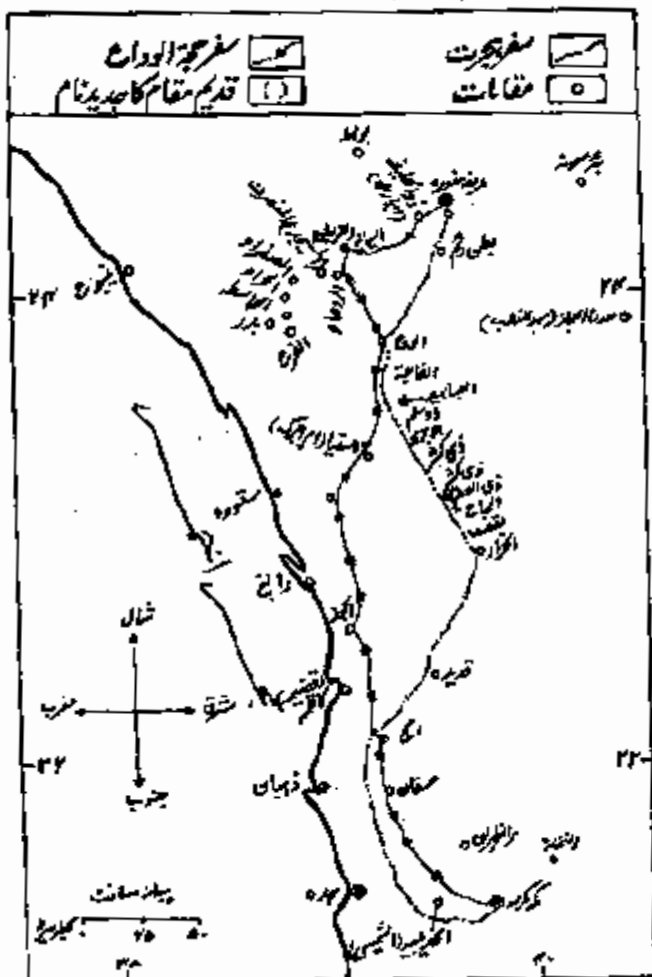
حجۃ الوداع کا اجمالی جائزہ

ہم اس سفر حج کا خلاصہ[1] بیان پیش کرتے ہیں جس کو "حجۃ الوداع" "حجۃ البلاغ" اور "حجۃ التمام" کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ ان سب کا جامع ہے بلکہ اس سے بھی سوا ہے آپ کے ساتھ اس سفر میں ایک لاکھ سے زیادہ صحابی شریک تھے[2]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حج کیسے کیا؟

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حج کا ارادہ فرمایا اور ذی قعدہ سنہ ۱۰ھ میں لوگوں کو اس کی اطلاع کر دی کہ آپ حج کے لئے جانے والے ہیں یہ سن کر لوگوں نے آپ کے ساتھ حج میں جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اس کی خبر مدینہ کے اطراف میں بھی پہونچی اور وہاں سے لوگ جوق جوق مدینہ حاضر ہوئے راستہ میں اتنی بڑی تعداد میں لوگ اس قافلہ میں شامل ہوتے گئے کہ

(باقی صفحہ ۵۱۰) نام آتی کہ اس حجام کا نام بھی مذکور ہے جس نے بال بنانے کی سعادت حاصل کی موئے مبارک تقسیم کئے تو اس کی بھی تفصیل موجود ہے کہ دائیں طرف کے بال کن لوگوں کو عطا ہوئے اور بائیں جانب کے کن لوگوں کو تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "حجۃ الوداع و جزء عمرات النبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم" مؤلفہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی مع مقدمہ بقلم مقدمہ کتاب راقم سطور (طبع بیروت) [1] ہم نے اس تلخیص میں علامہ ابن القیم کی تصنیف کتاب "زاد المعاد" سے استفادہ کیا ہے جنھوں نے اس موضوع کا روایات تاریخ اور نقد کی روشنی میں پورا استیعاب کیا ہے [2] ان کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار سے ایک لاکھ چوالیس ہزار تک بتائی گئی

ان کا شمار مشکل ہے بخلقت کا ایک ہجوم تھا جو آگے پیچھے دائیں بائیں صد نگاہ تک آپ کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھا۔ آپ مدینہ سے دن میں ظہر کے بعد ۲۵ ذی قعدہ کو سنیچر کے دن روانہ ہوئے پہلے ظہر کی چار رکعتیں آپ نے ادا فرمائیں اس سے پہلے خطبہ دیا اور اس میں احرام کے واجبات و سنن بیان فرمائے۔

پھر تلبیہ کہتے ہوئے روانہ ہوئے "لبیک اللّٰھم لبیک، لبیک لاشریک لک لبیک، إن الحمد والنعمۃ لک والملک لا شریک لک" بعض الفاظ میں کبھی اختصار (کبھی فرط شوق سے حذف و اضافہ کرتا) آپ یاس پر کبھی تکبیر نہ فرماتے تلبیہ کا سلسلہ آپ نے برابر جاری رکھا اور "عرج" میں پہونچ کر پڑاؤ کیا، آپ کی سواری اور حضرت ابوبکرؓ کی سواری ایک تھی۔

پھر آگے روانہ ہوئے اور "الابواء" پہونچے، وہاں سے چل کر وادی عسفان اور سرف میں پہونچے پھر وہاں سے روانہ ہو کر "ذی طوی" میں منزل کی اور سنیچر کی رات وہاں گذاری ۴ ذی الحجہ کی چاند تاریخ تھی فجر کی نماز آپ نے یہیں ادا فرمائی اسی روز غسل بھی فرمایا اور مکہ کی طرف روانہ ہوئے، مکہ میں آپ کا داخلہ دن میں بلندی کی طرف سے ہوا، وہاں سے چلتے ہوئے آپ حرم شریف میں داخل ہوئے یہ چاشت کا وقت تھا بیت اللہ پر نظر پڑتے ہی آپ نے فرمایا "اللّٰھم زد بیتک ھذا تشریفا وتعظیما وتکریما ومھابۃ" (اے اللہ اپنے اس گھر کی عزت و شرف تعظیم و تکریم اور رعب و ہیبت میں اور اضافہ فرما) دست مبارک بلند کرتے تکبیر کہتے اور ارشاد فرماتے "اللّٰھم انت السلام ومنک السلام حیّنا ربنا بالسلام" (اے اللہ آپ سلامتی دینا آپ ہی سے سلامتی کا وجود ہے اے ہمارے رب ہم کو سلامتی

کے ساتھ (رمل کیا)

جب حرم شریف میں آپ داخل ہوئے تو سب سے پہلے آپ نے کعبہ کا رخ کیا، حجر اسود کا سامنا ہوا تو آپ نے بغیر کسی مزاحمت کے اس کا بوسہ لیا پھر طواف کے لئے داہنی طرف رخ کیا بیت اللہ آپ کی بائیں طرف تھا اس طواف کے پہلے تین شوطوں میں آپ نے رمل[1] کیا۔

آپ تیز چل رہے تھے قدموں کا فاصلہ مختصر ہوتا تھا اپنی چادر آپ نے اپنے ایک شانہ پر ڈال لی تھی دوسرا شانہ مبارک کھلا ہوا تھا جب آپ حجر اسود کے سامنے گزرتے تو اس کی طرف اشارہ کر کے اپنی چھڑی سے استلام[2] کرتے جب طواف سے فراغت ہوئی تو مقام ابراہیم کے پیچھے تشریف لائے اور یہ آیت تلاوت فرمائی "وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى"[3] اس کے بعد یہاں دو رکعتیں پڑھیں نماز سے فارغ ہو کر پھر حجر اسود کے قریب تشریف لے گئے اور اس کا بوسہ لیا پھر صفا کی طرف اس دروازے سے چلے جو آپ کے مقابل تھا جب صفا کے قریب آئے تو یہ ﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ﴾ ابدأ بما بدأ اللہ بہ (صفا و مروہ اللہ تعالیٰ کے شعائر اور نشانیوں میں سے ہیں میں بھی شروع کرتا ہوں اس سے جس سے اللہ نے شروع کیا)۔

پھر آپ اس پر چڑھے یہاں تک کہ بیت اللہ آپ کو نظر آنے لگا، پھر قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر آپ نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت و کبریائی کا اعلان کیا۔

---

[1] رمل کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو مناسک کے مسائل کا انسائیکلوپیڈیا۔ [2] حجر کو بوسہ دینا اصطلاح میں استلام کہتے ہیں تفصیل کے لئے مسائل کا انسائیکلوپیڈیا دیکھی جائیں۔ [3] سورۃ بقرہ ۱۲۵

لا إله إلا الله وحده لا شريك له
له الملك وله الحمد وهو
على كل شيء قدير لا إله إلا الله
وحده أنجز وعده ونصر
عبده وهزم الأحزاب
وحده۔

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یکتا
ہے اس کا کوئی شریک نہیں اسی کا
سب ملک اور بادشاہی ہے اور اسی
کے لئے ساری حمد و تعریف ہے اور
وہ ہر چیز پر قادر ہے اللہ کے سوا کوئی
معبود نہیں وہ یکتا ہے اس کا کوئی
شریک نہیں اس نے اپنا وعدہ پورا
کیا اپنے بندہ کی مدد فرمائی اور تمام
جماعتوں اور گروہوں کو تنہا شکست دی تھی۔

مکہ میں آپ نے چار روز یکشنبہ، دوشنبہ، منگل، بدھ قیام فرمایا جمعرات کے روز
دن نکلتے ہی آپ تمام مسلمانوں کے ساتھ منیٰ تشریف لے آئے ظہر و عصر کی نمازیں
یہیں ادا فرمائیں اور رات بھی یہیں بسر کی یہ جمعہ کی رات تھی جب آفتاب نکل آیا تو
آپ عرفہ کی طرف روانہ ہوئے آپ نے دیکھا کہ نمرہ میں آپ کے لئے خیمہ لگایا جا چکا
ہے چنانچہ آپ اسی میں اترے جب زوال کا وقت ہو گیا تو اپنی اونٹنی "قصواء"
کو تیار کرنے کا حکم دیا پھر وہاں سے روانہ ہو کر عرفہ کے میدان کے وسط میں آپ
نے منزل کی اور اپنی سواری ہی پر تشریف رکھتے ہوئے ایک مہتم بالشان خطبہ دیا،
جس میں آپ نے اسلام کی بنیادوں کو واضح کیا اور شرک و جہالت کی بنیادیں
منہدم کر دیں اس میں ان تمام حرام چیزوں کی آپ نے تحریم فرمائی جن کے حرام
ہونے پر تمام مذاہب و اقوام متفق ہیں اور وہ ہیں ناحق خون کرنا، مال غصب کرنا

اور آپ نے رہبری کی۔ رسوم جاہلیت کی تمام باتوں اور مروجہ کاموں کو اپنے قدموں کے نیچے پامال کر دیا۔ جاہلیت کا شمہ ٔ کل کا کل آپ نے ختم فرما دیا اور اس کو بالکل باطل قرار دیا۔ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کی اور ان کے جو حقوق ہیں نیز ان کے ذمہ جو حقوق ہیں ان کی توضیح کی اور یہ بتایا کہ دستور کے مطابق خوراک و لباس نان نفقہ ان کا حق ہے۔

امت کو آپ نے کتاب اللہ کے ساتھ مضبوطی سے وابستہ رہنے کی وصیت کی اور ارشاد فرمایا کہ جب تک وہ اس کے ساتھ اپنے کو اچھی طرح وابستہ رکھیں گے گمراہ نہ ہوں گے۔ آپ نے ان کو آگاہ کیا کہ ان سے کل قیامت کے دن آپ کے بارے میں سوال ہو گا اور وہ اس کے جواب دہ ہوں گے اس موقع پر آپ نے تمام حاضرین سے دریافت فرمایا کہ وہ آپ کے متعلق کیا کہیں گے اور کیا گواہی دیں گے۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے پیغام حق کو بکمال و تمام پہونچا دیا، اپنا فرض پورا کیا، اور خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ یہ سن کر آپ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین بار اللہ تعالیٰ کو ان پر گواہ بنایا اور ان کو حکم دیا کہ جو یہاں موجود ہے وہ غیر حاضر تک یہ بات پہونچا دے۔

جب آپ خطبہ پورا فرما چکے تو آپ نے بلالؓ کو اذان کا حکم دیا، انھوں نے اذان دی، پھر آپ نے ظہر کی نماز دو رکعت پڑھی، اسی طرح عصر کی بھی دو ہی رکعتیں پڑھیں، یہ جمعہ کا روز تھا۔

نماز سے فارغ ہو کر آپ اپنی سواری پر تشریف لے گئے اور موقف[1] پر آئے یہاں آ کر

---

[1] موقف کی جگہ جہاں آپ نے دیر تک دعا فرمائی تھی وہ جگہ اب بھی عرفات میں معروف ہے۔

آپ اپنے اونٹ پر بیٹھے گئے اور غروب آفتاب تک دعاء و مناجات اور مالک الملک سے حضور تضرع وابتہال اور اپنی عاجزی و بے چارگی کے اظہار میں مشغول رہے، دعا میں آپ اپنا دست مبارک سینے تک اٹھاتے تھے جیسا کہ کوئی سائل اور مسکین نان جبینہ کا سوال کر رہا ہو، دعا یہ تھی:۔

اللهم إنك تسمع كلامي وترى	اے اللہ تو میری بات سنتا ہے اور میری
مكاني وتعلم سري وعلانيتي	جگہ کو دیکھتا ہے اور میرے پوشیدہ اور
لا يخفى عليك شيء من أمري	ظاہر کو جانتا ہے تجھ سے میری کوئی
أنا البائس الفقير المستغيث	بات چھپی نہیں رہ سکتی میں مصیبت زدہ
المستجير الوجل المشفق	ہوں محتاج ہوں فریادی ہوں
المقر المعترف بذنوبي	پناہ جو ہوں پریشان ہوں ہراساں
أسألك مسألة المسكين	ہوں اپنے گناہوں کا اقرار کرنے والا
وأبتهل إليك ابتهال	ہوں اعتراف کرنے والا ہوں،
المذنب الذليل وأدعوك	تیرے آگے سوال کرتا ہوں جیسے
دعاء الخائف الضرير من	بیکس سوال کرتے ہیں تیرے آگے
خضعت لك رقبته	گڑگڑاتا ہوں جیسے گنہگار ذلیل و خوار
وفاضت لك عيناه وذل	گڑگڑاتا ہے اور تجھ سے طلب کرتا
جسده ورغم أنفه لك	ہوں جیسے خوف زدہ آفت رسیدہ
اللهم لا تجعلني بدعائك	طلب کرتا ہو اور جیسے وہ شخص طلب
رب شقيا وكن بي رؤوفا رحيما	کرتا ہے جس کی گردن تیرے سامنے

یا خیر المسئولین
ویا خیر المعطین۔

جھکی ہوئی اور اس کے آنسو بہہ رہے
ہوں اور تن بدن گویا تیرے آگے
فروتنی کئے ہوئے ہو اور اپنی ناک تیرے
سامنے رگڑ رہا ہو اے رب تو مجھے اپنے
سے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ اور میرے
حق میں بڑا مہربان اور رحم کرنے والا
ہو جا اے سب مانگے جانے والوں سے
بہتر اور سب دینے والوں سے اچھے

اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا[1] جب آفتاب غروب ہو گیا تو آپ عرفہ سے روانہ ہو گئے اور اسامہ بن زید کو اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ آپ نہایت سکون و وقار کے ساتھ آگے چلے اونٹنی کی مہار آپ نے اس طرح سمیٹ لی تھی کہ قریب تھا کہ سر آپ کے کجاوے سے لگ جائے آپ کہتے جاتے تھے کہ لوگو! سکون اور اطمینان کے ساتھ چلو، راستہ بھر آپ تلبیہ کرتے جاتے، اور جب تک مزدلفہ پہنچ گئے یہ سلسلہ جاری رہا، وہاں پہنچتے ہی آپ نے حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم فرمایا، اذان دی گئی آپ کھڑے ہو گئے اور اونٹوں کو بٹھانے اور سامان اتارنے سے پہلے مغرب کی نماز ادا فرمائی جب لوگوں نے سامان اتار لیا تو آپ نے عشا کی نماز بھی ادا فرمائی پھر آپ آرام فرمانے کے لئے لیٹ گئے اور فجر تک سوئے۔

---

[1] سورۂ مائدہ۔ ۳

نماز فجر اول وقت ادا فرمائی، پھر سواری پر بیٹھے اور مشعر الحرام آئے اور قبلہ رو ہو کر دعا و تضرع، تکبیر و تہلیل اور ذکر میں مشغول ہو گئے یہاں تک کہ خوب روشنی پھیل گئی، یہ طلوع آفتاب سے پہلے کی بات ہے، پھر آپ مزدلفہ سے روانہ ہوئے فضل بن عباس رضی اللہ عنہ سواری پر آپ کے پیچھے تھے، آپ برابر تلبیہ میں مشغول رہے۔ آپ نے ابن عباس کو حکم دیا کہ رمی جمار کے لئے سات کنکریاں چن لیں، جب آپ وادی محسر کے وسط میں پہنچے تو آپ نے اونٹنی کو تیز کر دیا اور بہت عجلت فرمائی، اس لئے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں اصحاب فیل پر عذاب نازل ہوا تھا، یہاں تک کہ منیٰ پہنچے اور وہاں سے جمرۃ العقبہ تشریف لائے اور سواری پر طلوع آفتاب کے بعد رمی کی اور تلبیہ موقوف کیا۔

پھر منیٰ واپسی ہوئی، یہاں پہنچ کر آپ نے ایک بلیغ خطبہ دیا جس میں آپ نے یوم النحر کی حرمت سے آگاہ کیا اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس دن کی جو فضیلت ہے اس کو بیان کیا، دوسرے تمام شہروں پر مکہ کی افضلیت و برتری کا ذکر کیا اور جو کتاب اللہ کی روشنی میں ان کی قیادت کرے اس کی اطاعت و فرمانبرداری ان پر واجب قرار دی، پھر آپ نے حاضرین سے کہا کہ وہ اپنے مناسک و اعمالِ حج آپ سے معلوم کر لیں، آپ نے لوگوں کو یہ بھی تلقین فرمائی کہ دیکھو میرے بعد کافروں کی طرح نہ ہو جانا، جو ایک دوسرے کی گردن مارتے رہتے ہیں، آپ نے یہ بھی حکم دیا کہ یہ سب باتیں دوسروں تک پہنچا دی جائیں، اس خطبہ میں آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا۔

اعبدوا ربکم وصلوا خمسکم ——— اپنے رب کی عبادت کرو، پانچ وقت

وصوموا شہرکم واطیعوا اذا ——— کی نماز پڑھو، ایک مہینہ (رمضان)

اُمرکم تدخلوا جنـــة ربکم۔ — کا روزہ رکھو اور اپنے اولی الامر کی اطاعت کرو اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

اس وقت آپ نے لوگوں کے سامنے الوداعیہ کلمات بھی کہے اور اسی وجہ سے اس حج کا نام "حجۃ الوداع" پڑا۔

پھر آپ منیٰ میں "منحر" تشریف لے گئے، اور تریسٹھ اونٹ اپنے دست مبارک سے ذبح فرمائے جتنے اونٹ آپ نے ذبح کئے وہی تعداد آپ کی عمر شریف کے برسوں کی بھی تھی۔ اتنی تعداد کے بعد آپ نے توقف کیا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کہا کہ سو میں جتنے باقی ہیں وہ پورے کریں۔ غرض جب آپ نے قربانی مکمل کر لی تو آپ نے حجام کو طلب فرمایا اور حلق کروایا، اور اپنے موئے مبارک قریب کے لوگوں میں تقسیم فرما دیئے پھر سواری پر مکہ روانہ ہوئے، طواف افاضہ کیا جس کو طواف زیارت بھی کہتے ہیں پھر زمزم کے پاس تشریف لائے اور کھڑے ہو کر پانی نوش فرمایا، پھر اسی روز منیٰ واپسی ہوئی اور شب وہیں گذاری، دوسرے دن آپ زوال آفتاب کا انتظار کرتے رہے، جب زوال کا وقت ہو گیا تو آپ اپنی سواری سے اُتر کر رمی جمار کے لئے تشریف لے گئے جمرۂ اولیٰ سے آغاز فرمایا، اس کے بعد جمرۂ وسطیٰ اور جمرۂ عقبہ کے قریب جا کر رمی کی۔ منیٰ میں آپ نے دو خطبے دیئے، ایک قربانی کے دن جس کا ذکر ابھی اوپر گذرا، دوسرا قربانی کے دوسرے روز۔

یہاں آپ نے توقف فرمایا، اور ایام تشریق کے تینوں دن کی رمی مکمل کی، پھر مکہ کی طرف روانہ ہوئے، اور سحر کے وقت طواف وداع کیا، اور لوگوں کو تیاری

حکم فرمایا اور مدینہ روانہ ہو گئے۔[1]

جب آپ غدیر خم[2] پہونچے تو آپ نے ایک خطبہ دیا اور حضرت علیؓ کی فضیلت بیان فرمائی۔[3] اس موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

من کنت مولاہ فعلی مولاہ	جس کو میں محبوب ہوں علی بھی اس کو
اللھم وال من والاہ وعاد	محبوب ہونا چاہئے اے اللہ جو علی
من عاداہ۔	سے محبت رکھے تو بھی اس سے محبت رکھ اور جو ان سے عداوت رکھے اس سے تو بھی عداوت رکھ۔

جب آپ ذو الحلیفہ آئے تو رات بھیں بسر کی، سواد مدینہ پر آپ کی نظر پڑی تو آپ نے تین بار تکبیر کہی اور ارشاد فرمایا:۔

لا الٰہ الا اللہ وحدہ	خدا بزرگ و برتر ہے اس کے سوا
لا شریک لہ لہ الملک ولہ	کوئی معبود نہیں اس کا کوئی شریک
الحمد وھو علی کل شئ قدیر	نہیں بس اسی کی سلطنت ہے

---

[1] یہ حصہ زاد المعاد سے اختصار کے ساتھ لیا گیا ہے ج ۱ (ص ۱۲۱-۱۲۴) ان مباحث کو چھوڑ دیا گیا ہے جن میں مصنف نے زیادہ توسع و تفصیل سے کام لیا ہے اسی طرح فقہاء و محدثین کے اختلافات بھی حذف کر دیئے گئے ہیں

[2] غدیر خم مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے جحفہ اور اس میں تین میل کا فاصلہ ہے۔

[3] بروایت امام احمد و نسائی اس خطبہ کے ارشاد فرمانے کا ایک خاص سبب یہ تھا کہ لوگوں نے حضرت علیؓ کی آپ سے (بیجا) شکایت کی تھی اور ان کو آپ سے کبیدگی ہو گئی تھی بعض ایسے لوگوں نے ان پر اعتراضات کئے تھے جو یمن میں ان کے ساتھ تھے جو حضرت علی کے اس رویہ سے جو انصاف پر مبنی تھا ان کو یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ اس میں جانبداری سے کام لیا گیا ہے (ابن کثیر ج ۴ ص ۲۰۹، ۲۱۵)

آئبون تائبون، عابدون	اسی کے لئے مدح وستائش ہے دو
ساجدون، لربنا حامدون	ہر بات پر قادر ہے ہم لوٹنے آئے ہیں
صدق اللہ وعدہ ونصر	توبہ کرتے ہوئے قرار فرمانبردارانہ
عبدہ وھزم الاحزاب	زمین پر پیشانی رکھ کر اپنے پروردگار
وحدہ۔[1]	کی مدح وستائش میں مشغول ہو کر
	خدا نے اپنا وعدہ سچا کیا، اپنے
	بندہ کی نصرت کی اور تمام قبائل
	کو تنہا شکست دی۔

آپ مدینہ طیبہ میں دن کے وقت داخل ہوئے۔

حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خطبہ

یہاں پر ہم اس خطبہ کا پورا متن دے رہے ہیں جو آپ نے عرفہ کے روز دیا تھا اسی طرح ایام تشریق کے درمیان جو خطبہ آپ نے دیا تھا اس کا بھی پورا متن یہاں پیش کیا جا رہا ہے اس لئے کہ یہ دونوں عظیم الشان خطبے اپنے اندر حد درجہ سامان موعظت رکھتے ہیں اور کثیر فوائد پر مشتمل ہیں۔

خطبۂ عرفہ

ان دماءکم واموالکم تمھارا خون اور تمھارا مال اسی طرح

---

[1] زاد المعاد ج ۱ صفحہ ۲۴۳

حرام عليكم كحرمة يومكم هذا
في شهركم هذا في بلدكم هذا
ألا إن كل شيء من أمر
الجاهلية تحت قدمي
موضوع، ودماء الجاهلية
موضوعة، وإن أول دم
أضعه من دمائنا دم ابن
ربيعة بن الحارث كان
مسترضعا في بني سعد فقتله
هذيل، وربا الجاهلية
موضوع، وأول ربا أضع
من ربانا ربا العباس بن
عبد المطلب، فإنه موضوع
كله، فاتقوا الله في النساء
فإنكم أخذتموهن بأمانة
الله، واستحللتم فروجهن
بكلمة الله، ولكم عليهن
أن لا يوطئن فرشكم أحدا
تكرهونه، فإن فعلن ذلك

حرام ہے جس طرح یہ دن اس
مہینہ میں اور اس شہر میں حرام
ہے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ جاہلی امر
باطل ہے اور جاہلیت کے تمام
خون (یعنی انتقامی خون) باطل
کر دیئے گئے، اور سب سے پہلے میں
(اپنے خاندان کا خون) ابن
ربیعہ بن الحارث کا خون باطل
کر دیتا ہوں، جس نے بنی سعد میں
پرورش پائی اور اس کو ہذیل نے
قتل کر ڈالا۔ جاہلیت کے تمام
سود بھی باطل کر دیئے گئے اور
سب سے پہلے اپنے خاندان کا سود
عباس بن عبد المطلب کا سود
باطل کرتا ہوں، یہ سب کا سب
باطل ہے۔ عورتوں کے معاملہ میں
خدا سے ڈرو، تم نے ان کو اللہ
کی امانت کے طور پر حاصل کیا
ہے اور ان کی شرمگاہوں کو

فاضربوهن ضرباً غير مبرح ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف، وقد تركت فيكم ما لن تضلوا بعده إن اعتصمتم به، كتاب الله، وأنتم تسألون عني فما ذا أنتم قائلون؟ قالوا: نشهد أنك قد بلغت وأديت ونصحت، فقال بإصبعه السبابة يرفعها إلى السماء وينكبها إلى الناس اللهم اشهد ثلاث مرات۔[۱]

اللہ کی بات کے ساتھ حلال سمجھا ہے، اور تمہاری طرف سے ان پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی غیر کو (جس کا آنا تم کو گوارا نہیں ہے) نہ آنے دیں اگر وہ ایسا کریں تو تم ان کو ایسی مار مارو جو شدید نہ ہو، اور ان کا حق تمہارے اوپر یہ ہے کہ ان کو معقول طریقہ پر ان کی خوراک اور پوشاک کا انتظام کرو، میں تم میں ایک چیز چھوڑے جاتا ہوں اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو گمراہ نہ ہو گے وہ چیز کیا ہے؟ کتاب اللہ، تم سے خدا کے ہاں میری نسبت پوچھا جائے گا تم کیا جواب دو گے؟ صحابہ نے عرض کی کہ ہم کہیں گے کہ آپ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا اپنا فرض

---

[۱] مسلم، ابوداؤد وغیرہ بروایت حضرت جابر ابن عبداللہ بروایت حضرت جعفر صادق حضرت محمد الباقر سے اور وہ حضرت جابر سے کرتے ہیں۔

ادا کر دیا، آپ نے شہادت کی
انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور
تین مرتبہ فرمایا: "اے خدا! تو گواہ رہنا"۔

ایام تشریق کے وسط میں جو خطبہ آپ نے دیا تھا اس کا متن یہ ہے:-

یا أیها الناس هل تدرون	اے لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ یہ کون سا
فی أی شهر أنتم وفی أی یوم	مہینہ اور کون دن ہے؟ اور تم کس
أنتم وفی أی بلد أنتم	شہر میں ہو؟ لوگوں نے جواب دیا:
فقالوا: فی یوم حرام وبلد	یہ دن بڑا با حرمت اور یہ مہینہ
حرام، وشهر حرام، فقال: فإن	بڑا قابل احترام ہے اور یہ
دماءکم وأموالکم وأعراضکم	شہر حرمت والا ہے تو آپ نے
علیکم حرام کحرمة یومکم	فرمایا تمہارا خون، تمہارا مال اور
هذا فی شهرکم هذا وفی	تمہاری عزتیں اسی طرح قیامت
بلدکم هذا إلی یوم تلقونه	تک حرام ہیں جس طرح یہ دن،
ثم قال: اسمعوا منی تعیشوا	یہ مہینہ اور یہ شہر ہے، پھر
ألا لا تظلموا ألا لا تظلموا	فرمایا سنو مجھ سے وہ باتیں سنو
ألا لا تظلموا أنه لا یحل	جس سے تم صحیح زندگی گزارو گے
مال امرئ مسلم إلا بطیب	خبردار ظلم نہ کرنا خبردار ظلم نہ کرنا،
نفس منه، ألا وإن کل	خبردار ظلم نہ کرنا، کسی مسلمان شخص
دم ومال ومأثرة کانت	کے مال میں سے کچھ لینا جائز نہیں

في الجاهلية تحت قدمي	ان اگر وہ راضی ہو (تو) کوئی حرج
هذه إلى يوم القيامة،	نہیں، ہر خون کا بدلہ جو جاہلیت
وإن أول دم يوضع دم	سے چلا آتا تھا قیامت تک باطل
ربيعة بن الحارث بن[1]	ہے اور سب سے پہلا خون جو باطل
عبد المطلب كان مسترضعا	کیا جاتا ہے وہ ربیعہ بن الحارث
في بني ليث فقتلته هذيل	بن عبدالمطلب کا خون ہے جس نے
ألا وإن كل ربا في الجاهلية	بنی لیث میں پرورش پائی تھی اور
موضوع وإن الله عز وجل	ہذیل نے اس کو قتل کر دیا تھا،
قضى أن أول ربا يوضع	جاہلیت کے تمام سود بھی باطل
ربا العباس بن	کر دیئے گئے اور اللہ تعالیٰ نے
عبد المطلب، لكم رؤوس	فیصلہ فرما دیا کہ جو سب سے پہلا سود
أموالكم لا تظلمون ولا	باطل کیا جاتا ہے وہ عباس بن
تظلمون، ألا بدلت النوبات	عبدالمطلب کا سود ہے تمہارا

---

[1] صحیح مسلم اور سنن ابی داؤد وغیرہ میں ربیعہ کے بجائے ابن ربیعہ کے لفظ آئے ہیں، اور یہی مراد بھی ہے اس لئے کہ ربیعہ بن الحارث جو آپ کے رشتہ کے بھائی تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کی خلافت تک بقید حیات تھے جن روایات میں دم ربیعہ ابن الحارث کے الفاظ آئے ہیں ان کی تاویل کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے بیٹے حارث مقتول کے ولی الدم اور شرعاً و قانوناً اس کے مطالبہ کا استحقاق رکھتے تھے، اس لئے ان کا نام لیا گیا۔

(شرح صحیح مسلم للنووی ج ۸ ص ۱۸۲)

قد استدار كهيئته
يوم خلق الله السموات
والارض، ثم قرأ:
إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ
عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا
فِي كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ
السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا
أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ
الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوْا
فِيْهِنَّ أَنْفُسَكُمْ، ألا
لا ترجعوا بعدي كفارا
يضرب بعضكم رقاب
بعض، ألا إن الشيطان
قد أيس أن يعبده
المصلون، ولكنه في
التحريش بينكم،
واتقوا الله في النساء
فانهن عندكم عوان
لا يملكن لأنفسهن شيئا

راس حال میں تھا لہٰذا لئے محفوظ
ہے اس میں تم کسی پر ظلم کرو گے
نہ تمہارے اوپر ظلم کیا جائے گا
ابتدا میں خدا نے جب آسمان
و زمین کو پیدا کیا تھا زمانہ پھر کر
آج اسی نقطہ پر آ گیا پھر آپ نے
یہ آیت تلاوت فرمائی خدا کے
نزدیک مہینے گنتی میں (بارہ) ہیں
یعنی اس روز سے کہ اس نے
آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا کتاب
خدا میں (روز ہی سے) بارہ مہینے
(لکھے ہوئے) ہیں ان میں سے
چار مہینے ادب کے ہیں یہی دین
(کا) سیدھا راستہ ہے تو ان
(مہینوں) میں (قتال ناحق سے)
اپنے آپ پر ظلم نہ کرنا ہاں میرے
بعد کافر نہ ہو جانا کہ خود
ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو
اور ہاں شیطان بھی اس سے

الغائب فانه رب مُبَلَّغٍ
اسعد من سامع۔[1]

اللہ کے نام سے حلال کیا ہے آگاہ
ہوجاؤ جس کے پاس کوئی امانت
ہو وہ صاحب امانت کو واپس
کردے اتنا فرمانے کے بعد آپ نے
اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور فرمایا
کہ کیا میں نے پیغام پہنچا دیا کیا
میں نے پیغام پہنچا دیا پھر فرمایا
جو حاضر ہیں وہ غیر حاضر لوگوں
تک یہ بات پہنچا دیں کیونکہ بہت سے
غیر حاضر سننے والوں سے زیادہ
خوش بخت ہوتے ہیں۔

---

[1] رواہ الامام احمد عن ابی حرۃ الرقاشی عن عمہ۔

وفات

(ربیع الاول سنہ ۱۱ھ)

تبلیغ دعوت اور اجرائے شریعت کا نقطۂ عروج اور وصال حق کی تیاری

جب دین نقطۂ عروج اور نقطۂ کمال کو پہونچ گیا اور یہ آیت نازل ہوگئی۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ	(اور) آج ہم نے تمہارے لئے
وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ	تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی
وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ	نعمتیں تم پر پوری کردیں اور تمہارے
دِيْنًا۔ (سورۂ مائدہ۔ ۳)	لئے اسلام کو دین پسند کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغام ہدایت لوگوں کو پہونچا دیا، امانت الٰہی بے کم و کاست پہونچا دی، اور راہ حق میں قربانی اور جانفشانی کا حق ادا کر دیا، اور ایک ایسی امت تیار کر دی جو نبوت کی ذمہ داریوں کو (منصب نبوت پر فائز ہوئے بغیر) انجام دے سکتی تھی، اور اس کو اس دعوت کا علمبردار اور اس دین کو تحریف سے محفوظ رکھنے کا ذمہ دار بنایا گیا تھا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ	(مومنو) جتنی امتیں (یعنی قومیں)
لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب

وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔ (سورۂ آل عمران ۔ ۱۱۰)

بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔

اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی (جو اس دین کی اساس اور ایمان و یقین کا سرچشمہ اور منبع ہے) حفاظت اور بقا کی ذمہ داری بھی لے لی اور فرمایا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۔ (سورۂ حجر ۔ ۹)

بے شک یہ (کتاب) نصیحت ہمیں نے اُتاری ہے اور ہمیں اس کے نگہبان ہیں۔

دوسری طرف اس نے اس دین کی طرف لوگوں کے رجوع عام اور بڑی بڑی جماعتوں اور قبیلوں کے قبول اسلام سے اپنے نبی کی آنکھیں ٹھنڈی کیں اور پورے عالم میں اس کے فروغ اور اشاعت کے آثار ظاہر ہونے لگے، اور صاف نظر آنے لگا کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ دین دنیا کے سارے مذاہب پر غالب آجائے گا، سورۂ نصر میں اللہ تعالیٰ نے اس کا اشارہ بھی فرما دیا ہے:۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۝ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ (سورۂ نصر ۔ ۱ ۔ ۳)

جب اللہ کی مدد آپہنچی اور فتح (حاصل) ہوگئی اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ غول کے غول خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرو اور اس سے مغفرت مانگو، بے شک وہ معاف کرنے والا ہے۔

قرآن مجید کا دور اور اعتکاف میں اضافہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اعتکاف میں اس قدر اضافہ فرمایا کہ ہر سال آپ رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف کرتے تھے لیکن جس سال آپ کی وفات ہوئی آپ نے بیس روز کا اعتکاف فرمایا۔[1]

حضرت جبرئیل رمضان کی ہر شب میں آپ سے آکر ملتے اور آپ ان کے ساتھ قرآن مجید کا دور فرماتے تھے لیکن اس سال آپ نے فرمایا کہ اس مرتبہ وہ ایک کے بجائے دو بار آئے ہیں اس سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ میرا وقت قریب آگیا ہے۔[2]

اس وقت اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی کو لقاء رب اور وصال حق کی اجازت عطا فرمائی جس سے زیادہ اس کی ملاقات کا شوق و اشتیاق اور کسی کو نہیں ہو سکتا تھا، اللہ تعالےٰ کو بھی اس لقاء و کا اشتیاق تھا، اور آپ کو بھی اس کا غایت درجہ شوق اور آرزو تھی۔

اللہ تعالےٰ نے صحابۂ کرام کو جن سے بڑھ کر آپ کا چاہنے والا روئے زمین پر کوئی اور نہ تھا، آپ کی خبر وفات سننے اور اس صدمۂ عظیم کو برداشت کرنے کے لئے جس سے کوئی چارہ نہ تھا، پہلے سے تیار کر دیا تھا، اس سے پہلے غزوۂ احد میں ان کو آپ کی شہادت کی اچانک خبر ملی تھی پھر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شیطان کی سازش اور پھیلائی ہوئی افواہ تھی اور اللہ تعالےٰ نے ان کو اپنے نبی کی حیات طیبہ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الاعتکاف، باب الاعتکاف فی العشر الاوسط من رمضان۔

[2] صحیح بخاری کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ۔

اور صحبت سے فائدہ اٹھانے کا ایک موقع عطا فرمایا ہے اگرچہ یہ حادثہ بہر حال کسی نہ کسی روز پیش آنے والا ہے چنانچہ اللہ کا ارشاد ہوا کہ :-

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ	اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم تو صرف
مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ	(خدا کے) پیغمبر ہیں ان سے پہلے بھی
أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ	بہت سے پیغمبر ہو گذرے ہیں بھلا
وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ	اگر ان کی وفات ہو جائے یا شہید
فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا	کر دیئے جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر
وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ۔	جاؤ گے؟ (یعنی مرتد ہو جاؤ گے) اور
(سورۂ آل عمران ۔ ۱۴۴)	جو الٹے پھر جائے گا تو خدا کا کچھ نقصان
	نہیں کر سکے گا اور خدا شکر گزاروں
	کو (بڑا) ثواب دے گا۔

یہ تو تھیں مسلمان جن کی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بہترین تربیت فرمائی تھی اور ان کے دلوں کو اللہ تعالےٰ کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا اور دنیا کے دور دراز گوشے اور دور افتادہ قوموں تک اسلام کا پیغام پہونچانے کے عظیم اور مقدس کام میں ان کو مشغول کر دیا تھا۔ اس بات کا پورا یقین رکھتے تھے کہ آپ کسی نہ کسی دن اس عالم فانی کو چھوڑ کر ان سے جدا ہو جائیں گے اور اپنی اس طویل محنت و قربانی کا بہترین ثمرہ اور جزا ء حاصل کرنے کے لئے اپنے رب کے حضور حاضر ہو جائیں گے جب "إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ" کی آیت نازل ہوئی تو صحابۂ کرام نے سمجھ لیا کہ یہ آیت جدائی کی گھڑی کا پیش خیمہ اور اعلان ہے اس لئے کہ نبوت کا کام پایۂ تکمیل تک

پہنچ چکا ہے اور خدا کی نصرت اور فتح آ چکی ہے۔[1]

جس وقت آیت "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" نازل ہوئی تو اس وقت بہت سے جلیل القدر صحابہؓ نے محسوس کیا کہ آپؐ کی وفات کا وقت قریب ہے۔[2]

لقاءِ مولیٰ کا شوق اور دنیا کو وداع

حجۃ الوداع سے واپسی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی باتیں ظاہر ہوئیں جن سے اشارہ ملتا تھا کہ آپؐ کی وفات کے دن قریب ہیں اور آپ اپنے سفر کے لئے تیار اور "الرفیق الاعلیٰ" سے ملنے کے مشتاق ہیں۔ آپؐ نے اُحد کے شہداء کے لئے آٹھ سال کے بعد اس طرح دعا کی جیسے آپؐ عنقریب اپنے اصحاب کرامؓ سے جدا ہونے والے ہیں، جیسے کوئی زندوں اور مردوں کو رخصت کرنے والا کرتا ہے۔

پھر آپ منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا میں تمہارے آگے جانے والا ہوں اور تم پر گواہ ہوں اب تم سے ملاقات حوض (کوثر) پر ہوگی، میں اپنے کو اس مقام پر کھڑا ہوا دیکھ رہا ہوں، مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دے دی گئی ہیں، مجھے یہ ڈر نہیں کہ تم میرے بعد شرک کرنے لگو گے مگر یہ ڈرتا ہوں کہ تم حصولِ دنیا میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگو جیسی گذشتہ قومیں ہلاک ہوئیں تم بھی ہلاک ہو جاؤ۔[3]

---

[1] ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جہاں تک میں جانتا ہوں اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات مراد ہے۔ امام احمد نے اپنی مسند میں ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ جب اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے (اس سورہ میں) اپنی وفات کی خبر دی گئی ہے (دیکھئے تفسیر ابن کثیر)

[2] دیکھئے ابن کثیر ج ۲ ص ۱۴

[3] صحیح مسلم ج ۲ [illegible] سے ہو بہو [illegible] آئی ہے کہ آپ نے [illegible]

علالت کا آغاز

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو شکایت ماہ صفر کے آخر میں پیدا ہوئی۔[1] اس کا آغاز اس طرح ہوا کہ آپ نصف شب کو "جنت البقیع" تشریف لے گئے اور وہاں قبور کے لئے دعائے مغفرت کی پھر اپنے گھر تشریف لے آئے، جب صبح ہوئی تو اسی روز سے علالت شروع ہو گئی۔[2]

اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بقیع سے واپس آئے تو آپ نے مجھے اس حالت میں پایا کہ میرے سر میں سخت درد تھا میں کہہ رہی تھی کہ میرے سر میں کتنی تکلیف ہے آپ نے فرمایا نہیں میرے سر میں کتنا درد ہے عائشہؓ میرے سر میں کتنی تکلیف ہے۔[3] علالت میں ترقی ہوئی، اس وقت آپ میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھے آپ نے تمام ازواج مطہرات کو طلب فرمایا، اور ان سے اجازت چاہی کہ آپ بیماری کا زمانہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہاں گذاریں، انھوں نے اس کو بخوشی منظور کیا۔ آپ گھر کے دو افراد کے سہارے جن میں ایک فضل بن عباسؓ اور دوسرے حضرت علیؓ تھے، وہاں سے تشریف لے چلے سر مبارک پر پٹی بندھی ہوئی تھی آپ کے قدم زمین پر گھسٹتے تھے اسی طرح آپ حضرت عائشہؓ کے گھر تشریف لائے۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ آپ اس مرض میں جس میں آپ کی وفات ہوئی،

---

[1] احادیث کے تتبع اور قول راجح کی بنیاد پر یہی معلوم ہوتا ہے اور اغلب ہے کہ یہ دوشنبہ کا دن تھا۔ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۶۴۲ و ابن کثیر ج ۴ صفحہ ۲۲۴ [3] ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۶۴۳

[4] صحیح بخاری (باب مرض النبی صلے اللہ علیہ وسلم و وفاتہ)

یہ فرماتے تھے کہ عائشہؓ! میں اس کھانے کی تکلیف اب تک محسوس کرتا ہوں جو میں نے خیبر میں کھایا تھا، اس وقت اس زہر سے میری رگ (ابہر) کٹ رہی ہے۔[1]

آخری لشکر

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو ایک لشکر کا امیر بنا کر شام بھیجا اور ان کو حکم دیا کہ ان کے گھوڑے "بلقا" اور "داروم" کی سرزمین تک ضرور جائیں جو ارض فلسطین کا حصہ ہے۔

اس لشکر میں آپؐ نے مہاجرین و انصار کے چیدہ اور برگزیدہ اصحاب کو شامل فرمایا جن میں سب سے نمایاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے آپؐ نے ان کو سخت بیماری کی حالت میں وہاں پہونچنے کا حکم دیا اس وقت اسامہ کا لشکر جُرف میں خیمہ انداز تھا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی اس خواہش کی تکمیل کے لئے اسامہؓ کے لشکر کی پیش قدمی ملتوی نہیں کی بلکہ اس پر پورا پورا عمل کیا۔

جیشِ اسامہ سے آپؐ کی دلچسپی و اہتمام

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے محسوس کیا کہ لوگ جیشِ اسامہ کے معاملہ میں کمی کر رہے

---

[1] صحیح بخاری صفحہ (باب مرض النبی صلے اللہ علیہ وسلم ووفاتہ) حافظ بیہقی نے حاکم سے اور انھوں نے زہری سے بھی اس کو روایت کیا ہے، دیکھئے ابن کثیر ج ۴ ص ۴۴۹ صفحہ ابہر اس رگ کو کہتے ہیں جو پیٹھ سے نکل کر دل سے جا ملتی ہے وہ اگر کٹ جائے تو زندگی ممکن نہیں۔ ابن ہشام ج ۲ ص ۶۴۲ طبقات ابن سعد ج ۲

سستی سے کام لے رہے ہیں اس سے پہلے لوگوں نے اسی طرح کی باتیں کی تھیں کہ ایک نوعمر لڑکے کو جلیل القدر صحابہ مہاجرین وانصار کا امیر بنا دیا گیا ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اسی درد کی حالت میں سر پر پٹی باندھے ہوئے باہر تشریف لائے اور منبر پر بیٹھ گئے پہلے اللہ تعالے کی وہ حمد وثنا بیان کی جو اس کی شان کے لائق ہے پھر فرمایا کہ لوگو! اسامہ کے لشکر کو روانہ کرو، اگر آج تم ان کی امارت کے بارے میں چہ میگوئی کرتے ہو تو کل تم نے ان کے والد کی امارت پر بھی اعتراض کیا تھا بے شک وہ امارت کے لائق اور اس کے مستحق ہیں جیسے ان کے والد اس کے مستحق تھے اتنا فرما کر آپ منبر سے نیچے اتر گئے اور لوگ تیزی کے ساتھ تیاریوں میں مشغول ہو گئے ادھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی علالت پہلے سے بہت بڑھ گئی دوسری طرف اسامہ اس لشکر کو لے کر روانہ ہو گئے اور مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر جرف میں اپنا پڑاؤ ڈالا تاکہ باقی لوگ جو آنا چاہتے ہیں وہ سب یہاں مجتمع ہو جائیں اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طبیعت سخت علیل تھی اور اسامہ اور ان کے سب ساتھی وہاں رکے ہوئے تھے کہ دیکھیے اللہ تعالے کو کیا منظور ہے۔[1]

آپ نے اسی مرض میں مسلمانوں کو وصیت کی کہ وہ اس لشکر کو اسی طرح روانہ کریں جیسے آپ ان کو روانہ فرمایا کرتے تھے اور جزیرۃ العرب میں دو دین باقی نہ چھوڑیں اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مشرکین کو یہاں سے نکال دیا جائے۔[2]

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۶۴۲ نیز صحیح البخاری کتاب المغازی باب غزوۂ زید بن حارثہ اس میں اتنا اضافہ ہے کہ اگر تم آج ان کی امارت پر طعن کرتے ہو تو اس سے پہلے تم نے ان کے والد کی امارت پر طعن کیا تھا اور خدا کی قسم وہ امارت کے مستحق تھے اور مجھے محبوب تھے اور ان کے بعد یہ میرے بہت محبوب لوگوں میں ہیں۔ [2] دیکھیے صحیح بخاری باب (مرض النبی صلے اللہ علیہ وسلم ووفاتہ)

مسلمانوں کے لئے دعا اور ذاتی سربلندی کے شوق اور تکبر سے دور رہنے کی تاکید

علالت کے دوران کچھ صحابۂ کرامؓ حضرت عائشہؓ کے گھر میں جمع ہوئے آپ نے ان کا گرمجوشی سے استقبال کیا اور ان کے لئے ہدایت نصرت اور توفیق کی دعا فرمائی پھر آپ نے فرمایا میں تم کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ کو اپنے بعد تمہارا نگران بناتا ہوں، میں اس کی طرف سے تم کو کھلا ہوا ڈرانے والا اور آگاہی دینے والا ہوں۔ دیکھنا اللہ کی بستیوں اور اس کے بندوں میں تکبر اور بڑائی کو اختیار نہ کرنا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لئے اور تمہارے لئے پہلے ہی فرما دیا ہے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا	وہ (جو) آخرت کا گھر ہے (ہم نے
لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا	اسے) ان لوگوں کے لئے (تیار) کر رکھا
فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ	ہے جو ملک میں بڑائی اور فساد کا
وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝	ارادہ نہیں کرتے اور انجام (نیک)
(سورۃ قصص ۔ ۸۳)	تو پرہیزگاروں ہی کا ہے۔

پھر آپ نے یہ آیت بھی تلاوت فرمائی:۔

اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى	کیا غرور کرنے والوں کا ٹھکانہ
لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ۔ (سورۃ زمر ۔ ۶۰)	دوزخ میں نہیں ہے؟

دنیا سے بے تعلقی اور مال کے بچ جانے سے کراہت

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ آپ نے اپنے مرض میں

نقد بیہقی (السیرۃ النبویہ لابن کثیر ج ۴ ص ۵۰۹)

میں ایک مرتبہ دریافت فرمایا عائشہؓ! اُس سونے کو کیا کیا؟ وہ پانچ سے سات یا نو کے درمیان اشرفیاں لائیں آپ ان کو لے کر اپنے ہاتھ سے الٹتے پلٹتے اور فرماتے میں ان کے ساتھ خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا،[1] جاؤ ان سب کو راہ خدا میں خیرات کردو۔[2]

نماز کا اہتمام اور حضرت ابو بکرؓ کی امامت

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تکلیف میں اضافہ ہوا اور طبیعت زیادہ بھاری ہوگئی تو آپ نے اسی حالت میں دریافت فرمایا کہ کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی؟ ہم نے جواب دیا کہ نہیں یا رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں آپ نے فرمایا میرے لئے لگن میں پانی رکھدو لوگوں نے تعمیل کی آپ نے غسل فرمایا، پھر آپ نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن آپ پر غشی طاری ہوگئی جب آپ کو ہوش آیا تو فرمایا کہ کیا سب نے نماز پڑھ لی لوگوں نے جواب دیا نہیں یا رسول اللہ سب لوگ آپ کے منتظر ہیں تمام لوگ اس وقت مسجد نبوی میں خاموش بیٹھے ہوئے نماز عشاء کے منتظر تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکرؓ کو پیغام کہلوایا کہ وہ نماز پڑھائیں حضرت ابو بکرؓ بہت رقیق القلب شخص تھے انھوں نے کہا عمرؓ! تم نماز پڑھاؤ، انھوں نے کہا آپ اس کے مجھ سے زیادہ مستحق ہیں چنانچہ ان دنوں حضرت ابو بکرؓ ہی نماز پڑھاتے رہے۔

پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کچھ افاقہ اور طبیعت میں ہلکا پن محسوس فرمایا

---

[1] حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں "ما ظن محمد باللہ عزوجل لو لقیہ وھذہ عندہ" جس کا لفظی ترجمہ ہوا محمد کا اللہ کے ساتھ کیا گمان ہوگا جب اس سے ملاقات ہوگی اس حالت میں کہ یہ اشرفیاں اس وقت اس کے پاس ہیں [2] مسند امام احمد ج ۶ ص ۱۸۲

اور دو آدمیوں کے سہارے سے جن میں ایک عباس رضی اللہ عنہ اور دوسرے علی کرم اللہ وجہہ تھے ظہر کی نماز کے لئے باہر تشریف لائے جب حضرت ابوبکرؓ نے آپ کو دیکھا تو وہ پیچھے ہٹنے لگے آپ نے اشارہ سے ان کو ہدایت کی کہ وہ پیچھے نہ ہٹیں اور ان دونوں حضرات سے آپ نے فرمایا کہ وہ آپ کو ابوبکرؓ کے پہلو میں بٹھا دیں حضرت ابوبکرؓ کھڑے ہو کر نماز پڑھا رہے تھے اور آپ نے بیٹھ کر نماز ادا فرمائی۔

ام الفضل بنت الحارث روایت کرتی ہیں کہ میں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو مغرب کی نماز میں سورۂ "والمرسلات" پڑھتے سنا اس کے بعد آپ کو کسی نماز کی امامت کی نوبت نہ آئی یہاں تک کہ اللہ تعالے نے آپ کو اپنے پاس بلا لیا۔[1]

خطبۃ الوداع

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان ایام میں منبر پر بیٹھ کر جو کلمات ارشاد فرمائے اور اس حالت میں فرمائے کہ آپ کے سر مبارک پر کپڑا بندھا ہوا تھا اس میں ایک یہ تھی پھر آپ نے یہ بھی فرمایا "إن عبداً من عباد الله خيّره الله بين الدنيا وبين ما عنده فاختار ما عند الله" (اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کو اللہ تعالے نے دنیا اور اللہ کے پاس جو چیز ہے کسی ایک چیز کے اختیار کرنے کا اختیار دیا تو اس نے جو کچھ اللہ کے پاس ہے اُسے اختیار کیا) حضرت ابوبکرؓ ان الفاظ کے معانی سمجھ گئے اور انھوں نے محسوس کیا کہ یہ دراصل آپ نے اپنے لئے کہا ہے یہ خیال کرکے وہ رو پڑے اور کہا "نہیں! ہماری جانیں اور اولاد سب آپ پر فدا ہیں"۔

---

[1] صحیح بخاری (باب مرض النبی صلے اللہ علیہ وسلم و وفاتہ) کل احادیث کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری خطبہ

آپ نے فرمایا[1] "ابوبکر ٹھہرو! جلدی نہ کرو، بلاشبہ کوئی شخص ایسا نہیں جس نے اپنی جان اور مال سے مجھ پر اتنا احسان کیا ہے جتنا ابوبکرؓ نے کیا ہے اور اگر میں لوگوں میں کسی کو اپنا خلیل (خاص دوست و محبوب) بناتا تو ابوبکر کو اپنا خلیل بناتا لیکن اسلام کا تعلق اور اسلام سے محبت سب سے افضل ہے۔"

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ[2] "مسجد کا ہر دریچہ جس سے میرا سامنا ہوتا ہے بند کر دو صرف خوخہ ابوبکر کو باقی چھوڑ دو۔"[3]

انصار کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت

حضرت ابوبکر و حضرت عباس رضی اللہ عنہما ایک بار انصار کی ایک محفل سے گذرے انھوں نے دیکھا کہ وہ لوگ رو رہے ہیں انھوں نے پوچھا کہ تم لوگ کیوں رو رہے ہو؟ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور مجلس ہمیں یاد آرہی ہے۔ رسول اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع پہونچی تو آپ باہر تشریف لائے آپ نے سر مبارک کو اپنی چادر کے حاشیے سے لپیٹ لیا تھا آپ منبر پر جلوہ افروز ہوگئے[4] اس دن کے بعد پھر آپ کو منبر پر جانے کا موقع نہیں آیا پھر آپ نے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصلاۃ۔ باب الخوخۃ والممر فی الصلاۃ۔ [2] یہاں پر خوخہ کا لفظ آیا ہے جو چھوٹے دروازے کو کہتے ہیں۔ [3] صحیح بخاری کتاب الصلاۃ۔ باب الخوخۃ والممر فی الصلاۃ۔

[4] نزول الحج میں ہے کہ یہ آپ کا بالکل آخری خطبہ ہے جو جمعرات کے روز ظہر کی نماز کے بعد آپ نے دیا تھا۔ اس لئے کہ حدیث کے راوی جو انس بن مالکؓ ہیں کہتے ہیں کہ آپ منبر پر چڑھے اور اس دن کے بعد پھر آپ کو منبر پر جانے کا موقع نہیں آیا۔ پھر آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی جو اس کی شان کے لائق ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی جو اس کی شانِ عالی کے لائق ہے اس کے بعد ارشاد ہوا:
میں تم کو انصار کے ساتھ (حسنِ سلوک کی) وصیت کرتا ہوں وہ جسم و جان
کی طرح ہیں اور میرے معتمد و رازدار ہیں ان پر جو ذمہ داری تھی اس کو انھوں نے
پورا کیا، ان کا جو دوسروں پر حق ہے وہ باقی ہے اس لئے ان کے اچھے اور صالح
لوگوں کی بات قبول کرنا اور ان میں سے جو لوگ قصوروار ہوں ان سے درگذر کرنا۔[1]

مسلمانوں کی صف بستہ جماعت پر آپ کی آخری نگاہ

حضرت ابوبکرؓ بدستور نماز پڑھاتے رہے دوشنبہ کے دن وہ لوگ نماز فجر میں
صفیں باندھے کھڑے تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجرۂ مبارک کا پردہ
اٹھایا، اور کچھ دیر آپ یہ منظر دیکھتے رہے کہ مسلمان اپنے رب کے حضور کس طرح حاضر
ہیں، آپ کی دعوت اور جہاد و سعی کیا رنگ لائی ہے، اور یہ امت کس طرح تیار
ہوگئی ہے جو نماز سے اس درجہ تعلق رکھتی ہے اور اپنے نبی کی موجودگی اور غیر موجودگی
دونوں حالتوں میں اسی جوش و نشاط اور سرور و شوق کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں
دست بستہ حاضر ہے، یہ خوشگوار منظر اور اس کامیابی کو دیکھ کر جو آپ سے پہلے کسی نبی یا
داعی کو نصیب نہیں ہوئی تھی آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں،[2] اور آپ کو اس کا اطمینان
ہوگیا کہ اس دین اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے اس امت کا تعلق دائمی اور پائدار ہے جو
آپ کی وفات کے بعد بھی ختم نہ ہوگا، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس وقت آپ کو اس بلکے

---

[1] صحیح بخاری، مناقب اصحاب النبی صلے اللہ علیہ وسلم، باب قول النبی صلے اللہ علیہ وسلم اقبلوا من
محسنهم وتجاوزوا عن مسيئهم۔

کس درجہ مسرت ہوئی ہوگی یہ منظر دیکھ کر روئے انور فرط مسرت سے دمکنے لگا۔
صحابہ کرام رضوان اللہ تعالے علیہم اجمعین بیان فرماتے ہیں کہ:-

• رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حجرۂ عائشہؓ کا پردہ کھولا اور کھڑے ہوئے ہمیں برابر دیکھتے رہے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کا رخ مبارک ورق مصحف ہے پھر آپ مسکرائے اور ہنس پڑے ہمیں یہ خیال ہوا کہ کہیں ہم لوگ بھی خوشی کی وجہ سے آزمائش میں نہ پڑجائیں اور بے قابو ہوجائیں ہمیں یہ بھی گمان ہوا کہ شاید آپ نماز کے لئے باہر تشریف لانے والے ہیں آپ نے اشارہ فرمایا کہ نماز پوری کرو اس کے بعد آپ نے پردہ گرادیا، اور اسی دن آپ کی وفات ہوئی۔[1]

قبروں کی پرستش اور ان کو عبادت گاہ و سجدہ گاہ بنانے کی مذمت و ممانعت

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے آخری الفاظ یہ تھے" قاتل اللہ الیھود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیاءھم مساجد، لایبقین دینان علی ارض العرب"[2] (اللہ تعالیٰ یہود ونصاریٰ کو تباہ کرے انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا، سرزمین عرب میں بیک وقت دو مذہب نہ رہیں۔)

حضرت عائشہ و حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم روایت کرتے ہیں کہ جب رحلت کا وقت قریب آیا تو ایک سیاہ دھاری دار چادر آپ پر پڑی ہوئی تھی آپ اس کو کبھی چہرۂ مبارک پر ڈال لیتے جب تکلیف محسوس ہونے لگتی تو اس کو ہٹا دیتے اسی حال میں آپ نے ارشاد فرمایا "یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو

---

[1] صحیح بخاری کتاب المغازی باب مرض النبی صلے اللہ علیہ وسلم ووفاتہ [2] بروایت موطا امام مالک ابن ہشام ج ۲ ص ۱۶۸

عبادت گاہیں بنالیا" آپ مسلمانوں کو اس سے خبردار فرما رہے تھے۔

آخری وصیت

وفات کے قریب آپ کی زیادہ تر وصیت یہی "الصلاۃ وما ملکت ایمانکم" (دیکھو نماز کا خیال رکھنا اور اپنے ماتحتوں اور غلاموں کا) یہ آپ برابر فرماتے رہے، یہاں تک کہ زبان سے ان الفاظ کا ادا کرنا مشکل ہو گیا اور معلوم ہوا کہ آپ سینۂ مبارک سے ان الفاظ کو ادا کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔[1]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ آپ نے اس موقع پر نماز اور زکوٰۃ اور ماتحتوں اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت فرمائی۔[2]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ میں آپ پر معوذتین پڑھ کر دم کرنے لگی کہ آپ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور فرمایا "فی الرفیق الاعلیٰ، فی الرفیق الاعلیٰ" (سب سے اعلیٰ رفیق کے پاس، سب سے اعلیٰ رفیق کے پاس۔)

اسی وقت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ داخل ہوئے ان کے ہاتھ میں (پیلو کی) تر و تازہ شاخ تھی آپ نے اس کو ایک نظر دیکھا، میں نے خیال کیا کہ شاید آپ کو اس کی ضرورت ہے چنانچہ میں نے وہ ان سے لے کر نیچے وغیرہ جھاڑ کر مسواک تیار کی اور آپ کو پیش کی آپ نے اس سے بہت اچھے طریقے سے مسواک کی جیسے آپ کبھی فرمایا کرتے تھے، پھر مجھے واپس کرنے لگے لیکن وہ آپ کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔[3]

---

[1] بیہقی واحمد (ابن کثیر السیرۃ النبویہ ج ۴ ص ۴۷۳) [2] امام احمد (ابن کثیر ج ۴ ص ۴۷۳)

[3] سیرت ابن کثیر ج ۴ ص ۴۷۴ نیز صحیح بخاری (باب مرض النبی صلے اللہ علیہ وسلم ووفاتہ)

فرماتی ہیں کہ آپ کے سامنے پانی کا کٹورہ تھا، آپ اپنے ہاتھ پانی کے اندر ڈالتے اور چہرہ پر پھیر لیتے اور اس کے بعد فرماتے لا الٰہ الا اللہ ان للموت لسکرات "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں بے شک سکرات موت برحق ہے" پھر آپ نے بائیں انگلی بلند یا اٹھائی اور فرمانے لگے فی الرفیق الاعلیٰ... فی الرفیق الاعلیٰ "(سب سے اعلیٰ و برتر رفیق کے پاس) یہاں تک کہ روح مبارک نے عالم بالا کا رخ کیا، اور آپ کا ہاتھ پانی میں ایک طرف جھک گیا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جس وقت جدائی کی گھڑی قریب آئی تو اس وقت آپ کا سر میری ران پر تھا، ایک گھڑی کے لئے آپ پر غشی طاری ہوئی، پھر آپ کو ہوش آگیا، اور آپ نے کمرے کی چھت کی طرف اپنی نظر اٹھائی اور فرمایا "اللھم الرفیق الاعلیٰ" (بے شک سب سے اعلیٰ اور برتر رفیق کے پاس) یہ وہ آخری الفاظ تھے جو رحلت کے وقت آپ کی زبان مبارک سے نکلے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دنیا سے کس حال میں تشریف لے گئے!

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب اس دنیا سے پردہ فرمایا تو اس وقت پورا جزیرۃ العرب آپ کے زیر نگیں تھا، دنیا کے سلاطین و امراء پر آپ کا جلال و رعب تھا، آپ کے اصحاب کرام آپ پر اپنی جان و اولاد اور مال و متاع سب نثار کرنے پر تیار رہتے تھے اس سب کے باوجود آپ دنیا سے اس حال میں تشریف لے گئے کہ آپ نے ایک دینار یا درہم ایک غلام یا لونڈی اور کوئی چیز بھی اپنے پیچھے نہیں چھوڑی، صرف آپ کا ایک سفید خچر تھا، آپ کے ہتھیار تھے اور ایک قطعہ زمین جس کو آپ نے صدقہ کر دیا تھا۔

لے صحیح بخاری "باب مرض النبی صلے اللہ علیہ وسلم ووفاتہ" سے ایضاً

آپ کی وفات اس حالت میں ہوئی کہ آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس[2] صاع جو پر رہن رکھی ہوئی تھی[1] اور آپ کے پاس کوئی چیز نہ تھی کہ آپ اسے دے کر زرہ کو چھڑا سکتے یہاں تک کہ آپ دنیا سے تشریف لے گئے[3]۔

آپ نے اپنے مرض وفات میں چالیس[4] غلاموں کو آزاد فرمایا۔ آپ کے پاس سات[5] یا چھ دینار تھے حضرت عائشہؓ کو حکم ہوا کہ ان کو بھی صدقہ کر دیں[6]۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات اس حالت میں ہوئی کہ میرے گھر میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کو کوئی جاندار کھا سکتا۔ البتہ ذرا سا جو میری الماری پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسی میں سے کچھ کھایا وہ بہت دن چلا یہاں تک کہ میں نے ایک دن اس کی ناپ تول کر لی اس کے بعد وہ ختم ہو گیا[7]۔

آپ کی وفات دوشنبہ کے روز ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو زوال کے بعد ہوئی[8]۔ عمر شریف ترسٹھ[9] سال تھی۔ یہ مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ تاریک و وحشت ناک دن سب سے بڑا صدمہ و ابتلاء اور پوری انسانیت کا سب سے بڑا سانحہ تھا جس طرح آپ کی ولادت باسعادت کا دن انسانیت کا سب سے مبارک روشن اور تابناک دن تھا۔ حضرت انسؓ و ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جس دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تھے تو مدینہ کی ہر چیز آپ کی آمد سے روشن اور منور ہو گئی تھی جس دن آپ کی وفات ہوئی اس دن اس کی ہر چیز تاریک ہو گئی۔ ام ایمن بھی رو رہی تھیں لوگوں نے سبب پوچھا تو انھوں نے جواب دیا کہ بے شک مجھے معلوم تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے

---

[1] ایضاً [2] بیہقی ص۱۸۵ [3] السیرۃ الحلبیہ ج ۳ ص۳۸۶ [4] متفق علیہ البخاری کتاب الرقاق و فضل الفقر و مسلم کتاب الزہد [5] بعض روایات میں چاشت اور بعض میں آتا ہے جو چاشت کا وقت ہے (الاستیعاب ج ۱ ص۳۴) [6] قول راجح کی بنا پر

تشریف لے جا چکے لیکن یہ اس بات پر دلیل ہے کہ آپ کے بعد وحی کا سلسلہ ہم سے ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا۔[1]

صحابۂ کرامؓ نے آپ کی وفات کی خبر کس طرح سنی؟

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر صحابۂ کرامؓ پر بجلی بن کر گری، اس کی وجہ ان کا وہ عاشقانہ تعلق تھا جس کی نظیر نہیں، وہ آپ کے سایۂ شفقت میں اس طرح رہنے کے عادی ہو گئے تھے جس طرح بچے ماں باپ کے آغوشِ محبت میں رہتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ وہ اس لحاظ سے ان پر جتنا بھی اثر پڑتا کم تھا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ	(لوگو) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر
أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ	آئے ہیں تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم
حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ	ہوتی ہے اور تمہاری بھلائی کے بہت
رَءُوفٌ رَحِيمٌ	خواہشمند ہیں (اور) مومنوں پر نہایت
(سورۂ توبہ - ۱۲۸)	شفقت کرنے والے (اور) مہربان ہیں۔

ان میں سے ہر شخص سمجھتا تھا کہ وہ آپ کی نگاہِ لطف و کرم میں سب سے زیادہ محبوب اور مورد الطاف و کرم ہے بعض صحابہ کو اس پر یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ واقعہ پیش آیا، ان میں پیش پیش حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے انھوں نے ایسے شخص پر جو یہ کہتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی بہت نکیر کی وہ مسجد نبوی میں آئے اور لوگوں کے سامنے خطبہ دیا اور کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات اس وقت تک نہ ہوگی جب تک اللہ تعالیٰ منافقوں کو ختم نہ کر دے گا۔[2]

---

[1] السیرۃ النبویہ از ابن کثیر ج ۴ ص ۵۴۴-۵۴۱ [2] سیرت ابن کثیر ج ۴ ص ۵۴۴-۵۴۶

حضرت ابوبکرؓ کا فیصلہ کن اور جرأت مندانہ قدم

ان حالات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ (جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کی نیابت وخلافت اور تربیت حکمت کے موقف کے لئے تیار کیا تھا) جیسے عالی حوصلہ اور عزم وہمت کے پہاڑ کی ضرورت تھی جو اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کرے، ابوبکر صدیقؓ کو (جو مقام سُنح (مضافات مدینہ) میں تھے) اطلاع ہوئی تو اسی وقت تشریف لائے (بخاری ص ۶۴۰) اور مسجد نبوی کے دروازے پر ایک لمحہ کے لئے رکے اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں سے خطاب کر رہے تھے، پھر وہ کسی طرف ملتفت ہوئے بغیر سیدھے حضرت عائشہؓ کے گھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچے آپ پر ایک چادر پڑی ہوئی تھی، انھوں نے ذرا سی چادر سرکائی اور جھک کر روئے مبارک کا بوسہ لیا اور کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان! موت کا مزہ جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے مقدر کر دیا تھا آپ نے چکھ لیا، اب آپ کو کبھی بھی موت کی تکلیف نہ ہوگی، اس کے بعد انھوں نے چادر سے آپ کے روئے مبارک کو اسی طرح چھپا دیا، اس کے بعد مسجد نبوی میں آئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سلسلۂ کلام اس وقت تک جاری تھا، انھوں نے کہا عمر! ذرا ٹھہرو، لیکن جوشِ کلام میں انھوں نے ان کی بات نہیں سنی، جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ وہ خاموش نہیں ہوتے ہیں تو مجمع کی طرف متوجہ ہو کر انھوں نے اپنی بات شروع کی، لوگوں نے جب ان کو خطاب کرتے ہوئے دیکھا تو انھوں نے حضرت عمرؓ کی طرف سے رخ پھیر کر ان کی بات سننی شروع کر دی، حضرت ابوبکرؓ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد کہا:-

"لوگو! اگر کوئی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عبادت کرتا تھا تو اس کو معلوم

ہو جائے کہ) بلاشبہ ان کی وفات ہو گئی ۱؎ اور اگر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا (تو اطمینان رکھے کہ) اللہ تعالیٰ زندہ ہے اس کے لئے موت نہیں ہے پھر انھوں نے یہ آیت تلاوت کی۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ	اور محمد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو صرف
مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ اَفَاۡئِنْ	(خدا کے) پیغمبر ہیں ان سے پہلے بھی بہت
مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى	پیغمبر ہو گذرے ہیں بھلا اگر ان کی وفات
اَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ	ہو جائے یا شہید کر دیئے جائیں تو تم
عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ	الٹے پاؤں پھر جاؤ (یعنی مرتد ہو جاؤ)
شَيْـًٔا ۚ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ	اور جو الٹے پاؤں پھر جائے گا تو خدا
(سورۂ آل عمران۔ ۱۴۴)	کا کچھ نقصان نہیں کر سکے گا اور
	خدا شکر گذاروں کو (بڑا) ثواب دیگا۔

جو لوگ اس موقع پر حاضر تھے اور یہ منظر دیکھ رہے تھے ان کا بیان ہے کہ خدا کی قسم جب حضرت ابوبکرؓ نے یہ آیت تلاوت کی تو ایسا محسوس ہوا کہ یہ آیت ابھی نازل ہوئی ہے اور حضرت ابوبکرؓ نے ان کے منہ کی بات کہہ دی ۲؎ حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے جب ابوبکرؓ کو آیت تلاوت کرتے سنا تو حیرت زدہ ہو کر بے ساختہ زمین پر گر گیا میرے پیروں کی طاقت ختم ہو چکی تھی اس وقت گویا مجھے علم ہوا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا۔

حضرت ابوبکرؓ کی بیعت خلافت

اس کے بعد تمام مسلمانوں نے سقیفۂ بنو ساعدہ میں حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی

۱؎ سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۶۵۵-۶۵۶ صحیح بخاری باب مرض النبی صلے اللہ علیہ وسلم و وفاتہ میں بھی تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔

بیعت کی اس عجلت کا مقصد یہ تھا کہ شیطان کو ان کے دلوں میں پھوٹ ڈالنے اور ان کے اندر رخنہ پیدا کرنے کا موقع نہ ملے اور نفسانی خواہشات سر نہ اٹھا سکیں اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم اپنے آخری سفر پر اس حال میں روانہ ہوں کہ مسلمان ایک رشتہ میں منسلک اور پوری طرح متحد اور ہم رنگ و ہم آہنگ ہوں ان کا امیر موجود ہوا اور ان کے سارے معاملات کی دیکھ بھال کر رہا ہو حتیٰ کہ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین اور تدفین کا کام بھی امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کے ہاتھوں انجام پائے۔

مسلمانوں نے اپنے رسولؐ کو کس طرح الوداع کہا؟

اس کے بعد لوگ پر سکون ہو گئے اور تحیر اور صدمہ کا اثر بدلی کی طرح چھٹ گیا اور وہ ان کاموں اور ان فرائض کی تکمیل میں مشغول ہو گئے جو آپ ان کو تعلیم فرما گئے تھے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے غسل اور تکفین کا کام آپ کے اہل بیت نے انجام دیا اس سے فراغت کے بعد آپ کے جنازۂ مبارک کو گھر ہی میں رکھ دیا گیا، اس موقع پر حضرت ابو بکرؓ نے کہا کہ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جس نبی کا بھی انتقال ہوا اس کو اسی جگہ دفن کیا گیا جہاں اس کا انتقال ہوا تھا چنانچہ آپ کا بستر مبارک جس پر آپ کی وفات ہوئی تھی اٹھا دیا گیا اور ٹھیک اس کے نیچے قبر کھودی گئی ابو طلحہ انصاریؓ نے یہ کام انجام دیا۔

اس کے بعد لوگوں نے جماعتوں کی شکل میں حاضر ہونا شروع کیا ایک جماعت آتی اور نماز جنازہ ادا کرتی اس کے بعد دوسری جماعت آ کر نماز پڑھتی پہلے مرد داخل ہوتے رہے اس کے بعد عورتوں کو داخلہ کی اجازت دی گئی عورتوں کے بعد بچوں کو

اجازت ہوئی اور انھوں نے بھی آپ کی نماز جنازہ پڑھی کہ لوگوں کی کسی کو ان نمازوں کا امام نہیں بنایا گیا۔
یہ واقعہ سہ شنبہ کے دن کا ہے۔[۱]

یہ مدینہ کا ایک غمگین دن تھا جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فجر کی اذان دی تو حضور کو یاد کر کے بے ساختہ رونے لگے اور ان کی ہچکیاں بندھ گئیں اس منظر سے مسلمان جو پہلے ہی سے غمزدہ تھے اور گہرے رنج و غم میں ڈوب گئے۔ ان کے کان اس اذان کو اس حال میں سنتے تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان تشریف فرما تھے۔ آج صورت بالکل مختلف تھی۔

ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ تعالے عنہا کہتی تھیں کیسی سخت مصیبت تھی کہ جب ہم کو یہ مصیبت یاد آتی ہے تو ہر مصیبت اس کی وجہ سے ہیچ اور آسان معلوم ہوتی ہے۔[۲]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے متعلق ارشاد فرمایا تھا اے لوگو تم میں سے (یا اہل ایمان میں سے) کسی کو بھی کوئی مصیبت پہونچے تو وہ اس مصیبت کے بدلے جو اس کو دوسرے کے انتقال سے پیش آتی ہے اس مصیبت سے تسلی حاصل کرے جو میری وفات سے اس کو پیش آئی ہے اس لئے کہ میری اُمت میں کسی شخص کو میری وفات کے صدمہ سے بڑھ کر کوئی مصیبت پیش نہ آئے گی۔[۳]

جب تدفین سے لوگ فارغ ہو گئے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔

یا انس أطابت أنفسکم أن تحثوا	انس کیا تمہارے دل نے یہ گوارا
علی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم التراب[۴]	کر لیا کہ جسد مبارک پر مٹی ڈالو۔

---

[۱] سیرت ابن ہشام ج ۴ ص ۲۲۶ [۲] طبقات ابن سعد (السیرۃ النبویہ لابن کثیر ج ۴ ص ...)

[۳] السیرۃ النبویہ لابن کثیر ج ۴ ص ۵۳۹-۵۳۸ [۴] ایضاً ج ۴ ص ... از ابن ماجہ۔

[۵] صحیح بخاری (باب مرض النبی صلے اللہ علیہ وسلم ووفاتہ)

ازواجِ مطہراتؓ اولادِ اطہار

ازواجِ مطہراتؓ

آپؐ کی ازواجِ مطہرات میں سب سے پہلا نام حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کا ہے یہ آپؐ کی نبوت سے قبل جب ان کی عمر چالیس سال تھی آپ کی زوجیت میں آگئیں حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کی نبوت کے بعد پیش آنے والی مشکلات میں آپؐ کی پوری مدد کی اور جہاد و قربانی میں آپؐ کی رفاقت و شرکت فرمائی اور اپنی ہمدردی و محبت اور اپنے مال و دولت ہر طریقے سے آپؐ کی تسلی و تسکین کا سامان فراہم کیا، ان کی وفات ہجرت سے تین سال قبل ہوئی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تمام اولاد (سیدنا ابراہیمؑ کو چھوڑ کر) حضرت خدیجہؓ سے ہے آپ تعریف اور احسان شناسی کے ساتھ ان کا ہمیشہ ذکر فرماتے رہے کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی بکری ذبح کی جاتی تو آپؐ اس کے مختلف حصے علیٰحدہ کر کے حضرت خدیجہؓ کی سہیلیوں کے پاس بھجواتے۔[1]

ان کی وفات کے کچھ دن بعد سودہؓ بنت زمعہ کو آپؐ کی رفیقۂ حیات بننے کا شرف حاصل ہوا اس کے بعد آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے نکاح کیا جو آپؐ کی بہت عزیز و محبوب بیوی تھیں امت کی خواتین میں فقہ و علم دین میں کوئی ان کا ہم پایہ

---

[1] متفق علیہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سے کسی پر اتنا رشک نہیں آیا جتنا خدیجہؓ پر حالانکہ میں نے ان کو دیکھا بھی نہیں۔

شہنشاہ اکابر صحابہ مختلف مسائل میں ان سے رجوع فرماتے تھے اور ان کا فتویٰ اور رائے چلتے تھے اس کے بعد آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا، اس کے بعد زینب بنت خزیمہ سے شادی ہوئی جو شادی کے دو ماہ بعد وفات پا گئیں پھر ام سلمہ رضی اللہ عنہا آپ کی زوجیت میں آئیں ان کی وفات ازواج مطہرات میں سب کے بعد ہوئی پھر آپ نے زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے شادی کی یہ آپ کی پھوپھی امیمہ کی صاحبزادی تھیں، اس کے بعد آپ نے جویریہ بنت الحارث سے شادی کی جو قبیلہ بنو المصطلق سے تعلق رکھتی تھیں پھر ابو سفیانؓ کی صاحبزادی ام حبیبہؓ سے اور اس کے بعد قبیلہ بنی النضیر کے سردار حیی بن اخطب کی صاحبزادی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی، حیی بن اخطب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون بن عمرانؑ کی اولاد میں تھے، اس کے بعد میمونہ بنت الحارث الہلالیہ سے شادی ہوئی، ازواج مطہرات میں سب سے آخر میں انھیں کو یہ شرف حاصل ہوا۔

اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت آپ کی ازواج مطہرات میں سے نوؓ موجود تھیں، حضرت خدیجہؓ اور زینب بنت خزیمہؓ کا آپ کی حیات مبارکہ ہی میں انتقال ہو گیا تھا، یہ سب حضرت عائشہؓ کو مستثنیٰ کر کے شادی شدہ تھیں۔[1]

آپ کی وفات کے وقت آپ کی دو باندیاں موجود تھیں، ایک ماریہ بنت شمعون جو مصر کے قبطی خاندان کی فرد تھیں جن کو مصر کے حاکم مقوقس نے آپ کی

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۲۶-۲۹ تلخیص کے ساتھ۔

۵۵۳

خدمت میں پیش کیا تھا اور جو آپ کے صاحبزادے سیدنا ابراہیم رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں، دوسری قبیلۂ بنی النضیر کی خاتون ریحانہ بنت زید تھیں،[1] اسلام قبول کرنے کے بعد آپ نے ان کو آزاد فرما دیا، اور پھر ان کو اپنی زوجیت میں قبول کیا۔[2]

اللہ تعالیٰ نے آپ کی وفات کے بعد ان ازواج مطہرات سے شادی ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے دی، اس لئے کہ وہ اُمہات المومنین کا درجہ رکھتی تھیں، اس تعلق (زوجیت کے ساتھ) اس مقدس اور نازک رشتہ کی پوری حفاظت و رعایت ناممکن تھی، جو اُمت کو اپنے نبی سے (دائمی طور پر) ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ تَنْكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمًا ۝ (احزاب-۵۳)

اور تم کو یہ شایاں نہیں کہ پیغمبر خدا کو تکلیف دو اور نہ یہ کہ ان کی بیویوں سے کبھی ان کے بعد نکاح کرو بے شک یہ خدا کے نزدیک بڑے گناہ کا کام ہے۔

ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

علماء کا اس بات پر کلی اتفاق ہے کہ آپ کی وفات کے بعد کسی دوسرے کے لئے آپ کی ازواج مطہرات سے نکاح کرنا حرام ہے اس لئے کہ دنیا و آخرت دونوں جگہ وہ آپ کی بیبیاں اور اہل ایمان کی مائیں ہیں۔[3]

---

[1] ایک روایت یہ ہے کہ وہ بنی قریظہ میں سے تھیں۔ [2] ابن کثیر ج ۳ ص ۵۰۵-۶

[3] ابن کثیر ج ۳ ص ۵۰۶ (دار الاندلس)

تعددِ ازدواج پر ایک نظر

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمرِ مبارک کا ایک حصہ تجرد میں گذارا، پچیس سال کی وہ مدت ہے جو نوجوانی کا خاص زمانہ ہوتا ہے آپ کمال الفطرت انسانی وعربی جوانمردی اور جسمانی صحت کا بہترین و اعلیٰ پیکر تھے بادیۂ عرب میں آپ کی پرورش ہوئی تھی، تہذیب و تمدن کے امراض اور عیوب سے اللہ تعالےٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی تھی شہسواری اور مردانگی کی اعلیٰ صفات سے آپ کو حصۂ وافر ملا تھا جن کی عربوں کی نگاہ میں بڑی اہمیت تھی، اور جن کو علم النفس اور اخلاقیات کے ماہرین بھی تسلیم کرتے ہیں۔

آپ کے بدترین دشمنوں کو بھی اس زمانہ میں (جو نبوت سے قبل آپ کا بہت اہم اور نازک دور تھا) آپ پر حرف گیری اور انگشت نمائی کا کوئی موقع ملا نہ آپ کی نبوت کے بعد آج تک کسی نے اس سلسلہ میں آپ پر نکتہ چینی کی آپ طہارت وعفت، پاکیزگیٔ قلب ونظر، معصومیت وطہارت کی اعلیٰ مثال تھے اور ہر اس کمزوری سے بہت دور تھے جو آپ کے شایانِ شان نہ تھی۔

پچیس سال کی اس عمر میں آپ نے سب سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا جو بیوہ تھیں چالیس سال کی ان کی عمر تھی، اس سے قبل ان کی دو شادیاں ہو چکی تھیں صاحبِ اولاد تھیں، پھر مشہور قول کے مطابق آپ کے اور ان کے سن میں پندرہ سال کا فرق تھا ـــــ اس کے بعد دوسری شادی آپ نے حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے اس وقت کی جبکہ آپ کی عمرِ مبارک پچاس سال سے زیادہ

ہو چکی تھی ان کے شوہر کا حبشہ میں ایک مہاجر مسلمان کی حیثیت سے انتقال ہو گیا تھا۔ آپ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ کسی دوشیزہ اور غیر شادی شدہ خاتون سے نکاح نہیں فرمایا۔ اس کے علاوہ جتنی شادیاں آپ نے فرمائیں اس میں دین اور دعوت دین کی کوئی مصلحت، فراخ قلبی و عالی ظرفی، مکارم اخلاق، مسلمانوں کا کوئی مفاد عام، یا کسی بڑے اجتماعی خطرہ اور فسدہ کا سدباب آپ کے پیش نظر تھا۔ رشتوں اور ازدواجی قرابتوں کی عربوں کی قبائلی اور سماجی زندگی میں جس قدر اہمیت ہے اتنی کسی اور سوسائٹی اور سماج میں نہیں ہے اس لئے یہ شادیاں اور نئی قرابتیں اسلامی دعوت اور اسلام کے قتالی معاشرہ کی تاریخ، خون بہانے سے حفاظت اور عربی قبائل کے ضرر سے بچاؤ کا ایک بڑا ذریعہ تھیں۔

مزید بر آں ان ازواج مطہرات کے ساتھ آپ کی زندگی کوئی عیش و آرام مرفہ الحالی یا لذت کام و دہن کی زندگی نہ تھی جو تعدد ازدواج میں بہت لوگوں کے پیش نظر رہتا ہے وہ اس درجہ زہد و تقشف اور ایثار و قناعت کی زندگی تھی، جس کی استطاعت قدیم اور جدید دور کے بڑے سے بڑے حوصلہ مند اور اولوالعزم افراد اور نامور زعماء میں بھی نہیں ہے اس کی کچھ جھلکیاں اور نمونے اخلاق و شمائل کے حصے میں پیش کئے جائیں گے تاہم ایک انصاف پسند شخص کے لئے قرآن مجید کی یہی ایک آیت کافی ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ	اے پیغمبر اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ
إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا	اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی
وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ	زینت و آرائش کی خواستگار ہو تو

وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا	میں تمھیں کچھ مال دے دوں اور اچھی طرح
وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ	سے رخصت کر دوں اور اگر تم
وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ	خدا اور اس کے پیغمبر اور عاقبت
أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنكُنَّ	کے گھر (یعنی بہشت) کی طلبگار
أَجْرًا عَظِيمًا ۝	ہو تو تم میں جو نیکوکاری کرنے والی
(سورۂ احزاب - ۲۸-۲۹)	ہیں ان کے لئے خدا نے اجر عظیم
	تیار کر رکھا ہے۔

اس عالی مقصد، پاکیزہ جذبہ، پاک و صاف ذہن اور عمیق و حکیمانہ تربیت کا اثر یہ تھا کہ ان سب ازواج مطہرات نے بغیر کسی ہچکچاہٹ اور ادنیٰ درجہ کے تردد کے اللہ اور اس کے رسول اور دار آخرت کو ترجیح دی۔ مثال اور نمونہ کے طور پر حضرت عائشہؓ کا وہ جواب کافی ہے جو اس سلسلہ میں انھوں نے دیا۔ آپ نے یہ آیت ان کے سامنے تلاوت کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ دیکھو جلدی نہ کرنا اپنے والدین سے مشورہ ضرور کر لینا۔ انھوں نے جواب دیا، بھلا اس معاملہ میں بھی والدین سے مشورہ کی ضرورت ہے؟ مجھے تو اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کا گھر مطلوب ہے۔[1] وہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سب بیویوں نے ایسا ہی کیا۔[2]

تعددِ ازدواج اور اس کے نفسیاتی، اقتصادی اور اجتماعی اثرات اور تقاضوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دعوت کی عظیم ذمہ داری، جہد و مجاہدہ کی زندگی اور مسلمانوں کے اہم ترین امور سے ایک لمحہ کے لئے غافل نہیں کیا، بلکہ اس آپ کی

---

[1] صحیح بخاری بروایت عائشہ رضی اللہ عنہا [2] صحیح بخاری، ابن ابی حاتم و احمد۔

سرگرمی و اولوالعزمی اور قوت و نشاط میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ ازواج مطہرات تبلیغِ اسلام اور تعلیم دین کے مقصدِ عظیم میں آپ کی معاون و مددگار تھیں، وہ غزوات میں آپ کے ہمراہ رہتی تھیں، زخمیوں کا علاج معالجہ اور مریضوں کی تیمارداری کرتی تھیں۔ آپ کی گھریلو اور معاشرتی زندگی کا ایک نہائی حصہ اور اس کے علاوہ دینی احکام و تعلیمات ازواج مطہرات ہی کی رہین منت ہیں، اور مسلمانوں نے ان کو باقاعدہ ان سے سیکھا، یاد کیا، اور دوسروں کو بتایا اور سکھایا ہے۔[1]

اس سلسلہ میں صرف حضرت عائشہؓ کا نام لے لینا کافی ہے، جن کے متعلق فن علم الرجال اور طبقات کے امام ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے اپنی مشہور کتاب "تذکرۃ الحفاظ" میں لکھا ہے کہ:۔

"وہ فقہائے صحابہ میں بھی سب سے ممتاز تھیں، فقہائے صحابہ مسائل میں ان سے رجوع کرتے تھے، قبیصہ بنت ذویبؓ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ مسائل سے سب سے زیادہ واقف تھیں، اکابر صحابہ ان سے مسائل دریافت کیا کرتے تھے، ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ ہم اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کسی حدیث کے سمجھنے میں دشواری ہوتی تو عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کرتے اور ان کے پاس اس کا علم ضرور ہوتا

---

[1] تعددِ ازدواج اور اس کی حکمتوں اور مصلحتوں اور اس کے متعلق حالات اور تقاضوں پر مولانا قاضی محمد سلیمان منصورپوری نے اپنی نفیس کتاب "رحمۃ للعالمین" کی دوسری جلد میں بہت اچھی روشنی ڈالی ہے (دیکھئے ص ۱۴۳-۱۴۹) مصر کے مشہور فاضل عباس محمود العقاد نے اپنی کتاب "عبقریۃ محمد" میں تعددِ ازدواج اور اسباب تعدد زوجات کے عنوان کے تحت اچھا کلام کیا ہے۔

حسان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے قرآن مجید، حلال و حرام، فرائض واحکام، اشعار، تاریخ عرب اور انساب سے ان سے زیادہ کسی کو واقف نہیں پایا۔[1]

جہاں تک مکارم اخلاق، عالی ہمتی، جود و سخا، ہمدردی و غمخواری اور شفقت و دلداری کا تعلق ہے اس کے متعلق جتنا بھی کہا جائے کم ہی ہوگا۔ اس سلسلہ میں وہ روایت کافی ہوگی جو ہشام نے اپنے والد سے نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ایک لاکھ درہم بھیجے مگر ایک ہفتہ بھی نہیں گذرا تھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اہل حاجت پر اس کو تقسیم کر کے فارغ ہو گئیں۔ ان کی باندی نے کہا کہ اگر آپ اس میں ایک درہم کا گوشت خرید لیتیں تو اچھا تھا، کہنے لگیں کہ تم نے اس وقت یاد دلا دیا ہوتا۔[2] اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روزہ سے تھیں۔[3]

اس مسئلہ نے مغرب کے بہت سے اہل فکر اور مستشرقین کے ذہن و دماغ کو الجھا رکھا ہے، اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ انھوں نے ممالک عرب میں اسلامی شریعت میں ازدواجی زندگی کے مخصوص نظام کو مغربی تصورات اور حالات و عادات اور رسم و رواج کا پابند بنانا چاہا ہے، انھوں نے مغرب کے پیمانوں کو (جو ایک خاص تہذیب اور سوسائٹی کی پیداوار ہیں) اس صورت حال پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے جو فطرت سلیم اور عربی ماحول کے عین مطابق تھی، اور جس کے پیچھے مختلف اخلاقی اور سماجی مصالح کار فرما تھے، اور جس کی خدا کی طرف سے اجازت بھی تھی،

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸-۲۷ شائع کردہ داراحیاء التراث العربی۔ [2] ایضاً ص ۲۸

[3] ایضاً۔ اضافہ از روایت ام ذرہ۔

یہ دراصل مغربی طرز فکر اور مغربی مصنفین کی کتابوں کا ایک بہت گہرا پہلو ہے کہ وہ پہلے مغرب کو میزان قرار دیتے ہیں پھر ہر اس چیز کے خلاف جو اس کے خلاف ہو، بے رحمی سے فیصلے صادر کرتے ہیں، وہ خود ایک مسئلہ کھڑا کرتے ہیں جس کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی پھر اس کو حل کرنے کے درپے ہوتے ہیں یہ ان کے قومی تکبر اور مغرب کے دل پسند افکار و تصورات کی حد سے بڑھی ہوئی تقدیس کا نتیجہ ہے۔

انگریز مصنف مسٹر بوڈلے (R. V. C BODLEY) نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے مسئلہ میں اس مغربی احساس اور طرز فکر پر بہت جرأت وانصاف سے تنقید کی ہے، وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:-

"محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی ازدواجی زندگی کو نہ تو مغرب کے پیمانہ سے جانچنے کی ضرورت ہے، اور نہ ان رسم و قوانین کے نقطۂ نظر سے جنہیں عیسائیت نے جنم دیا ہے، یہ لوگ نہ مغربی تھے نہ عیسائی، بلکہ وہ ایک ایسے ملک میں اور ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے جبکہ ان کے اپنے ضابطہ اخلاق کا ہی چلن تھا، اس کے باوجود امریکہ اور یورپ کے ضابطہ اخلاق کو عربوں کے ضابطہ اخلاق سے بہتر سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے مغرب کے پاس مشرق کو دینے کے لئے بہت کچھ ہے، لیکن اپنے طریقہ زندگی کو بہتر اور اپنے ضابطہ اخلاق کو اعلیٰ ثابت کرنے کے لئے ابھی انھیں بہت چھان بین کرنے کی ضرورت ہے، لہٰذا انھیں دوسروں کے مذہب و تمدن پر نکتہ چینی کرنے سے احتراز کرنا چاہئے۔"[1]

لے [1] R. V. C. BODLEY :- THE MESSENGER, THE LIFE OF MOHAMMAD (LONDON. 1946) P. P. 202-203

اس کے علاوہ تعدد ازدواج کی وہ قباحت جو آج مغرب میں ایک بدیہی حقیقت بن گئی ہے اور اہل مغرب نے اس کو آنکھ بند کر کے تسلیم کر لیا ہے کوئی ایسی قباحت نہیں جو صدیوں اور نسلوں تک قائم رہے یہ نہ طے شدہ علمی اصولوں پر قائم ہے نہ انسان کی فطرت سلیم کے مطابق ہے یہ دراصل ایک خیالی اور جذباتی قباحت ہے جو پرجوش اور طاقتور پروپیگنڈہ اور تشہیر کے بل پر قائم ہے اور اس کا پورا امکان ہے کہ زمانہ کی رفتار اور اقتصادی سماجی اور تہذیبی رجحانات اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ نہ صرف اس کا زور کم ہو جائے بلکہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

ایک مغربی مصنف (ALWIN TOFFLER) نے اپنی کتاب (FUTURE SHOCK) میں جس نے مغرب کے علمی حلقوں میں ایک ہلچل مچا دی ہے اس ذہنی و سماجی تبدیلی کی طرف اشارے بھی کیے ہیں جس کا مستقبل قریب میں امکان ہے۔[1]

آپؐ کی اولاد و احفاد

حضرت خدیجہؓ سے آپؐ کے ایک صاحبزادے القاسم پیدا ہوئے، ان ہی کے نام پر آپؐ کی کنیت تھی، ان کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا، اس کے بعد بالترتیب حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہن پیدا ہوئیں، صاحبزادوں میں حضرت عبد اللہؓ، حضرت طیب اور حضرت طاہرؓ کے بارے میں اختلاف ہے بعض لوگوں نے ان کو تین شمار کیا ہے لیکن علامہ ابن القیم کی تحقیق یہ ہے کہ طیب و طاہر عبد اللہ کے لقب تھے،

---

[1] ALWIN TOFFLER, FUTURE SHOCK, BANTAM BOOKS INC, NEW YORK 1970

یہ سب اولاد حضرت خدیجہؓ سے تھی۔[1]

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپؐ کی سب سے زیادہ محبوب صاحبزادی تھیں آپؐ نے ان ہی کے لیے ارشاد فرمایا تھا کہ وہ جنت میں عورتوں کی سردار ہوں گی،[2] آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ فاطمہ میرے جسم کا ایک حصہ ہے جس بات سے اسے تکلیف ہوتی ہے اس سے مجھے ہوتی ہے۔[3] اہل بیت میں سب سے پہلے آپؐ ہی اس دنیا سے رخصت ہوئیں اور آپؐ سے جا ملیں۔

ماریہ قبطیہؓ سے آپؐ کے ایک صاحبزادے ابراہیمؓ ہوئے ان کی وفات بھی بچپن میں اس وقت ہوئی جب وہ اپنے پالنے میں تھے ان کی وفات پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ فرمائے :-

تدمع العین ویحزن القلب	آنکھیں اشک بار ہیں اور دل
ولا نقول ما یسخط الرب	بجھ رہا لیکن ہم کوئی ایسی بات نہیں کہیں
وانا بک یا ابراھیم لمحزونون[4]	جو رب کو ناراض کرنے والی ہو اے
	ابراہیمؓ ہم تم پر غمزدہ ہیں۔

ان کے انتقال پر سورج گرہن ہو گیا تو صحابہ نے عرض کیا کہ ابراہیمؓ کے انتقال کی وجہ سے سورج گرہن ہو گیا ہے آپؐ نے اس موقع پر صحابہ کو جمع کر کے ان سے خطاب فرمایا اور کہا کہ سورج اور چاند اللہ عزوجل کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں جن کو کسی کی موت سے گرہن نہیں ہوتا۔[5]

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۲۴-۲۵ [2] جامع الترمذی ج ۲ ص ۲۲۱ [3] متفق علیہ۔

[4] صحیح مسلم بروایت اسماء بنت یزید بن السکن تفصیل کے ساتھ [5] صحیح مسلم کتاب الکسوف۔

غالیانہ خوش عقیدگی اور شخصیت پرستی کا استیصال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اہتمام کے ساتھ صحابہ کرامؓ کو جمع کر کے ان سے خطاب فرمایا اور اس کی وضاحت فرمائی کہ سورج اور چاند کے گرہن اور کائنات کی کسی تبدیلی کو کسی کی موت و حیات سے کوئی تعلق نہیں خواہ اس کا کچھ رتبہ ہو اور اس کو کسی بڑی سے بڑی محبوب شخصیت سے نسبت ہو، یہ عمل وہم پرستی بلکہ غالیانہ خوش عقیدگی اور شخصیت پرستی کی جڑ کاٹتا ہے۔ دنیا کا کوئی داعی، کوئی پیشوا، کسی تحریک کا علمبردار، کسی انسانی جماعت کا قائد ہوتا تو کم سے کم درجہ یہ تھا کہ اگر اس خیال کی تردید نہ کرتا تو خاموش رہتا کہ یہ بات ہماری تحریک کے مفاد میں جاتی ہے ایسی نے تو کہلوائی بھی نہیں، خود بخود لوگوں کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ سورج گرہن پیغمبر خدا کے فرزند عزیز کے انتقال پر ہوا ہے، اس کی تردید کچھ ضروری نہیں ہے۔

یہی فرق ہے پیغمبر اور غیر پیغمبر میں کہ سیاسی ذہن رکھنے والے جن واقعات سے فائدہ اٹھاتے ہیں (خواہ وہ واقعات غیر اختیاری طریقہ پر پیش آئے ہوں) پیغمبر عقیدہ کا فساد اور دین کا نقصان گوارہ نہیں کرتا، وہ ان سے فائدہ اٹھانا حرام اور منصب نبوت کے منافی سمجھتا ہے، اس موقع پر اگر آپ خاموشی اختیار فرماتے تو اس سے دنیا میں کوئی عظیم فساد برپا ہونے والا نہیں تھا، لیکن اس سے عقیدۂ توحید پر اثر پڑتا، اور شخصیت پرستی اور تصرف الکائنات کے امکان کا دروازہ کھل جاتا اور یہ ذہنیت انسانی کا وہ انحراف تھا جو بہت خطرناک ہے، اور ایک نبی برحق کے لئے اس کا علاج اور سد باب ضروری تھا۔

حضرت زینبؓ کے جو حضرت خدیجہؓ کے بھانجے ابوالعاص بن ربیع کی زوجیت میں تھیں ایک صاحبزادے ہوئے جن کا نام علی تھا، اور ایک صاحبزادی جن کا نام امامہ تھا۔ حضرت رقیہؓ کی شادی حضرت عثمانؓ سے ہوئی اور ان سے ایک لڑکے عبداللہ ہوئے۔ حضرت رقیہؓ کا انتقال اس وقت ہوا جب آپ بدر میں تھے، اور حضرت عثمانؓ ان کی تیمارداری میں مشغول تھے، ان کے بعد انھوں نے ان کی بہن ام کلثومؓ سے شادی کی، اسی لئے ان کا لقب "ذوالنورین" پڑ گیا۔ ان کی وفات بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی میں ہوئی۔

حضرت فاطمہ کی شادی ابوطالب کے صاحبزادے اور آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ابن عم حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ہوئی ان کے ایک صاحبزادے حسنؓ جن کے نام پر ان کی کنیت تھی، اور دوسرے صاحبزادے حسینؓ تھے، جن کے متعلق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "وہ اس دنیا میں میرے دو پھول ہیں"[1] ان دونوں کے بارے میں آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "یہ دونوں اہل جنت میں نوجوانوں کے سردار ہوں گے"[2]

اللہ تعالےٰ نے ان دونوں کی اولاد میں خوب برکت عطا فرمائی، اور اسلام اور مسلمانوں کو ان سے عظیم الشان فائدہ پہونچا، ان میں بڑے بڑے سردار اور قائد اور علم و دین اور جہاد اور زہد و تقویٰ کے امام پیدا ہوئے، اور انھوں نے تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں بڑے نازک وقتوں میں مسلمانوں کی رہنمائی کا فرض انجام دیا اور علم جہاد دبلند کیا۔ حضرت فاطمہؓ کی حضرت علیؓ سے دو صاحبزادیاں زینبؓ اور

---

[1] صحیح بخاری کتاب المناقب باب مناقب الحسن والحسین [2] ترمذی ج ۲ ص ۲۱۸

ام کلثوم یعنی نفیسہ زینبؓ کی شادی ان کے ابن عم عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب سے ہوئی جن کا عرب کے چیدہ سخی ترین افراد میں شمار تھا ان سے علی اور عون دو صاحبزادے پیدا ہوئے۔ ام کلثوم کی شادی حضرت عمر بن الخطاب سے ہوئی اور ان سے ایک صاحبزادے زید ہوئے۔[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سب اولاد کا آپ کی حیات ہی میں انتقال ہوا سوائے حضرت فاطمہؓ کے جن کا انتقال آپؐ کی وفات کے چھ ماہ بعد ہوا۔[2]

---

[1] ماخوذ از سیرت ابن کثیر ج ۴ ص ۵۸۲ تا ۵۸۵ و دیگر مراجع [2] ماخوذ از زاد المعاد لابن القیم ص ۳۰

اخلاق وشمائل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ اوصاف کریمہ اور حلیہ مبارک

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ اوصاف کریمہ اور خصائل شریفہ کا ذکر ہند بن ابی ہالہؓ نے (جو ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ کے فرزند اور حضرت حسنؓ و حسینؓ کے ماموں ہیں) بہت جامع اور بلیغ انداز میں کیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت آخرت کی فکر میں اور امور آخرت کی سوچ میں رہتے، اس کا ایک تسلسل قائم تھا کسی وقت آپ کو چین نہیں ہوتا تھا، اکثر طویل خاموشی اختیار فرماتے، بلا ضرورت کلام نہ فرماتے، گفتگو کا آغاز فرماتے تو دہن مبارک سے اچھی طرح الفاظ ادا فرماتے[1] اور اسی طرح اختتام فرماتے، آپ کی گفتگو اور بیان بہت صاف، واضح اور دو ٹوک ہوتا، نہ اس میں غیر ضروری طوالت ہوتی نہ زیادہ اختصار، آپ نرم مزاج و نرم گفتار تھے، درشت خو اور بے مروت نہ تھے، نہ کسی کی اہانت کرتے تھے اور نہ اپنے لئے اہانت پسند کرتے تھے[2]، نعمت کی بڑی قدر کرتے اور اس کو بہت زیادہ

---

[1] یعنی متکبرین کی طرح بے توجہی و بے نیازی کے ساتھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ استعمال نہ کرتے [2] یہاں "المہین" کا لفظ آیا ہے جو میم کے پیش اور زبر دونوں کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے اگر پیش مراد لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کسی کی اہانت آپ نہ فرماتے تھے اور اگر زبر ہو تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ آپ اپنے لئے ذلت و خواری پسند نہ فرماتے تھے، مطلب یہ ہے کہ نہ درشت خو تھے نہ کمزور طبیعت کے الگ تھلگ تھے کہ ہر چیز گوارا فرما لیتے بلکہ ہیبت و رعب اور جلال و وقار کے مختلف پہلوؤں کے جامع تھے۔

جاتے خواہ کتنی ہی قلیل ہو حتیٰ کہ آسانی سے نظر بھی نہ آئے اور اس کی برائی نہ فرماتے کھانے پینے کی چیزوں کی برائی کرتے نہ تعریف۔ دنیا اور دنیا سے متعلق جو بھی چیز ہوتی، اس پر آپ کو کبھی غصہ نہ آتا۔ لیکن جب خدا کے کسی حق کو پامال کیا جاتا تو اس وقت آپ کے جلال کے سامنے کوئی چیز ٹھہر نہ سکتی تھی یہاں تک کہ آپ اس کا بدلہ لے لیتے آپ کو اپنی ذات کے لئے نہ غصہ آتا نہ اس کے لئے انتقام لیتے۔ جب اشارہ فرماتے تو پورے ہاتھ کے ساتھ اشارہ فرماتے۔ جب کسی امر پر تعجب فرماتے تو اس کو پلٹ دیتے گفتگو کرتے وقت داہنے ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے ملاتے۔ غصہ اور ناگواری کی بات ہوتی تو رخ پھیرتے اور اس طرف سے بالکل پھیر لیتے اور اعراض فرما لیتے، خوش ہوتے تو نظر جھکا لیتے۔ آپ کا ہنسنا زیادہ تر تبسم تھا جس سے صرف آپ کے دندان مبارک جو بارش کے اولوں کی طرح پاک و صاف تھے ظاہر ہوتے۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ جو فرد خاندان تھے اور جن کو علم و واقفیت کے بہترین ذرائع اور مواقع حاصل تھے اور جن کی نظر نفسیات انسانی اور اخلاق کی باریکیوں پر بہت گہری تھی، قریب ترین اشخاص میں سے تھے اور اسی کے ساتھ وصف و بیان اور منظر کشی میں بھی آپ کو سب سے زیادہ قدرت تھی، آپ کے خلق عظیم کے متعلق یہ کہتے ہیں۔

"آپ طبعاً بدکلامی اور بے حیائی و بے شرمی سے دور تھے اور تکلفاً بھی ایسی کوئی بات آپ سے سرزد نہیں ہوتی تھی، بازاروں میں آپ کبھی آواز بلند نہ فرماتے برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیتے بلکہ عفو و درگذر کا معاملہ فرماتے آپ نے کسی پر کبھی دست درازی نہ فرمائی سوائے اس کے کہ جہاد فی سبیل اللہ کا موقع ہو، کسی خادم یا عورت پر آپ نے کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا، میں نے آپ کو کسی ظلم و زیادتی کا انتقام لیتے ہوئے بھی

نہیں دیکھا جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کی خلاف ورزی نہ ہو اور اس کی حرمت و ناموس پر آنچ نہ آئے، ہاں اگر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کو پامال کیا جاتا، اور اس کے ناموس پر حرف آتا تو آپ اس کے لئے ہر شخص سے زیادہ غصہ ہوتے، دو چیزیں سامنے ہوتیں تو ہمیشہ آسان چیز کا آپ انتخاب فرماتے، جب اپنے دولت خانہ پر تشریف لاتے تو عام انسانوں کی طرح نظر آتے، اپنے کپڑوں کو صاف کرتے، بکری کا دودھ دوہتے، اور اپنی سب ضرورتیں خود انجام دیتے۔

اپنی زبان مبارک محفوظ رکھتے، اور صرف اسی چیز کے لئے کھولتے جس سے آپ کو کچھ سروکار ہوتا، لوگوں کی دلداری فرماتے، اور ان کو متنفر نہ کرتے، کسی قوم و برادری کا معزز شخص آتا تو اس کے ساتھ اکرام و اعزاز کا معاملہ فرماتے اور اس کو اپنے اور اعلیٰ عہدہ پر مقرر کرتے، لوگوں کے بارے میں محتاط تبصرہ کرتے بغیر اس کے کہ اپنی بشاشت اور اخلاق سے ان کو محروم فرمائیں، اپنے اصحاب کے حالات سے برابر خبر رکھتے، لوگوں سے لوگوں کے معاملات کے بارے میں دریافت کرتے رہتے۔

اچھی بات کی اچھائی بیان کرتے اور اس کو قوت پہونچاتے، بری بات کی برائی کرتے اور اس کو کمزور کرتے، آپ کا معاملہ معتدل اور یکساں تھا، اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا تھا، آپ کسی بات سے غفلت نہ فرماتے تھے، اس ڈر سے کہ کہیں دوسرے لوگ بھی غافل ہونے لگیں اور اکتا جائیں، ہر حال اور ہر موقع کے لئے آپ کے پاس اس حال کے مطابق ضروری سامان تھا، نہ حق کے معاملہ میں کوتاہی فرماتے نہ حد سے آگے بڑھتے، آپ کے قریب جو لوگ رہتے تھے وہ سب سے اچھے اور منتخب ہوتے تھے، آپ کی نگاہ میں سب سے زیادہ افضل وہ تھا،

جس کی خیر خواہی اور اخلاق عام ہو سب سے زیادہ قدر و منزلت اس کی تھی
جو خیر خواہی و ہمدردی اور دوسروں کی مدد اور معاونت میں سب سے آگے ہو خدا کا
ذکر کرتے ہوئے کھڑے ہوتے اور خدا کا ذکر کرتے ہوئے بیٹھتے جب کہیں تشریف
لے جاتے تو جہاں مجلس ختم ہوتی اسی جگہ تشریف رکھتے اور اس کا حکم بھی فرماتے
اپنے حاضرین مجلس اور ہم نشینوں میں ہر شخص کو (اپنی توجہ اور التفات میں) پورا
حصہ دیتے آپ کا شریک مجلس یہ سمجھتا کہ اس سے بڑھ کر آپ کی نگاہ میں کوئی
اور نہیں ہے اگر کوئی شخص آپ کو کسی غرض سے بٹھا لیتا یا کسی ضرورت میں
آپ سے گفتگو کرتا تو نہایت صبر و سکون سے اس کی پوری بات سنتے یہاں تک کہ
وہ خود ہی اپنی بات کر کے رخصت ہوتا، اگر کوئی شخص آپ سے کچھ سوال کرتا
اور کچھ مدد چاہتا تو بلا اس کی ضرورت پوری کئے واپس نہ فرماتے یا کم از کم
نرم و شیریں لہجہ میں جواب دیتے آپ کا حسن اخلاق تمام لوگوں کے لئے وسیع
اور عام تھا، اور آپ ان کے حق میں باپ ہو گئے تھے، تمام لوگ حق کے معاملہ میں
آپ کی نظر میں برابر تھے آپ کی مجلس علم و معرفت، حیاء و شرم اور صبر اور
امانت داری کی مجلس تھی، نہ اس میں آوازیں بلند ہوتی تھیں، نہ کسی کے عیوب
بیان کئے جاتے تھے، نہ کسی کی عزت و ناموس پر حملہ ہوتا نہ کمزوریوں کی تشہیر کی
جاتی تھی سب ایک دوسرے کے مساوی تھے اور صرف تقویٰ کے لحاظ سے ان کو
ایک دوسرے پر فضیلت حاصل ہوتی تھی، اس میں لوگ بڑوں کا احترام اور چھوٹوں
کے ساتھ رحمدلی و شفقت کا معاملہ کرتے تھے حاجتمند کو اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے
مسافر اور نووارد کی حفاظت کرتے اور اس کا خیال رکھتے تھے۔

حضرت علیؓ مزید فرماتے ہیں:-

آپ ہمہ وقت کشادہ رو اور انبساط و بشاشت کے ساتھ رہتے تھے بہت
نرم اخلاق اور نرم پہلو[1] تھے نہ سخت طبیعت کے تھے نہ سخت بات کہنے کے عادی،
نہ چلا کر بولنے والے نہ عامیانہ اور مبتذل بات کرنے والے نہ کسی کو عیب لگانے والے
نہ تنگ دل بخیل جو بات آپ کو پسند نہ ہوتی اس سے تغافل فرماتے (یعنی اس کو نظر انداز
کر دیتے اور گرفت نہ فرماتے) اور صراحتاً اس سے مایوس بھی نہ فرماتے اور اس کا جواب
بھی نہ دیتے، تین باتوں سے آپ نے اپنے آپ کو بالکل بچا رکھا تھا، ایک جھگڑا، دوسرے
تکبر، تیسرے غیر ضروری اور لایعنی کام لوگوں کو بھی تین باتوں سے آپ نے بچا رکھا
تھا، نہ کسی کی برائی کرتے تھے، نہ اس کو عیب لگاتے تھے، اور نہ اس کی کمزوریوں اور
پوشیدہ باتوں کے پیچھے پڑتے تھے، صرف وہ کلام فرماتے تھے جس پر ثواب کی
امید ہوتی تھی، جب گفتگو کرتے تھے تو شرکاء مجلس ادب سے اس طرح سر جھکا لیتے تھے کہ
معلوم ہوتا تھا کہ ان سب کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں[2]، جب آپ خاموش ہوتے
تب یہ لوگ بات کرتے آپ کے سامنے کبھی نزاع نہ کرتے، اگر آپ کی مجلس میں کوئی شخص
گفتگو کرتا تو بقیہ سب لوگ خاموشی سے سنتے یہاں تک کہ وہ اپنی بات ختم کر لیتا، آپ کے
سامنے ہر شخص کی گفتگو کا وہی درجہ ہوتا جو ان کے پہلے آدمی کا ہوتا (کہ ہر ایک کو پورے اطمینان
سے اپنی بات کہنے کا موقع ملتا اور اسی قدر دانی اور اطمینان کے ساتھ اسے سنا جاتا)

---

[1] یعنی جلد مہربان ہو جانے والے بہت لطف و کرم والے اور بہت آسانی سے درگذر کرنے والے
تھے یہ بھی آتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ کسی سے نزول تعبیر فرماتے تھے ایک قول یہ ہے کہ اس سے
مراد سکوت و وقار اور تواضع و خشوع ہے۔ [2] یعنی بے حس و حرکت کہ جیسے جنبش سے چڑیاں نہ اڑ جائیں۔

جس بات سے سب لوگ ہنستے اس پر آپ بھی ہنستے جس سے سب تعجب کا اظہار کرتے آپ بھی تعجب فرماتے مسافر اور پردیسی کی بے تمیزی اور بے طرح کے سوال کو صبر و تحمل کے ساتھ سنتے یہاں تک کہ آپ کے اصحاب کہتے ایسے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیجئے (تاکہ آپ پر کوئی بار نہ ہو) آپ فرماتے تھے کہ تم کسی صاحب حاجت کو پاؤ تو اس کی مدد کرو آپ مدح و تعریف اسی شخص کی قبول فرماتے جو حد اعتدال میں رہتا کسی کی گفتگو کے دوران کلام نہ فرماتے اور اس کی بات کبھی نہ کاٹتے ہاں اگر وہ حد سے بڑھنے لگتا تو اس کو منع فرما دیتے یا مجلس سے اٹھ کر اس کی بات قطع فرما دیتے۔

آپ سب سے زیادہ فراخ دل کشادہ قلب راست گفتار نرم طبیعت اور معاشرت و معاملات میں نہایت درجہ کریم تھے جو پہلی بار آپ کو دیکھتا مرعوب ہو جاتا آپ کی صحبت میں رہتا اور جاننے پہچاننے کا موقع حاصل ہوتا تو آپ کا فریفتہ اور دلدادہ ہو جاتا آپ کا ذکر کرنے والا کہتا ہے کہ نہ آپ سے قبل میں نے آپ جیسا کوئی شخص دیکھا نہ آپ کے بعد صلی اللہ علی نبینا وسلم[1]

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کو لباس جمال و کمال سے آراستہ فرمایا تھا اور آپ کو محبت و دلکشی اور رعب و ہیبت کا حسین و جمیل پیکر بنایا تھا، ہند بن ابی ہالہ بیان کرتے ہیں۔

"آپ بہت خوددار و باوقار اور شان و شوکت کے حامل تھے اور دوسروں کی نگاہ میں بھی نہایت پرشکوہ آپ کا روئے انور چودھویں رات کے چاند کی طرح دمکتا تھا۔"[2]

---

[1] اقتباس از شمائل ترمذی [2] سیدنا الحسن بروایت ہند بن ابی ہالہ (شمائل ترمذی)

براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:۔
"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میانہ قد تھے، میں نے آپ کو ایک مرتبہ سرخ قبا میں دیکھا، اس سے اچھی کوئی چیز میں نے کبھی نہیں دیکھی۔"[1] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ "آپ میانہ قد تھے، طول کی طرف کسی قدر مائل، رنگ نہایت گورا، ریش مبارک کے بال سیاہ، دہانہ نہایت متناسب اور حسین، آنکھوں کی پلکیں دراز، چوڑے شانے۔" آخر میں کہتے ہیں کہ "میں نے آپ جیسا آپ کے پہلے یا آپ کے بعد کبھی نہیں دیکھا۔"
حضرت انسؓ راوی ہیں کہ "میں نے حریر و دیباج کو بھی آپ کے دست مبارک سے زیادہ نرم نہیں پایا اور نہ آپ کی خوشبو سے بڑھ کر کوئی خوشبو سونگھی۔"[2]

تعلق مع اللہ

باوجود اس کے کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کو اپنی رسالت، محبوبیت اور قرب خاص سے نوازا تھا اور آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف فرما دیئے تھے، آپ عبادت میں سب سے زیادہ کوشاں اور اس کے سب سے زیادہ شائق اور مشتاق تھے۔
مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نماز نفل میں اتنی دیر تک کھڑے رہے کہ آپ کے قدم مبارک پر ورم آ گیا، عرض کیا گیا کہ آپ کے تو اگلے پچھلے گناہوں کی معافی ہو چکی ہے، یہ سن کر آپ نے ارشاد فرمایا "کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔"[3]

---

۱ متفق علیہ ۲ الادب المفرد للبخاری باب [illegible] ۳ متفق علیہ
(البخاری کی کتاب المناقب در باب صفۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم، کتاب الفضائل) [illegible]
امام بخاری نے سورۃ الفتح کی تفسیر میں اور مسلم [illegible] میں نقل کیا ہے

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی ایک آیت میں پوری رات گذار دی۔[1] حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم رات کو نماز کے لئے کھڑے ہوئے اور ایک آیت میں صبح کر دی اور وہ آیت تھی[2]

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ	اگر تو ان کو عذاب دے تو بے شک
وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ	وہ تیرے بندے ہیں اور اگر معاف
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (المائدہ - ۱۱۸)[3]	فرمادے تو تو غالب اور حکمت والا ہے۔

حضرت عائشہؓ یہ بھی روایت فرماتی ہیں کہ آپ جب روزے رکھتے تو اس کی کثرت دیکھ کر ہم لوگ کہتے کہ اب شاید آپ ہمیشہ روزہ ہی سے رہیں گے جب روزہ سے نہ ہوتے تو ہم سوچتے کہ شاید اب آپ روزہ نہ رکھیں گے۔[3]

حضرت انسؓ راوی ہیں اگر کوئی آپ کو قیام لیل میں مشغول دیکھنا چاہتا تو دیکھ سکتا تھا، اور اسی طرح نیند کی حالت میں دیکھنا چاہتا تو بھی دیکھ سکتا تھا۔[4]

عبداللہ بن الشخیر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے دیکھا کہ آپ نماز میں مصروف ہیں اور گریہ کی وجہ سے آپ کے سینۂ مبارک سے ایسی آواز نکل رہی ہے جیسے دیگچی اُبل رہی ہو۔[5]

آپ کو نماز کے سوا کسی اور چیز سے تسلی نہ ہوتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ نماز کے بعد بھی آپ نماز کے مشتاق اور منتظر ہیں آپ ارشاد فرماتے تھے جعل قرة عینی

---

[1] ترمذی [2] نسائی نے اس کو "باب ترديد الآية" میں اور ابن ماجہ نے باب ما جاء فی القراءة بالليل میں درج کیا ہے [3] یہ سب نقل ابوذرؓ کے متعلق ہے [4] صحیح بخاری باب (قیام النبی صلے اللہ علیہ وسلم ونومہ۔ کتاب التہجد) [5] شمائل ترمذی۔

فی الصلوٰۃ" (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے)۔[1]

صحابہ کرام کا بیان ہے کہ جب کوئی پریشانی کی بات درپیش ہوتی تو آپ بے ساختہ نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے۔[2]

ابو الدرداء رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ جب کبھی رات کو تیز ہوائیں چلنے لگتیں تو آپ مسجد میں پناہ لیتے یہاں تک کہ ہوا تھم جاتی اگر فلک پر کوئی تغیر ظاہر ہوتا سورج گرہن یا چاند گرہن ہوتا تو آپ نماز کی طرف رجوع فرماتے اور اس سے پناہ حاصل کرتے یہاں تک کہ گرہن ختم ہو جاتا اور مطلع صاف ہو جاتا۔[3] آپ نماز کے ہر وقت مشتاق رہتے اور اس کے بغیر آپ کو اطمینان و سکون حاصل نہ ہوتا اور جب تک نماز پڑھ نہ لیتے آپ کی بے کلی اور بے چینی برقرار رہتی۔ کبھی آپ اپنے مؤذن بلال رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرماتے: بلال! نماز کا اہتمام کرو اور ہمارے سکون کا سامان کرو۔[4]

آپ کی نگاہ میں متاعِ دنیا کی حقیقت اور اس سے آپ کی بے رغبتی

جہاں تک درہم و دینار اور دنیا کے مال و متاع کا تعلق ہے انسانوں کا بڑے سے بڑا ذخیرہ اور اعلیٰ درجہ کی قادر الکلامی بھی آپ کی نگاہ میں اس کی صحیح حیثیت کو پوری طرح بیان نہیں کر سکتی اس لئے کہ آپ کے ایمان اور ربانی مدرسہ کی تعلیم و تربیت اور وسیع تجربہ میں ان کے شاگردوں کی نگاہ اور خود صحابہ بھی درہم و دینار کو حقیر ریزوں اور ٹھیکروں سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے اور ان کی ادائیں

---

[1] نسائی (کتاب عشرۃ النساء۔ باب حب النساء) [2] ابوداؤد [3] طبرانی

[4] ابوداؤد (کتاب الادب باب۔ فی صلاۃ العتمۃ)

متاع دنیا کی بے وقعتی دوسروں پر اپنا مال خرچ کرنے کا شوق اور بات کو اپنے اوپر ترجیح دینے کا ذوق، قدرِ کفاف پر قناعت اور شانِ بے نیازی و استغناء کے جو واقعات تاریخی طور پر ثابت ہیں[1] ان سے عقل انسانی حیران ہو جاتی ہے جب آپ کے غلاموں کے غلاموں کا یہ حال ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خود رسالت صلے اللہ علیہ وسلم جو ان سب کے امام و رہنما اور ہر خیر و صلاح اور فضیلت و تقویٰ میں ان کے مربی اور معلم تھے ان کا حال اس معاملے میں کیا ہوگا؟

اس لئے اس سلسلے میں ہم صرف ان چند روایات کا ذکر کرتے ہیں جو صحابہ کی زبان سے ہم تک پہونچی ہیں، اس لئے کہ واقعات سے بڑھ کر کوئی چیز موثر نہیں، اور ان سے زیادہ صحیح اور بلیغ ترجمانی کسی عبارت آرائی سے نہیں ہو سکتی۔

آپ کا وہ مشہور قول جس پر آپ عمر بھر عامل تھے اور جو آپ کی پوری زندگی کا مرکزی نقطہ اور محور کہا جا سکتا ہے، یہ ہے:-

اللھم لا عیش الا عیش الآخرۃ۔	اے اللہ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔

آپ فرمایا کرتے تھے:-

مالی وللدنیا وما انا والدنیا الا کراکب استظل تحت شجرۃ ثم راح وترکھا۔[2]	مجھے دنیا سے کیا سروکار، میرا دنیا سے واسطہ اتنا ہی ہے جیسے کوئی مسافر راہ میں تھوڑی دیر کے لئے

---

[1] اس موضوع پر تفصیلی مطالعہ کے لئے عبداللہ بن المبارک کی کتاب "الزہد"، ابن الجوزی کی "صفۃ الصفوۃ" اور ابی نعیم کی "حلیۃ الاولیاء" کا مطالعہ مفید ہوگا۔ [2] مسند ابی داؤد الطیالسی

کسی درخت کے سایہ میں ٹھہر لے
پھر اپنی راہ لے اور اس کو چھوڑ کر
چل دے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو ایک مرتبہ چٹائی پر اس حالت میں لیٹے ہوئے دیکھا کہ آپ کے پہلو میں اس کے نشانات پڑ گئے تھے یہ منظر دیکھ کر ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ آپ نے دریافت فرمایا "کیا بات ہے؟" انھوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! آپ اللہ کی مخلوق میں سب سے برگزیدہ ہیں، اور عیش کسریٰ او قیصر کرتے ہیں" یہ سن کر آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آپ نے فرمایا "ابن الخطاب! کیا تمھیں کچھ شک ہے" پھر آپ نے ارشاد فرمایا "یہ وہ لوگ ہیں جن کو دنیا کی زندگی کے سارے مزے یہیں دیدیے گئے ہیں"[1]

آپ وہ طرز معیشت یا وہ معیار زندگی نہ صرف اپنے لئے ناپسند فرماتے تھے بلکہ اپنے اہل بیت کے لئے بھی اس کے روادار نہ تھے، چنانچہ آپ کی دعا تھی "اللھم اجعل رزق آل محمد قوتا" (اے اللہ آل محمد کا رزق بقدر ضرورت ہو)[2] حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں "قسم اس کی جس کے قبضے میں ابوہریرہ کی جان ہے اللہ کے نبی اور ان کے اہل بیت بھی متواتر تین دن گیہوں کی روٹی پیٹ بھر کر نہ کھا سکے یہاں تک کہ اس دنیا سے پردہ فرمایا"[3]

ام المومنین حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں "ہم اہل بیت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو ایک چاند گزر کر دوسرا چاند نظر آجاتا، اور ہمارے گھر میں چولہا نہ جلتا،

۱؎ حدیث کا پورا متن صحیحین میں ملاحظہ فرمائیے ۲؎ متفق علیہ صحیح بخاری کتاب الرقاق
صحیح مسلم کتاب الزہد ۳؎ بخاری و احمد بروایت احمد، صحیح مسلم کتاب الزہد۔

صرف کھجور اور پانی پر ہماری گذر بسر ہوتی تھی۔[1]

آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھی ہوئی تھی، اور آپ کے پاس اتنا نہ تھا کہ آپ اس کو چھڑا سکتے یہاں تک کہ اسی حال میں آپ کی وفات ہوگئی۔[2]

آپ نے حجۃ الوداع اس حال میں کیا کہ حد نگاہ تک مسلمان نظر آرہے تھے، پورا جزیرۃ العرب آپ کی زیر نگیں تھا اور کیفیت یہ تھی کہ آپ ایک نہایت خستہ حال کجاوہ پر تھے آپ پر صرف ایک چادر پڑی ہوئی تھی جس کی مالیت چار درہم سے زیادہ نہ تھی، اس وقت آپ نے فرمایا "اے اللہ اس کو ایسا حج بنا جس میں کوئی ریا اور شہرت طلبی نہ ہو۔"[3]

حضرت ابوذرؓ سے آپ نے ایک موقع پر فرمایا "مجھے یہ گوارا نہیں کہ میرے پاس اُحد پہاڑ کے برابر سونا ہو اور تین دن گذر جائیں اور اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس باقی رہے سوائے اس کے کہ کسی دینی کام کے لئے میں اس میں سے کچھ بچا رکھوں، ورنہ اللہ کے بندوں میں میں اس کو اس طرح اور اس طرح دائیں بائیں اور پیچھے لٹا دوں گا۔"[4]

جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کسی چیز کا سوال کیا گیا ہو اور آپ نے اس کے جواب میں نہیں کہا ہو۔[5] ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فیاضی اور داد و دہش میں تیز ہوا سے زیادہ تیز رفتار تھے۔[6]

---

[1] متفق علیہ [2] ترمذی [3] شمائل ترمذی بروایت انسؓ [4] متفق علیہ یہ الفاظ بخاری کے ہیں، کتاب الرقاق باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما احب ان لی احدا ذھبا" [5] بخاری کتاب الادب (باب حسن الخلق) [6] حدیث کا پہلا باقی صحیحین میں بالاختلاف ہے۔

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے آپ سے کچھ سوال کیا تو آپ نے اس کو بکریوں بھیڑوں کا اتنا بڑا گلہ عطا فرمایا جو دو پہاڑوں کے درمیان تھا، وہ یہ سب بکریاں لے کر اپنی قوم میں واپس آگیا اور کہنے لگا لوگو! اسلام لے آؤ! محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اس طرح دے دلاتے ہیں کہ جیسے ان کو فقر و فاقہ کا ڈر ہی نہ ہو! ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں نوے ہزار درہم پیش کئے گئے، یہ رقم ایک چٹائی پر ڈال دی گئی اور آپ نے کھڑے ہو کر اس کو تقسیم کرنا شروع کیا اور کسی سائل کو بھی آپ نے واپس نہ فرمایا، یہاں تک کہ سارا ڈھیر ختم ہو گیا!!

خلق خدا کے ساتھ

لیکن اس ذوق عبادت، دنیا اور سامان دنیا سے بے تعلقی کمال زہد، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کامل اور اس کے حضور آہ و زاری اور دعا و مناجات کے آپ کی خندہ جبینی حسن اخلاق، شفقت و ملاطفت، دلداری و دلنوازی اور ہر شخص کو اس کا جائز حق دینے اور اس کے مرتبہ و حیثیت کے مطابق سلوک کرنے میں کوئی فرق نہ آتا تھا، اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں کہ ان کو اس طرح جمع کرنا کسی دوسرے شخص کے لئے ممکن ہے آپ فرماتے تھے۔

لو تعلمون ما اعلم لضحکتم	جو میں جانتا ہوں وہ اگر تم جان لیتے
قلیلا و لبکیتم کثیرا[1]	بہت کم ہنستے اور بہت زیادہ روتے۔

آپ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ فراخ دل، نرم طبیعت اور خندہ رو تھے

---

[1] مسلم۔

سب سے زیادہ محترم تھے، اپنے اصحاب کرامؓ سے الگ تھلگ نہ رہتے تھے بلکہ ان سے پورا میل جول رکھتے تھے ان سے باتیں کرتے، ان کے بچوں کے ساتھ خوش طبعی وخوش مذاقی کے ساتھ پیش آتے، ان بچوں کو اپنی گود میں بٹھاتے، غلام اور آزاد باندی مسکین اور فقیر سب کی دعوت قبول فرماتے، بیماروں کی عیادت فرماتے خواہ وہ شہر کے آخری سرے پر ہوں، عذر خواہ کا عذر قبول فرماتے، آپؐ کو کبھی صحابۂ کرامؓ کی مجلس میں پیر پھیلائے ہوئے نہیں دیکھا گیا تاکہ اس کی وجہ سے کسی کو تنگی ہو۔

عبداللہ بن الحارثؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ خندہ رو اور متبسم کسی کو نہیں دیکھا۔ جابر بن سمرہؓ کہتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں سو بار سے زیادہ بیٹھنے کا اتفاق ہوا، میں نے دیکھا کہ آپؐ کے اصحاب کرامؓ ایک دوسرے سے اشعار سن رہے ہیں یا سنا رہے ہیں اور جاہلیت کی بعض باتوں اور واقعات کا تذکرہ بھی کر رہے ہیں اور آپ ساکت ہیں یا کبھی کوئی ہنسی کی بات ہوتی تو ان کے ساتھ آپ بھی تبسم فرماتے ہیں۔

شرید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے امیہ بن ابی الصلت کے اشعار سننے کی فرمائش کی، چنانچہ میں نے آپ کو اس کے اشعار سنائے۔

آپؐ نہایت درجہ نرم دل، محبت کرنے والے اور لطف وعنایت کے پیکر تھے، انسانی جذبات اور لطیف احساسات آپ کی سیرت میں بہترین اور حسین ترین شکل میں جلوہ گر تھے۔ انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرماتے "میرے دونوں بیٹوں (حسن

۱؎ بروایت انس بن مالک رضی اللہ عنہ (روایت الترمذی والحاکم) ۲؎ شمائل ترمذی ۳؎ الادب المفرد للبخاری ص

وحسین رضی اللہ عنہما) کو بلایا، وہ دوڑتے ہوئے آئے تو آپ ان دونوں سے منہ ملاتے اور ان کو اپنے سینہ سے لگا لیتے[1]۔" آپ نے ایک مرتبہ اپنے نواسے حسن بن علی رضی اللہ عنہ کو بلایا وہ دوڑتے ہوئے آئے اور آپ کی گود میں گر پڑے پھر آپ کی ریش مبارک میں اپنی انگلیاں ڈالنے لگے اس کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنا دہن مبارک کھول دیا اور وہ اپنا منہ آپ کے دہن مبارک میں ڈالنے لگے[2]۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ زید بن حارثہ (جو آپ کے غلام تھے) مدینہ آئے تو اس وقت آپ گھر پر تشریف فرما تھے، وہ گھر پر آئے اور دروازہ پر دستک دی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے آپ اس وقت پورے کپڑوں میں ملبوس نہ تھے چادر جسم مبارک سے گری جا رہی تھی ان کو دیکھ کر آپ نے معانقہ فرمایا اور بوسہ لیا[3]۔

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک صاحبزادی نے آپ کو یہ پیغام کہلوایا کہ میرے بچہ کا دم واپسیں ہے آپ اس وقت یہاں تشریف لے آئیں، آپ نے ان کو سلام کہلوایا اور فرمایا کہ اللہ ہی کے لئے ہے جو اس نے لیا، اور اسی کے لئے ہے جو اس نے عطا کیا، ہر چیز اس کے یہاں نامزد اور مقرر ہے، پس چاہئے کہ صبر سے کام لیں، اور اجر و ثواب کی نیت اور امید رکھیں، انھوں نے آپ کو قسم دلائی کہ آپ ضرور تشریف لائیں، آپ کھڑے ہوئے اور ہم سب آپ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے، جب آپ وہاں پہنچے تو بچہ گود میں آپ کے پاس لایا گیا،

---

[1] بروایت ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب الحسن والحسین رض [2] الادب المفرد بخاری ص ۱۴۳ [3] ترمذی۔

آپ نے اس کو اپنے آغوش مبارک میں لے لیا۔ اس وقت اس کی سانس اکھڑ رہی تھی یہ منظر دیکھ کر آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ سعدؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یہ رحمت ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کے دل میں چاہتا ہے ڈال دیتا ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ اپنے رحم دل بندوں ہی پر رحم فرماتا ہے۔[1]

جب بدر کے قیدیوں کے ساتھ حضرت عباسؓ کی مشکیں کسی گئیں، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی کراہ سنی تو آپ کو نیند نہیں آئی جب انصار کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے ان کی مشکیں کھول دیں۔ انصار کی یہ رحم دلی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اس بات پر آمادہ نہ کر سکی کہ حضرت عباسؓ اور دیگر قیدیوں میں فرق رکھا جائے۔ انصار نے یہ دیکھ کر کہ حضرت عباسؓ کی مشکیں کھولنے سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خوش ہوئے تھے یہ خواہش کی کہ ان کا فدیہ بھی چھوڑ دیا جائے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور زیادہ خوش ہوں، لیکن آپ نے اس بات کو قبول نہ فرمایا۔[2]

ایک اعرابی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، وہ کہنے لگا کہ کیا آپ لوگ اپنے بچوں کو پیار کرتے ہیں ہم تو ان کو پیار نہیں کرتے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تمھارے دل سے رحم نکال لیا ہو تو میں تمھارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟[3]

آپ بچوں پر بہت شفیق تھے اور ان سے بہت نرمی اور محبت کا معاملہ فرماتے تھے۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ آپ کا گزر کچھ بچوں پر ہوا جو کھیل رہے تھے آپ نے ان کو سلام کیا۔[4]

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب عیادۃ الصبیان، نیز کتاب الجنائز باب قول النبی صلے اللہ علیہ وسلم "انا بک لمحزونون" [2] فتح الباری ج ۸ ص ۲۲۴ (مصری ایڈیشن) [3] بروایت عائشہؓ صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد [4] صحیح بخاری کتاب الاستیذان

انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہم میں گھلے ملے رہتے تھے میرے ایک چھوٹے بھائی سے آپ فرماتے ابو عمیر نغیر کیا ہوا؟[1][2]

مسلمانوں پر آپ بے حد شفیق اور مہربان تھے اور ان کے احوال کی بہت رعایت فرماتے تھے انسانی طبائع میں اکتاہٹ اور وقتی طور پر پست ہمتی یا تعطل پیدا ہوتا رہتا ہے اس کا برابر لحاظ رکھتے تھے

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو جو وعظ و نصیحت فرماتے تھے وہ وقفوں کے ساتھ ہوتی تھی اس خیال سے کہ کہیں ہمارے اندر اکتاہٹ نہ پیدا ہونے لگے[3] نماز خصوصاً سے متعلق تعلق باللہ اور شیفتگی کے باوجود آپ اگر کسی بچہ کا رونا سن لیتے تو نماز مختصر فرما دیتے آپ نے خود یہ ارشاد فرمایا کہ میں نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ طویل نماز پڑھوں کہ کسی بچے کے رونے کی آواز سن کر تو اس خیال سے نماز مختصر کر دیتا ہوں کہ اس کی ماں کو دشواری اور تکلیف نہ ہو[4]

عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ بخدا کی قسم میں اللہ صبح کی نماز میں بعض اس لئے نہیں پہنچ پاتا کہ فلاں صاحب بہت طویل نماز پڑھاتے ہیں اس کے بعد وعظ آپ نے فرمایا اس سے زیادہ خفگی کی حالت میں میں نے کسی اور وعظ میں آپ کو نہیں دیکھا آپ نے فرمایا تم میں بعض لوگ ہیں جو لوگوں کو متنفر کرتے ہیں تم میں سے جو نماز پڑھائے اس کو چاہیے کہ مختصر پڑھائے اس لئے کہ نمازیوں میں کمزور بھی ہوتے ہیں بوڑھے اور ضرورت والے بھی[5]

---

[1] چھوٹی چڑیا جس سے بچے اکثر کھیلتے ہیں۔ [2] الادب المفرد [3] صحیح بخاری کتاب العلم (باب من اخف الصلوٰۃ) [4] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ (باب تخفیف الامام القراءۃ)

اسی سلسلہ میں یہ واقعہ بھی آسکتا ہے کہ انجشہ جو عورتوں کے قافلہ کے حُدی خواں تھے بہت خوش آواز شخص تھے ان کی خوش آوازی کی وجہ سے اونٹ بہت تیز رفتاری کے ساتھ چلنے لگتے تھے عورتوں کو اس سے زحمت ہوتی تھی یہ دیکھ کر آپ نے انجشہ سے فرمایا "انجشہ ذرا آہستہ اس تیز رفتاری سے آبگینوں (کمزور و نازک ہستیوں) کو تکلیف نہ پہونچ جائے"[1]

اللہ تعالےٰ نے آپ کے سینے کو کینہ سے اور کسی کا بُرا چاہنے سے ہر طرح پاک کر دیا تھا، آپ فرماتے تھے کہ تم میں سے کوئی شخص مجھ سے کسی دوسرے کی شکایت نہ کرے اس لئے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے سامنے اس حالت میں آؤں کہ میرا دل بالکل صاف ہو[2]

آپ مسلمانوں کے حق میں شفیق باپ کی طرح تھے اور سارے مسلمان آپ کے سامنے اس طرح تھے جیسے وہ سب آپ کے اہل و عیال میں شامل ہوں اور ان سب کی ذمہ داری آپ پر ہو آپ کو ان پر اس درجہ شفقت اور ان سے اس درجہ تعلق تھا جیسے ماں کو اپنے کمسن بچے سے ہوتی ہے مسلمانوں کے پاس مال و دولت اور ان کے رزق میں جو فراخی اللہ تعالےٰ نے فرمائی تھی اس سے تو آپ کو کوئی سروکار نہ تھا لیکن ان کے قرضوں اور ان کو زیر بار کرنے والی چیزوں کو ہلکا کرنا آپ نے اپنے ذمہ لیا تھا آپ فرماتے تھے جس نے ترکہ میں مال چھوڑا وہ اس کے وارثوں کا ہے جو کچھ قرض وغیرہ باقی ہے تو وہ ہمارے ذمہ ہے[3] ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کوئی مومن ایسا نہیں جس کا مجھ سے زیادہ دنیا و آخرت میں کوئی ولی ہو اگر چاہو تو یہ آیت پڑھو۔

---

[1] الادب المفرد صفحہ ۵۱ نیز صحیح بخاری و صحیح مسلم [2] کتاب الشفاء مطبوعہ بروایت ابو داؤد

[3] صحیح بخاری کتاب الاستقراض باب (الصلاۃ علی من ترک دینا)

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (الاحزاب ۶) — نبی مسلمانوں کے تئیں ان کی جانوں سے زیادہ دوست (اقرب) ہیں۔

اس لیے جس مسلمان کا انتقال ہوا اور وہ کچھ مال چھوڑے تو وہ اس کے عصبہ، قریبی رشتہ داروں کا حق ہے وہ جو بھی ہوں، اگر اس کے ذمہ کچھ قرض ہو اور زمین جائیداد رہ جائے تو میرے پاس آئے، اس کا والی اور ذمہ دار میں ہوں۔[1]

اعتدالِ فطرت اور سلامتِ ذوق

اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس اعلیٰ درجہ کے اخلاق اور اعلیٰ درجہ کی طبعی خلقی موزونیت سے نوازا تھا وہ آنے والی صدیوں اور مہذب و شائستہ نسلوں کے لئے معیارِ کمال ہے، اور اس کو ہم اعتدالِ فطرت، سلامتِ ذوق، لطافتِ حس، موزونیت و جامعیت اور افراط و تفریط سے پرہیز سے تعبیر کر سکتے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دو کاموں میں کسی ایک کو ترجیح دینی ہوتی تو ہمیشہ اس کو اختیار فرماتے جو زیادہ سہل ہوتا بشرطیکہ اس میں گناہ کا شائبہ نہ ہو، اگر اس میں گناہ ہوتا تو آپ اس سے سب سے زیادہ دور ہوتے۔[2]

آپ تکلفات، ضرورت سے زیادہ زہد و تقشف اور نفس کے جائز حقوق سے ناگواری سے بہت دور تھے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا!

"دین آسان ہے اور جو بھی دین سے زور آزمائی کرے گا دین اس پر غالب آ جائے گا، اس لئے میانہ روی اور اعتدال کے ساتھ چلو، قریب کے پہلوؤں کی رعایت کرو اور بشارت

---

[1] ایضاً [2] صحیح مسلم، باب مباعدتہ صلی اللہ علیہ وسلم للآثام

اور صبح و شام اور کسی قدر تاریکی شب کی عبادت سے تقویت حاصل کرو۔[1]

آپ نے یہ بھی فرمایا "ٹھیرو اتنا ہی کرو جتنا کرنے کی تمہارے اندر طاقت ہو اس لئے کہ خدا کی قسم اللہ تعالیٰ تو نہیں تھکے گا تم ہی تھک جاؤ گے" ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو کون سا دین سب سے زیادہ محبوب ہے آپ نے فرمایا "الحنيفية السمحة" (سہولت و خلوص والا دین ابراہیمی)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مبالغہ و سختی سے کام لینے والے اور بال کی کھال نکالنے والے ہلاک ہو گئے۔[2]

آپ نے اپنے بعض صحابیوں کو جب کسی جگہ تعلیم اور وعظ و نصیحت کے لئے بھیجا تو ان سے فرمایا کہ "آسانی پیدا کرنا تنگی نہ کرنا بشارت دینا اور متنفر نہ کرنا" عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ اپنی نعمت کا نشان اپنے بندہ پر دیکھے۔[3]

اپنے گھر میں اہل و عیال کے ساتھ

آپ اپنے گھر میں عام انسانوں کی طرح رہتے تھے اور جیسا کہ خود حضرت عائشہؓ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان باب الدین یسر [2] الادب المفرد ملتقا (طبع المطبعۃ السلفیہ)

[2] صحیح مسلم یعنی دین کے معاملات میں اپنے پیچ کرنے والے اور اس میں تشدد اور مبالغہ کرنے والے۔

[3] ترمذی نے یہ حدیث ابواب آداب میں بیان کی ہے باب ان اللہ یحب ان یری اثر نعمتہ علی عبدہ یعنی اللہ نے اس کو جب کشود گی نوازا ہے تو اس کی زندگی سے اس کا اظہار ہو، آکسی مفلس آدمی کی طرح رہے تو گویا وہ خدا کے احسان کی ناشکری کرتا ہے اور اپنے فقر کا بلا ضرورت اعلان کرتا ہے۔

نے بیان فرمایا ہے "آپ اپنے کپڑوں کو بھی صاف فرماتے تھے بکری کا دودھ بھی خود دوہ لیتے تھے اور اپنا کام خود انجام دیتے تھے" آگے بیان فرماتی ہیں کہ "اپنے کپڑوں میں پیوند لگا لیتے تھے جوتا گانٹھ لیتے تھے اور اسی طرح کے اور کام کرتے تھے" حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ آپ اپنے گھر میں کس طرح رہتے تھے انھوں نے جواب دیا کہ "آپ گھر کے کام کاج میں رہتے تھے جب نماز کا وقت آتا تو نماز کے لئے باہر چلے جاتے۔"[1]

ایک روایت میں ہے کہ "آپ اپنی جوتی ٹانک لیتے تھے کپڑا سی لیتے تھے جیسا تم میں سے کوئی اپنے گھر میں کرتا ہے۔"[2]

حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ آپ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ نرم اور سب سے زیادہ کریم تھے اور ہنستے مسکراتے رہتے تھے۔[3]

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں "میں نے کسی شخص کو نہیں دیکھا جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اپنے اہل وعیال پر شفیق و رحیم ہو"[4] حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تم میں سب سے زیادہ بہتر وہ ہے جو اپنے اہل وعیال کے لئے سب سے بہتر ہو اور میں اپنے اہل وعیال کے معاملے میں تم سب سے زیادہ بہتر ہوں۔"[5]

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی کھانے میں کبھی عیب نہیں نکالا، اگر خواہش ہوتی تو تناول فرمایا نا پسند ہوا تو چھوڑ دیا۔[6]

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصلاۃ، باب من کان فی حاجۃ اہلہ نیز بروایت احمد و عبدالرزاق۔

[2] مصنف عبدالرزاق حدیث نمبر ۲۰۴۹۲ ج ۱۱ ص ۲۶۰ [3] ابن عساکر [4] مسند احمد بروایت انسؓ نیز صحیح مسلم

[5] ابن ماجہ باب حسن معاشرۃ النساء [6] متفق علیہ صحیح بخاری کتاب الاطعمہ باب ما عاب النبی صلے اللہ علیہ وسلم طعاما نیز صحیح مسلم

خطرات اور آزمائشوں میں سب سے آگے اور انعام و اکرام میں سب سے پیچھے

اپنے اہل بیت، اہل و عیال اور قرابت داروں کے ساتھ آپ کا مستقل معاملہ اور اُصول یہ تھا کہ جو آپ سے جس قدر قریب ہوتا آپ خطرات اور آزمائشوں میں اس کو اسی قدر آگے رکھتے اور انعام و اکرام اور مال غنیمت کی تقسیم کے وقت اسی قدر پیچھے رکھتے جب عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ نے (جو قریش کے نامی گرامی بہادروں اور جنگ آزماؤں میں تھے) بدر میں قریش کو للکارا اور مبارز طلبی کی تو آپ نے حمزہ، علی اور عبیدہ کو آواز دی اور ان کے مقابلہ پر بھیجا حالانکہ آپ کو ان شہسواروں کی حیثیت و اہمیت سے خوب واقف تھے، مہاجرین میں متعدد ایسے بہادر اور جری شہسوار موجود تھے، جو ان سے دو دو ہاتھ کر سکتے تھے، بنی ہاشم کے یہ تینوں افراد وہ تھے جو قوت اور رشتہ میں آپ سے سب سے قریب تھے اور آپ کو سب سے زیادہ عزیز و محبوب بھی تھے، لیکن آپ نے ان کو اس خطرہ سے بچانے کے لئے دوسرے حضرات کو خطرہ میں نہیں ڈالا اور انہیں کو مقابلہ کے لئے بھیجا، اللہ تعالیٰ کا کرنا کہ اس نے ان کو اپنے دشمنوں پر غالب فرما دیا اور فتح عطا فرمائی، حضرت حمزہؓ و حضرت علی رضی اللہ عنہما مظفر و منصور اور صحیح سالم واپس آئے، عبیدہ رضی اللہ عنہ کو زخمی حالت میں لایا گیا۔

آپ نے جب سود کو حرام اور جاہلیت کے خون کو کالعدم قرار دیا تو اس کی ابتدا اپنے عم محترم عباسؓ بن عبد المطلب اور اپنے بھتیجے (ربیعہ بن الحارثؓ بن عبد المطلب کے فرزند) سے فرمائی، حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا:۔

"زمانۂ جاہلیت کا سود آج سے ختم اور کالعدم ہے اور پہلا سود جو میں ختم کرتا ہوں وہ ہمارے یہاں کا عباس بن عبد المطلب کا سود ہے۔ زمانۂ جاہلیت کا خون بھی کالعدم ہے اور وہ ہمارے ہی یہاں کا ربیعہ بن الحارث کے فرزند کا خون ہے۔"[1]

راحت و آرام اور انعام و اکرام کے موقع پر آپ عام سلاطین و حکمرانوں یا سیاسی رہنماؤں کی روش اور عادت کے خلاف ان حضرات کو ہمیشہ پیچھے رکھتے تھے اور ان پر دوسروں کو ترجیح دیتے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ فاطمہؓ کو چکی پیسنے میں مشقت ہوتی تھی، اسی زمانہ میں ان کو یہ خبر ملی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ باندیاں آئی ہیں، وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اس کی خواستگار ہوئیں کہ ان کو بھی ان میں سے خدمت و مدد کے لئے کوئی باندی عطا ہو جائے، لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس وقت دولت خانہ پر تشریف نہیں رکھتے تھے، انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس بات کا ذکر کیا، حضرت عائشہؓ نے آپ سے اس کا تذکرہ کیا، چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے یہاں تشریف لائے، اس وقت ہم سونے کے لئے لیٹ چکے تھے، آپ کو دیکھ کر ہم کھڑے ہونے لگے، آپ نے فرمایا کہ لیٹے رہو، یہاں تک کہ آپ کے قدم مبارک کی ٹھنڈک میں نے اپنے سینے میں محسوس کی، آپ نے ارشاد فرمایا کیا میں تم کو اس سے بہتر بات نہ بتاؤں جس کا تم نے سوال کیا تھا، جب تم سونے کے لئے لیٹو تو ۳۴ بار اللہ اکبر کہو ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۳ بار سبحان اللہ کہو، یہ تمہارے لئے اس سے بہتر ہے جس کا سوال تم دونوں نے مجھ سے کیا تھا۔[2]

---

[1] صحیح مسلم کتاب الحج، باب حجۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم، بروایت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ، یہ کلام بعض روایات میں خطبہ میں آیا ہے۔ [2] صحیح بخاری کتاب الجہاد، باب الدلیل علی ان الخمس لنوائب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔

ایک دوسری روایت میں اسی واقعہ کے ساتھ یہ بھی آتا ہے کہ آپ نے ان سے فرمایا کہ خدا کی قسم اس حالت میں کہ اہلِ صفہ کے پیٹ بھوک سے پیٹھ سے لگ گئے ہیں میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا، میرے پاس ان پر خرچ کرنے کے لئے کچھ نہیں ہے، ان کو فروخت کر کے میں ان کی آمدنی ان پر خرچ کروں گا۔[1]

لطافتِ شعور اور جذبات کی بلندی و پاکیزگی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں نبوت اور دعوتِ حق کے کارِ عظیم انسانیت کے درد و سوز اور ان مسلسل فکروں اور گرانباریوں کے ساتھ جن کا تحمل پہاڑوں کے لئے بھی آسان نہ تھا، لطیف انسانی احساسات اور پاکیزہ و بلند جذبات پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ ریز تھے، اس غیر معمولی قوتِ ارادی، غیر متزلزل رائے و مسلک کے ساتھ جو انبیاء کا شیوہ اور امتیازی خصوصیت ہوتی ہے، اور جو دعوت الی اللہ اور اعلاء کلمۃ اللہ کے راستہ اور اس کے احکام کی تعمیل میں کسی چیز کو کوئی وزن نہیں دیتی اور کسی بات کو خاطر میں نہیں لاتی، آپ نے اپنے ان وفادار رفقاء کو اپنی زندگی کے آخری ایام تک فراموش نہیں کیا، جنھوں نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا تھا، اور راہِ حق میں اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا، اور احد کے معرکہ میں شہادت پا کر حیاتِ جاوید حاصل کی تھی، آپ ان کا برابر ذکر فرماتے رہے، ان کے لئے دعائیں کرتے رہے اور ان کے ہاں تشریف لے جاتے رہے۔

یہ محبت دو انسانی جسموں سے تجاوز کر کے ان بے جان پتھروں، پہاڑوں

---

[1] بروایت احمد (فتح الباری ج ۷ صفحہ ۲۲-۲۳)

اور وادیوں تک میں سرایت کر گئی جہاں عشق و وفا اور قربانی و جاں نثاری کے بے شمار نظارے چشم فلک نے دیکھے تھے اور جن کو ان کی جائے قیام بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ انس بن مالکؓ بیان فرماتے ہیں کہ آپ نے اُحد کو دیکھ کر ارشاد فرمایا "ھٰذَا جَبَلٌ یُحِبُّنَا وَنُحِبُّہٗ"[1] (یہ وہ پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں) ابی حمیدؓ راوی ہیں کہ "ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ تبوک سے واپس آئے جب مدینہ قریب آیا تو آپ نے فرمایا "ھٰذِہٖ طَابَۃٌ، وَھٰذَا جَبَلٌ یُحِبُّنَا وَنُحِبُّہٗ" (یہ طابہ (مدینہ طیبہ) ہے اور یہ وہ پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں)[2]

عقبہؓ کا بیان ہے کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک روز اہل اُحد کے پاس تشریف لے گئے، اور ان کے لئے دعاء مغفرت کی۔" جابر بن عبد اللہؓ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے اصحاب اُحد کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا خدا کی قسم، میری خواہش تھی کہ میں بھی شہداء اُحد کے ساتھ پہاڑ کے دامن میں رہ جاتا۔ آپ نے اپنے چاہنے والے چچا اور رضاعی بھائی کی شہادت کا صدمہ (جنھوں نے آپ کی محبت و حمیت اور اسلام کی نصرت و حمایت میں جان دی، اور ان کی نعش کے ساتھ وہ سلوک کیا گیا جو کسی کے ساتھ نہ ہوا تھا) انبیاء و اولوا العزم کے صبر کے ساتھ برداشت کیا، لیکن جب آپ اُحد سے واپس ہوتے ہوئے مدینہ تشریف لائے اور بنی عبد الاشہل کے گھر کے سامنے سے آپ گذرے، اور ان کے شہداء پر رونے کی آواز آپ کے کانوں میں آئی تو اس واقعہ نے آپ کے لطیف انسانی احساسات کو چھیڑ دیا، اور آپ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں، آپ نے فرمایا

---

[1] صحیح بخاری کتاب المغازی باب اُحد یحبنا [2] صحیح بخاری کتاب المغازی واقعہ تبوک [3] بیہقی

"لکن حمزۃ لا بواکی لہ" (لیکن حمزہؓ کے رونے والیاں نہیں ہیں)[1]

تاہم یہ شریفانہ و اعلیٰ انسانی احساسات و جذبات نبوت اور دعوت اسلامی کی عظیم ذمہ داریوں اور حدود الٰہیہ کی رعایت و حفاظت پر بھی اثر انداز نہیں ہوئے سیرت نگار اور مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ جب سعد بن معاذ اور اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہما بنی عبد الاشہل کے گھر واپس آئے تو انھوں نے اپنے گھر کی عورتوں کو حکم دیا کہ تیار ہو کر جائیں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کا ماتم کریں۔ ان خواتین نے ایسا ہی کیا جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو ان کو مسجد نبوی کے دروازے پر روتا ہوا پایا آپ نے فرمایا "اللہ تم پر رحم فرمائے واپس جاؤ، تمھارے یہاں آنے ہی سے غمخواری کا سامان ہو گیا" ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ سب کیا ہے؟ آپ کو بتایا گیا کہ انصار نے اپنی عورتوں کو کس مقصد سے یہاں بھیجا ہے آپ نے خدا کے حضور مغفرت طلب کی اچھے الفاظ سے ان کو خطاب کیا اور فرمایا "میرا مطلب یہ نہیں تھا میں میت پر رونا پسند نہیں کرتا، پھر آپ نے اس سے منع فرمایا"[2]

اس سے نازک موقع اسد اللہ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی کے ساتھ پیش آیا، جب مسلمانوں نے مکہ کو فتح کر لیا تو دنیا ان کی نظر میں تاریک ہو گئی اور راستے مسدود نظر آنے لگے اُن کے لئے قدرتی طور پر مشکلات پیدا ہو گئیں انھوں نے شام و یمن اور بعض دوسرے مقامات پر جانے کا ارادہ کیا ان سے لوگوں نے کہا بھلے آدمی! رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کسی ایسے شخص کو قتل نہیں کرتے جو آپ کے

---

[1] ابن کثیر ج ۳ ص ۹۵ ، امام احمد نے اس کی ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے ابن کثیر کا قول ہے کہ یہ علی شرط مسلم
[2] ابن کثیر ج ۳ ص ۹۶

ذہن میں داخل ہو چلے تھے ان کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور وہ کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔ مسلمان ہونے کے بعد جب وہ پہلی بار حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان کا اسلام قبول فرمایا اور کوئی ایسی بات نہیں فرمائی جس سے ان کے دل میں خوف پیدا ہو۔ حضرت حمزہؓ کے قتل کا واقعہ آپؐ نے ان سے سنا، جب وہ سب کہہ چکے تو آپؐ کے اندر وہ لطیف انسانی احساس اور کیفیت ضرور پیدا ہوئی لیکن یہ خاص کیفیت اور جذبہ آپؐ کے منصب نبوت کے مزاج اور احساس ذمہ داری پر غالب نہیں آنے پایا کہ آپؐ ان کے اسلام کو قبول نہ فرماتے یا غصہ میں ان کو قتل کروا دیتے۔ آپؐ نے اس کے علاوہ کچھ نہ فرمایا: بندۂ خدا! میرے سامنے نہ آنا، میں یہ چاہتا ہوں کہ میری نظر تم پر نہ پڑے۔ وحشی کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں برابر آپؐ کے سامنے آنے سے کتراتا رہا کہ کہیں آپؐ مجھے دیکھ نہ لیں یہاں تک کہ ان کا وقت موعود آ گیا۔[1]

بخاری میں ہے کہ آپؐ کی نظر جب مجھ پر پڑی تو آپؐ نے فرمایا کیا تم وحشی ہو؟ میں نے عرض کیا ہاں! فرمایا کیا تمہیں نے حمزہ کو شہید کیا تھا؟ میں نے کہا آپ کو جو اطلاع پہنچی ہے وہ درست ہے۔ آپؐ نے فرمایا کیا تم یہ کر سکتے ہو کہ میرے سامنے نہ آیا کرو۔[2]

ان فطری و انسانی احساسات و کیفیات اور اعلیٰ و لطیف جذبات کی جھلک ہمیں وہاں بھی نظر آتی ہے جب آپؐ ایک ننھی منی پرانی قبر پر تشریف لے گئے۔

---

[1] ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۷۳۔ صحیح بخاری میں یہ واقعہ کتاب المغازی باب قتل حمزہ رضی اللہ عنہ میں بیان کیا گیا ہے۔ [2] صحیح بخاری، باب قتل حمزہؓ۔

اس وقت آپ پر رقت طاری ہوئی اور آپ رو دیئے پھر آپ نے فرمایا یہ آمنہ کی قبر ہے یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کی وفات پر طویل عرصہ گذر چکا تھا۔

کرم گستری اور تحمل و بردباری

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکارم اخلاق نوازش و کرم گستری اور تواضع میں ملت اسلامیت کے امام و مقتدا و پیشوا تھے اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ[۱]	بے شک آپ بہت عظیم اخلاق کے حامل ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود ارشاد فرمایا:۔

اَدَّبَنِيْ رَبِّيْ فَاَحْسَنَ تَادِيْبِيْ۔	میری تربیت اللہ تعالےٰ نے فرمائی ہے اور بہترین فرمائی ہے۔

حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَنِيْ لِتَمَامِ مَكَارِمِ الْاَخْلَاقِ وَكَمَالِ مَحَاسِنِ الْاَفْعَالِ[۲]	اللہ تعالےٰ نے مجھے مکارم اخلاق اور محاسن اعمال کی تکمیل کے لئے مبعوث فرمایا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپؐ کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا انھوں نے کہا:۔

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنَ۔[۳]	آپ اخلاق میں قرآن کا مجسم نمونہ تھے۔

---

[۱] بیہقی بروایت سفیان ثوریؒ (دیکھئے ابن کثیر ج ۲ ص ۲۲) [۱] القلم ۴ [۲] شرح السنۃ و مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۱۳ [۳] صحیح مسلم بروایت عائشہؓ

عفو و درگذر، تحمل و بردباری، کنارہ کشی اور قوت برداشت میں آپ کا جو مقام تھا، وہاں تک بلی ذہانت کی ذہانت اور شعراء کے خیال و تصور کی بھی رسائی نہیں ہو سکتی اگر ان واقعات کو اس مخصوص طریقہ سے بیان نہ کیا گیا ہوتا جو شک و شبہ سے بالاتر ہے تو لوگوں کے ذہن آج اس کو قبول نہ کرتے لیکن یہ روایات اس قدر صحیح اور مسلسل اسناد اور ایک ثقہ و عادل راوی سے دوسرے ثقہ و عادل راوی تک اس انضباط و ارتباط کے ساتھ بیان کی گئی ہیں اور ان میں اس درجہ تواتر پایا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ معتبر ترین تاریخی دستاویزات سے کہیں زیادہ قابل اعتماد ہیں۔ اس موقع پر ہم اس سلسلے کے چند واقعات بیان کریں گے:۔

آپ کی نوازش و کرم اور بڑے سے بڑے دشمن کے ساتھ دلداری اور احسان کا ایک نمونہ وہ تھا جب منافقین کے سردار عبداللہ بن اُبی بن سلول کو قبر میں اتارا گیا تو آپ وہاں تشریف لائے حکم دیا کہ اس کو قبر سے نکالا جائے اس کے بعد آپ نے اس کو اپنے گھٹنوں پر رکھا اور اپنا لعاب دہن اس پر ڈالا اور اپنی قمیص مبارک اس کو پہنائی[1]۔

انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل رہا تھا آپ اس وقت نجران کی چادر زیب تن کئے ہوئے تھے جس کے کنارے موٹے تھے راستہ میں ایک عربی آپ کو ملا اور آپ کی چادر مبارک پکڑ کر زور سے کھینچی میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ آپ کی گردن پر اس کے کھینچنے کی وجہ سے نشان

[1] ۹ھ میں تبوک سے واپسی پر ذی قعدہ میں اس کی موت واقع ہوئی۔ از زرقانی ج ۳ صفحہ ۱۱۳۔ [2] صحیح بخاری کتاب الجنائز مختصر کے ساتھ۔

پڑ گئے ہیں۔ پھر اس اعرابی نے کہا یا محمد! اللہ کا جو مال آپ کے پاس ہے اس میں سے مجھے دینے کا حکم دیجیے۔ آپ نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور ہنسے پھر ہدایت کی کہ اس کو دیا جائے۔[1]

زید بن سعنہ قبول اسلام سے قبل آپ کے پاس آیا اور قرض کا مطالبہ کیا جو آپ نے اس سے لیا تھا پھر اس کے بعد اس نے کپڑا پکڑ کر آپ کے شانہ مبارک سے زور سے کھینچا اور اپنی مٹھی میں کپڑے کو لے لیا اور سخت الفاظ میں بات کی پھر کہا کہ تم عبد المطلب کی اولاد بڑے ٹال مٹول کرنے والے ہو۔ حضرت عمرؓ نے اس کو جھڑکا اور سخت لہجہ میں بات کی لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ کا رد عمل مسکراہٹ کا رہا۔ آپ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا عمر! ہم اور یہ شخص تمہاری طرف سے دوسرے رویے کے مستحق تھے۔ مجھے تم قرض جلد ادا کرنے کا مشورہ دیتے اور اس کو نرم طریقے سے تقاضہ کرنے کو کہتے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اس کی مدت ادائیگی میں ابھی تین دن باقی ہیں۔ بہر حال آپ نے حضرت عمرؓ کو اس کے قرض کی ادائیگی کا حکم دیا اور بیس صاع اس کو مزید دینے کو فرمایا کہ یہ اس کا معاوضہ ہے جو حضرت عمرؓ نے اس کو خوف زدہ کر دیا تھا اور یہی بات اس کے اسلام کا باعث بن گئی۔[2]

حضرت انسؓ بیان فرماتے ہیں کہ ایک بار مکہ سے اسی مسلح آدمی جبل تنعیم سے اچانک وارد ہوئے اور دھوکہ میں رکھ کر آپ کو گزند پہنچانا چاہا۔ آپ نے ان سب کو قیدی بنا لیا اور ان کو زندہ رہنے دیا۔[3]

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد باب کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعطی المؤلفۃ قلوبہم، نیز مسند امام احمد ج ۳ ص ۱۵۳ الفاظ کے تھوڑے اختلاف کے ساتھ۔ [2] بروایت بیہقی (تفصیل کے ساتھ) و بروایت احمد ج ۳ ص ۱۲۲ الفاظ کے کسی قدر اختلاف کے ساتھ۔ [3] صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر باب قول اللہ وھو الذی کف ایدیھم عنکم۔

جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نجد کی طرف لشکر کشی کی۔ راستے میں دوپہر کا وقت ہوا اور آرام کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس علاقہ میں کثرت سے جھاڑیاں تھیں۔ آپ ببول کے ایک درخت کے سایہ میں استراحت فرمانے لگے۔ اور اپنی تلوار درخت پر لٹکا دی اور لوگ بھی منتشر ہو کر مختلف درختوں کے نیچے پناہ گیر ہو گئے۔ یہ کیفیت تھی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں آواز دی۔ ہم حاضر خدمت ہوئے تو دیکھا کہ ایک اعرابی آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں سو رہا تھا کہ یہ شخص آیا اور میری تلوار کھینچ لی۔ میں بیدار ہوا تو تلوار کھینچے ہوئے میرے سر پر کھڑا تھا۔ اس نے کہا تمہیں مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ میں نے کہا اللہ۔ اس نے تلوار نیام میں کر لی[1] اس کے بعد بیٹھ گیا۔ اور یہ ہے وہ شخص جو تمہارے سامنے بیٹھا ہوا ہے" راوی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو کوئی سزا نہ دی[2]۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حلم و بُردباری کا یہ حال تھا کہ تمام صحابہؓ کرام کا حلم بھی مل کر آپ کے برابر نہ تھا۔ حالانکہ سب صحابہؓ کرام حلم و سکینت کے حامل تھے۔ آپ کی حیثیت ان تمام معاملات میں سب کے لئے ایک شفیق استاد، اور رحم دل و مہربان مصلح و مربی کی تھی۔ اس کا ایک نمونہ ہمیں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "ایک مرتبہ ایک اعرابی نے مسجد میں

---

[1] اس روایت میں لفظ شام آیا ہے جس کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ اس نے تلوار نیام میں کر لی اور اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اس نے تلوار کھینچی اور اس کو دیکھا (ملاحظہ ہو مجمع بحار الانوار)

[2] صحیح بخاری کتاب المغازی باب (غزوہ بنی المصطلق)

پیشاب کر دیا۔ لوگ یہ دیکھ کر اس پر دوڑ پڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کو چھوڑ دو اور جہاں اس نے پیشاب کر دیا ہے اس پر ایک ڈول پانی یا بھرا پانی کے ڈول بہا دو۔ اور خیال رکھو کہ تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو۔ تنگی و دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں۔[1]

معاویہ بن الحکم راوی ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک شخص کو چھینک آئی میں نے کہا "یرحمک اللہ" لوگ یہ سن کر مجھے گھورنے لگے۔ میں نے کہا تمہاری مائیں تم پر روئیں آخر کیا ہوا ہے کہ تم لوگ مجھے اس طرح تیز نگاہوں سے گھور رہے ہو۔ یہ سن کر لوگ اپنی رانوں پر ہاتھ مارنے لگے جب میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے خاموش کرنا چاہتے ہیں تو میں چپ ہو گیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو میرے ماں باپ آپ پر قربان میں نے نہ آپ سے پہلے آپ کی طرح کوئی مربی اور معلم دیکھا اور نہ آپ کے بعد۔ خدا کی قسم نہ آپ نے مجھے ڈانٹا نہ مارا نہ برا بھلا کہا بس یہ فرمایا کہ نماز میں عام انسانی گفتگو مناسب نہیں یہ تو بس نماز صرف تسبیح و تکبیر اور تلاوت قرآن کے لئے ہے۔[2]

انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت رحم دل تھے آپ کے پاس کوئی ضرورت مند آتا تو آپ اس سے وعدہ ضرور کرتے اور اگر کچھ ہوتا تو اسی وقت اس کی حاجت پوری فرماتے۔ ایک بار نماز کھڑی ہو چکی تھی کہ ایک اعرابی آگے بڑھا اور آپ کا کپڑا پکڑ کر کہنے لگا میری ایک معمولی سی ضرورت باقی رہ گئی ہے مجھے ڈر ہے کہ کہیں بھول نہ جاؤں۔ آپ اس کے ساتھ تشریف لے گئے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الوضو [2] مسلم باب تحریم الکلام فی الصلاۃ۔

جب اس نے اپنا کام کرلیا تو آپؐ واپس تشریف لائے اور نماز ادا فرمائی۔

آپ کے تحمل، قوت برداشت، کشادگی قلب اور صبر و عزیمت کے واقعات میں آپؐ کے خادم حضرت انسؓ کی وہ شہادت ہے جو انھوں نے اس سلسلہ میں دی ہے اس وقت وہ بہت کمسن تھے انھوں نے کہا کہ "میں نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی دس سال خدمت کی آپؐ نے کبھی اُوں بھی نہیں کہا، اور نہ یہ فرمایا کہ فلاں کام تم نے کیوں کیا اور فلاں کام تم نے کیوں نہ کیا؟"[1]

سُوادا بن عمرؓ کہتے ہیں کہ "میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور میرے کپڑے پر زعفران سے ملی ہوئی خوشبو کا نشان تھا، آپؐ نے دیکھا تو فرمایا: "ورس ورس[2] پھینکو پھینکو" اور میرے پیٹ پر ایک چھڑی ماری جس سے مجھے تکلیف ہوئی، میں نے کہا یا رسول اللہ مجھ کو قصاص کا حق ہو گیا ہے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے شکم مبارک سے کپڑا ہٹا دیا اور فرمایا قصاص لے لو۔"[3]

آپؐ کی تواضع

تواضع آپؐ کے اندر انتہا درجہ کی تھی اور آپؐ کسی چیز میں نمایاں اور ممتاز ہونا پسند نہیں فرماتے تھے اور نہ آپ اس کو اچھا سمجھتے تھے کہ لوگ آپؐ کے لئے کھڑے ہوں اور آپؐ کی مدح و توصیف میں مبالغہ سے کام لیں جیسے گذشتہ اُمتوں نے اپنے انبیاء کے ساتھ کیا تھا یا آپؐ کو عبدیت اور رسالت کے درجہ سے بلند کریں، حضرت انسؓ

---

[1] مسلم کتاب الفضائل باب حسن خلقہ صلے اللہ علیہ وسلم [2] ایک زرد بوٹی جس سے کپڑا رنگا جاتا ہے [3] کتاب الشفاء باب اصول نے صحبت میں کہا کہ قصاص لینے کے لئے نہیں۔

فرماتے ہیں کہ ہم کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی شخص محبوب نہ تھا، لیکن ہم آپ کو دیکھ کر اس خیال سے کھڑے نہیں ہوتے تھے کہ آپ اس کو پسند نہیں فرماتے۔[1]

آپ سے عرض کیا گیا کہ "یا خیر البریۃ" (اے مخلوق میں سب سے افضل) آپ نے فرمایا "ذاک ابراھیم علیہ السلام" (یہ ابراہیم علیہ السلام کا مقام ہے)[2]

حضرت عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میری اس طرح آگے بڑھ کر تعریف و توصیف نہ کرو جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کے ساتھ کیا تھا، میں تو صرف ایک بندہ ہوں، تم مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔[3]

عبداللہ بن ابی اوفیٰ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس میں کوئی تکلف اور عار نہ ہوتا تھا کہ آپ کسی غلام یا کسی بیوہ کے ہمراہ تشریف لے جائیں یہاں تک کہ اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔[4]

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ مدینہ کی لونڈیوں اور باندیوں میں سے کوئی آپ کا ہاتھ پکڑ لیتی اور جو کچھ کہنا ہوتا کہتی اور جہاں چاہتی لے جاتی۔[5]

• عدی بن حاتم الطائی جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان کو اپنے گھر بلایا، باندی نے تکیہ جس پر ٹیک لگاتے ہیں پیش کیا، آپ نے اس کو اپنے اور عدی کے درمیان رکھ دیا اور خود زمین پر بیٹھ گئے، عدی کہتے ہیں کہ اس سے

---

[1] ترمذی (باب ما جاء فی کراہیۃ قیام الرجل للرجل) یہ روایت مسند احمد ج ۳ ص ۱۳۲

[2] مسلم کتاب الفضائل باب: من فضل ابراہیم علیہ السلام [3] بخاری کتاب الانبیاء و شمائل ترمذی (باب تواضع رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) [5] مسند احمد ج ۳ ص ۲۱۵ و جمع الفوائد ج ۲ کتاب المناقب باب مناقب خاتم النبیین

میں سمجھ گیا کہ آپ بادشاہ نہیں ہیں۔[1]

حضرت انسؓ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بیمار کی عیادت فرماتے تھے جنازہ میں شریک ہوتے تھے گدھے پر بھی سواری فرماتے تھے اور غلام کی دعوت قبول فرماتے تھے۔[2]

جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کمزور کے خیال سے اپنی رفتار سست فرما دیتے تھے اور اس کے لئے دعا فرماتے تھے۔[3]

انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو کی روٹی اور ایسے سالن پر جس کا مزہ بدل چلا ہو مدعو ہوتے تو بھی آپ قبول فرماتے۔[4]

انہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں بندہ ہوں بندہ کی طرح کھاتا ہوں اور بندہ کی طرح بیٹھتا ہوں۔[5]

عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میرے یہاں تشریف لائے میں نے چمڑے کا ایک تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی آپ کو پیش کیا آپ زمین پر بیٹھ گئے اور تکیہ کو میرے اور اپنے درمیان رکھ دیا۔[6]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خود گھر کی صفائی فرما لیتے اونٹ کو باندھ لیتے اور اپنے جانور کو چارہ بھی دیتے اپنے خدمت گار کے ساتھ کھانا تناول فرماتے اور آٹا گوندھنے میں اس کا ہاتھ بٹاتے اور بازار سے سودا بھی لے آتے۔[7]

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۳ [2] شمائل ترمذی باب تواضع النبی صلے اللہ علیہ وسلم [3] الترغیب والترہیب للمنذری [4] شمائل ترمذی باب تواضع النبی صلے اللہ علیہ وسلم و مسند احمد ج ۳ ص ۲۱۱-۲۸۹ [5] الشفاء ص ۱۰۱ [6] الادب المفرد ص ۱۶۷ [7] کتاب الشفاء ص ۸۱ بہ روایت بخاری

شجاعت، دلاوری اور شرم و حیا

آپ کی سیرت میں شجاعت و دلاوری اور شرم و حیا (جس کو بہت سے لوگ متضاد سمجھتے ہیں) کی یکساں نمود تھی، جہاں تک آپ کی حیا کا تعلق ہے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ پردہ نشین کنواری لڑکی سے زیادہ حیادار تھے، جب آپ کو کوئی چیز ناگوار ہوتی تھی تو اس کا اثر آپ کے چہرۂ مبارک سے ظاہر ہو جاتا تھا[1] شرم و حیا کی وجہ سے کسی کے روبرو ایسی بات نہ کہہ سکتے تھے جو اس کو ناگوار ہو، چنانچہ یہ کام کسی اور کے حوالے فرماتے، حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ایک شخص تھا جس کے کپڑوں پر زردی کا اثر غالب تھا، چونکہ آپ کسی کے روبرو ایسی بات کہنا پسند نہیں فرماتے تھے جو اس کو ناگوار ہو اس لئے جب وہ کھڑا ہو گیا تو آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ اچھا تھا اگر تم اس سے یہ کہتے کہ وہ زرد رنگ کا استعمال چھوڑ دے[2]۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ جب آپ کو کسی کے متعلق کسی برائی کی اطلاع ملتی تو آپ اس کا نام لے کر یہ نہ فرماتے کہ فلاں نے ایسا کیوں کیا، بلکہ یہ فرماتے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسا کہتے ہیں یا ایسا کرتے ہیں، آپ اس کی مخالفت تو فرماتے لیکن کام کرنے والے کا نام ظاہر نہ فرماتے[3]۔

جہاں تک شجاعت و دلاوری کا تعلق ہے تو اس کے لئے شیر خدا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی شہادت کافی ہے، وہ کہتے ہیں کہ جب زور کا رن پڑتا تھا، اور معلوم ہوتا تھا کہ آنکھیں حلقوں سے باہر آ جائیں گی تو اس وقت ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو

---

[1] صحیح بخاری کتاب المناقب باب صفۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم۔ [2] شمائل ترمذی باب خلق النبی صلے اللہ علیہ وسلم [3] سنن ابی داؤد باب حسن العشرۃ۔

آپ کی پناہ لینے کے لئے ڈھونڈتے اور یہ دیکھتے تھے کہ دشمن سے آپؐ سے زیادہ کوئی قریب نہیں ہے غزوہ بدر میں ہمارا یہی حال تھا ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پناہ لے رہے تھے اور آپؐ دشمن سے ہم سب سے زیادہ قریب تھے[1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ حسین جمیل سب سے زیادہ سخی و فیاض اور سب سے زیادہ شجاع و بہادر تھے ایک رات اہل مدینہ خوف زدہ ہو گئے اور جدھر سے آواز آ رہی تھی اُدھر لوگوں نے رخ کیا راستے میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لاتے ہوئے ملے آپؐ آواز سن کر ان سب سے پہلے وہاں تشریف لے گئے تھے آپؐ فرماتے جاتے تھے کہ ڈرو نہیں ڈرو نہیں آپؐ اس وقت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے پر سوار تھے جس پر زین بھی نہ تھا تلوار آپؐ کے شانے سے لٹک رہی تھی آپؐ نے گھوڑے کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا میں نے اس کو سمندر کی طرح رواں اور تیز رفتار پایا[2]

غزوۂ احد اور غزوۂ حنین میں جب بڑے بڑے بہادر اور جگر دار تتر بتر ہو گئے تھے اور میدان خالی تھا اس وقت بھی آپؐ اپنے خچر پر اسی سکون اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے مقام پر موجود تھے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بات ہی نہیں ہوئی آپ یہ رجز بھی پڑھتے جاتے تھے

انا النبیُّ لا کذِب ــــــــ انا ابن عبد المطّلب

میں نبی ہوں اس میں کوئی جھوٹ بات نہیں ہے ــــــــ میں عبد المطلب کا فرزند ہوں

شفقت و محبت و رحمت عامہ

اس شجاعت و بہادری کے ساتھ آپؐ بے حد نرم دل تھے آپؐ کی آنکھیں بہت جلد نم

---

[1] الشفاء ص۸۹ [2] الادب المفرد ص۴۶ بروایت صحیحین۔

اور انکسار ہو جاتا ہیں کمزور لوگوں اور بے زبان جانوروں تک کے ساتھ آپ نرمی کا حکم فرماتے تھے
شداد بن اوس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے ساتھ
اچھا سلوک کرنے اور رحم برتاؤ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس لئے اگر قتل بھی کرو تو اچھی طرح کرو ذبح کرو تو
اچھی طرح کرو تم میں سے جو ذبح کرنا چاہے وہ اپنی چھری پہلے تیز کرے اور اپنے ذبیحہ کو آرام دے۔[1]

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے ایک بکری زمین پر ذبح کرنے
کے لئے لٹائی اس کے بعد چھری کا تیز کرنا شروع کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر
فرمایا کیا تم اس کو دو بار ذبح کرنا چاہتے ہو۔ اس کو لٹانے سے پہلے تم نے چھری تیز کیوں نہ کر لی۔[2]

آپ نے صحابہ کرام کو جانوروں کو چارہ پانی دینے کی ہدایت فرمائی اور ان کو پریشان
کرنے اور ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ لادنے کی ممانعت کی اور جانوروں کی تکلیف دور کرنے اور
ان کو آرام پہونچانے کو باعث اجر و ثواب اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ قرار دیا، اور اس کے
قصے نقل بیان فرمائے حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ ایک شخص جب سفر پر تھا، راستہ میں اس کو
سخت پیاس لگی، سامنے ایک کنواں نظر پڑا، وہ اس میں اتر گیا جب باہر آیا تو دیکھا
کہ ایک کتا پیاس کی شدت سے کیچڑ چاٹ رہا ہے۔ اس نے اپنے دل میں کہا کہ پیاس
سے جو میرا حال ہو رہا تھا وہی اس کا بھی ہے، وہ پھر کنوئیں میں اترا اپنے چمڑے کے
موزے پانی سے بھرے پھر اپنے دانتوں سے ان کو دبایا اور اوپر آکر کتے کو پلایا،
اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل کو قبول فرمایا اور اس کی مغفرت فرما دی لوگوں نے
عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم کو جانوروں کے معاملے میں بھی اجر ہے آپ نے فرمایا

---

[1] مسلم، باب الامر باحسان الذبح (کتاب الذبح) [2] طبرانی اور حاکم کا قول ہے کہ
یہ حدیث بخاری کی شرط پر صحیح ہے۔

ہر اس مخلوق میں جو تر و تازہ جگر رکھتی ہے اجر ہے۔[1]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ ایک عورت کو صرف اس بات پر عذاب دیا گیا کہ اس نے اپنی بلی کو کھانا پانی نہیں دیا اور نہ اس کو چھوڑا کہ وہ حشرات الارض ہی سے اپنا پیٹ بھر لے۔[2]

سہیل بن عمرو (اور ایک روایت میں ہے سہیل بن الربیع بن عمرو) روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا گذر ایک ایسے اونٹ پر ہوا جس کی پیٹھ لاغری کی وجہ سے اس کے پیٹ سے لگ گئی تھی۔ آپ نے فرمایا ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں اللہ سے خوف کرو، ان پر سواری کرو تو اچھی طرح ان کو ذبح کرکے ان کا گوشت استعمال کرو تو اس حالت میں کہ وہ اچھی حالت میں ہوں۔[3]

عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک انصاری کے احاطہ میں داخل ہوئے اس میں ایک اونٹ تھا اس نے جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو وہ بلبلانے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس کے قریب تشریف لائے اور اس کے کوہان اور کنپٹیوں پر اپنا دست مبارک پھیرا اس سے اس کو سکون ہو گیا۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب المساقاۃ، باب فضل سقی الماء، و صحیح مسلم، باب فضل سقی البہائم۔

[2] امام نووی بروایت مسلم [3] ابوداؤد، باب ما یؤمر بہ من القیام علی الدواب۔

پھر آپ نے پوچھا کہ اس اونٹ کا مالک کون ہے؟ ایک انصاری نوجوان آیا، اور اس نے کہا کہ یا رسول اللہ یہ میرا ہے آپ نے فرمایا کیا تم اس جانور کے معاملے میں جس کا مالک اللہ تعالےٰ نے تم کو بنایا ہے، اللہ سے نہیں ڈرتے وہ مجھ سے شکایت کر رہا تھا کہ تم اس کو تکلیف دیتے ہو اور ہر وقت کام میں لگائے رکھتے ہو؟[1]

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم کسی سرسبز جگہ جاؤ تو اونٹوں کو زمین پر ان کے حق سے محروم نہ کرو اور اگر خشک زمین میں جاؤ تو وہاں تیز چلو اور رات کو پڑاؤ ڈالنا ہو تو راستہ پر نہ ڈالو اس لئے کہ وہاں جانوروں کی آمد و رفت رہتی ہے اور کیڑے مکوڑے وہاں پناہ لیتے ہیں۔[2]

ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے کہ آپ ایک ضرورت کے لئے وہاں سے تھوڑی دیر کے لئے تشریف لے گئے۔ اس درمیان ہم نے ایک چھوٹی چڑیا دیکھی اس کے ساتھ دو بچے تھے ہم نے دونوں بچے لے لئے وہ یہ دیکھ کر اپنے پروں کو پھڑپھڑانے لگی، آپ تشریف لائے اور پوچھا کہ کس نے اس کے بچے چھین کر اس کو تکلیف پہونچائی ہے، پھر آپ نے حکم دیا کہ اس کو بچے واپس کر دو یہاں ہم نے چیونٹیوں کی ایک آبادی دیکھی اور اس کو جلا دیا، آپ نے فرمایا اس کو کس نے جلایا ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ ہم لوگوں نے، آپ نے فرمایا کہ آگ سے عذاب دینے کا حق صرف آگ کے رب کو ہے۔[3]

---

[1] ایضاً۔ [2] مسلم باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب [3] ابو داؤد کتاب الجہاد باب کراہیۃ حرق العدو بالنار۔

خادم، نوکر اور مزدور کے ساتھ جو اور انسانوں کی طرح انسان ہیں اور
جن کا پیٹ آپ کے اور آقا کا احسان ہے آپ نے حسنِ سلوک کی جو تعلیم دی ہے
وہ اس کے علاوہ ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا کہ جو تم کھاتے ہو وہی ان کو کھلاؤ، جو تم پہنتے ہو وہی ان کو پہناؤ اور
اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو عذاب میں مبتلا نہ کرو[1]۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے ماتحت
کیا ہے تمہارے بھائی، تمہارے خادم اور مددگار ہیں جس کا بھائی اس کا ماتحت ہو
اس کو چاہیے کہ جو خود کھائے وہی اس کو کھلائے، جو خود پہنتا ہے وہی اس کو پہنائے
ان کے سپرد ایسا کام نہ کرو جو ان کی طاقت سے باہر ہو اگر ایسا کرنا ہی پڑے تو
پھر ان کا ہاتھ بٹاؤ[2]۔

عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
پاس آیا اور پوچھا کہ میں اپنے نوکر کو ایک دن میں کتنی مرتبہ معاف کروں؟ آپ نے
فرمایا ستر مرتبہ[3]۔ وہی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو[4]۔

کامل، عالمگیر اور لازوال نمونہ

اس فصل کا اختتام حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی کی مشہور کتاب
"خطبات مدراس" کے ایک اقتباس و انتخاب پر کیا جا رہا ہے جس کا یہ حصہ حسبِ

---

[1] بخاری کتاب الادب المفرد ص۳۰ [2] بخاری و ابوداؤد [3] ترمذی و ابوداؤد

[4] ابن ماجہ ابواب الرہون (باب اجر الاجراء)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل، عالمگیر اور لافانی نقش حیات آپ کی جامعیت و کاملیت اور تمام طبقات انسانی نیز ہر ماحول، ہر زمانہ ہر پیشہ اور ہر مشغلہ غرض ہر قسم کے حالات اور ہر سطح و معیار کے لئے آپ کی کامل و جامع رہنمائی اور اسوۂ حسنہ کی نہایت موثر اور بلیغ انداز میں تشریح کی ہے وہ لکھتے ہیں:

"ایک ایسی شخصی زندگی جو ہر طائفۂ انسانی اور ہر حالتِ انسانی کے مختلف مظاہر اور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا مجموعہ ہو، صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے اگر تم دولت مند ہو تو مکہ کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو اگر تم غریب ہو تو شعب ابی طالب کے قیدی اور مدینہ کے مہمان کی کیفیت سنو اگر تم بادشاہ ہو تو سلطانِ عرب کا حال پڑھو اگر تم رعایا ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر دیکھو اگر تم فاتح ہو تو بدر و حنین کے سپہ سالار پر نگاہ دوڑاؤ اگر تم نے شکست کھائی ہے تو معرکۂ احد سے عبرت حاصل کرو، اگر تم استاد اور معلم ہو تو صفہ کی درسگاہ کے معلم قدس کو دیکھو اگر شاگرد ہو تو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر جماؤ اگر تم واعظ و ناصح ہو تو مسجد مدینہ کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو اگر تم تنہائی اور بے کسی کے عالم میں حق کے منادی کا فرض انجام دینا چاہتے ہو تو مکہ کے بے یار و مددگار نبی کا اسوۂ حسنہ تمہارے سامنے ہے اگر تم حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمنوں کو زیر اور اپنے مخالفوں کو کمزور بنا چکے ہو تو فاتح مکہ کا نظارہ کرو اگر تم اپنے کاروبار اور دنیاوی جدوجہد کا

نظم و نسق درست کرنا چاہتے ہو تو بنی نضیر، خیبر اور فدک کی زمینوں
کے مالک کے کاروبار اور نظم و نسق کو دیکھو، اگر یتیم ہو تو عبداللہ اور آمنہ
کے جگر گوشہ کو نہ بھولو، اگر بچہ ہو تو حلیمہ سعدیہ کے لاڈلے کو دیکھو، اگر تم
جوان ہو تو مکہ کے ایک چرواہے کی سیرت پڑھو، اگر تم سفری کاروبار
میں ہو تو بصریٰ کے کارواں سالار کی مثالیں ڈھونڈو، اگر تم عدالت
کے قاضی ہو اور پنچایتوں کے ثالث ہو تو کعبہ میں نور آفتاب سے
پہلے داخل ہونے والے ثالث کو دیکھو جو حجر اسود کو کعبہ کے ایک گوشہ
میں کھڑا کر رہا ہے، مدینہ کی کچی مسجد کے صحن میں بیٹھنے والے منصف کو
دیکھو جس کی نظر انصاف میں شاہ و گدا اور امیر و غریب سب برابر
تھے، اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہ اور عائشہ کے مقدس شوہر کی
حیات پاک کا مطالعہ کرو، اگر تم اولاد والے ہو تو فاطمہ کے باپ
اور حسن و حسین کے نانا کا حال پوچھو، غرض تم جو کوئی بھی ہو اور کسی حال
میں بھی ہو تمہاری زندگی کے لئے نمونہ تمہاری سیرت کی درستگی و اصلاح
کے لئے سامان تمہارے ظلمت خانے کے لئے ہدایت کا چراغ اور رہنمائی
کا نور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی جامعیت کبریٰ کے خزانے میں ہر وقت
اور ہمہ دم مل سکتا ہے اس لئے طبقات انسانی کے ہر طالب علم اور
نور ایمانی کے ہر متلاشی کے لئے صرف محمد رسول اللہ کی سیرت ہدایت
کا نمونہ اور نجات کا ذریعہ ہے جس کی نگاہ کے سامنے محمد رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے اس کے سامنے نوح و ابراہیم

ایوبؑ و یونسؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ علیہم السلام سب کی سیرتیں موجود ہیں گویا تمام دوسرے انبیاء کرام کی سیرتیں ایک ہی جنس کی اشیاء کی دوکانیں ہیں اور محمد رسول اللہؐ کی سیرت، اخلاق و اعمال کی دنیا کا سب سے بڑا بازار ہے جہاں ہر جنس کے خریدار اور ہر شئے کے طلب گار کے لئے بہترین سامان موجود ہے۔[1]

---

[1] خطبات مدراس ص ۹۶ - ۹۸

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

چھٹی صدی عیسوی میں عالمگیر پیمانہ پر یہ کیفیت نظر آتی ہے کہ پوری نوع انسانی خودکشی پر آمادہ نہیں بلکہ بضد ہے جیسے خودکشی کرنے کی اس نے قسم کھائی ہے، ساری دنیا میں خودکشی کی تیاری ہو رہی ہے اللہ تعالےٰ نے قرآن شریف میں اس منظر اور صورت حال کی جو تصویر کھینچی ہے اس سے بہتر کوئی بڑے سے بڑا مصور، ادیب و مؤرخ تصویر نہیں کھینچ سکتا، وہ فرماتا ہے :-

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ	اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو
اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ	جب تم ایک دوسرے کے دشمن
بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ	تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں
بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ	الفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی
عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ	سے بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے
فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۔ (آل عمران ۱۰۳)	گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے تو
	خدا نے تم کو اس سے بچا لیا۔

۱؎ جلسۂ سیرت کی ایک تقریر کا آخری حصہ جس میں بعثت محمدی کے احسانات اور بعثت محمدی کے ان عطیوں کا ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے تاریخ انسانی میں انقلاب برپا کر دیا اور نوع انسانی کی قسمت بدل دی، اس کتاب کا اختتام اسی مضمون پر کیا جا رہا ہے۔ (الانبیاء ۱۰۷)

بہت سے مؤرخوں اور سیرت نگاروں سے جاہلیت کی تصویر پوری طور پر
نہ کھینچ سکی، وہ تو صرف قابل معافی بلکہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ادب اور زبان
کا ذخیرہ ساتھ نہیں دیتا، واقعہ اور صورت حال اتنی سنگین، اتنی نازک، اتنی عجیب
اور اتنی پیچیدہ اور وسیع تھی کہ کوئی قلم سے اس کی تصویر اور زبان و ادب کی
بڑی سے بڑی قدرت و صلاحیت سے اس کی تعبیر ممکن نہیں، کوئی مؤرخ اس کا
حق کیسے ادا کر سکتا ہے، دور جاہلیت جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت
ہوئی کیا وہ ایک یا دو قوموں کے انحطاط یا اخلاقی بگاڑ کا مسئلہ تھا، خالی بت پرستی
کا مسئلہ تھا، اخلاقی جرائم و گناہ کا مسئلہ تھا، شراب نوشی، قمار بازی، عیش پرستی،
ہوس رانی، حقوق کی پامالی، ظلم و استبداد، معاشی استحصال، جابر و ظالم حکومتوں
ظالمانہ نظاموں اور غیر منصفانہ قوانین کا مسئلہ تھا؟ کیا مسئلہ یہ تھا کہ کسی ملک میں
باپ اپنی نوزائیدہ بچی کو زندہ درگور کر رہا تھا؟ مسئلہ یہ تھا کہ انسان انسانیت کو
خاک میں ملا رہا تھا، مسئلہ یہ نہیں تھا کہ عرب کے کچھ تنگ دل اور شقی القلب لوگ
اپنی معصوم بچیوں کو جھوٹی شرم اور خیالی ننگ و عار سے بچنے کے لئے ایک خود ساختہ
تخیل اور ایک ظالمانہ روایت کی بناء پر اپنے ہاتھوں زمین میں زندہ دفن کر دیتا
چاہتے تھے، مسئلہ یہ تھا کہ انسانیت اپنی پوری نسل کو زندہ دفن کرنا چاہتی تھی اور حدود
ختم ہو چکا اب اس کو کیسے لا کر سنبھالا کر دیا جائے، وہ دور جن لوگوں نے
دیکھا تھا وہی اس کی حقیقت کو سمجھتا اور جانتے تھے۔

مسئلہ کسی ایک ملک و قوم کا بھی نہیں تھا، نہ کسی ایک منطقہ اور خطہ کا تھا،
مسئلہ انسانیت کی قسمت کا تھا، مسئلہ نوع انسانی کے مستقبل کا تھا، اگر کوئی معمولی

ایسی تصویر پیش کرتے جیسا ہیں دکھایا گیا ہو کہ نوع انسانی کی نمائندگی ایک انسان
کر رہا ہے ایک حسین و جمیل پیکر ایک فربہ و توانا جسم جو خدا کی صنعت کا بہترین
نمونہ ہے جس سے آدم کا نام زندہ اور اس کا سلسلہ قائم ہے جو مسجود ملائکہ ہے
اور مقصود آفرینش جس کے سر پر خدا نے خلافت کا تاج رکھا ہے اور جس کی وجہ
سے یہ کرۂ ارضی ایک خرابہ اور ویرانہ نہیں ایک آباد اور گلزار جگہ ہے اس انسان
کے سامنے آگ کا ایک سمندر ہے ایک نہایت عجیب خندق ہے جس کی کوئی
تھاہ نہیں وہ انسان اس میں چھلانگ لگانے کے لئے تیار کھڑا ہے اس کے
پاؤں اٹھ چکے ہیں اور وہ بالکل بے پرواہ ہے ایسا نظر آرہا ہے کہ چند لمحوں میں وہ
اس کی اندھیریوں میں غائب ہو جائے گا اگر اس دور کی ایسی تصویر کھینچی جائے تو
کسی حد تک اس صورت حال کا اندازہ ہو سکتا ہے جو بعثت کے وقت پائی
جاتی تھی اور اسی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے کہ:۔

وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ	اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے
النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔	تک پہنچ چکے تھے خدا نے تم کو اس سے
(آل عمران - ۱۰۳)	بچا لیا۔

اور اسی بات کو نبوت نے ایک تمثیل میں بیان کیا ہے آنحضرت صلے اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اس دعوت و ہدایت کی مثال جس کے ساتھ مجھے دنیا
میں بھیجا گیا ہے ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی جب اس کی روشنی
گرد و پیش میں پھیلی تو پتنگے پروانے اور کیڑے جو آگ پر گرا کرتے ہیں ہر طرف سے ٹوٹ کر
اس میں گرنے لگے اسی طرح سے تم آگ میں گرنا اور کودنا چاہتے ہو اور میں تمہاری

کر کمر پکڑ کر تم کو اس سے بچاتا اور علیحدہ کرتا ہوں۔[1]

حقیقتاً اصل مسئلہ یہی تھا کہ انسانیت کی کشتی کو سلامتی کے ساتھ پار لگایا جائے جب انسان اپنے صحیح موڈ میں آجائے گا جب زندگی میں اعتدال اور توازن پیدا ہو جائے گا تو ان سب تعمیری، اصلاحی، علمی، ادبی اور ترقیاتی کوششوں اور منصوبوں کا دور آئے گا جن کی صلاحیت مختلف انسانوں اور انسانیت کے بہی خواہوں میں پائی جاتی ہے حقیقتاً ساری دنیا پیغمبروں کی احسان مند ہے کہ انھوں نے نوع انسانی کو ان خطرات سے بچا لیا جو اس کے سر پر ننگی تلوار کی طرح لٹک رہے تھے، دنیا کا کوئی علمی تعمیری اصلاحی کام، کوئی فلسفہ کوئی دبستان فکر ان کے احسان سے سبکدوش نہیں، سچ پوچھئے تو موجودہ دنیا اپنی بقا اور ترقی اور زندگی کے استحقاق میں پیغمبروں ہی کی رہین منت ہے، انسانوں نے زبان حال سے کئی مرتبہ یہ اعلان کیا کہ اب ان کی افادیت ختم ہو گئی اور اب وہ دنیا کے لئے اور اپنے لئے کوئی نافعیت، برکت و رحمت اور کوئی پیغام اور دعوت نہیں رکھتے انھوں نے اپنے خلاف خدا کی عدالت میں خود نالش کی اور گواہی دی ان کی مسل تیار تھی اور وہ اپنے کو بڑی سے بڑی سزا بلکہ سزائے موت کا مستحق ثابت کر چکے تھے۔

جب تمدن اپنے حدود سے تجاوز کر جاتا ہے جب وہ اخلاقیات کو یکسر فراموش کر دیتا ہے جب انسان اپنی سفلی خواہشات اور نفس کے حیوانی تقاضوں کی تکمیل کے سوا ہر مقصد اور ہر حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے جب اس کے پہلو میں انسان کے دل کے بجائے بھیڑیے اور چیتے کا دل پیدا ہو جاتا ہے جب اس کے

---

[1] صحیح بخاری (مشکوٰۃ ج ۱ ص۲۸)

جسم میں ایک فرضی معدہ اور ایک لامحدود نفس امارہ جنم لیتا ہے جب یہ نیا جنون کا دورہ پڑتا ہے تو قدرت خداوندی اس کو سزا دینے یا اس کے جنون کے نشہ کو اتارنے کے لئے نئے نئے نشتر اور نئے نئے جراح پیدا کرتی ہے ۔

کرتی ہے ملوکیت انداز جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز

آپ ملوکیت کے لفظ کو تمدن سے بدل دیجئے کہ تمدن کا بگاڑ اور تمدنی جنون ملوکیت کے جنون سے زیادہ خطرناک اور زیادہ وسیع ہوتا ہے ایک کمزور سا مریض اگر پاگل ہو جاتا ہے تو محلہ کی نیند حرام کر دیتا ہے اور سارا محلہ عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے آپ تصور کیجئے کہ جب نوع انسانی پاگل ہو جائے اور جب تمدن کا توازن بگڑ جائے، جب انسانیت کا مزاج خراب ہو جائے تو اس کا کیا علاج ہے؟

جاہلیت میں تمدن صرف بگڑا ہی نہیں تھا متعفن ہو گیا تھا اس میں کیڑے پڑ گئے تھے انسان نوع انسانی کا شکاری بن گیا تھا اس کو کسی انسان کی جانکنی کسی زخمی کی تڑپ اور کسی مصیبت زدہ کی کراہ میں وہ مزا آنے لگا تھا جو جام و سبو میں اور دنیا کے لذیذ سے لذیذ کھانے اور خوش نما منظر میں نہیں آتا تھا، آپ روما کی تاریخ پڑھیں جس کی فتوحات نظم و نسق اور قانون سازی اور تہذیب کے دنیا میں ڈنکے بجے یورپین مورخ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ اہل روما کے لئے سب سے زیادہ دلچسپ فرحت افزا اور مست کر دینے والا نظارہ وہ ہوتا تھا جب باہم شمشیر زنی یا خونخوار جانوروں کی لڑائی میں ہزیمت خوردہ اور مجروح شمشیر زن GLADIATOR جانکنی کی تکلیف میں مبتلا ہوتا اور موت کے کرب میں آخری ہچکی لیتا

اس وقت روما کے خوش باش اور زندہ دل تماشائی اس خونی کھیل کو دیکھنے کے لئے ایک دوسرے پر گرے پڑتے اور پولیس کو بھی ان کو کنٹرول میں رکھنا ممکن نہ ہوتا۔[1]

رومی عہد کی حیوانی جس میں انسان کو جانوروں سے لڑنے پر مجبور کیا جاتا تھا انسانی شقاوت و سنگدلی کی بدترین مثال پیش کرتی ہے لیکن یہ صرف اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ "تاریخ اخلاق یورپ" کے مصنف "لیکی" ان کھیلوں کی ہر دلعزیزی بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"حیوانی کی یہ مقبولیت و دل فریبی اس لحاظ سے مطلق حیرت انگیز نہیں کہ دیکھنے کے جتنے مناظر اس میں آکر جمع ہو گئے تھے اتنے کسی دوسرے منظر میں نہ تھے ان وسیع اکھاڑہ امراء و اعیان دولت کی زرق برق پوشاکیں تماشائیوں کا انبوہ کثیر ان کے ذوق و شوق کا اثر متعدی اتنے بڑے مجمع میں ایک موقع سکون و خاموشی اسّی ہزار زبانوں سے ایک بارگی صدائے تحسین بلند ہوتی اس کی آواز سے شہر کا سارا مضافات تھرتھرا جاتا اٹھتے جنگ کا گھڑی گھڑی رنگ بدلتے رہنا عدیم المثال جرأت و بے جگری کا اظہار ان میں سے ہر شئی تخیل کو متاثر کرنے کے لئے کافی ہے اور ان کی مجموعی طاقت قدرتی طور پر بہت قوی ہے۔

ان تماشا تفریحات کو روکنے کے لئے احکام جاری کئے گئے لیکن یہ سیلاب اتنا تیز و تند تھا کہ کوئی بند اسے روک نہیں سکتا تھا۔"[2]

۱؎ ملاحظہ ہو لیکی کی کتاب "تاریخ اخلاق یورپ" HISTORY OF EUROPEAN MORALS (BY LECKY)

۲؎ ایضاً صفحہ ۲۸۰ (ترجمہ مولانا عبدالماجد دریابادی)

پس جاہلیت کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ پوری زندگی کی چول اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی بلکہ ٹوٹ گئی تھی، انسان انسان نہیں رہا تھا، انسانیت کا مقدمہ اپنے آخری مرحلہ میں خدا کی عدالت میں پیش تھا، انسان اپنے خلاف گواہی دے چکا تھا، اس حالت میں خدا نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور ارشاد ہوا:۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔ (الانبیاء ۔ ۷ ۔۱) اور (اے محمد) ہم نے تم کو تمام جہان کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا یہ دور بلکہ قیامت تک پورا دور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت و دعوت اور مساعی جمیلہ کے حساب میں ہے۔ آپ کا پہلا کام یہ تھا کہ آپ نے اس تلوار کو جو نوعِ انسانی کے سر پر لٹک رہی تھی اور کوئی گھڑی تھی کہ اس کے سر پر گر کر اس کا کام تمام کر دے اس تلوار کو ہٹا لیا، اور اس کو وہ تحفے عطا کئے جنھوں نے اس کو نئی زندگی دیا، حوصلہ، نئی طاقت، نئی عزت اور نئی منزلِ سفر عطا کی اور ان کی برکت سے انسانیت تہذیب و تمدن، علم و فن، روحانیت و اخلاص اور تعمیرِ انسانیت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ہم یہاں پر آپ کے ان چند عطیوں کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے نوعِ انسانی کی ہدایت و اصلاح اور انسانیت کی تعمیر و ترقی میں بنیادی اور قائدانہ کردار ادا کیا اور جن کی بدولت ایک نئی دنیا وجود میں آئی۔

آپ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ آپ نے دنیا کو عقیدۂ توحید کی نعمت عطا فرمائی۔ اس سے زیادہ انقلاب انگیز، حیات بخش عہد آفریں اور مفید تر عقیدہ دنیا کو نہ پہلے کبھی ملا ہے، اور نہ قیامت تک کبھی مل سکتا ہے۔ یہ انسان جس کو

شاعری، فلسفہ اور سیاست میں بڑے بڑے دعوے ہیں اور جس نے قوموں ملکوں کو بار ہا غلام بنایا، عناصر اربعہ پر اپنی حکومت چلائی، پتھر میں پھول کھلائے اور پہاڑ کا جگر کاٹ کر دریا بہائے اور جس نے کبھی کبھی خدائی کا بھی دعویٰ کیا، یہ اپنے سے کہیں زیادہ مجبور و ذلیل، بے حس و حرکت، بے جان و مردہ اور بعض اوقات خود اپنی ساختہ پرداختہ چیزوں کے سامنے جھکتا تھا، ان سے ڈرتا اور ان کی خوشامد کرتا تھا، یہ پہاڑوں، دریاؤں، درختوں، جانوروں، ارواح و شیاطین اور مظاہر قدرت ہی کے سامنے نہیں، بلکہ کیڑوں مکوڑوں تک کے سامنے سجدہ ریز ہوتا تھا، اور اس کی پوری زندگی انہیں سے خوف و امید اور انہیں خطرات میں بسر ہوتی تھی جس کا نتیجہ بزدلی، ذہنی انتشار، وہم پرستی اور بے اعتمادی تھا، آپ نے اس کو ایسے خالص، بے آمیز، سہل الفہم، حیات بخش عقیدۂ توحید کی تعلیم دی جس سے وہ خدا کے سوا خالق کائنات ہے ہر ایک سے آزاد، نڈر اور بے فکر ہوگیا، اس میں ایک نئی قوت، نیا حوصلہ، نئی شجاعت اور نئی وحدت پیدا ہوئی، اس نے صرف خدا کو کارساز حقیقی، ساجت روائے مطلق، اور نافع و ضار (نفع پہنچانے والا اور نقصان پہنچانے والا) سمجھنا شروع کیا، اس نئی دریافت اور یافت سے اس کی دنیا بدل گئی، وہ ہر قسم کی غلامی و محکومیت اور ہر طرح کے بے جا خوف و رجا اور ہر طرح کے تشتت و انتشار سے محفوظ ہوگیا، اس کو کثرت میں وحدت نظر آنے لگی، وہ اپنے کو ساری مخلوقات سے افضل، ساری دنیا کا سردار و منتظم اور صرف خدا کا محکوم اور فرمانبردار سمجھنے لگا، اس کا لازمی نتیجہ انسانی عظمت و شرف کا قیام تھا جس سے پوری دنیا محروم ہوچکی تھی۔

بعثت محمدی کے بعد ہر طرف سے اس عقیدۂ توحید کی، جس سے زیادہ مظلوم و مجہول

کوئی عقیدہ نہ تھا، صدائے بازگشت آنے لگی، دنیا کے سارے فلسفوں اور افکار و خیالات پر اس کا گہرا اثر پڑا، وہ بڑے بڑے مذاہب جن کے رگ و ریشہ میں شرک اور تعدد الٰہ (متعدد خداؤں اور معبودوں) کا عقیدہ رچ بس گیا تھا، کسی نہ کسی طرح یہ اعلان کرنے پر مجبور ہوئے کہ خدا ایک ہے، وہ اپنے مشرکانہ عقیدوں کی تاویل پر مجبور ہوئے، اور ان کی ایسی فلسفیانہ تشریح کرنے لگے جس سے ان پر شرک و بدعت پرستی کا الزام نہ آئے اور وہ اسلامی عقیدۂ توحید سے کچھ دبے ہوئے نظر آئے، ان کو شرک کا اقرار کرنے میں شرم اور جھجک محسوس ہونے لگی اور سارے مشرکانہ نظام فکر و اعتقاد احساس کمتری INFERIORITY COMPLEX میں مبتلا ہو گئے، اس محسن اعظم کا احسان عظیم یہ ہے کہ اس نے توحید کی نعمت دنیا کو عطا کی۔

آپ کا دوسرا انقلاب آفریں اور عظیم احسان وحدت انسانی کا وہ تصور ہے جو آپ نے دنیا کو عطا کیا، انسان قوموں اور برادریوں، ذات پات اور اعلیٰ و ادنیٰ طبقوں میں بٹا ہوا تھا، اور ان کے درمیان انسانوں اور جانوروں، آقاؤں اور غلاموں اور عبد و معبود کا سا فرق تھا، وحدت و مساوات کا کوئی تصور نہ تھا، آپ نے صدیوں کے بعد پہلی مرتبہ یہ انقلاب انگیز اور حیرت خیز اعلان فرمایا۔

یا ایہا الناس إن ربکم واحدٌ	لوگو! تمہارا پروردگار ایک ہے، اور
وإن اباکم واحدٌ، کلکم لآدم	تمہارا باپ بھی ایک ہے، تم سب اولاد
وآدم من تراب، إن اکرمکم	آدم ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے، اللہ
عند اللہ اتقاکم، ولیس لعربی	کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز
علی عجمی فضل إلا بالتقویٰ۔ ([illegible])	وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ

پاک باتے ہے کسی عربی کو عجمی پر فضیلت
نہیں مگر تقویٰ کی بنا پر۔

یہ وہ الفاظ ہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری حج میں ایک لاکھ
چوبیس ہزار کے عظیم مجمع میں فرمائے تھے ان میں دو وحدتوں کا اعلان کیا گیا ہے
اور یہی وہ دو فطری مستحکم اور دائمی بنیادیں ہیں جن پر نسل انسانی کی حقیقی وحدت
کا قصر تعمیر کیا جا سکتا ہے اور جس کے سایہ کے نیچے انسان کو امن و سکون حاصل ہو سکتا
ہے اور وہ اشتراک عمل اور تعاون کے اصول پر انسانیت کی تعمیر نو کا کام انجام دے سکتا
ہے۔ یہ دو وحدتیں کیا ہیں؟ ایک نوع انسانی کے خالق و صانع کی وحدت، اور ایک
نسل انسانی کے بانی اور مورث کی وحدت اس طرح ہر انسان دوسرے انسان سے
دو ہرا رشتہ رکھتا ہے ایک روحانی اور حقیقی طور پر، وہ یہ کہ سب انسانوں اور جہانوں کا
رب ایک ہے، دوسرا جسمانی اور نسلی طور پر، وہ یہ کہ سب انسان ایک باپ کی اولاد
ہیں۔ دوسرے الفاظ میں توحید رب اور توحید اب کی تعلیم دی جس کو مختصر الفاظ
میں یوں کہا جا سکتا ہے "الرب احد والاب احد" رب (پروردگار) بھی ایک ہے اور
اب (والد بزرگوار) بھی ایک۔

جس وقت یہ اعلان کیا گیا تھا اس وقت دنیا اس کے سننے کے قابل (موڈ)
میں نہ تھی، یہ اعلان اس وقت کی دنیا میں ایک زلزلہ سے کم نہ تھا، بعض چیزیں
ایسی ہوتی ہیں جو تدریجی طور پر قابل برداشت ہو جاتی ہیں بجلی کا یہی حال ہے کہ
اس کو پردوں میں رکھ کر چھو لیتے ہیں لیکن بجلی کی عریاں لہر کو اگر کوئی چھو لے تو جسم میں

ف اس نکتہ کی تشریح میں جو تقریر میں اجمالاً آیا تھا مقرر کی تصنیف "ارکان اربعہ" سے استفادہ
کیا گیا ہے۔

اس کا کریڈٹ دوڑ جاتا۔ اور اس کا کام تمام کر دیتا ہے آج علم و فہم اور فکر انسانی کے
ارتقاء کی ان منزلوں میں جو اسلام کی دعوت اسلامی معاشرہ کے قیام مصلحین اور داعیان
اسلام کی کوششوں سے طے ہوئیں اس انقلاب انگیز اور زلزلہ فگن اعلان کو روز مرہ
کی حقیقت بنا دیا ہے اقوام متحدہ کے اسٹیج سے لے کر جس نے حقوق انسانی کا منشور
(HUMAN RIGHTS CHARTER) شائع کیا، ہر چھوٹے بڑے اور ادارہ کی طرف سے انسانی
حقوق اور مساوات انسانی کا اعلان کیا جا رہا ہے اور کوئی اس کو سن کر تعجب نہیں
ہوتا لیکن ایک زمانہ تھا جب مختلف قوموں اور خاندانوں کے مافوق البشر ہونے کا
عقیدہ قائم تھا اور بہت سی نسلوں اور خاندانوں کا نسب نامہ خدا سے اور سورج چاند
سے ملایا جا رہا تھا قرآن شریف نے یہودیوں اور عیسائیوں کا قول نقل کیا ہے کہ
ہم خدا کی لاڈلی اور چہیتی اولاد کی طرح ہیں "وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ
أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ" فراعنہ مصر اپنے کو سورج دیوتا کا اوتار کہتے تھے ہندوستان
میں سورج بنسی اور چندر بنسی خاندان موجود تھے شاہان ایران کو جن کا لقب کسریٰ
(خسرو) ہوا کرتا تھا اس کا دعویٰ تھا کہ ان کی رگوں میں خدائی خون ہے اہل ایران
انہیں اسی نظر سے دیکھتے تھے ان کا اعتقاد تھا کہ ان پیدائشی بادشاہوں کے خمیر میں
کوئی مقدس آسمانی چیز شامل ہے کیانی سلسلہ کے آخری ایرانی شہنشاہ یزدگرد کا
نام بتاتا ہے کہ وہ اور ایرانی ان کو خدا کا کس درجہ مقرب اور ہم نشین
سمجھتے تھے۔

چینی اپنے شہنشاہ کو آسمان کا بیٹا تصور کرتے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ
آسمان نر اور زمین مادہ ہے ان دونوں کے اتصال سے کائنات کی تخلیق عمل میں آئی

آلہ ہے اور شہنشاہ (خدا اول) اس جوڑے کا بیٹو تھا بیٹا[1] عرب اپنے سوا ساری دنیا کو گونگا اور بے زبان (عجم) کہتے تھے ان کا سب سے ممتاز قبیلہ قریش، عام عربوں سے بھی اپنے کو بالا و برتر سمجھتا تھا اور اسی احساس برتری میں حج کے ایسے عمومی اجتماع میں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھتا تھا[2]۔

قرآن نے اس فضا اور اس ماحول میں اعلان کیا:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن
ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا
وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ
عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات ۱۳)

لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے
پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے
تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو خدا
کے نزدیک تم میں عزت والا وہ ہے جو زیادہ
پرہیزگار ہے۔

اور قرآن کی ایک ایسی سورہ میں جو قرآن کا دیباچہ (فاتحہ) اور سب سے زیادہ پڑھی جانے والی سورہ ہے کہا گیا ہے:۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

سب تعریف اللہ کی ہے جو سارے جہانوں
کا پروردگار ہے۔

آپ کی رحمۃ للعالمینی کا تیسرا مظہر اور نوع انسانی پر تیسرا احسان عظیم احترام انسانیت اور انسان کی قدر و قیمت کا وہ اسلامی تصور ہے جو آپ کا عطیہ اور اسلام کا تحفہ ہے اسلام کا ظہور جس زمانہ میں ہوا اس زمانہ میں انسان سے زیادہ ذلیل کوئی نہیں تھا، انسانی وجود بالکل بے قیمت اور بے حقیقت ہو کر رہ گیا تھا بعض اوقات پالتو جانور

۱؎ ملاحظہ ہو تاریخ چین ان جیسی کا ذکر۔ ۲؎ ملاحظہ ہو کتب حدیث و سیرت۔

بعض مقدس جانور، بعض درخت جن کے ساتھ بعض عقائد و روایات وابستہ ہوگئی تھیں انسان سے کہیں زیادہ قیمتی لائق احترام اور قابل حفاظت تھے ان کے لیے بے تکلف انسانوں کی جانیں لی جا سکتی تھیں اور انسانوں کے خون اور گوشت کے چڑھاوے چڑھائے جا سکتے تھے آج بھی بعض بڑے بڑے ترقی یافتہ ممالک میں اس کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کے دل و دماغ پر نقش بٹھا دیا کہ انسان اس کائنات کا سب سے زیادہ قیمتی قابل احترام لائق محبت اور مستحق حفاظت وجود ہے آپ نے انسان کا پایہ اتنا بلند کیا کہ اس سے اوپر صرف خالق کائنات کی ہستی رہ جاتی ہے قرآن نے اعلان کیا کہ وہ خلیفۃ اللہ (خدا کا نائب) ہے ساری دنیا اور یہ سارا کارخانۂ عالم اسی کے لئے پیدا کیا گیا ہے:-

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرہ ۲۹)

وہی ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا جو اس زمین پر ہے۔

وہ اشرف المخلوقات اور اس بزم عالم کا صدر نشین ہے:-

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (اسراء ۔ ۷۰)

اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو جنگل اور دریا میں سواری اور پاکیزہ روزی عطا کی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی۔

اس سے زیادہ اس کی عزت افزائی اور اس کی اہمیت کا اعتراف کیا ہو سکتا ہے کہ صاف کہہ دیا گیا کہ انسان خدا کا کنبہ ہیں اور خدا کو اپنے بندوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور اس کو آرام پہنچائے "الخلق

عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ[۱]

انسانیت کی بلندی اور خدا کے اس کے قرب اختصاص کا اظہار اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے
جو ایک حدیث قدسی میں کیا گیا ہے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہے گا کہ اے فرزند آدم میں بیمار
ہوا تو مجھے دیکھنے نہیں آیا بندہ کہے گا پروردگار میں تیری عیادت کیا کر سکتا ہوں تو تو رب العالمین
ہے ارشاد ہوگا کیا تجھے معلوم نہیں ہوا میرا فلاں بندہ بیمار پڑ گیا تھا تو اس کی عیادت کو نہیں گیا۔
تجھے معلوم نہیں تھا کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا پھر ارشاد ہوگا اے
فرزند آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں دیا بندہ عرض کرے گا پروردگار
میں تجھے کیسے کھانا کھلا سکتا ہوں تو تو رب العالمین ہے ارشاد ہوگا کیا تجھے اس کا علم نہیں
ہوا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے اسے نہیں کھلایا کیا تجھے اس کی خبر نہ تھی کہ
اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو تو اس کو میرے پاس پاتا اے فرزند آدم میں نے تجھ سے پانی مانگا
تو نے مجھے پانی نہیں پلایا بندہ عرض کرے گا اے رب! میں تجھے کیسے پانی پلا سکتا ہوں تو تو
رب العالمین ہے ارشاد ہوگا تجھ سے میرے فلاں بندے نے پانی طلب کیا تھا تو نے اسے پانی نہیں
دیا تجھے اس کا پتہ نہیں چلا کہ اگر تو اس کو پانی پلاتا تو اس کو میرے پاس پاتا۔[۱] کیا کسی توحید
مذہب میں کیا انسانیت کی بلندی اور انسان کی رفعت و محبوبیت کا اس سے بڑھ کر اعتراف
واعلان پایا جا سکتا ہے؟ اور کیا دنیا کے کسی مذہب و فلسفہ میں انسان کو یہ مقام دیا گیا ہے؟
آپ نے خدا کی رحمت و شفقت کے لئے انسانوں پر رحم و شفقت کو شرط اور اس کا سبب قرار دیا اور فرمایا:

الراحمون یرحمھم الرحمٰن — رحم کرنے والوں پر رحمٰن کی رحمت ہوتی

ارحموا من فی الارض یرحمکم — ہے اگر تم اہل زمین پر رحم کھاؤ گے تو وہ

---

[۱] مشکوٰۃ بروایت بیہقی۔ [۲] صحیح مسلم۔

من فی السماء۔ جو آسمان پر ہے وہ تم پر رحمت نازل کریگا۔

آپ غور کیجیے کہ وحدت انسانی کا نقش دلوں پر بٹھانے اور احترام انسانیت کا یقین دلوں میں پیدا کرنے کے لئے جب یہ بلیغ تعبیر کی گئی تھی اس وقت انسانیت کا کیا حال رہا ہوگا ایک انسان کی ادنیٰ خواہش کی قیمت ہزاروں انسانوں کی زندگی تھی بادشاہ اٹھتے تھے اور ملکوں کے ملکوں کا صفایا کر دیتے تھے سکندر اٹھا اور جیسے کوئی کبڈی کھیلتا ہے ہندوستان تک چلا آیا اور قوموں اور تہذیبوں کے چراغ گل کر دیئے سیزر اٹھا اور انسانوں کا اس طرح شکار کھیلنا شروع کیا جیسے جنگلی جانوروں کا شکار کھیلا جاتا ہے ہمارے زمانہ میں بھی دو دو عالمگیر جنگیں برپا ہوئیں جنھوں نے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور محض قومی تکبر سیاسی انانیت اقتدار کی ہوس یا تجارتی منڈیوں پر قبضہ کرنے کے جذبہ کا نتیجہ تھا اقبال نے سچ کہا ہے

ابھی تک آدمی صید زبون شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے

چوتھا انقلابی کارنامہ یہ ہے کہ بعثت محمدی کے وقت نوع انسانی کے اکثر افراد پر فطرت انسانی سے بدگمانی اور خدا کی رحمت سے مایوسی کی ایک عام فضا چھائی ہوئی تھی اس ذہنی کیفیت کے پیدا کرنے میں ایشیا کے بعض قدیم مذاہب اور مشرق وسطیٰ اور یورپ کی تبدیل شدہ عیسائیت نے یکساں کردار ادا کیا تھا ہندوستان کے قدیم مذاہب نے تناسخ اور آواگون کے فلسفہ کے ذریعہ جس میں انسان کے ارادہ و اختیار کو مطلق دخل نہیں ہے اور جس کی رو سے ہر انسان کو اپنے پچھلے جنم کے اعمال اور غلطیوں کی سزا بھگتنی ضروری ہے اور عیسائیت نے انسان کے پیدائشی گنہگار

۱؎ مولانا حالی نے اس حدیث کا ترجمہ اس طرح کیا ہے ؎

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

ہونے اور اس کے لئے حضرت مسیح کے کفارہ ہونے کی ضرورت کے عقیدہ کی تعمیر اس بات کے متعلق دنیا کے لاکھوں کروڑوں افراد کو جو ان مذاہب کے پیرو تھے اپنی ذات سے بیگانگی اور اپنے مستقبل اور خدا کی رحمت سے مایوسی میں مبتلا کر دیا تھا۔

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پوری طاقت و صفائی سے اعلان کیا کہ انسان کی فطرت ایک سادہ تختی کے مانند ہے جس پر پہلے سے کوئی تحریر لکھی نہیں گئی اس پر بہتر سے بہتر تحریر لکھی جا سکتی ہے انسان اپنی زندگی کا خود آغاز کرتا ہے اور اپنے اچھے یا برے عمل سے اپنی دنیا و عاقبت بناتا یا بگاڑتا ہے وہ کسی دوسرے کے عمل کا ذمہ دار یا جوابدہ نہیں قرآن مجید نے بار بار اعلان کیا کہ آخرت میں کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ اس کے حصہ میں اپنی ہی کوشش اور اس کے نتائج آنے والے ہیں انسان کی کوشش کا نتیجہ ضرور ظاہر ہوگا اور اس کو اس کا پورا بدلہ ملے گا۔

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۝	یہ کہ کوئی شخص دوسرے (کے گناہ) کا بوجھ
وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝	نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کو
وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝	وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے
ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۝	اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی
(النجم ۳۸-۴۱)	پھر اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

اس اعلان سے انسان کا اپنی فطرت اور اپنی فطری صلاحیتوں پر وہ اعتماد بحال ہو گیا جو بالکل متزلزل ہو گیا تھا، وہ نئے عزم و یقین اور نئے جوش و ولولہ کے ساتھ اپنی اور انسانیت کی تقدیر چمکانے اور اپنی قسمت اور قوت آزمانے کے لئے سرگرم سفر ہو گیا۔

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے گناہوں لغزشوں یا غلطیوں کو ایک عارضی حالت قرار دیا جس میں انسان کبھی کبھی اپنی نادانی کی بنا پر فطری یا بتقریب شیطان کی ترغیب سے مبتلا ہو جاتا

صلاحیت خیر پسندی اور اعتراف قصور و ندامت اس کی فطرت کا اصل تقاضا اور
انسانیت کا جوہر ہے اپنی غلطی کا اعتراف کرنا اس پر نادم ہونا خدا کے سامنے جھک کر اپنے اس
قصور کی معافی مانگ لینا اور آئندہ ایسی غلطی کے نہ کرنے کا عزم کرنا انسان کی شرافت اور آدم کی میراث ہے
آپ نے دنیا کے مایوس دل شکستہ اور گناہوں کی دلدل میں گلے گلے ڈوبے ہوئے انسانوں پر توبہ کا باب دوبارہ
کھولا اور اس کی اس زور و شور سے تبلیغ فرمائی کہ آپ کو اس شعبہ کا دوبارہ زندہ کرنے والا کہنا
صحیح ہوگا اسی بنا پر آپ کے ناموں میں ایک نام "نبی التوبہ" (توبہ کا پیغمبر) بنا سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ نے
توبہ کو ایک مجبوری کی بات اور مجبوری ناکامی کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ آپ نے اس کے ایسے فضائل بیان
کئے اور اس کا مرتبہ اتنا بلند کیا کہ وہ اعلیٰ درجہ کی عبادت اور خدا کے تقرب و محبوبیت کا ایسا
ذریعہ بن گیا کہ اس پر بڑے بڑے معصوم صفت انسان گنہگاروں اور خطاکاروں پر رشک کرنے لگے۔

قرآن مجید نے اس طرح رحمت کی وسعت پر گنہگاروں کے توبہ کرسکنے اور ہر قسم کے گناہ
سے پاک صاف ہوجانے کے امکان کو اس دلکش اور دل نواز انداز میں بیان کیا اور گنہگار بندوں
اور نفس و شیطان کے زخم خوردہ انسانوں کو اس طرح خدا کے دامن رحمت میں پناہ لینے کی
منادی کی اور اس کی صلائے رحمت جوش و تلاطم کو اس انداز میں بیان کیا کہ محسوس ہونے لگا کہ
وہ مطلوب سے زیادہ طالب ہے اور ان گنہگار بندوں کے حق میں ذات حلیم و رحیم اور فیاض و کریم ہے
بلکہ اگر یہ کہنا صحیح ہو ان کا منتظر و مشتاق اور ان کا سچا قدردان ہے قرآن مجید کے ان
الفاظ کو پڑھئے اور اس لطف و شفقت کا اندازہ کیجئے جو اس کے لفظ لفظ سے ٹپکتی ہے۔

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا	کہہ دیجئے کہ اے میرے وہ بندو جنہوں نے
عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ	اپنے حق میں زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت
رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ	سے مایوس نہ ہو بیشک اللہ تعالیٰ تمام گن

الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (الزمر ۵۳)

معاف کر دیتا ہے بے شک وہ بڑا بخشنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔

ایک دوسری آیت میں گنہگار اور خطاکار انسانوں کے تذکرے اور سیاق وسباق میں نہیں بلکہ خالصتہً نیکو سیرت اور متّقی انسانوں کے سلسلہ اور سیاق وسباق میں گناہوں سے توبہ کرنے والوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:۔

وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ ○ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ○ وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ○ أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ مَغْفِرَةٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي

اور اپنے پروردگار کی بخشش اور بہشت کی طرف لپکو جس کا عرض آسمان اور زمین کے برابر ہے اور جو (خدا سے) ڈرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو آسودگی اور تنگی میں (اپنا مال خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور غصے کو روکتے اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں اور خدا نیکو کاروں کو دوست رکھتا ہے اور وہ کہ جب کوئی کھلا گناہ یا اپنے حق میں کوئی اور برائی کر بیٹھتے ہیں تو خدا کو یاد کرتے اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور خدا کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے؟ اور جان بوجھ کر اپنے افعال پر اڑے نہیں رہتے ایسے لوگوں کا صلہ پروردگار

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝ (آل عمران ۱۳۳، ۱۳۶)

کی طرف کی بخشش اور باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ بستے رہیں گے اور (اچھے) کام کرنے والوں کا بدلہ بہت اچھا ہے۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر پاکباز اور نیک سیرت بندوں کے مختلف طبقوں کا ذکر کرتے ہوئے اس نورانی فہرست کا افتتاح عابدوں زاہدوں کے بجائے "تائبوں" سے فرمایا گیا، قرآن مجید کی اس سورہ کی جس کا نام ہی سورہ توبہ ہے آیت ہے:-

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (التوبہ ۔ ۱۱۲)

توبہ کرنے والے عبادت کرنے والے حمد کرنے والے بے تعلق رہنے والے رکوع کرنے والے سجدہ کرنے والے نیک کاموں کا امر کرنے والے اور بری باتوں سے منع کرنے والے خدا کی حدوں کی حفاظت کرنے والے (یہی مومن لوگ ہیں) اور (اے پیغمبر) مومنوں کو (بہشت کی) خوشخبری سنا دو۔

اس اعزاز اور اظہار اعتماد کی ایک روشن مثال یہ ہے کہ جب قرآن مجید کی زبان سے ان تین صحابیوں کی توبہ کی قبولیت کا اعلان کیا گیا جو غزوۂ تبوک[1] کے نازک اور اہم موقع پر (جس میں شرکت نہایت ضروری تھی) بغیر کسی معقول عذر کے مدینہ میں رہ کر سخت کوتاہی کے مرتکب ہوئے تھے، تو ان کا ذکر کرنے سے پہلے خود پیغمبر اور ان مہاجرین و انصار کا ذکر کیا گیا جن سے اس موقع پر کسی کوتاہی کا صدور نہیں ہوا تھا، تاکہ ان تین پیچھے رہ جانے والوں کو اپنی تنہائی اور بے مائیگی کا

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتب سیرت اور کتب تفسیر و حدیث، واقعہ غزوۂ تبوک۔

احساس نہ ہوا اور وہ احساس کہتری اور انگشت نمائی کے داغ سے بری ہوجائیں اور ان پر تا قیامت تک قرآن مجید کے پڑھنے والوں پر یہ بات واضح ہوجائے کہ ان کی اصل جگہ اور اصل گروہ یہی صادقین اولین اور مہاجرین و انصار کے صف اول کے لوگ ہیں توبہ کی قبولیت تائب کی مقبولیت اور تعقیب الٰہی کے طور پر دلنوازی اور چارہ سازی کی اس سے زیادہ لطیف اور دقیق مثال ادیان و مذاہب اور علم الاخلاق اور علم النفس کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ اسی سورۂ توبہ میں ارشاد ہوا ہے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

(التوبہ ۔ ۱۱۷ ۔ ۱۱۸)

بے شک خدا نے پیغمبر پر مہربانی کی اور مہاجرین و انصار پر جو باوجود اس کے کہ ان میں سے بعضوں کے دل جلد پھر جانے کو تھے مشکل کی گھڑی میں پیغمبر کے ساتھ رہے پھر خدا نے ان پر مہربانی فرمائی بے شک وہ ان پر نہایت شفقت کرنے والا (اور) مہربان ہے اور ان تینوں پر بھی جن کا معاملہ ملتوی کیا گیا تھا یہاں تک کہ جب زمین باوجود فراخی کے ان پر تنگ ہوگئی اور ان کی جانیں بھی ان پر دوبھر ہوگئیں اور انہوں نے جان لیا کہ خدا (کے ہاتھ) سے خود اسی کے سوا کوئی پناہ نہیں پھر خدا نے ان پر مہربانی کی تاکہ توبہ کریں بے شک خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

اس کے علاوہ ایک اصول کے طور پر اس کا اعلان کیا کہ رحمت الٰہی ہر چیز پر حاوی

اور غضب و جلال پر غالب ہے، قرآن مجید میں ہے :-

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ۔ میری رحمت ہر چیز پر چھا دی اور محیط ہے
(الاعراف ۱۵۶)

اور حدیث قدسی میں ہے :-

اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ (حدیث) میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔

پھر اس نے مایوسی کو بھی کفر کا اور جہالت و گمراہی کا مرادف قرار دیا ہے، قرآن مجید میں ایک جگہ ایک پیغمبر برحق (حضرت یعقوبؑ) کی زبان سے کہلوایا گیا ہے :-

اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اللہ کی رحمت سے وہی لوگ مایوس ہوتے ہیں
اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (یوسف ۸۷) جو خدا کے منکر اور اس کی ذات و صفات سے انکار کرتے ہیں

دوسری جگہ ایک دوسرے جلیل القدر پیغمبر (حضرت ابراہیمؑ) کا قول نقل کیا گیا ہے۔

وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اپنے رب کی رحمت سے گمراہوں کے سوا
اِلَّا الضَّآلُّوْنَ۔ (الحجر ۵۶) کون مایوس ہو سکتا ہے؟

اس طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے توبہ کی فضیلت و ترغیب اور خدا کی رحمت کی وسعت و شمولیت کا اعلان و تبلیغ کر کے یاس و قنوط کی ماری ہوئی اور غضب و جلال کے اعلانات و تفصیلات سے (جن میں یہودی علماء اور شارحین کتب مقدسہ و قرون وسطیٰ کے غالی اور قطرت و شین عیسائی راہبوں اور پادریوں نے اہم کردار ادا کیا تھا) ڈری اور سہمی ہوئی انسانیت کو نئی زندگی کا پیغام دیا، اس کے تن مردہ اور دل افسردہ میں نئی روح پھونکی، اس کے زخموں پر مرہم رکھا، اور اس کو خاک ذلت سے اٹھا کر عزت و شرف، خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کے بام عروج پر پہونچا دیا۔

نبوت محمدی کا یہ پانچواں عظیم اور نا قابل فراموش احسان اور ایک گراں قدر تحفہ،

دین و دنیا کی وحدت کا تصور اور یہ انقلاب انگیز تعلیم ہے کہ ان میں کوئی حقیقی اختلاف نہیں محض اصطلاح
کا اختلاف ہے اور قدیم مذہبی زبان میں یا نزاع لفظی ہے۔ انسان کے اعمال و اخلاق اور ان سے
پیدا ہونے والے نتائج کا اصل انحصار انسان کی ذہنی کیفیت، عمل کے محرکات اور اس کے مقصد
پر ہے جس کو اسلام کے دین و شریعت کی زبان میں نیت کے ایک مختصر و سادہ لیکن نہایت بلیغ
و عمیق لفظ میں ادا کیا گیا ہے۔ اس کے نزدیک نہ کوئی چیز دنیا ہے اور نہ کوئی چیز دین۔ اس کے نزدیک
خدا کے رضا کی طلب، اخلاص اور اس کے حکم کی تعمیل کے جذبہ و ارادہ سے بڑے سے بڑا دنیاوی کام
یہاں تک کہ حکومت و جنگ، دنیاوی ضروریات، نفس کے تقاضوں کی تکمیل، حصول معاش کی
جد و جہد، جائز تفریح طبع کا سامان، ازدواجی و عائلی زندگی کا اسباب اعلیٰ درجہ کی عبادت، تقرب الٰہی
کا ذریعہ اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب ولایت تک پہنچنے کا وسیلہ اور خالص دین بن جاتا ہے۔ اس کے
برخلاف بڑی سے بڑی عبادت اور دینی کام جو رضائے الٰہی کے مقصد اور اطاعت کے جذبہ
سے خالی ہو حتیٰ کہ نماز، جہاد، ہجرت و جہاد، قربانی و سرفروشی اور ذکر و تسبیح، خالص
دنیا اور ویسا عمل شمار ہوگا جس پر کوئی ثواب اور اجر نہیں ہے۔

قدیم مذاہب نے زندگی کو دو خانوں (دین و دنیا) میں تقسیم اور دنیا کو دو کیمپوں،
اہل دین اور اہل دنیا میں بانٹ دیا تھا، جو نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے جدا تھے اور ان کے درمیان
ایک بڑی گہری اور وسیع خلیج حائل تھی بلکہ یہ دونوں خانے ایک دوسرے سے جدا اور
یہ دونوں کیمپ باہم متحارب تھے۔ ان کے نزدیک دین و دنیا میں کھلا تضاد اور شدید رقابت تھی، ہر
انسان کو کسی ایک کے رحم و کرم پر یا کسی ایک کا ہو کر دوسرے سے قطع تعلق اور اعلان جنگ کرنا ضروری
تھا، کوئی انسان ایک وقت میں ان دونوں کشتیوں پر سوار نہیں ہو سکتا تھا، معاشی جد و جہد، تجارت
و صنعت، زراعت و حرفت، حکومت و سلطنت، دینی و اخلاقی تعلیمات کو نظر انداز کئے بغیر نہ صرف خدا سے

خالی ہوئے بغیر اور دیندار رہنا تارک الدنیا ہوئے بغیر متصور ہی نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ انسان
عام طور پر سہولت پسند اور لذت پرست واقع ہوا ہے، دین کا ایسا تصور جس میں دنیا کی کسی جائز
تمتع، ترقی اور سربلندی یا طاقت و حکومت کے حصول کی گنجائش نہ ہو انسانوں کی اکثریت کے لئے
قابل قبول اور قابل برداشت نہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے متمدن ذہین، صاحب صلاحیت اور
باعزم انسانوں کی بڑی تعداد نے اپنے لئے "دین" کے بجائے "دنیا" کا انتخاب کیا، اور اس نے
اس پر اپنے کو مطمئن و راضی کر لیا، وہ ہر قسم کی دینی ترقی سے مایوس ہو کر دنیا کے حصول و اس کی
ترقی میں مشغول ہو گئی، دین و دنیا کے اس تضاد کو ایک مذہبی اور مسلم حقیقت بنا کر انسانوں کے
مختلف طبقوں اور نسلوں اور ملکوں نے عام طور پر مذہب کو خیر باد کہا، اور ریاست نے مذہب کے
نمائندہ کلیسا سے بغاوت کی اور اپنے کو اس کی ہر پابندی سے آزاد کر لیا، انسان بھی بے زنجیر
اور معاشرہ شتر بے مہار ہو کر رہ گیا، دین و دنیا کی اس دوئی اور اہل دین اور اہل دنیا کی
اس رقابت نے نہ صرف یہ کہ مذہب و اخلاق کے اثر کو محدود و کمزور اور انسانی زندگی اور انسانی
معاشرہ کو اس کی برکت و رحمت سے محروم کر دیا، بلکہ اس الحاد و لادینیت کا دروازہ کھولا جس کا
سب سے پہلے یورپ شکار رہا، پھر دنیا کی دوسری قومیں جو یورپ کے فکری، علمی یا سیاسی اقتدار کے
زیر اثر آئیں اس سے کم و بیش متاثر ہوئیں، موجودہ دنیا کی صورت حال جس میں مذہب و اخلاق کا زوال،
اور نفس پرستی اپنے وسیع معنی میں اپنے آخری نقطہ پر پہنچ گئی ہے اسی دین و دنیا کی تفریق کا نتیجہ ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم ترین معجزہ اور انسانیت کے لئے عظیم ترین تحفہ
اور آپ کی رحمۃ للعالمینی کا مظہر ہے کہ آپ کامل طور پر رسول و متحد ہیں اور بیک وقت "بشیر
و نذیر" ہیں، آپ نے دین و دنیا کے تضاد کے نظریہ کو ختم کر کے پوری زندگی کو عبادت میں اور
پورے روئے زمین کو ایک وسیع عبادت گاہ میں تبدیل کر دیا، دنیا کے انسانوں کو متحارب کیمپوں

نکال کر حسنِ عمل، خدمتِ خلق اور حصولِ رضاءِ الٰہی کے ایک ہی محاذ پر کھڑا کر دیا، یہاں لباس دنیا میں بھی درویشی، قبا و شاہی میں فقیر و زاہد، سیف و تسبیح کے جامع اور رات کے عبادت گذار اور دن کے شہسوار نظر آئیں گے اور ان کو اس میں کسی قسم کا تضاد محسوس نہیں ہوگا۔

چوتھا انقلاب یہ ہے کہ بعثتِ محمدی سے پہلے انسان اپنی منزلِ مقصود سے بے خبر تھا، اس کو یاد نہیں رہا تھا کہ اس کو کہاں جانا ہے؟ اس کی صلاحیتوں کا اصل میدان اور اس کی کوششوں کا اصل نشانہ کیا ہے؟ انسان نے کچھ موہوم منزلیں اور اپنی کوشش کے لئے کچھ چھوٹے چھوٹے دائرے بنا لئے تھے، ان میں انسانوں کی ذہانت اور قوتِ عمل صرف ہو رہی تھی، کامیاب اور بڑا انسان بننے کا مطلب صرف یہ تھا کہ میں دولت مند بن جاؤں، طاقتور اور حاکم بن جاؤں، وسیع سے وسیع رقبۂ زمین اور کثیر سے کثیر انسانی نفوس پر میری حکمرانی اور فرمان روائی قائم ہو جائے، لاکھوں آدمی ایسے تھے جن کا پروازِ تخیل، نقش و نگار، رنگ و آہنگ، لذت و ذائقہ اور طبل و طاؤس یا چوپایہ و حیوان کی تقلید سے بلند نہیں ہوتا تھا، ہزاروں انسان ایسے تھے جن کی ساری ذہانت اپنے زمانہ کے دولت مندوں اور طاقت وروں اور سرکار و دربار کی خدمت و خوشامد یا بے مقصد ادب و شاعری سے دل خوش کرنے میں صرف ہو رہی تھی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نسلِ انسانی کے سامنے اس کی حقیقی منزل لا کر کھڑی کر دی، آپ نے یہ بات دل پر نقش کر دی کہ خالقِ کائنات کی صحیح معرفت، اس کی ذات و صفات اور اس کی قدرت و حکمت کا صحیح علم، ملکوت السماوات والارض کی وسعت و عظمت اور ما بعد الطبیعیات کی دریافت، ایمان و یقین کا حصول، خدا کی محبت و محبوبیت، اس کو راضی کرنا اور اس کے

راضی ہو جانا، اس کثرت میں وحدت کی تلاش اور یافت انسان کی حقیقی سعادت اور کمالِ آدمیت ہے اپنی باطنی قوتوں کو ترقی دینا، ایمان و یقین کی دولت سے مالا مال ہونا، انسانوں کی خدمت اور ایثار و قربانی کے ذریعہ خدا کی خوشنودی کا حاصل کرنا اور کمال و ترقی کے ان اعلیٰ مدارج تک پہنچ جانا، جہاں فرشتے بھی نہیں پہنچ سکتے انسان کی کوششوں کا حقیقی میدان ہے۔

آپ کی بعثت کے بعد دنیا کی رُت بدل گئی انسانوں کے مزاج بدل گئے، دلوں میں خدا کی محبت کا شعلہ بھڑکا، خدا طلبی کا ذوق عام ہوا، انسانوں کو ایک نئی دُھن (خدا کو راضی کرنے اور خدا کی مخلوق کو خدا سے ملانے اور اس کو نفع پہنچانے کی) لگ گئی جس طرح بہار یا برسات کے موسم میں زمین میں روئیدگی، سوکھی ٹہنیوں اور پتیوں میں شادابی اور ہریالی پیدا ہو جاتی ہے، نئی نئی کونپلیں نکلنے لگتی ہیں اور در و دیوار پر سبزہ اُگنے لگتا ہے اسی طرح بعثتِ محمدی کے بعد قلوب میں نئی حرارت، دماغوں میں نیا جذبہ اور سروں میں نیا سودا سما گیا، کروڑوں انسان اپنی حقیقی منزلِ مقصود کی تلاش اور اس پر پہنچنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے، ہر ملک اور قوم اور ہر سمتوں میں یہی نشہ اور ہر طبقہ میں اس میدان میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کا یہی جذبہ موجزن نظر آتا ہے، عرب و عجم، مصر و شام، ترکستان اور ایران، عراق و خراسان، شمالی افریقہ اور اسپین اور بالآخر سارا ملک ہندوستان اور جزائر شرق الہند سب اسی صہبا ہے محبت کے متوالے اور اسی مقصد کے دیوانے نظر آتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انسانیت صدیوں کی نیند سے سو کر بیدار ہوئی، آپ تاریخ و تذکرے کی کتابیں پڑھئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ خدا طلبی اور خدا شناسی کے سوا کوئی کام ہی نہیں، شہر شہر قصبہ قصبہ، جگہ جگہ، گاؤں گاؤں بڑی تعداد میں ایسے خدا پرست، عالی ہمت، عارف کامل، داعی حق اور خادمِ خلق، انسان دوست اور ایثار پیشہ انسان نظر آتے ہیں جن پر فرشتے بھی رشک کریں تو بجا ہے

دلوں کی سرد انگیٹھیاں گرما دیں، عشقِ الٰہی کا شعلہ بھڑکا دیا، علوم و فنون کے دریا بہا دیئے علم و معرفت کی محبت کی جوت جگا دی اور جہالت و وحشت، ظلم و عداوت سے نفرت پیدا کر دی، مساوات کا سبق پڑھایا، دکھوں کے مارے اور سماج کے ستائے ہوئے انسانوں کو گلے لگایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بارش کے قطروں کی طرح ہر چپۂ زمین پر ان کا نزول ہوا اور ان کا شمار نا ممکن ہے۔

آپ ان کی کثرت (کمیت) کے علاوہ ان کی کیفیت کو دیکھئے ان کی ذہنی پرواز ان کی روح کی لطافت اور ذکاوت اور ان کے ذوقِ سلیم کے واقعات پڑھئے انسانوں کے لئے کس طرح ان کا دل روتا اور ان کے غم میں گھلتا، کس طرح ان کی روح سلگتی تھی انسانوں کو مصیبت سے نجات دینے کے لئے وہ کس طرح اپنے کو خطرہ میں ڈالتے اور اپنی اولاد اور متعلقین کو آزمائش میں مبتلا کرتے تھے ان کے حاکموں کو اپنی ذمہ داری کا کس قدر احساس اور محکوموں میں اطاعت و تعاون کا کس قدر جذبہ تھا، ان کے ذوقِ عبادت، ان کی قوتِ دعا، ان کے زہد و فقر، جذبۂ خدمت اور مکارمِ اخلاق کے واقعات پڑھئے نفس کے ساتھ ان کا انصاف، اپنا احتساب، کمزوروں پر شفقت، دوست پروری دشمن نوازی، ہمدردی خلائق کے نمونے دیکھئے بعض اوقات شاعروں اور ادیبوں کی قوتِ تخیل بھی ان بلندیوں تک نہیں پہنچتی جہاں وہ اپنے جسم و عمل کے ساتھ پہنچ گئے تاریخ کی مستند اور متواتر شہادت نہ ہوتی تو یہ واقعات قصے کہانیاں اور افسانے معلوم ہوتے۔

یہ انقلابِ عظیم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا عظیم معجزہ اور آپ کی "رحمۃ للعالمین" کا کرشمہ ہے۔

صدق اللہ العظیم۔ وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین۔
(الانبیاء - ۱۰۷)

INDEX

اشاریہ

(انڈکس نبیٔ رحمتؐ)

مرتبہ

محمد غیاث الدین ندوی

شخصیات

(ش)

اقوام و قبائل، طبقات اور ملتیں

کتابیات

ش

ص

مقامات

مساجد و عبادت گاہیں:

درس گاہیں، ادارے اور مطابع:

جنگیں سریے اور غزوات:

اسلحے اور متعلقات جنگ:

وفود قبائل عرب برائے قبول اسلام:

مذاہب و ادیان عقائد و فلسفہ

اسلامی، تمدنی و اصطلاحی الفاظ:

بت و بت خانے:

منصب و عہدے:

اشیاء خورد و اجناس، پھل پھول و نباتات:

سلطنتیں اور عہد:

معدنی اشیاء و پیداوار:

سکے، اوزان، پیمانے اور ظروف:

معاشرے، سوسائٹی اور تہذیب و ثقافت:

زیورات، اشیاءِ زینت و دیگر سامانِ استعمال:

پیشے، صنعت و حرفت اور معاملات:

زبان:

نامہ ہائے مبارک:

فتوحات و صلح نامے و عہد نامے:

بعض اہم اور تاریخ ساز واقعات:

دیگر متفرقات:

فہرست نقشہ جات "نبی رحمت"